گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

فروری 2016

انجم انصار کا نیا سلسلے وار ناول

نگہت سیما، تابندہ نعیم اور ناہید سلطانہ اختر کی دلکش کہانیاں......

شیف گلزار حسین کی دلچسپ باتیں......



ماہنامہ

کراچی

معران

زرارسول

انصار

معاون



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 3-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا اے حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

جبار

پارلر

فوٹو

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زرسالانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے...... جلد: 43 شمارہ: 11 فروری 2016ء

اداریہ

سلسلے وار ناول

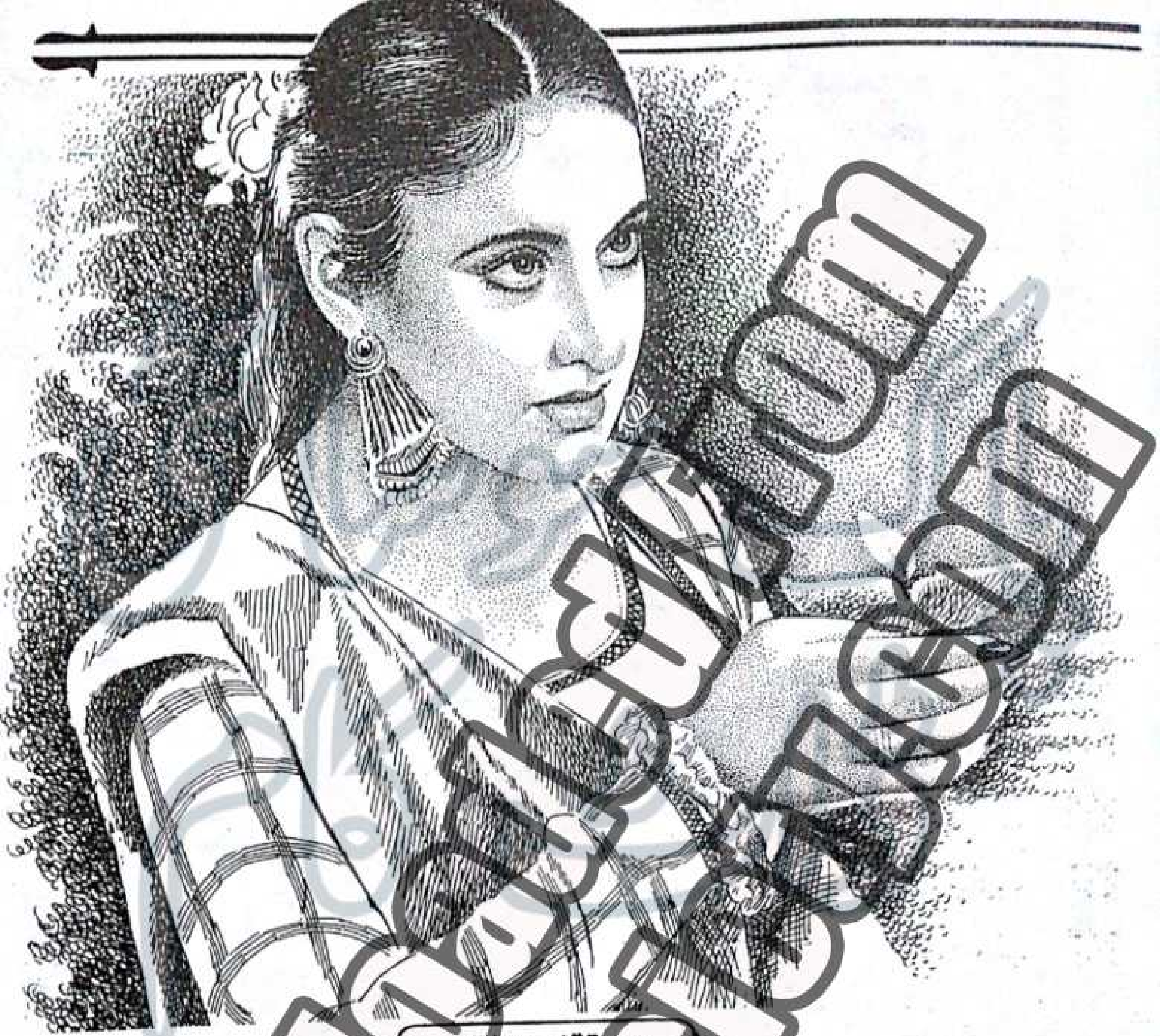
منی ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com



دنیا کا ہر مثبت سوچ اور پُر اعتماد شخصیت رکھنے والا فرد جانتا ہے کہ جس طرح اللہ نے ہر مرض کی دوا تخلیق کی ہے، اسی طرح اسے دی جانے والی مشکل کا حل بھی اس کی اپنی ذات کے اندر مخفی کر دیا ہے...... گویا یقین ہی وہ چراغ ہے جو زندگی کے اندھیروں میں آپ کی رہنمائی کرتا ہے...... وہ مقام جہاں ہر تدبیر ناکام ہو جاتی ہے وہاں ایک شخص کا یقین ہی سانس کی آمدورفت کا وسیلہ بنتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی مشکل، پریشانی کسی بھی شخص کو نہ صرف پریشان کر سکتی ہے بلکہ حواس باختہ بھی...... مگر پریشان ہو جانے سے کبھی کوئی پریشانی حل نہیں ہو سکتی...... اس لیے جب بھی کبھی ایسے حالات رونما ہوں تو جذباتی رویہ اپنانے سے گریز کرنا چاہیے......اور اپنے آپ کو جہاں تک ممکن ہو پُر سکون رکھیں۔

ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ گرم دماغ کبھی بھی اپنے افعال مکمل طور پر انجام نہیں دے پاتا...... اس لیے دماغ کو ٹھنڈا اور زبان کو اپنے قابو میں رکھیں...... کیونکہ آج تک کوئی بھی مسئلہ صرف غصے کی وجہ سے حل ہوتا دکھائی نہیں دیا ہے۔ مشکلات سے نمٹنے اور انہیں خوش اسلوبی سے حل کرنے کے لیے تین چیزیں یعنی معلومات، تفکر اور یقین بہت ضروری ہیں اگر آپ ان ہتھیاروں کی مدد سے اپنے دشمن کو چٹکی بجاتے ہی ختم کر سکتے ہیں ان تینوں کی مدد سے آپ اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں...... آپ کا یقین اور عزم...... وہ آپ کی ہمت ہے کہ آپ جو چاہتے ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں...... اور آپ، ہم اور سب یہی چاہتے ہیں ناں کہ نہ صرف ہمارے ملک میں امن ہو بلکہ پورے مسلم امہ میں پیار، محبت یک جہتی بھی ہو، آمین۔

مدیرہ
انجم انصار

اور وہ اپنے (تمام) بندوں پر غالب ہے اور وہ حکمت والا (اور) باخبر ہے (۱۸) کہہ دو کہ شہادت میں اللہ سے بڑھ کر کون ہے؟ کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان میں اللہ گواہ ہے اور (وہ گواہی دیتا ہے کہ) یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور اس کو جسے (یہ) پہنچ جائے اس کے ذریعے سے ڈراؤں کیا تم لوگ یقیناً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور معبود (بھی) ہیں؟ تم کہو کہ میں ایسی جھوٹی گواہی نہیں دے سکتا۔ کہہ دو کہ صرف وہی ایک معبود ہے اور بے شک میں ان سے بری ہوں جنہیں تم (اللہ کا) شریک کرتے ہو (۱۹) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (نبی) کو ایسا جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (مگر) جن لوگوں نے اپنا نقصان کیا تو وہ اس (نبی پر) ایمان نہیں لاتے (۲۰) اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے (۲۱) اور (وہ کیفیت یاد کرو) جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر جن لوگوں نے شرک کیا ہے ان سے کہیں گے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم (اللہ کا شریک) خیال کرتے تھے (۲۲) پھر ان کا عذر نہ رہے گا سوا اس کے کہ کہیں گے کہ اپنے پروردگار اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے (۲۳) (اے نبی ﷺ) دیکھو انہوں نے اپنے اوپر کیسا جھوٹ بولا اور جو کچھ (دنیا میں) یہ (ہمارے اوپر) افترا (کیا) کرتے تھے وہ ان (کے ذہن) سے جاتا رہا (۲۴) اور ان میں سے بعض (لوگ ایسے) ہیں کہ تمہاری طرف کان رکھتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں اس بات سے کہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرے پن کو (پیدا کر دیا ہے) اور اگر وہ تمام معجزے دیکھ لیں (تب بھی) اس پر ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تم سے جھگڑتے ہیں کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر اگلوں کی نقلیں (۲۵) (سورۃ انعام آیت نمبر ۱۸ تا ۲۵)



سیدنا قاسم ﷺ

صفاتی اسم مبارک

۲۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مرض الوفات میں آنحضرت ﷺ کے میرے پاس چھ یا سات دینار امانت کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میں ان کو تقسیم کردوں مگر آپ ﷺ کی بیماری میں مجھ کو اس کا خیال نہ رہا، آپ ﷺ نے ایک بار پھر پوچھا۔ میں نے عرض کی کہ آپ ﷺ کی علالت کی فکر کی وجہ سے یہ غفلت مجھ سے ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ان دیناروں کو منگوا کر اپنے ہاتھ مبارک پر رکھا اور فرمایا۔ اللہ کے اس نبی کے متعلق کیا گمان ہے جس کی اپنے رب سے ملاقات کا اگر وقت قریب آگیا ہوتو وہ اس حالت میں جائے کہ یہ دینار اس کے پاس موجود ہوں۔

۳۔ رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں بھیجا حضرت بلالؓ نے بازار میں غلہ فروخت کر کے ایک یہودی کا جو قرض تھا وہ ادا کیا۔ پھر آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر اطلاع کی تو آپ ﷺ نے پوچھا۔ کچھ بچ تو نہیں رہا۔ وہ بولے۔ ہاں کچھ بچ بھی رہا ہے۔ فرمایا کہ جب تک کچھ باقی رہے گا میں نہیں جاسکتا۔ حضرت بلالؓ نے عرض کی میں کیا کروں کوئی سائل ہی نہیں۔ آپ ﷺ نے مسجد میں رات بسر کی۔ دوسرے دن حضرت بلالؓ نے آکر کہا۔ یارسول اللہ ﷺ خدا نے آپ ﷺ کو سبکدوش کردیا یعنی جو کچھ تھا وہ بھی تقسیم کردیا گیا۔ آپ ﷺ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔ (بخاری)

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

یادوں کی مالا

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی



پُر عقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز رُوداد

یہ داستان جو میں رقم کررہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں...... نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستانِ عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

پانچواں باب

حکیم صاحب نے انشاء اللہ کہا تھا۔ مجھے ڈگری کیوں نہ ملتی۔ ان کی محبت، شفقت، وسعتِ قلبی سب کچھ سامنے ہے، میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ وہ میرے اعزاز میں ایک تقریب کرتے، وہ شہید کردیے گئے مگر اپنی وہ تحریر چھوڑ گئے جو میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ ان کی شہادت کے دو ماہ بعد مجھے ڈگری مل گئی۔ کاش وہ زندہ رہ جاتے، اس کے بعد وہ مجھے خود بتاتے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا تھا۔ انہوں نے میرے لیے کیا سوچ رکھا تھا، میں کچھ نہیں جانتی۔ حکیم سعید صاحب ایک آئیڈیل انسان تھے۔ ان کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ وہ میری تحریروں میں بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہمدرد کے ادارے سے میری دو کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ یہ بچوں کی کہانیوں کے مجموعے ہیں...... ایک کا نام ہے ''آنکھیں'' اور دوسری کتاب ''ماں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ بچوں کی ان دو کتابوں کے علاوہ فیروز سنز نے میری سیریز چچا بھلکو کو بھی دو والیوم میں شائع کیا تھا۔ بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب بچوں کا ادب دعوت اکیڈمی اسلامک یونیورسٹی سے شائع ہونے کے لیے گئی ہوئی ہے۔ دیکھیں کب چھپ کر آتی ہے، ابھی اس کے

عنوان کا بھی علم نہیں۔ (اب تک یہ چھپ بھی چکی ہے)
کبھی، کبھی سوچتی ہوں حکیم سعید صاحب سے میری شناسائی قرآن ہی کی بدولت تو ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ اللہ کی کتاب ہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ اسی کتاب کی روشنی تھی۔ جس نے میرے لیے علم کی راہوں کو منور کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں علم کو روشنی سے تعبیر کیا ہے اور جہالت کو اندھیرے سے، میں یہاں پر ایک بات کہنا چاہتی ہوں، میں نے عربی نہیں پڑھی، میں نے کتابت نہیں سیکھی، میرے پاس مذہب کے حوالے سے کوئی ڈگری نہیں ہے۔ میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں مگر میں نے اس کتاب کو بار، بار پڑھا، اس کے معنی بھی بار، بار پڑھے، لکھے بھی، اگر انسان بار، بار پڑھے تو اللہ کی کتاب کو اتنا ضرور سمجھ لے گا کہ وہ اپنی زندگی کو درست راستے پر ڈال سکے۔ اچھائی اور برائی میں فرق سمجھ سکے۔ ہمارا دین، دینِ فطرت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر وہ چیز منع فرمائی جو انسان کی فطری شرافت کے منافی ہے۔ جھوٹ بولنا، دھوکا دہی، قتل و غارت گری، فتنہ فساد، عیب جوئی، ماں باپ سے بدسلوکی، لوگوں پر ظلم کرنا، نمود و نمائش، منافقت، تکبر، غیبت، بہتان، ٹوہ لینا، کسی کو کم تر سمجھنا، عورتوں اور بچوں سے بدسلوکی کرنا اور ایسی ہی بے شمار باتیں جو اللہ تعالیٰ نے منع فرمائیں، وہ تو ویسے بھی کسی شریف انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ سب سے بڑا گناہ شرک قرار دیا۔ بے شک اللہ ایک ہے اور اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔

میں نے پورے قرآن حکیم کے معنی پڑھے اور لکھے بھی۔ میں نے بہت سوچا، ایک خاکہ یا ایک خیال...... میں نے پورے قرآن پاک کا خیال یا پورے قرآن پاک کا خلاصہ خود میں نے اپنے ذہن میں بنایا پھر اس کا خلاصہ اور خلاصے کا خلاصہ اور پھر یہ reduce ہوتے، ہوتے صرف ایک لفظ پر آ گیا۔ اور وہ لفظ تھا ''نور''...... اللہ تعالیٰ کے پاس نور ہے۔ اسی نے نور کو بھی تخلیق کیا، تمام فرشتے نور سے بنائے گئے۔ انبیا علیہم السلام بھی نور تھے۔ ان کے قلوب کو نور سے بھر دیا گیا۔ اللہ کی کتابیں بھی نور ہیں، قرآنِ حکیم نورِ ہدایت ہے اور مومنین بھی نور کا خزانہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ایک جانب اللہ تعالیٰ ہے اس کا نور ہے، روشنی، سیدھا راستہ، نیکی، سچائی، پارسائی، علم اور سکون...... اور دوسری جانب شیطان ہے، اندھیرا، برائی کا راستہ، بے حیائی، بدنامی، جھوٹ، فریب، جہالت، بے سکونی......

بدنصیب ہیں وہ لوگ جو شیطان کے فریب میں آکر اندھیری راہ چلتے اور گڑھے میں گر جاتے ہیں۔ نور ہی سے وحدانیت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ کیونکہ کائنات کی ہر شے نور سے بنائی گئی اور خود نور کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا۔

قرآن حکیم کو پڑھیں ایک بار ہی سہی مگر ترجمے کے ساتھ۔ نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ ہر لفظ بولتا ہے کبھی سنیے ضرور۔ یہ میں بس اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ میں کوئی عالم نہیں، نہ مفتی، نہ میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھتی ہوں نہ ہی جرأت کر سکتی ہوں کہ اللہ کے کلام کی تفسیر بیان کروں۔ میں تو صرف احساس کی بات کر رہی ہوں، وہ بھی اپنے احساس کی۔ مجھے بس ایسا ہی لگتا ہے۔ مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ میں اسے کیوں لکھتی ہوں بار، بار، میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

آپ اسے دیوانگی کہہ سکتے ہیں یا پھر passion، عشق کرنے والا انسان دیوانہ ہوتا ہے، وہ کچھ نہیں سوچتا، وہ کسی سوال کے یا جواب کے چکر میں نہیں پڑتا۔ وہ بس دیوانہ ہوتا ہے، بے غرض عشق کرنے والا جسے بدلے میں کچھ نہیں چاہیے ہوتا اور عطا کرنے والی ذات تو سب کچھ دیکھ رہی ہوتی ہے۔

تو ہے واحد تو احد تیرے سوا کوئی نہیں
کیوں میں مانگوں غیر سے میرا خدا تو ہی تو ہے
(ذکیہ بلگرامی)

وہ ضرور عطا کرتا ہے، اپنی رضا اپنی خواہش بتانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ تو خود جانتا ہے بن مانگے جھولی بھر دیتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(علامہ اقبال)

مانگنے والے نے جو مانگا اسے وہ مل گیا
اور بن مانگے بھی جو کر دے عطا تو ہی تو ہے

(ذکیہ بلگرامی)

میں ایک قلم کار ہوں، افسانہ، ناول اور مضامین لکھنا میرا مشغلہ رہا ہے مگر میں شاعر نہیں ہوں۔ ہاں شعر کہہ لیتی ہوں کبھی کبھار، جو ظاہر ہے شاعری کے معیار پر پورے نہیں اتر سکتے۔ میں نے تین نعتیں بھی لکھی تھیں بہت پہلے مگر ایک بار عجیب اتفاق ہوا۔ یہ 1999ء کی بات ہے۔ رمضان المبارک میں ہر رات مجھ پر ایک نعت اترتی، میں ڈائری میں لکھ لیتی، تاریخ نوٹ کر لیتی، کبھی نعت اور کبھی حمد، میں حیران ہوں، میں نعت لکھنا نہیں جانتی تھی نہ میں شاعر ہوں مگر ایک ساتھ 30 یا 40 نعتیں لکھ لینا، یہ کیونکر ممکن ہوا؟ رمضان کے بعد بھی کچھ ماہ یہ سلسلہ رہا تھا۔ اس میں سے بیشتر شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے شاعری کی ایک کتاب بھی ترتیب دے لی ہے۔ جس میں زیادہ تر یہی نعتیں، حمد، سلام وغیرہ ہیں، کچھ نظمیں ہیں اور چند غزلیں مختصر کلام ہے۔ میرے شعری مجموعے کا نام ہے۔ ''ٹھہرا ے زندگی'' اسی کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ''ٹھہرا ے زندگی'' آپ کو سنا رہی ہوں۔ اس میں ایک آرزو بیان کی گئی ہے آپ بھی پڑھیے۔

ٹھہرا ے زندگی

شاید مجھے وہ رات مل جائے
کوئی سوغات مل جائے
گزر جاؤں میں جس کو تھام کر ہر دشت و صحرا سے
مجھے وہ ہاتھ مل جائے
میں دُہراؤں جسے تا زندگی خاموش راتوں میں
مجھے وہ بات مل جائے
کوئی سوغات مل جائے
ٹھہرا ے زندگی!
زمیں سے آسماں تک نور میں ڈوبی ہوئی اک روشنی چمکے
میں سجدے میں گروں اس دم
اسی سے لو لگاؤں
اور
اسی کی بن کے سو جاؤں، سکوں پاؤں
عجب کیا ہے کہ سب یوں ہو
اگر وہ رات مل جائے
کوئی سوغات مل جائے
ٹھہرا ے زندگی!
شاید مجھے وہ رات مل جائے!

☆☆☆

مجھے ڈر ہے میرے پڑھنے والے بور نہ ہو گئے ہوں۔ کیونکہ یہ کوئی عام داستان نہیں ہے نہ ہی عام لوگوں کے لیے ہے۔ یہ تو ایک دیوانگی کی سچی داستان ہے۔ ایک ایسی خاتونِ خانہ کی داستان جو ساری زندگی علم کے پیچھے بھاگتی رہی، روشنی اور نور کی تلاش میں سرگرداں رہی...... جس کی زندگی میں صرف دو چیزیں ہمیشہ ساتھ، ساتھ رہیں...... ایک قلم، دوسرا قرآنِ حکیم...... کاش میں وہ سب کچھ لکھ سکتی جو میرے دل میں ہے، وہ سب کچھ بیان کر سکتی جو ان آنکھوں نے دیکھا اور جو محسوس کیا مگر تمام باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں، بتانے کی بھی نہیں ہوتیں۔

بات ہو رہی تھی حکیم سعید صاحب کی شہادت کی اور میرے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی...... بس یہ کہانی تو ختم ہوئی۔ جب مجھے ڈگری ایوارڈ ہوئی تو ریڈیو پاکستان سے بی بی سی اردو سروس کے نمائندے نے میرے گھر آ کر میرا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ میرے تمام رشتے داروں، دوستوں اور چاہنے والوں نے مبارک بادوں اور تحائف سے نوازا۔ میں سن سیٹ کلب کی ممبر ہوں اپنی کامیابی کی اطلاع میں نے کلب میں کر دی تھی۔ چنانچہ 1999ء کے سالانہ فنکشن میں مجھے وہاں بھی بہت سے تحائف سے نوازا گیا۔ یہ سب یادیں ہیں جو ذہن میں کہیں محفوظ ہیں۔ اس وقت جو یاد آ رہا ہے لکھتی جا رہی ہوں۔

یادوں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اگر انسان اس میں گم ہو جائے تو باہر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یادیں دکھ دیتی ہیں، یادیں خوشی بھی دیتی ہیں۔ یادیں انسان کی

دوست ہوتی ہیں، تنہائی کی ساتھی...... انسان ان یادوں سے باتیں کرتا ہے۔ ان کے ساتھ، ساتھ سفر کرتا ہے۔ گزرے ہوئے لمحات اسے حال سے ماضی کی طرف لے جاتے ہیں۔ انسان عمر کے کسی بھی حصے میں ہو، کبھی بچہ بن جاتا ہے، کبھی لڑکپن کے زمانے میں اور کبھی جوانی کے دنوں میں ان لمحوں کا مسافر بن جاتا ہے۔ اس سفر میں جتنے لوگ ملتے ہیں اور بچھڑتے ہیں ان سب کا احاطہ کرتا ہے۔ زندگی کا طویل سفر لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔ ذہن کی اسکرین پر ایک فلم چلتی ہے۔ جہاں سے چاہو اور جب چاہو اس فلم کو روک دو یا شروع کر دو بس بٹن آن یا آف کرنا پڑتا ہے۔

ادب کے حوالے سے چند ایسی شخصیات سے ملاقات ہوئی جن سے عام طور پر نہیں ہوتی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ویمن کالج میں بی ایس سی کی طالبہ تھی۔ میری ایک جگری دوست گوہرین قدوائی (ڈاکٹر) بھی اسی کالج میں آگئی تھی۔ اس نے فرسٹ ائیر سائنس میں داخلہ لیا تھا۔ اس کی والدہ نے اسکول کے زمانے ہی میں اسے انگلش میڈیم اسکول میں دو سال پیچھے کر کے داخل کرا دیا تھا اس وجہ سے میرا اور اس کا ساتھ چھُٹ گیا تھا مگر اب کالج میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے گھر میں مشاعرہ تھا۔ گوہرین، جلیل احمد قدوائی کی بیٹی ہے۔ اس رات میں اسی کے گھر رہی...... مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں کہ کون سے شاعر حضرات آئے تھے مگر بس اتنا یاد ہے کہ جوش ملیح آبادی خاص مہمان تھے مگر یہاں کچھ اور لکھنا چاہ رہی ہوں۔ میں نے وہاں موجود مہمان خواتین میں ایک عمر رسیدہ نہایت نفیس خاتون کو دیکھا بلکہ رات کو ہم ایک ہی کمرے میں سوئے...... میں نے گوہرین قدوائی سے پوچھا کہ یہ کون صاحبہ ہیں، تب اس نے بتایا یہ نذر سجاد ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی والدہ اور سجاد حیدر یلدرم کی بیگم...... مجھے ان صاحبہ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں نذر سجاد اور ان کے شوہر یلدرم کی تحریریں پڑھی تھیں۔ نذر سجاد نے اپنی شادی کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا اور یلدرم سے پہلی ملاقات کا ذکر کیا تھا جو کہ شادی کے بعد ہی ہوئی تھی۔ بے حد خوب صورت تحریر تھی، مجھے کسی ان دیکھی دنیا میں لے جاتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے کسی اسٹیج پر میں اس ہستی سے ملوں گی بلکہ ایک رات گزاروں گی جس کو صرف تصوراتی طور پر دیکھا تھا۔

اس کے بعد مجھے ابنِ انشا سے ملاقات یاد آتی ہے۔ ان دنوں میں نے سرسید کالج میں نیا، نیا پڑھانا شروع کیا تھا۔ کالج اسٹاف نے ایک گیٹ ٹوگیدر کی تھی، اس میں ابن انشا اور فیض احمد فیض آئے تھے۔ اسی محفل میں ہماری ایک اسٹاف ممبر نے ہارمونیم پر فیض کی نظمیں سنائیں۔ ان دنوں ہم ابنِ انشا کی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے دیوانے تھے۔ اب موقع ملا تھا ان سے باتیں کرنے کا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ابن انشا نے پوچھا تھا۔ آپ یہاں پڑھتی ہیں یا پڑھاتی ہیں......؟ ہم نے فخریہ کہا تھا کہ پڑھاتی ہوں۔ پھر میری ایک دوست نے ابنِ انشا کو بتایا کہ انہوں نے یعنی (میں نے) ایک عدد ناول لکھا ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے کوئی چھاپتا نہیں ہے۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ انشا جی مسکرائے اور انہوں نے اپنا کارڈ نکال کر مجھے دیا کہ آپ مجھ سے مل لیجیے گا۔ میں نے کارڈ لے کر پرس میں رکھا۔ ابن انشا کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ایک یادگار تصویر میرے پاس ہے۔

(میں ان کے کارڈ کے حوالے سے ان سے ملنے نہیں گئی مگر بعد میں ان کے خاندان سے تعلقات ہوگئے تھے)

ایک اور ملاقات سلمیٰ صدیقی سے تھی۔ معروف افسانہ نگار، پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی......ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر احسان رشید کراچی یونیورسٹی کے وی سی رہ چکے تھے۔ سلمیٰ صدیقی اپنی والدہ کے ساتھ کراچی آئی تھیں۔ یہ کافی پرانی بات ہے۔ اس وقت میرے بچے چھوٹے تھے۔ میری بڑی نند جنہیں ہم

آپا کہتے تھے، علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکی تھیں۔ میری سسرال کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے گھرانے سے قریبی تعلقات تھے اس وجہ سے یہ دونوں خواتین ایک دن آپا کے گھر گزارنے آئی تھیں۔ اس روز آپا نے مجھے بھی اپنے گھر بلالیا تھا اور افسانہ نگار کی حیثیت سے میرا تعارف ان سے کروایا تھا۔ سلمیٰ صدیقی نے اپنا ایک افسانہ بھی سنایا تھا۔ بس ہم چند ہی لوگ تھے۔ سلمیٰ صدیقی بہت اچھی افسانہ نگار ہیں۔ اچھی خاتون ہیں۔ معروف گھرانے سے تعلق بھی ہے مگر ان کو شہرت اس لیے زیادہ ملی کہ انہوں نے کرشن چندر سے شادی کی۔ آپا (میری نند) بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں ان کا ادبی معیار بہت بلند تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک قلم کار کی حیثیت سے میں ان کے معیار پر پورا نہیں اترتی تھی پھر بھی انہوں نے مجھے سلمیٰ صدیقی سے ملوایا تھا۔ آپا ایک بار مجھے مجنوں گورکھپوری سے ملوانے بھی لے گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی کے گھر بھی لے گئیں۔ آپا اگرچہ میری تحریریں نہیں پڑھتی تھیں مگر حوصلہ افزائی ضرور کرتی تھیں۔ ان کا انتقال پہلی جنوری 2006ء کو ہوا۔ ان کی تاریخ پیدائش بھی یکم جنوری ہی ہے۔

میری قریبی دوستوں میں ڈاکٹر گوہرین قدوائی، ڈاکٹر تنویر زبیری، ریحانہ جمیل، عالیہ حیات، فریدہ، ذکیہ دُرانی اور خورشید شامل ہیں۔ یہ ان خواتین کے نام ہیں جنہوں نے میرے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے علاوہ میری بے شمار دوستیں ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میری جان پہچان بے شمار لوگوں سے ہے کیونکہ بقول شاعر......

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

سرسید کالج کی ساتھیوں میں قمر خلیل اور اقبال صادق ہیں، یہ اگرچہ مجھ سے سینئر تھیں مگر دوستی میں سینئر جونیئر نہیں ہوتا۔ بس وہ دوست ہوتا ہے۔ دوست وہ ہوتا ہے جس سے کسی وقت بھی بلا جھجک فون پر بات کرلی جائے...... وہ یہ نہیں پوچھے گا نہ حیران ہوگا کہ ایک سے دوسری بار فون کیوں کیا اور جو صرف ملاقاتی ہوتے ہیں ان سے سوچ سمجھ کر یا پھر ضرورتاً بات کی جاتی ہے۔

پاکیزہ ڈائجسٹ کی ایڈیٹر انجم انصار کو میں دوست کہتی ہوں اس لیے کہ میں انہیں جب چاہوں فون کرلیتی ہوں اور اپنے بہت سے معاملات میں ان سے مشورہ لیتی ہوں۔ میری کہی ہوئی نظمیں ان کے ناولوں کی زینت بنی ہیں۔

میں نے ابھی اپنی بچپن کی دوست گوہرین قدوائی کا ذکر کیا تھا۔ آٹھویں تک ہم ساتھ پڑھے تھے پھر وہ دوسرے اسکول میں چلی گئی تھی۔ گورنمنٹ کالج فار ویمن میں جب میں بی ایس سی پارٹ ون میں آئی تو اس نے فرسٹ ائیر سائنس میں داخلہ لیا، اس طرح دو سال ملتے رہے۔ وہ میڈیکل کالج میں چلی گئی۔ میں یونیورسٹی اس کے بعد پھر کئی برس ملاقات نہ ہوئی۔ شادی کے بعد میں کراچی سے کوئٹہ ریل گاڑی سے جارہی تھی اور وہ بھی اتفاقیہ طور پر سلیپر کے ڈبے میں تھی۔ اس کا بیٹا اس وقت گود میں تھا۔ اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات پر بے حد خوشی ہوئی، پتا چلا وہ کوئٹہ میں رہتی ہے اور وہیں پریکٹس کرتی ہے۔ میں جب تک مسلم باغ میں رہی کوئٹہ جاتی تو اس کے گھر ضرور جاتی...... اس کے بعد میں کراچی آگئی تو پھر ہمیں ایک دوسرے کی کوئی خبر نہیں ملی کیونکہ وہ پھر کوئٹہ میں نہیں تھی۔

جب میرا چھوٹا بیٹا کاشف این ای ڈی میں پڑھتا تھا تب اس نے اپنے ایک میتھ کے استاد پروفیسر معروف قدوائی کا تذکرہ کیا۔ میں نے سوچا کہ یقیناً یہ گوہرین قدوائی کے بڑے بھائی ہوں گے۔ میں نے کاشف کو اپنا کارڈ دیا اور کہا تم اپنے پروفیسر سے پوچھو کہ وہ گوہرین کے بھائی ہیں اور ان کا پتا لے آؤ۔ کاشف کو جھجک تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آپ کی دوست کے بھائی نہیں ہوں گے۔ بہر حال ایک دن یہ ڈرتے، ڈرتے قدوائی صاحب کے پاس گیا اور میرا کارڈ دیا تب انہوں نے بتایا کہ گوہرین ان کی بہن ہے اور وہ یہ جان کر بے حد خوش ہوئے کہ میں ان کی بہن کی دوست ہوں۔ ان دنوں میں پی ایچ ڈی کررہی تھی۔ قدوائی صاحب نے اپنا فون نمبر دیا تھا۔ میں دو روز تک ان سے بات نہ کرسکی تو

ان کا خود ہی میرے پاس فون آگیا۔ شکوہ کرنے لگے کہ میں نے فون کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے گوہرین کا پتا اور فون نمبر دیا جو کہ اس وقت لاہور میں رہتی تھی۔ اور پھر بہت دیر تک پرانی باتیں کرتے رہے کیونکہ ان کے گھرانے سے ہمارے گھرانے کے پرانے تعلقات تھے۔ میری بڑی بہن دہرہ دون میں ان کے والد سے پڑھتی تھیں پھر ان کی ایک بہن ڈاکٹر پروین قدوائی میری بہن کی شاگرد بنی...... پھر میں اور گوہرین کلاس فیلو اور دوست تھے اور اب میرا بیٹا قدوائی صاحب کا شاگرد تھا۔ ان سے اکثر فون پر بات ہوتی رہی اور گوہرین سے ایک بار پھر بات چیت شروع ہوگئی۔ وہ مجھے لاہور بلاتی ہے اور میں اسے کراچی آنے کی دعوت دیتی ہوں۔ دیکھیں کب ملاقات ہو۔

زندگی کے سفر میں کھو کر بھی
ملنے والے ضرور ملتے ہیں
(ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی)

میری ایک اور پانچویں جماعت کی دوست فرزانہ یاسمین مجھے کچھ سال قبل ملی۔ وہ ٹورنٹو میں رہتی ہے۔ اس نے کراچی یونیورسٹی سے زوولوجی میں ایم ایس سی کیا تھا۔ میری افسانہ نگار دوستوں میں ایک نام عفت گل اعزاز کا بھی ہے۔ یہ اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں باٹنی کی پروفیسر ہیں 2004ء میں اردو ڈائجسٹ کی اسلام آباد میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جسے میں اٹینڈ کرنے گئی تھی تب چند گھنٹے ان کے گھر بھی گزارے تھے۔ بے حد مخلص اور محبت کرنے والی ہستی اور بہت اچھی لکھاری بھی ہیں۔ ان کے علاوہ میں فرزانہ چیمہ کا ذکر بھی ضرور کروں گی جو کہ پنجاب یونیورسٹی میں لائبریرین ہیں۔ کئی ماہناموں کی ایڈیٹر بھی ہیں ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ مگر یہ بہت اچھی دوست ہیں۔ عرصہ ہوا انہوں نے ماہنامہ ''بتول'' لاہور کے لیے میرا انٹرویو کیا تھا۔ بس تبھی سے دوستی ہوگئی۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے ماہنامہ ''نور'' میں میرا تفصیلی انٹرویو شائع کیا۔ فون پر اکثر بات چیت ہوتی ہے۔ میری تحریر شاید بے ربط ہورہی ہے۔ کبھی کوئی بات تو کبھی کوئی، دراصل یادیں بہت ہیں اور یہاں میں مختصر لکھنا چاہ رہی ہوں اور وہ بھی صرف ایک ہی پہلو سے...... اب میں 2000ء کی بات کروں گی۔

میں اپنے بچوں سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مجھے 2000ء سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتادیا تھا...... الرٹ کردیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور پھر وہ ہوگیا جس کا گمان بھی نہیں تھا۔ 10 مئی 2000ء کو پتا چلا کہ میرے شوہر کو کینسر ہے۔ پھیپھڑے کا کینسر اور یہ پورے جسم میں پھیل چکا ہے۔ ان کے دل کی بیرونی جھلی سے دو لیٹر پانی نکالا گیا۔ 29 بوتلیں خون کی دی گئیں۔ platelets دیے گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے یہ کہہ دیا کہ یہ مہینے یا دو مہینے کے مہمان ہیں۔ میں ان لمحات کی کیفیت کو الفاظ میں نہیں بیان کرسکتی۔ ایک شخص چند روز پہلے تک چل پھر رہا تھا۔ بظاہر نارمل تھا، اس سے متعلق یہ سب سن کر نارمل رہنا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میری دنیا اجڑ رہی تھی۔ بچے پریشان تھے، میں نے پھر قرآن حکیم کا سہارا لیا۔ ان کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے عالیہ کی شادی ہوجانے کی بھی دعا کی۔ پہلی کیموتھراپی کے بعد وہ بہت بہتر ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر حیران تھے، میڈیکل ہسٹری تو کچھ اور کہتی تھی کہ اس طرح کا مریض ایک ہفتے یا پھر دو ہفتے بعد دوبارہ اسپتال آجاتا ہے، دوبارہ پانی بھر جاتا ہے، میری دعائیں رنگ لائیں اور وہ اتنے ٹھیک ہوگئے تھے کہ اخبار پڑھتے، ٹی وی دیکھتے، ڈرائیور کے ساتھ جاکر بینک اور بچت سینٹر کا کام نمٹاتے، مناسب غذا بھی لیتے۔ کم از کم ایک سال تک وہ بالکل ٹھیک رہے۔ میں ان کے لیے مسلسل دعائیں کرتی۔ ان دنوں میں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں یونیورسٹی نہیں چھوڑوں گی اور ریسرچ جاری رکھوں گی لیکن اب حالات ایسے تھے کہ یہ سب ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی لیب جاکر تمام سامان اپنے گائڈ کے حوالے کردیا۔

2001ء کے آخر میں ان کی طبیعت پھر خراب

ہوئی لیکن عالیہ کا رشتہ بھی طے ہوگیا۔ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور یہ وہ رمضان ہے جب میں نے صرف پہلا روزہ رکھا پھر نہ رکھ سکی۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ میں اپنے تمام روزے پورے کروں گی۔ گھر اور آغا خان اسپتال پھر بازار کے چکر، ذہنی انتشار نے مجھے اندر سے مار دیا تھا۔ شروع، شروع میں دوسرے لوگ بھی اسپتال میں رہ جاتے لیکن بعد میں، میں ہی اسپتال میں رہتی، گھر بھی دیکھتی، کھانا پکاتی، راتوں کو جاگتی، انہیں سانس مشکل سے آتی تھی اس لیے آکسیجن لگانا اور کبھی، کبھی Nebulizer بھی دینا ہوتا تھا۔ میں سو نہیں سکتی تھی۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کب دن ہوا کب رات آئی۔ کبھی وہ گھر آجاتے کبھی اسپتال میں ہوتے۔ 17 دسمبر کو عید تھی اور 23 دسمبر کو عالیہ کا نکاح گھر پر کیا پھر 26 دسمبر کو رخصتی اور 27 دسمبر کو ولیمہ ہوا۔ باپ نے اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو رخصت کیا بس پھر ان کی طاقت ختم ہوگئی۔ 14 جنوری 2002ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

موت اور زندگی سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو بہتر سمجھتا ہے کرتا ہے۔ ہمیں اس کی مرضی میں راضی، خوشی رہنا چاہیے۔ میں نے سوچا اللہ کتنا بڑا کارساز ہے۔ اگر وہ 1972ء میں ہونے والے جان لیوا حادثے میں ختم ہوگئے ہوتے تو میں کیا کرتی؟ وہ نہ صرف اس وقت اچھے ہوگئے تھے بلکہ صحت مندی کے ساتھ اپنی سروس پوری کی اور باعزت ریٹائر ہوئے۔ اپنے فرائض بھی پورے کیے۔ گھر تو وہ پہلے ہی بنوا چکے تھے۔ بیٹی کی شادی کے لیے فکر مند رہتے تھے وہ بھی ہوگئی۔ میں اپنے بڑے بیٹے کی شادی 1997ء میں کر چکی تھی۔

ان کے انتقال کے بعد میری زندگی میں ایک ٹرننگ پوائنٹ آیا۔ میں نے تمام مصروفیات ترک کردیں۔ کہیں بھی جانا چھوڑ دیا۔ عدت کے بعد بھی میں نہ کسی کے گھر جاتی نہ کسی سے ملتی، دل بجھ گیا تھا۔ میری سوشل لائف بہت اچھی رہی تھی کیونکہ بلگرامی صاحب مجھے اپنے ساتھ ہر جگہ لے جاتے تھے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے پروگرام میں وہ مجھے لے جاتے۔ ایک زمانے میں Jabees ہوٹل میں ہر ماہ پروگرام ہوتا تھا اور ہم ضرور جاتے تھے۔ ریسرچ کے دنوں میں سات سال تک ہم بزمِ سائنسی ادب کے پروگراموں میں پابندی سے جاتے رہے، ہر ماہ کے آخری ہفتے کو یہ پروگرام بھی ہوتا ہے۔ سلیم الزماں صدیقی سینٹر میں مگر اب لے جانے والا کوئی نہیں اس لیے وہاں بھی جانا چھوڑ دیا۔

بزمِ سائنسی ادب کا ممبر بننے کی بس ایک شرط ہے کہ کم از کم تعلیم ایم ایس سی ہو۔ یہاں ہر چیز سائنسی ہوتی ہے۔ نظم، غزل یا مضامین سب ہی کسی نہ کسی سائنسی موضوع پر ہوتے ہیں۔ میں نے وہاں سائنسی افسانے بھی پڑھے جو لوگوں نے پسند کیے۔ میں نے کئی پروگراموں میں سائنسی نظمیں اور غزلیں بھی پڑھیں۔ ہر پروگرام کی تصاویر میرے پاس ہیں۔ بلگرامی صاحب کو فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ وہ کیمرا ضرور لے جاتے تھے۔ بزمِ سائنسی ادب کا ایک پروگرام مدینتہ الحکمت میں ہوا تھا۔ اس پروگرام میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر علی تھے۔ جو اُن دنوں کراچی یونیورسٹی کے وی سی تھے۔ میں نے اس پروگرام میں بھی نظم پڑھی تھی جو فنجائی کے حوالے سے تھی۔

شوہر کی وفات کے بعد میں اکیلی ہوگئی۔ وہ کہتے تھے کہ میری صرف دو خواہشیں رہ گئی ہیں۔ ایک تو عالیہ کی شادی ہوگئی تھی اور اب مجھے ان کی دوسری خواہش پوری کرنی تھی۔ مجھے ان کا حج بدل کروانا تھا۔ اسی سال میں نے آصف (بڑے بیٹے) کے ساتھ حج پر جانے کی درخواست دی۔ حج بدل کے لیے آصف کے دوست عمران نے رضامندی دی جو اپنا حج اسی سال کر کے آئے تھے۔ ہم نے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر حج کیا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انتظامات بہت اچھے کروادیے۔ 10 فروری 2003ء کو حج ہوگیا۔ ہمارا 22 دن کا ٹرپ تھا۔ رہائش اور ٹرانسپورٹ، کھانا پینا ہر چیز کا بہت اعلیٰ انتظام تھا۔ خوش قسمتی سے علما گروپ کے ساتھ ہمیں جگہ مل گئی تھی۔ مکے سے مدینے کا سفر بھی ہم نے

ہوائی جہاز سے کیا۔ اللہ کا لاکھ احسان اور شکر ہے کہ حج کے سلسلے میں ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں ہوا بلکہ اس قدر آرام ملا کہ جس کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہم ساتھ خیریت کے گھر واپس آئے اور میرے دل کو سکون ملا کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا اور اپنے شوہر کی آخری خواہش پوری کردی۔

میں یہاں پر ایک بات کہنا چاہوں گی ان خواتین سے جو یہ روداد پڑھ رہی ہیں کہ میں نے اب تک جو کچھ لکھا اس میں یہی بتایا کہ میرے شوہر ایک مثالی شوہر تھے۔ انہوں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اور جتنا کچھ کیا وہ کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا تھا۔ مگر ایک بات ہے کہ یہ سب کچھ یہ خیال، محبت اور جاں نثاری ...... یہ کبھی یکطرفہ نہیں ہوتے۔ یہ معاملات ہمیشہ دو طرفہ ہوتے ہیں اگر انہوں نے میرے ساتھ بہترین رویہ رکھا تو میں نے بھی ان کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہوگا بلکہ بہت کچھ کیا ہوگا۔ ہر انسان کے اندر کچھ عادتیں ہوتی ہیں۔ ان کے اندر بھی کچھ عادتیں تھیں، کچھ باتیں اور کچھ آئیڈیاز جن کو وہ تبدیل نہیں کرسکتے تھے۔ وہ اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ میں نے ان کی عادت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے سمجھوتا کرلیا اور تمام زندگی نبھایا۔ میں نے اپنی ذات کے لیے ان سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی...... بہت سادہ زندگی گزاری، وہ خود ہی میرے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے جس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ لہٰذا میری نصیحت ہے لڑکیوں کے لیے، اپنے شوہر کے مزاج کو سمجھیں اور اس کی خوشی کی خاطر اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ صبر، شکر، خاموشی اور تحمل سے کام لیں۔ گھر کو جنت بنانا لڑکی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور جنت بھی ان ہی عورتوں کو ملتی ہے جو اپنے شوہروں کو خوش رکھتی ہیں۔

اب پھر میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتی ہوں۔ مجھے چھٹا کلام پاک لکھے ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں اتنی مصروفیات رہیں کہ لکھنا ناممکن تھا۔

سب سے اہم اور ضروری کام شوہر کی خدمت کرنا اور دیکھ بھال تھی۔ چنانچہ دو سال اس میں گزر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد میں عدت میں چلی گئی۔ چار ماہ دس دن نہ کہیں جانا تھا اور نہ آنا، اور ویسے بھی کسی کے گھر گئے دو سال سے زائد گزر چکے تھے۔ اب میں نے ایک بار پھر قرآن حکیم کی کتابت کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس بار جو قرآن حکیم لکھا گیا وہ سات رنگ کے کاغذوں پر ہے۔ قرآن حکیم کی سات منزلیں ہیں، ہر منزل ایک الگ رنگ کے کاغذ پر لکھی گئی۔ آیات کو سنہرے رنگ سے بھرا گیا۔ یہ قرآن حکیم میں نے اپنی نجات کی نیت سے لکھا۔ 25 مارچ 2002ء پیر 10 محرم الحرام کو شروع کیا جانے والا یہ قرآن حکیم 4 اکتوبر 2002ء جمعہ شبِ معراج کو مکمل ہوا۔ اسے لکھنے میں 6 ماہ اور 9 دن لگے۔ اسے میں نے دن اور رات کے حصے میں بھی لکھا۔ جب بھی وضو ہوتا لکھنے بیٹھ جاتی۔ عجب سکون ملتا۔ جی چاہتا تھا اسے جلد مکمل کرلوں۔ چنانچہ یہ بہت جلد مکمل ہوگیا۔ خوب صورت جلد بندی کروائی...... اس پر سنہرے حروف سے القرآن حکیم لکھ دیا۔ یہ میری پرسنل کاپی ہے اس لیے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔

(باقی آئندہ)

ضروری نوٹ

عزیز قارئین! ذکیہ آپا ناسازیٔ طبع اور ضعف کے باعث فون پر زیادہ گفتگو نہیں کرپاتیں۔ آپ کے جذبات و احساسات ان تک پہنچادیے جاتے ہیں پھر بھی آپ ان سے بذریعہ سوال کوئی رابطہ کرنا چاہتی ہیں تو ادارے کے ایڈریس پر ڈاکٹر ذکیہ آپا اور پاکیزہ لکھ کر روانہ کردیں۔ آپ لوگ بذریعہ ای میل بھی رابطہ کرسکتے ہیں۔

E.mail:kitabiat.1970@yahoo.com

jdpgroup@hot mail.com

آپ کی دعائیں، آرا، تجاویز ہم سب کے لیے قابلِ قدر رہیں۔

اعتبارِ وفا

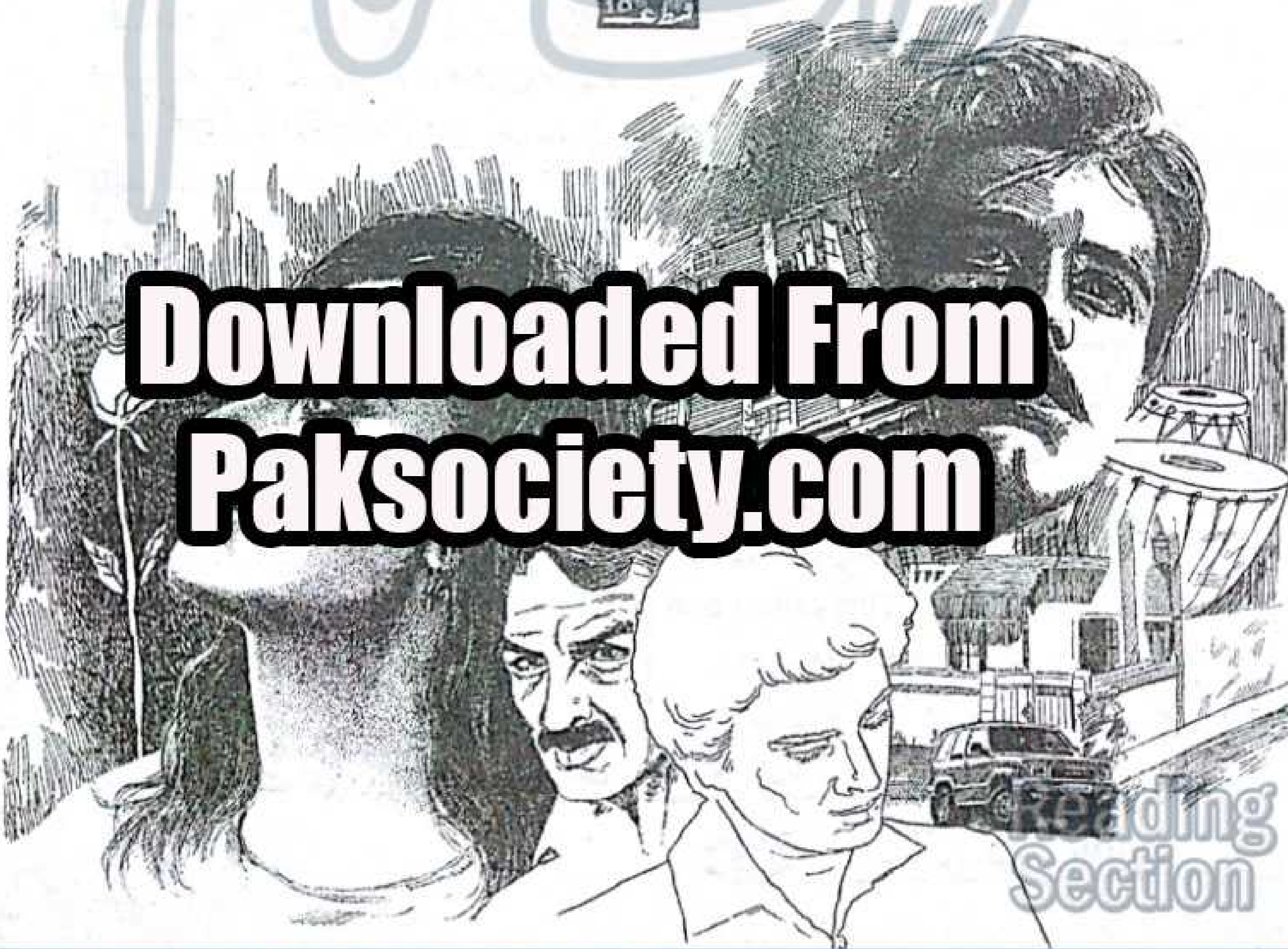
نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

18





''مقبول بٹ...... بالی......'' اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا اور وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔
''بالی یار رکو......'' وہ نوجوان ایک راہداری کی طرف مڑا تو اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ یک دم ٹھٹک کر رک گیا، اس کی نظر اچانک ہی دائیں طرف راہداری میں لگے بیسن کے آئینے پر پڑی تھی۔ کنپٹی پر سے سفید ہوتے بال، چہرے پر گزرتی عمر کے واضح نشان اور یہ عمر صرف اس پر سے تو نہیں گزری تھی۔ مقبول بٹ بھی تو چھتیس سال بعد بالکل ویسا نہیں رہا ہوگا...... اس کے بالوں میں بھی تو سفیدی کہیں نہ کہیں اتری ہوگی۔ اور گزرے ماہ و سال نے چہرے پر اپنے نشان چھوڑے ہوں گے تو پھر یہ نوجوان...... آج سے چھتیس سال پہلے کے مقبول بٹ کی کاپی بالکل وہی شکل...... صورت...... ویسے ہی سلکی بال پیشانی پر پڑے ہوئے جنہیں وہ بالکل مقبول بٹ کے انداز میں ہاتھ کی پشت سے پیچھے کرتا ہوا تیز، تیز چلتا ہوا راہداری میں گم ہو گیا تھا۔
''اور میں بھی کتنا پاگل ہوں کہ اسے مقبول بٹ سمجھ بیٹھا۔ جیسے درمیان میں چھتیس سال نہیں گزرے چند دن گزرے ہوں۔'' ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں کے گوشوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔
یہ نوجوان پتا نہیں کون تھا جو اتنا زیادہ مقبول بٹ سے ملتا تھا۔ اتنی مشابہت کہ وہ بھی ماہ و سال کا حساب کیے بغیر اسے مقبول بٹ سمجھ بیٹھا تھا۔
''کہیں یہ مقبول بٹ کا بیٹا ہی نہیں ہو۔'' ایک خیال اڑتا، اڑتا سا اس کے ذہن میں آیا تو اس نے اسے دیکھنے کے لیے سامنے نظر دوڑائی۔ راہداری دور، دور تک سنسان پڑی تھی۔ پھر راہداری کے دونوں اطراف بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کا دروازہ کھلا اور ایک میل نرس کسی پیشنٹ کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا باہر نکلا۔
''کیا خبر وہ ان کمروں میں سے کسی کے اندر چلا گیا ہو...... لیکن پتا نہیں وہ کس کمرے میں گیا ہے۔ اور اگر وہ مجھے نظر آجائے تو میں اس سے پوچھوں گا کہ اس کے باپ کا نام کیا ہے اور...... کیا وہ کسی مقبول بٹ کو جانتا ہے۔ مقبول بٹ کیسا پیارا آدمی تھا یاروں کا یار...... ہر ایک کی مدد کے لیے تیار...... اور اگر جو وہ انگلینڈ نہ گیا ہوتا اس وقت وہاں ہوتا وہ اس مشکل وقت یہاں ہوتا تو ضرور میری مدد کرتا اور پھر شاید زندگی کا رنگ ایسا نہ ہوتا کچھ اور ہی ہوتا......''
بہت سارے منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اور وہ وہاں ہی ساکت کھڑا ان منظروں میں گم ہوا ہی چاہتا تھا کہ عظام نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''پاپا...... چلیں آپ کو رواحہ کے پاس لے چلوں۔''
''ہاں چلو......'' ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے راہداری میں دور تک نظر دوڑائی لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے عظام کے ساتھ چل پڑا۔
''پاپا...... وہ...... بابا انجائنا کے پیشنٹ ہیں، میں نے ابھی تک انہیں یہ نہیں بتایا کہ رواحہ کو گولیاں لگی ہیں۔ آپ بھی ذکر مت کیجیے گا۔'' اس نے صرف سر ہلایا تھا۔
''آپ کی انسپکٹر سے کیا بات ہوئی؟''
''وہ دو دن تک بیان لینے نہیں آئے گا۔ تم بے فکر رہو...... لیکن بیان تو بہر حال اسے لینا ہی پڑے گا۔ تم رواحہ کو سمجھا دینا کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں...... بس یہ کہہ دے کہ اسے علم نہیں ہے کہ گولیاں چلانے والے کون تھے اور یہ کہ اس کی کسی سے دشمنی نہیں ہے یوں بھی یہاں اپنے اس شہر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی نامعلوم شخص گولیاں مار کر چلا گیا۔''
''لیکن کیوں پاپا...... جب رواحہ کو یقین ہے کہ یہ کام ظفری کا ہی ہے تو پھر وہ کیوں نہ اس کا اور اس کے چچا کے گارڈ کا نام مشتبہ افراد میں لکھوائے۔ آخر پہلے بھی تو انہوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' عظام کے لہجے

میں ہلکا سا احتجاج تھا۔
''میں اسے مناسب نہیں سمجھتا عظام۔'' ثمر حیات نے بے حد نرمی سے کہا۔
''لیکن اس طرح تو وہ لوگ اور شیر ہو جائیں گے اور اگلی بار پھر وہ ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور خدانخواستہ پھر اگر وہ کامیاب ہو گئے تو......'' عظام نے تشویش سے اسے دیکھا۔
''ان کا مقصد رواحہ کو مارنا نہیں تھا بیٹا ورنہ ان کا نشانہ خطا نہ جاتا...... وہ صرف رواحہ کو ڈرانا چاہتے تھے اور ہم نے انہیں یہ ہی تاثر دینا ہے کہ ہم ڈر گئے ہیں۔'' برسوں کے تجربے سے انہوں نے یہی اخذ کیا تھا کہ اگر انہوں نے رواحہ کو مارنا ہوتا تو ان جیسے لوگوں کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ کہیں بھی، کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت اس کی زندگی ختم کر سکتے تھے۔
''آپ کی بات ٹھیک ہے پاپا......'' عظام نے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے ذرا سا رخ ان کی طرف موڑا۔ ''لیکن یہ تو ظلم کے ہاتھ مضبوط کرنے والی بات ہے...... کیا ہمیں ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے؟''
''تمہاری عمر میں شاید میں بھی ایسے ہی سوچتا لیکن زندگی کے تجربات سے میں نے یہی سیکھا ہے کہ ایسے لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ تم انہیں نہیں جانتے عظام اگر رواحہ نے ان کے خلاف بیان دیا تو وہ تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ پولیس بھی ان ہی جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے۔ پولیس بھی ان کی اپنی اور نظام بھی ان کا اپنا...... ان کا کچھ نہیں بگڑے گا میری جان لیکن وہ رواحہ کو معاف نہیں کریں گے اور رواحہ پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑ دو۔''
عظام لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا مگر پھر چند قدم چل کر پوچھ بیٹھا۔
''پاپا...... میں بات کروں ظفری سے...... اسے سمجھاؤں کہ وہ خواہ مخواہ......''
''ہرگز نہیں......'' ثمر حیات نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ ''تم ان لوگوں سے دور رہو گے۔''
''پاپا......'' عظام نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔
''کچھ مت کہو عظمی...... تم نہیں جانتے، تم بالکل نہیں جانتے ان لوگوں کو، کتنے ظالم اور شقی القلب ہیں یہ سائیں مٹھا اور اس کے چیلے......'' ایک گہرے درد نے دل سے اٹھ کر جیسے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اور اذیت رگوں کو کاٹتی خون میں دوڑنے لگی۔ ان جلتی آنکھوں سے وہ ماضی کے منظر دیکھنے لگا۔
اس روز وہ اسلامیہ پارک میں بسمل خان سے جو ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پزیر تھا مل کر آ رہا تھا اور یہ سائیں مٹھا کو شاہجہان بیگم کے کوٹھے سے بھگانے کے ٹھیک تین دن بعد کی بات تھی۔ شیر خان سڑک پر گاڑی میں اس کا منتظر تھا اور وہ اردگرد سے بے نیاز بسمل خان سے ہونے والی گفتگو کو سوچتا ہوا میانی والے قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ، ساتھ چلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا جب دو بندوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں چلنے لگے تھے۔
''خاموشی سے چلتے رہو۔'' ایک نے کرخت آواز میں کہا تھا اور ساتھ ہی اسے اپنے پہلو میں ریوالور کی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ وہ کون تھے، وہ نہیں جانتا تھا اس سے پہلے اس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔
''کون ہو تم لوگ...... اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے باری، باری دونوں کی طرف دیکھا تھا۔
''اتنے اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو، سیدھی طرح چلتے رہو ابھی پتا چل جائے گا کون ہیں ہم اور کیا چاہتے ہیں۔'' وہ اس سچویشن پر غور کرتا ہوا ان کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ان کا مقصد کیا ہے...... اگر لوٹنا مقصود ہوتا تو اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا وہ آسانی سے اسے لوٹ کر چلتے بنتے...... شاید وہ اسے کسی کے پاس

لے جانا چاہتے تھے.......لیکن کس کے پاس......اور یہاں اس وقت کیا وہ اس کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ کیا انہیں علم تھا کہ وہ یہاں اس وقت بسمل خان کے گھر آیا ہوا ہے۔ وہ الجھا، الجھا ہوا سا اُن کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ کچھ بھی اندازہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جس سڑک پر آیا تھا وہ نسبتاً سنسان اور ویران تھی۔ اس وقت وہاں صرف ایک پجارو کھڑی تھی اور گاڑی سے ٹیک لگائے جو شخص کھڑا تھا اسے دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''تو یہ تم ہو سائیں مٹھا......''

''اوہ......'' اس نے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکیڑے۔ ''تو پہچان لیا تم نے۔'' اس کے ہونٹوں پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ابھی کہاں پہچانا ہے سائیں۔'' اس کے دائیں طرف کھڑے شخص نے ریوالور کی نال اس کی پہلو میں چبھوتے ہوئے کہا تھا۔ ''پہچان تو ہم اسے کرائیں گے اچھی طرح۔''

''نہیں پہچانا تو اب پہچان لے گا۔'' دوسرا بھی بولا۔

وہ گاڑی کی ٹیک چھوڑ کر دو قدم اس کی طرف بڑھا اور اب اس کے بالکل مقابل کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے سائیں مٹھا کے مسکراتے ہوئے لب بھنچ گئے تھے اور آنکھوں سے نفرت اور سختی جھلکنے لگی تھی۔

''تو تم حاتی دادا ہو، خانو دادا کے چمچے......لیکن مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟''

''مجھے تمہیں جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں پھر بھی اگر تم مجھ سے اپنا تعارف کروانا چاہتے ہو تو شوق سے کراؤ۔'' وہ اب بھی سائیں مٹھا کی طرف دیکھ رہا تھا اور جانچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے سامنے کھڑا نوجوان جو اس سے آدھی عمر کا ہوگا وہ اپنے دل میں اس کے لیے کیا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ کیا وہ محض اسے دھمکانا چاہتا ہے یا پھر وہ اسے مار دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سائیں مٹھا نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔ شاید تب ہی دائیں طرف کھڑے شخص نے اس کے پہلو میں زوردار مکا مارا۔

''تعارف کراؤں تم سے سائیں کا؟'' ساتھ ہی ایک مکا اس کی پسلیوں پر پڑا تھا۔

''مزید تعارف میں کرواتا ہوں جیرے۔'' بائیں طرف والے نے اپنی انگلیاں اس کے پیٹ میں چبھوئیں۔

''بس......'' سائیں مٹھا نے ہاتھ ذرا بلند کیا تھا۔ ''پہلے میں اسے اس کا سارا بایو ڈیٹا نہ بتا دوں۔''

''مجھے اپنے بایو ڈیٹا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مسٹر، مطلب کی بات کرو جس کے لیے یہاں بلایا ہے۔'' وہ اندازہ کر چکا تھا کہ ان کا مقصد محض خوفزدہ کرنا ہے۔

''مطلب کی بات بھی کر لیتے ہیں دادا، اتنی جلدی کیا ہے؟'' ساتھ ہی اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ابرو اچکائے تھے اور اس کے ساتھ ہی دونوں آدمیوں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔ ایک کا مکا اس کے جبڑے پر پڑا تھا۔ اور دوسرے نے پیٹ پر اپنا ہنر آزمایا تھا درد کی ایک شدید لہر سر سے لے کر پاؤں تک اس کے وجود میں پھیل گئی تھی لیکن وہ صبر اور ضبط کیے کھڑا رہا تھا۔

''تو مسٹر دادا......'' سائیں مٹھا کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''سائیں حکم کریں، آج اس کی دادا گیری یہاں ہی نکال دیتے ہیں۔'' ایک شخص نے سائیں مٹھا کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں کیا نام ہے تمہارا...... حاتی داداتم مطلب کی بات سننا چاہتے ہوناں تو سنو...... آئندہ اگر تم مجھے شاہجہان کے کوٹھے پر تو درکنار اس بازار کے اردگرد بھی کہیں دکھائی دیے تو تمہاری بوٹی، بوٹی کر کے چیل کوؤں کے آگے پھنکوادوں گا سمجھے......''

''اور اگر یہی بات میں تم سے کہوں تو......؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''تم......'' سائیں مٹھا زور سے ہنسا تھا۔ ''تمہیں شاید ابھی میری پہچان نہیں ہوئی۔''

''اور تم بھی شاید اس روز کو بھول گئے ہو۔''

''بھولا نہیں ہوں۔'' وہ بولا نہیں پھنکارا تھا۔ ''سائیں مٹھا...... اپنی بے عزتی نہیں بھولتا اور نہ ہی اپنی بے عزتی کرنے والوں کو معاف کرتا ہے لیکن تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں صرف اس شرط پر کہ آئندہ میرے راستے میں مت آنا ورنہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے مسٹر مٹھا نہ ہی میری تم سے ذاتی طور پر کوئی دشمنی ہے لیکن تم نے اگر شاہجہان بیگم یا ان کی لڑکیوں کو تنگ کیا تو میں......''

''شاہجہان بیگم اور ان کی لڑکیوں سے کیا رشتہ ہے تمہارا...... ماں بہنیں ہیں تمہاری۔'' اس نے تمسخر سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی تھی اور اس نے بہ مشکل اپنے اشتعال پر قابو پایا تھا۔

جلیل خان کی صحبت اور ٹریننگ میں اس نے اپنے اشتعال اور غصے پر قابو پانا سیکھا تھا...... نازک سے نازک صورتِ حال میں بھی وہ خود پر پورا کنٹرول رکھتا تھا۔

''وہ میری بہنیں نہیں ہیں لیکن وہ مظلوم ہیں۔'' اس نے بے حد تحمل سے کہا تھا۔ ''اور میں تمہیں ان کے ساتھ ظلم کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''اچھا......'' سائیں مٹھا نے قہقہہ لگایا تھا۔

''دیکھو حاتی دادا وہ ایک طوائف کا کوٹھا ہے۔ جہاں جس کا جی چاہے جائے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔'' اس نے اسی تحمل سے کہا تھا۔ ''ہزار بار تماش بین بن کر جاؤ...... گانا سنو...... رقص دیکھو اور......''

لمحہ بھر کے لیے بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سائیں مٹھا کی طرف دیکھا تھا جو عجیب تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن ان پر ظلم وزیادتی مت کرو...... جبر نہ کرو جو کچھ تم نے اس بیچاری کوئل کے ساتھ کیا ہے۔''

''کیا تم خدائی فوجدار ہو دادا...... چلو تم اپنا کام کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو......''

''سائیں قصہ ختم کریں، حکم کریں۔'' دائیں طرف والا شخص جس کے چہرے پر بڑا سا مسہ تھا اور جو تقریباً سائیں مٹھا کی ہی عمر کا تھا آگے بڑھا۔

''نہ......'' سائیں مٹھا نے ہاتھ ذرا سا اونچا کیا تھا۔ ''میں خواہ مخواہ کسی کے خون میں ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا...... سمجھ دار آدمی ہے سمجھ گیا ہوگا جو سمجھایا ہے۔''

''کوئل بیچاری کا خون بھی تو خواہ مخواہ بہایا ہے تم نے۔'' اس کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا۔

''کوئل......'' اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ ''اسے میں نے نہیں مارا تھا وہ تو خود ہی ٹیرس سے کود گئی تھی۔''

''اور اسے کودنے پر کس نے مجبور کیا تھا تم نے...... ہاں۔'' کوئل کی سُریلی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور اس کے اندر دور تک دکھ پھیلتا گیا۔

''ارے نہیں وہ تو چوہدری......'' سائیں مٹھا کے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی......اور پھر یک دم ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے رخسار پر اپنی پوری طاقت سے تھپڑ مارا تھا اور جب اس نے دوسری بار تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سائیں مٹھا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

''چاہوں تو ابھی تمہاری کلائی کا جوڑا الگ کردوں۔'' ثمر حیات نے کہتے ہوئے ایک جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''سائیں مٹھا اچھی طرح کان کھول کر سن لو......شاہجہان بیگم اور اس کے چوبارے کو بھول جاؤ......ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے ہلکا سا دھکیلا وہ گاڑی سے جالگا تھا۔ مسے والا شخص تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا تھا اور پیچھے سے اس کی کمر میں زوردار لات ماری تھی۔

''سائیں یہ اس طرح نہیں سمجھے گا......ہم اسے اچھی طرح سمجھاتے ہیں۔''

''ہاں اچھی طرح سمجھا دو......'' سائیں مٹھا نے بھی کہا تھا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر اپنی طرف بڑھتے شخص کو سر کی ٹکر مارتے ہوئے لات ماری تھی......وہ شخص اچھلتا ہوا دور جا گرا تھا۔ جبکہ دوسرے نے فوراً ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا کہیں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی تھی اور ریوالور اڑتا ہوا دور جا گرا تھا۔ یقیناً اتنا غضب کا نشانہ شیر خان کا ہی ہوسکتا تھا اور پھر قبرستان کی دیوار کے پیچھے اسے شیر خان کا سر نظر آیا تھا اور دوسرے ہی لمحے شیر خان گن ہاتھ میں اٹھائے دیوار پر سے چھلانگ لگا کر تیزی سے ان کے قریب آیا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' سائیں مٹھا نے غصے سے شیر خان کی طرف دیکھا تھا۔

''اپنی راہ جاؤ اور ہمارے معاملے میں دخل اندازی نہ کرو۔'' وہ شخص تیزی سے اپنے ریوالور کی طرف بڑھا لیکن شیر خان نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر ریوالور کی ضرب لگائی تھی جس نے اسے لمبا لٹا دیا تھا۔ مسے والا شخص بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسے شیر خان کی لات نے دوبارہ زمین بوس کر دیا تھا لیکن شیر خان نے اطمینان کی خاطر اس کی کنپٹی پر بھی ریوالور کی ایک ضرب لگائی تھی۔ تب ہی سائیں مٹھا نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر ڈیش بورڈ پر پڑا اپنا پسٹل اٹھانے کی کوشش کی لیکن پاس کھڑے ثمر حیات نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے پیچھے کھینچ لیا تھا۔ سائیں مٹھا کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ وہ اس سے لپٹ پڑا تھا لیکن اپنے چیلوں سے دوسروں کو پٹوانے والا خود لڑائی بھڑائی میں اتنا ماہر نہیں تھا سو جلد ہی زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ ثمر حیات نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا تھا۔

''آئندہ کسی لڑکی کے ساتھ بھلے وہ کوٹھے کی ہی کیوں نہ ہو ایسا سلوک مت کرنا جیسا سلوک کونل کے ساتھ کیا تھا تم نے اور آئندہ کبھی شاہجہان بیگم کے چوبارے پر قدم مت رکھنا۔''

اس نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیے تھے اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا تھا اس اثنا میں شیر خان نے دونوں آدمیوں کے ریوالور اور گاڑی میں پڑے ہوئے پسٹل سے گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لی تھیں۔ سائیں مٹھا کے لبوں سے بے حد گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔ اس نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

''اپنی غلیظ زبان بند کرو سائیں مٹھا۔'' زمین پر پڑا ہوا ایک شخص ہولے ہولے کسمسا رہا تھا شیر خان کے کہنے پر وہ انہیں یوں ہی اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چلے آئے تھے۔

''کاش اس روز اس نے سائیں مٹھا کی بات چپ چاپ سن لی ہوتی تو......کاش اس روز وہ جانتا ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص کو اپنا دشمن بنا بیٹھا ہے جو......''

''پاپا......'' عظام نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ ٹھیک ہیں ناں......''
''ہاں......'' اس نے چونک کر عظام کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرایا۔
''کیا آپ ظفری کے چچا کو پہلے سے جانتے ہیں...... پاپا...... اور کیا اس نے کبھی آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے؟''
''ایسے لوگوں کے متعلق سب کو ہی پتا ہوتا ہے جانم......'' اس نے ایک گہری سانس لی تھی...... وہ آئی سی یو کے سامنے پہنچ چکے تھے...... اس نے آئی سی یو کے باہر بیٹھے رواحہ کے بابا کو تو دیکھا تھا۔ عظام نے اس کو ان کی طرف متوجہ کیا۔
''پروفیسر صاحب تو وہ بیٹھے ہیں باہر۔''
''میں نے کہا بھی تھا بابا سے کہ وہ کمرے میں چلے جائیں۔'' عظام بات کر کے اُن کی طرف بڑھا۔ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا اور اٹھ کر بے تابانہ اس کی طرف بڑھے۔
''عظام...... عظمی۔''
وہ بے حد پریشان اور گھبرائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ عظام کو یک دم ادراک ہوا کہ انہیں رواحہ کو گولیاں لگنے کے متعلق پتا چل گیا ہے۔ ورنہ کچھ دیر پہلے تو وہ انہیں خاصا مطمئن چھوڑ کر گیا تھا۔
''عظمی...... بیٹا میری بات سنو......''
''بابا میں پاپا کو رواحہ کے پاس چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ بس ایک منٹ۔''
اس نے ثمر حیات کو آئی سی یو سے باہر آتے جواد کے حوالے کیا اور خود پلٹ کر اُن کے پاس آیا۔
''جی بابا کیا بات ہے؟'' اس نے ان کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
''بیٹا...... وہ لوگ کون تھے جنہوں نے میرے رواحہ کو......'' ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ''میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے پھر کیوں عظمی...... ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔''
''بابا پلیز ریلیکس!'' اس نے اپنے ہاتھوں میں دبے ان کے ہاتھوں کو ہولے سے دبایا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''
''بھلا کیسے پریشان نہ ہوں؟'' انہوں نے ناراضی سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ ''میرے بچے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا عظام جو......''
''آپ کو تو پتا ہے بابا یہاں کے حالات کا...... موٹر سائیکل سوار راہ چلتے لوگوں پر گولیاں چلا کر غائب ہو جاتے ہیں۔''
''نہیں...... میرا دل نہیں مانتا کہ کسی نے یونہی بلاوجہ میرے رواحہ پر گولی چلائی ہو گی...... مجھے سچ بتاؤ...... میری جان مجھ سے کچھ مت چھپاؤ...... اگر یہاں اس کی جان کو خطرہ ہے تو ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں بہت دور کسی دور افتادہ جگہ پر۔''
عظام پریشان ہو گیا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے انہیں سب سچ بتا دے یا چھپا لے۔
''بولو ناں بیٹا...... بتاؤ کیا بات ہے؟'' انہوں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''کیا یہ وہی لوگ تھے جو گھر میں بھی گھس آئے تھے؟''
''معلوم نہیں بابا......'' عظام نے نظریں چرائیں۔
''یہ تو رواحہ ہی بتا سکتا ہے، اس کی طبیعت کچھ مزید بہتر ہو جائے اور وہ اسے کمرے میں منتقل کر دیں تو میں پوچھوں گا اس سے۔''

''میرا خیال ہے یہ وہی لوگ ہوں گے، کیا نام تھا اس لڑکے کا...... ہاں یاد آیا ظفری...... اس کے بندے......؟'' انہوں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تو تم رواحہ کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دے...... کیا میرے رواحہ کے لیے لڑکیوں کی کمی ہے۔'' ان کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئیں۔

''کیا ضروری ہے عظام کہ صرف وہی لڑکی...... کوئی اور لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ان کی آنکھوں کے سامنے ارتفاع کا چہرہ آ گیا۔ ان کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھی بار، بار آنسوؤں سے بھر جانے والی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی...... بے چینی سے عظام سے رواحہ کا حال پوچھتی ہوئی وہ جو کوئی بھی تھی اس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں اس سے بے حد اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رواحہ کے لیے آنسو تھے، وہ رواحہ کے لیے رو رہی تھی اور اس کے لب ہولے، ہولے ہل رہے تھے یقیناً وہ اس کی صحت و زندگی کے لیے دعا کر رہی ہو گی...... تو وہ لڑکی...... انہوں نے سوالیہ نظروں سے عظام کی طرف دیکھا۔

''عظام وہ لڑکی جس سے تم نے میرا تعارف کروایا تھا، کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے ظفری نے دھمکی دی تھی اور کیا اسی لڑکی کو رواحہ پسند کرتا ہے؟''

عظام نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پریشان سا ہو کر انہیں دیکھا

''آپ پلیز پریشان نہ ہوں...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا، کیا رواحہ اس لڑکی کو پسند کرنا چھوڑ دے گا؟'' انہوں نے محبت کے بجائے پسند کا لفظ دانستہ لگایا...... حالانکہ وہ جانتے تھے کہ رواحہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی ہے...... وہ آنسو جو اس کی آنکھوں میں تھے، وہ تڑپ جو اس کے پورے وجود سے جھلکتی تھی، محبت کی تڑپ تھی...... یہ آنسو محبت کی دین تھے...... عظام متذبذب سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

ان کا جی چاہا اس سے پوچھیں...... عظام یہ محبت اتنی تکلیف دہ، اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے۔ میں نے محبت کی تو میرا دامن دکھوں سے اذیت سے اور کرب سے بھر گیا...... اس محبت نے مجھے تنہا اور میرے دل کو ویران کر دیا...... ایسا ویران کہ وہاں جدائیوں کے نوحے گونجتے ہیں...... محبتوں کے بچھڑ جانے کے بین سنائی دیتے ہیں، محبت نے میرے دل کو قبرستان بنا ڈالا ہے اور میرے بیٹے نے محبت کی تو محبت نے اسے لہولہان کر دیا۔

''بابا......'' عظام نے کچھ کہنے کے لیے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو آئی سی یو سے باہر آتے ثمر حیات کو دیکھ کر وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تابانہ اُن کی طرف بڑھے۔

''وہ کیسا ہے اب...... اس نے آپ سے بات کی...... آنکھیں کھولیں کچھ بتایا...... آپ کو پتا ہے وہاں آئی سی یو میں موجود ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو کسی نے گولیاں ماری ہیں۔''

''وہ ٹھیک ہے، ہوش میں ہے۔ اس نے مجھ سے بات بھی کی۔'' ایک بازو اُن کی کمر کے گرد حمائل کرتے ہوئے وہ وہاں ہی نصب بینچ پر بیٹھ گئے اور ہولے، ہولے انہیں تسلی دینے لگے۔ عظام نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے آئی سی یو کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ اس کے فون کی بیپ ہوئی۔ اس نے دیکھا سنہری کا نمبر تھا...... اس نے آن کیا دوسری طرف بجل تھی۔

''سوری بجل میں صبح سے تم سے بات نہیں کر سکا۔ دراصل رواحہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ہم اب بھی اسپتال میں ہیں...... ہمارا ارادہ تھا آج شام آنے کا...... پاپا نے ناشتے پر مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں اطلاع دے دوں کہ ہم شام کو آئیں گے لیکن پھر یہ حادثہ ہو گیا۔ رواحہ کی طبیعت جیسے ہی ذرا سنبھلتی ہے میں آپ کو فون کرتا ہوں۔'' اس نے

سجل کی آواز سنتے ہی تفصیل سے بتایا۔

''کوئی بات نہیں...... یوں بھی اماں آج صبح لاہور چلی گئی ہیں...... اچانک ہی کوئی کام آپڑا ہے...... میں نے اس لیے فون کیا کہ بتادوں......''

''اوہ...... کب تک واپس آئیں گی ہ'' اس نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں......'' سجل نے یک دم ہی فون آف کر دیا لمحہ بھر وہ فون ہاتھ میں پکڑے دیکھتا رہا...... پھر ہولے سے سر جھٹک کر مڑ کر دیکھا...... ثمر حیات اب بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھے کچھ کہہ رہے تھے اور اُن کے چہرے پر پہلے جیسا تناؤ اور پریشانی نہ تھی۔ قدرے مطمئن ہو کر وہ آئی سی یو کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ لو اپنا فون......'' سجل نے سنہری کی طرف فون بڑھایا تو سنہری نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں...... تم نے بات کیوں نہیں کی۔''

''بس اماں کے لاہور جانے کا ہی بتانا تھا اور کیا بات کرتی'' سجل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ارے وہی جو دو محبت کرنے والے ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔'' سنہری نے آنکھیں مٹکائیں۔

''دو محبت کرنے والے......'' سجل کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ ''تم بھی ناں سنہری عجیب باتیں کرتی ہو، ہمارے درمیان بھلا محبت کہاں سے آگئی۔ میں نے اس سے مدد طلب کی اور اس نے ترس کھا کر مجھ سے میری مدد کا وعدہ کرلیا...... اس میں محبت کی کہاں گنجائش ہے؟''

''محبت کی ہی تو گنجائش ہے بی بی، محبت کا بیج اندر کہیں نمو پارہا ہوتا ہے تو ہمدردی کی کونپل پھوٹتی ہے ہا...... ہا......'' وہ ہنسی۔

''محبت ہمیشہ ہمدردی کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے۔'' جی ہاں وہ پھر ہنسی۔

''تم نے اتنی کتابیں پڑھیں اور سیکڑوں کتابوں کا ڈھیر اکٹھا کر رکھا ہے۔ دو تین سو کتابیں تو ہوں گی ناں تمہارے پاس لیکن تم نے تو جو سب پڑھا لکھا کنوئیں میں پھینک دیا۔ تم مانو نہ مانو، وہ تم سے محبت کرتا ہے اور بغیر محبت کے کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا سمجھیں...... خیر یہ بتاؤ کہ کیا کہہ رہا تھا، کیا اس کے باپ نے سچ میں آج آنا تھا؟''

''ہاں...... آنا تو تھا لیکن وہ جو اس کا دوست ہے ناں پروفیسر صاحب کا بیٹا اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔''

''لو جی کرلو گل......'' سنہری نے برا سا منہ بنایا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اِدھر اماں لاہور چلی گئیں اُدھر پروفیسر کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا...... غریبوں نے روزے رکھے اور دن ہی بڑے ہوگئے۔''

اس وقت وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سجل دونوں پاؤں صوفے پر رکھے بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔

''سچی میں اتنی خوش ہو رہی تھی کہ عظام اپنے باپ کے ساتھ رشتہ لینے آئے گا تو کیسا انوکھا سا لگے گا۔ ہمارے جیسوں کے گھروں میں بھلا کہاں کوئی رشتہ لے کر آتا ہے' یہ اماں کو بھی ابھی جانے کی سوجھی...... حالانکہ میں نے بتایا بھی تھا اماں کو کہ تمہارے رشتے کے لیے کسی نے آنا ہے دو دن بعد چلی جائیں پر اماں کے پاؤں کے نیچے تو جیسے کسی نے آگ بچھادی تھی۔'' سنہری نے ناک چڑھائی۔

''لیکن اماں اچانک لاہور کیوں چلی گئیں؟'' سجل نے پوچھا۔

''اللہ جانے......'' سنہری نے کندھے اچکائے۔

''لگتا ہے کسی خفیہ مشن پر ہی گئی ہیں۔ لاکھ پوچھا ظہورے سے مگر مجال ہے جو ایک لفظ بھی نکالا ہو منہ

ہے.....ویسے ہزاروں باتیں سن لو دنیا جہان کی لیکن اگر کوئی مطلب کی بات ہو تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔'' سنہری کو اکثر ہی ظہور ے پر غصہ آیا رہتا۔

''کہیں صاحبزادہ صاحب نے گھر تو خالی کرنے کا نہیں کہہ دیا۔'' سجل کو وہم ہوا۔

''موتیا بھی جب سے مری سے آئی ہے گھر پر ہی ہے..... کہیں اماں نے لاہور واپس جانے کا پروگرام تو نہیں بنالیا اور شاید وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لینے گئی ہوں۔''

''پتا نہیں.....'' سنہری نے کندھے اچکائے۔

''لیکن اگر ایسا ہے تو اچھا ہی ہے ناں، تمہارا کیا دل لگا تھا کراچی میں اور سچ پوچھو تو مجھے بھی کبھی، کبھی لاہور بہت یاد آتا ہے۔ اللہ کرے اماں لاہور میں رہنے کا ہی فیصلہ کرلیں۔'' بات کرتے، کرتے اس نے سجل کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک دکھ بھری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''او.....ہو.....'' اس نے اپنے رخسار پر خود ہی چپت لگائی۔

''لو بھلا اب تمہارا کہاں دل لگے گا لاہور میں..... یہاں تمہارا اعظام جو ہے۔''

''تمہارا اعظام.....تمہارا اعظام.....'' دل کے اندر خوشگوار سی دھڑکنوں نے اودھم مچادیا اور خوشنما آنکھوں سے سنجیدگی کے بجائے ایک نرم محبت بھرا تاثر جھلکنے لگا۔

''کیا ایسا ہوگا..... کیا کبھی میں پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکوں گی میرا اعظام۔'' اپنے ہی خیالات سے گھبرا کر اس نے سنہری کی طرف دیکھا جو بہت دلچسپی سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیات دیکھ رہی تھی، اسے اپنی طرف دیکھتا پاکر اس نے چٹکی بجائی۔

''سن..... جو ذرا فون تو ملا اسے۔'' اور ساتھ ہی اس نے پاس پڑا فون اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''کیوں.....؟'' سجل نے فون نہیں پکڑا۔

''یونہی گپ چپ لگا اور اسے کہہ باہر ڈنر شنر پر چلنے کی دعوت دے۔ ذرا گھوم پھر آ اس کے ساتھ..... ویسے بھی اماں تو ہیں نہیں۔''

''میں..... اس کے ساتھ باہر جاؤں؟ نہیں یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔'' سجل نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''کیوں..... کیوں نہیں ہوسکتا؟'' سنہری نے آنکھیں مٹکائیں۔

''ست بسم اللہ..... کرکے آئے گا تو ایک بار کہہ کر تو دیکھ۔''

''نہیں، مجھے اس کے ساتھ کہیں باہر نہیں جانا۔'' سجل کا لہجہ حتمی تھا اور ہلکی سی سختی لیے ہوئے تھا جبکہ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور کچھ دیر پہلے والی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

''اچھا تو پھر گھر بلالو..... ذرا اندازہ لگاتے ہیں کتنے پانی میں ہے، کہیں بقول اماں کے پھٹیچر ہی نہ ہو۔''

''تمہیں بتایا تو ہے میں نے پروفیسر صاحب کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے..... وہ اسپتال میں ہے۔''

''تو دو دن بعد بلالینا۔'' سنہری نے فوراً ہی دوسرا حل پیش کردیا۔ ''بھئی پتا تو چلے کچھ اس کے بارے میں.....''

''تمہیں کیا لگتا ہے سنہری کہ وہ کوئی ایسا ویسا غریب، غربا اور بیچارہ سا ہے۔''

''نہیں، خیر ایسا تو نہیں لگتا بلکہ شکل صورت سے تو وہ کوئی شہزادہ لگتا ہے لیکن کبھی، کبھی شہزادے بھی بالکل خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ ٹھن، ٹھن گوپال۔'' اس نے تالی بجائی اور ہنسی۔

''کیا مطلب.....؟'' سجل اس کی بات نہ سمجھ سکی تھی، کبھی سنہری ایسے ہی عجیب و غریب جملے بولتی تھی۔

''مطلب..... مفلس، غریب، خالی جیب.....''

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے سنہری؟'' سجل نے پوچھا تو سنہری کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''نہیں خیر فرق تو نہیں پڑتا...... تم معتبر ہو جاؤ گی۔ بھلے وہ تمہیں کسی جھونپڑے میں رکھے اور کھانے کو دو وقت پیٹ بھر کھانا بھی نہ کھلا سکے۔''

''اور مجھے معتبر ہی تو ہونا ہے سنہری۔'' سجل کی خوب صورت آنکھوں میں افسردگی کا غبار سا پھیلا تھا...... خواب تو سنہری دیکھتی تھی گھر گرہستی کے خواب اور تعبیر اسے ملنے والی تھی۔

''کیا واقعی اسے تعبیر مل جائے گی۔'' اس نے مضطرب سا ہو کر گھٹنوں کے گرد سے بازو ہٹائے...... پاؤں نیچے رکھے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''کیا وہ عظام کے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ سر اٹھا کر جی سکے گی یا ساری زندگی اس کے احسان کے بوجھ تلے دبی سر جھکائے گزار دے گی۔'' وہ یک دم ہی بہت مضطرب اور بے چین ہو گئی تھی۔ شاید اس نے غلط کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے خود کو ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں میں گرا لیا تھا اور عظام کی نظروں میں بھی...... ''مجھے عظام سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ صرف ایک مذاق تھا اور مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے آنکھیں کھولیں اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سینٹر ٹیبل پر پڑے سنہری کے فون کو دیکھا اور یک دم کھڑی ہو گئی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، مجھے ابھی اس سے کہہ دینا چاہیے اسے بتا دینا چاہیے۔'' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اسے لگا جیسے اس کا دل نیچے کہیں پاتال میں گر گیا ہو۔ وہ جیسے نڈھال سی ہو کر واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا سجو......؟'' سنہری اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں......'' اس نے نچلے لب کو دانتوں تلے کاٹا۔

''کچھ تو ہے جانو......'' سنہری نے اس کی آنکھوں میں تیزی سے پھیلتی نمی کو دیکھا۔

''وہ۔ مجھے لگتا ہے سنہری میں نے غلط کیا ہے۔'' وہ اب بھی نچلا لب دانتوں تلے کاٹ رہی تھی۔

''بتاؤ کیا غلط کیا ہے تم نے سجو......؟'' سنہری نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہی...... عظام کو یہ کہہ کر وہ مجھ سے شادی کرلے۔''

''اس میں ایسا کیا غلط ہے سجو......؟'' سنہری کی سوالیہ نظریں اس پر جمی تھیں۔

''سب...... سب غلط ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' آنکھوں میں پھیلتی نمی آنسو بن کر رخساروں پر ڈھلک آئی۔

''کچھ غلط نہیں کیا تم نے بے وقوف۔'' سنہری کے لہجے میں بڑی بہنوں کا سا ناصحانہ رنگ اتر آیا۔

''اپنے لیے اچھی اور باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرنا ہر انسان کا حق ہے...... میرا اور تمہارا بھی...... دیکھ لینا مجھے اگر کوئی ایسا مل گیا ناں تیرے عظام جیسا تو میں اسے پانے کی کوشش ضرور کروں گی بھلے اس کے قدموں میں گرنا پڑے۔''

''تیرے عظام......'' پر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ اس بے ترتیبی میں بھی ایک خوشگوار سا ردھم تھا۔ اس کے رخساروں پر گلابیاں سی بکھریں تو سنہری اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ دو چار ملاقاتیں کر اس سے اور اس کے دل پر تیرا جو نقش بنا ہے اسے اتنا گہرا کردے جیسے پتھر پر کھدا ہوا ناکہ پانی پر لکھی تحریر...... تو اس پر ایسا تاثر چھوڑ کر آ سے لگے جیسے تیرے بنا زندگی اس کے لیے بیکار ہے۔'' سجل حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ سنہری نے کبھی کوئی کتاب، کوئی ناول، کوئی افسانہ نہیں پڑھا تھا لیکن وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتی تھیں جیسے ہزاروں کتابیں گھول کر پی رکھی ہوں۔

''تو میری جان اس سے ملتی رہ...... اور......'' سیڑھیوں سے اترتی موتیا کو دیکھ کر اس نے ایک دم بات ادھوری چھوڑ دی اور اس کی طرف دیکھنے لگی جس کی رنگت زرد ہو رہی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے

تھے۔ وہ ریلنگ کا سہارا لیتی ہوئی بہت آہستہ، آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔

''موتی کیا ہوا ہے'' سنہری ایک دم ہی اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ بے شک اس کی موتیا سے اکثر تو، تو میں، میں ہوتی رہتی تھی لیکن اس کے دل میں موتیا کے لیے بہت پیار تھا۔ ''موتی کیا ہوا ہے تجھے...... جب سے مری سے آئی ہے تیری حالت ایسی ہو رہی ہے۔''

''بخار نہیں اتر رہا سنہری۔'' موتیا کے لہجے میں تھکن تھی...... سنہری لمحہ بھر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''بخار ہی ہے ناں موتی یا کچھ اور......؟''

''بخار ہی ہے سنہری...... لگتا ہے بخار ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے۔ لگتا ہے نمونیہ ہو گیا ہے، سینے میں درد بھی رہتا ہے۔''

''یا اللہ...... موتیا تم اتنے دنوں سے اس بخار کو لے کر بیٹھی ہوئی ہو...... ڈاکٹر کی طرف نہیں گئیں اور یہ اماں بھی تمہیں لے کر نہیں گئیں۔'' سنہری نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں تو، اماں نے تو کہا تھا کہ موراں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کی طرف چلی جاؤں لیکن میں نے ہی منع کر دیا کہ موراں خود ہی میری حالت بتا کر لے آئے گی اور موراں دوائی لے تو آئی تھی پر دوائی کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے بخار کم ہوتا ہے کچھ دیر بعد پھر ویسے ہی بدن ٹوٹنے لگتا اور جسم تپ جاتا ہے۔''

''تم بھی عجیب احمق ہو موتیا، بھلا بتانے سے ڈاکٹر کو کیا پتا چلا ہوگا کہ کیسا بخار ہے، ملیریا ہے ٹائیفائڈ ہے یا پھر...... یا اللہ۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''کہیں ڈینگی ہی نہیں ہو۔'' سنہری کو ٹی وی بہت دیکھنے سے ڈینگی سے کافی آگہی تھی۔

''نہیں سنہری، مجھے لگتا ہے مری میں ٹھنڈ لگ گئی ہے مجھے۔'' موتیا نے تسلی دینے کے انداز میں سنہری کے بازو پر ہاتھ رکھا تو سنہری چلائی۔

''ہائے موتیا تجھے تو بہت تیز بخار ہے، تیرا بدن تو جل رہا ہے۔ چل ڈاکٹر کے پاس میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔''

''میں ڈاکٹر کی طرف ہی جا رہی ہوں موراں کے ساتھ...... موراں نے شیدے کو بھیجا ہے ٹیکسی لینے آتا ہی ہوگا۔''

''تو اپنے صاحبزادہ صاحب سے کہہ ناں تجھے بھی ایک گاڑی لے دیں...... بڑی نہ سہی چھوٹی سی...... نئی نہ ہو پرانی ہی سہی۔''

سنہری کا ذہن یوں ہی لمحوں میں پلٹا کھاتا تھا۔ موتیا کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سجل بھی تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ نے جیسے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔ موتیا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن اسی ایک مدھم سی مسکراہٹ میں جو لمحہ بھر کے لیے اس کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی نہ جانے کتنی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن یہ مسکراہٹ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

''تم اپنا خیال نہیں رکھتی ہو موتیا۔'' سجل نے اس کی مسکراہٹ کے حصار سے خود کو نکالنے کی کوشش کی۔

''جی ہی نہیں چاہتا سجو اپنا خیال رکھنے کا۔'' وہ ہولے، ہولے چلتی ہوئی سجل کے قریب آئی اور کچھ دیر یونہی اسے دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے اس کی پیشانی چومتے ہوئے سرگوشی کی۔

''سجو عظام کو مت کھونا۔''

سجل ساکت سی ہو گئی تو کیا سنہری نے وہ سب کچھ موتیا کو بتا دیا ہے جو اس نے سنہری کو بتایا تھا اور ابھی یہ کل رات کی ہی تو بات تھی کہ وہ بے اختیار سنہری کو سب بتا بیٹھی تھی۔ عظام کا پارک میں ملنا اور اس کا اس سے شادی کے لیے کہنا...... سجل نے شاکی نظروں سے سنہری کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر موراں کو دیکھنے لگی جو دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے نکلی تھی۔

''چلو موتیا، شیدا ٹیکسی لے آیا ہے۔'' غالباً اس نے کچن کی کھڑکی سے اسے دیکھا تھا۔
''میں بھی چلوں؟'' سنہری نے پوچھا۔
''شیدا...... ! اور موراں تو ہیں ناں...... تم کیا کرو گی۔'' اپنی چادر درست کرتے ہوئے موتیا نے مڑ کر سنہری سے کہا...... وہ لوگ عموماً جب پبلک پلیسز پر جاتی تھیں تو چادر لے لیتی تھیں۔ وہاں لاہور میں تو موتیا، سنہری اور شاہجہان تینوں ہی باہر نکلتیں تو برقع لیا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں کراچی آ کر انہوں نے برقع اوڑھنا چھوڑ دیا تھا کبھی کبھار باہر جاتے ہوئے موتیا اور سنہری چادر لے لیتی تھیں۔
موراں اور موتیا باہر چلی گئیں۔ سنہری بھی ان کے پیچھے گیٹ بند کرنے گئی تھی۔ تجل ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی رہی...... سنہری گیٹ بند کر کے واپس آئی...... اور تجل کی طرف دیکھا جس کی نظروں میں اب بھی شکایت تھی اور چہرے سے ناگواری جھلکتی تھی...... وہ اسے دیکھ کر مدھم سا مسکرائی۔
''میں نے موتیا کو کچھ نہیں بتایا تجو...... شاید اماں نے ذکر کیا ہو آخر اس روز میں نے اماں سے اتنی بحث جو کی تھی کہ اگر عظام کے پاپا آئیں رشتہ لینے تو وہ ہاں کر دیں۔'' سنہری نے تو جیسے اس کے اندر جھانک لیا تھا۔ اور کبھی کبھار سنہری کے اس طرح کوئی بات بوجھ لینے پر وہ بہت حیران ہوتی تھی اور اب بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''تمہیں کیسے پتا چلا سنہری کہ میں نے تمہارے متعلق ایسا سوچا کہ تم نے موتیا کو بتایا ہوگا۔''
''تمہاری نظروں نے مجھے بتا دیا۔ اتنی ناراضی سے دیکھ رہی تھیں مجھے، کیا تم نے سنہری کو پیٹ کا اتنا ہلکا سمجھا...... تم سمجھو تم نے جو بات مجھ سے کی تھی، میں اسے بھول بھی گئی۔ مانو تم نے اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دیا ہو۔''
تجل نے سر ہلایا بولی کچھ نہیں تھی تاہم وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔
''اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو، چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو باہر کہیں گھومنے چلتے ہیں، تمہارے تیار ہونے تک موتیا بھی آ جائے گی۔''
''نہیں سنہری، کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''
''اچھا چلو ایسے ہی چلتے ہیں سامنے پارک تک ادھر سے آئس کریم کھا کر......'' لیکن ڈور بیل کی تیز آواز سے اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔
''یا اللہ خیر اس وقت کون آ سکتا ہے...... ہائے کہیں موتیا اور موراں تو واپس نہیں آ گئیں...... ابھی تو نکلی تھیں...... شاید کوئی چیز گھر رہ گئی ہو...... پر کیا...... شاید فون لینا ہو موتیا نے...... ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھیں...... ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' وہ خود ہی اندازے لگاتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئی۔ اس وقت گھر میں سوائے تجل کے اور اس کے کوئی نہیں تھا۔ اسے ہمیشہ اپنے اندازوں پر سو فی صد یقین ہوتا تھا اس لیے بغیر پوچھے ہی چھوٹا گیٹ کھول دیا لیکن باہر ایک اجنبی کو دیکھ کر ذرا سا حیران ہوئی۔
''جی کس سے ملنا ہے؟''
''شاہجہان...... شاہجہان بیگم سے۔''
''اماں سے؟'' اس نے اب کے بغور اجنبی کی طرف دیکھا وہ جو کوئی بھی تھا اپنے لباس اور انداز سے کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر اس کے عقب میں موجود گاڑی پر نظر ڈالی جو یقیناً اس کی ہی تھی۔ بی ایم ڈبلیو...... خاصی قیمتی گاڑی تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے پاس بھی ایسی ہی ایک گاڑی تھی۔ وہ ایک دم گیٹ پر موجود شخص سے مرعوب سی ہو گئی۔

''کیا یہ شاہجہان بیگم کا گھر نہیں ہے؟''

''ان کا ہی گھر ہے۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

''کہاں ہیں اور کب تک گھر آ جائیں گی؟''اجنبی نے کلائی موڑ کر وقت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ یہاں نہیں ہیں، لاہور گئی ہوئی ہیں......اور پتا نہیں کب آئیں گی...... بتا کر نہیں گئیں۔''

''اچھا...... کوئی رابطہ نہیں ہے آپ کا اُن سے؟''اجنبی اب سنہری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں...... اماں تو جب سے لاہور گئی ہیں ایک بار بھی فون نہیں کیا......لیکن آ جائیں گی تین چار روز تک جاتے ہوئے جلدی آنے کا کہا تھا۔''سنہری پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم موتیا ہو؟''اجنبی نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... میں سنہری ہوں۔''

''اچھا......دراصل بیس اکیس سال پہلے جب میں شاہجہان بیگم سے ملا تھا تو موتیا تب یہی کوئی دس گیارہ سال کی ہو گی اور تم......تمہیں میں نے نہیں دیکھا تھا تب......لیکن شاہجہان نے بتایا تھا کہ اس کی موتیا سے چھوٹی بھی ایک بیٹی ہے۔''

''آپ آئیں ناں...... اندر بیٹھیں کوئی چائے پانی۔''سنہری نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور سوچا۔''پچاس سال کا تو ضرور ہو گا لیکن زبردست پرسنالٹی ہے......اور اماں بھی تو بیس سال پہلے اتنی بڈھی....بے ڈھنگی نہیں ہوں گی۔''اپنی سوچ پر خود بخود ہی اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''نہیں...... شکریہ...... دو چار روز میں پھر چکر لگاؤں گا۔تمہاری چائے ادھار رہی۔''وہ واپس مڑا۔

''سنیں، سنیں......!''سنہری نے بے اختیار اسے آواز دی۔

''تم...... آپ حاتی دادا ہو؟''

''نہیں......''اس نے مڑ کر اسے دیکھا جو بے حد تجسس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''خانو دادا......؟''

''نہیں......''وہ مسکرایا۔''میرا نام بابر نوید ہے۔جب شاہجہان بیگم آئیں تو انہیں بتا دینا کہ بابر نوید آیا تھا......دوبارہ پھر آؤں گا جلد ہی۔''

وہ پھر مڑ گیا تھا وہ آنکھیں پھاڑے اسے جاتے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اس شاندار گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی تب گیٹ بند کر کے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔

''بجو، بجو......''

''کیا ہوا......؟''سجل گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔''موتیا تو ٹھیک ہے ناں کیا وہ واپس آئی تھی؟''

''نہیں......''اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر گیٹ پر کون تھا سنہری؟''سجل نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔''کیا کوئی ڈاکو؟''

موراں پتا نہیں کدھر، کدھر سے ڈاکوؤں کے قصے سن کر آتی تھی اور پھر گھر آ کر بتاتی

''نہیں......''سنہری پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''وہ......کوئی بابر نوید تھا اور اماں سے ملنے آیا تھا۔''

''تو پھر......؟''سجل کو سنہری کی اس کیفیت پر حیرت ہوئی اور وہ اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گئی جبکہ سنہری اپنی

انگلیوں پر کوئی حساب لگا رہی تھی۔

''بیس اکیس سال پہلے......'' اس نے زیر لب دُہرایا اور تجل سے پوچھا۔

''تمہاری عمر انیس سال ہے ناں......؟''

''ہاں تقریباً......!''

''تو فرض کرو وہ بیس سال پہلے اماں سے ملنے آیا تھا اور اب!''

وہ تھوڑا سا تجل کی طرف جھکی، اس کی آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔

''تجو...... یہ جو بابر نوید ہے ناں مجھے لگتا ہے یہ...... تم جاننا چاہتی تھیں کہ ناں کہ تمہارا باپ کون ہے، تو بس سمجھ لو کہ اللہ شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے...... بابر نوید خود ہی بیس سال بعد اماں سے ملنے چلا آیا...... میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسے کہوں اماں تو گھر پر نہیں ہیں لیکن اصل میں تم بیس سال بعد جس کی تلاش میں آئے ہو وہ تو اندر بیٹھی ہے تمہاری بیٹی تجل......''

''توبہ ہے سنہری، تم کیسے منٹوں میں کہانی گڑھ لیتی ہوں، تمہیں تو کہانی نگار ہونا چاہیے تھا۔'' تجل جھنجلائی۔

''اماں سے تو بیس برس پہلے نہ جانے کتنے لوگ ملے ہوں گے بیس برس پہلے تو بقول اماں کے ان کے چوبارے پر خوب رونق ہوتی تھی، سیکڑوں لوگ آتے تھے۔''

''ہاں لیکن یہ بندہ مجھے لگتا ہے جو ہو نہ ہو یہ ہی تمہارا......''

''خواہ مخواہ فضول اندازے مت لگاؤ سنہری۔''

''نہیں سچ میں تجو، اس کی آنکھیں بالکل تمہاری طرح تھیں...... نہیں آنکھیں نہیں ہونٹ...... یا پھر ناک بلکہ......''

''سنہری......'' تجل نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کل تک تو تم حاتی دادا کے متعلق انکشاف کر رہی تھیں اور آج تمہیں یہ......''

''میں نہیں حاتی دادا کے متعلق تو ظہورا کہتا تھا...... ذرا سوچو تو تجل بیس سال پہلے یہ شخص اماں سے ملا تھا اور پھر نہیں ملا اور اب بیس سال بعد بھلا کیوں اماں کو ڈھونڈتا ہوا چلا آیا اس میں کچھ تو بھید ہے ناں۔''

تجل نے سر تھام لیا...... اب بھلا وہ سنہری سے کیا کہتی...... وہ تو ایسی ہی تھی...... اپنے اندازوں پر اسے ہمیشہ ہی ہنڈرڈ پرسنٹ یقین ہوتا تھا۔

''تجی کتنا مزہ آئے گا ناں جب وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے گا۔ اتنی شاندار گاڑی تھی اس کے پاس اور اتنی قیمتی گھڑی باندھ رکھی تھی اس نے اور یقیناً اس کا گھر بھی اتنا ہی شاندار ہوگا۔ تجی تیرے تو مزے ہو جائیں گے اور عظام......'' وہ مزے سے اپنی ہی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی جب اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔

''اُف... کس کا فون ہے۔'' وہ اٹھی ''ہائے کہیں موتیا کا نہ ہو۔'' اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور تجل کی طرف بڑھا دیا۔

''لو تمہارا فون ہے، عظام کا۔'' اس نے فون اس کی طرف بڑھایا اور وہ فون ہاتھ میں لیے خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ بیل آنا بند ہوگئی۔

''تم نے کال کیوں اٹینڈ نہیں کی تجل؟'' سنہری نے پوچھا۔

تجل خاموش ہی رہی...... فون ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا...... اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

''ابھی اسے نظر انداز نہ کرو...... ابھی تم اسے بتاؤ کہ تم اس سے زیادہ بے تاب رہتی ہو اس سے بات کرنے کے لیے۔'' سنہری کو اماں کا سکھایا ہوا سبق یاد آیا تھا۔ فون ایک بار پھر بجنے لگا تھا...... اور تجل فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھی تھی جیسے بے جان مجسمہ......

”لاؤ مجھے دو، میں بات کرتی ہوں۔“

سنہری نے اس کے ہاتھ سے اپنا موبائل لیا لیکن تب تک ایک بار پھر بیل آنا بند ہو گئی تھی...... سنہری فون ہاتھ میں لیے، لیے لاؤنج سے باہر نکل گئی جبکہ نجل نے سر صوفے کی پشت سے ٹیکتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور انگوٹھے سے اپنی کنپٹی کو ہولے، ہولے دبانے لگی۔

☆☆☆

عظام نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کو دیکھا۔

”آخر نجل فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہی...... اس وقت بھی اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا تھا اور اب بھی وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ کہیں وہ اس بات پر خفا تو نہیں ہو گئی کہ میں حسبِ وعدہ آج پاپا کے ساتھ ان کے گھر نہیں جا سکوں گا لیکن نہیں وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ اس کی اماں لاہور گئی ہوئی ہیں اور اس نے شاید یہی بتانے کے لیے فون بھی کیا تھا پھر بھلا وہ کیسے ناراض ہو سکتی ہے۔ شاید وہ بزی ہے یا...... پھر فون بھی تو سنہری کا ہے ناں...... ہو سکتا ہے سنہری نے فون کہیں اِدھر اُدھر رکھا ہوا ہو اور خود کہیں کام میں مصروف ہو...... میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنا ایک الگ فون ضرور لے لے بلکہ میں خود ہی اسے گفٹ کر دوں گا۔“ دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ ایک بار پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کر لے...... ابھی اس نے نمبر ملانے کے لیے فون ان لاک کیا ہی تھا کہ ثمر حیات نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے مڑ کر دیکھا۔

”پاپا آپ!“

”میں جا رہا ہوں، بہت ضروری کام ہے ورنہ نہ جاتا۔ پھر چکر لگاؤں گا۔ ابھی تو ممتاز خان میرے ساتھ جا رہا ہے لیکن وہ سب کے لیے کھانا وغیرہ لے کر واپس آ جائے گا۔ تم لوگوں کے دوست وغیرہ بھی ہیں...... میں نے کینٹین پر چائے کے لیے کہہ دیا ہے...... وہ روم میں ہی بھجوا دیں گے۔ ممتاز خان اُدھر ہی رہے گا باہر گاڑی میں کوئی بھی بات ہو تو......“

”ممتاز خان کی کیا ضرورت ہے پاپا...... جواد ہے اور ایک اور کلاس فیلو بھی ابھی آیا ہے۔ میں اور خدا بخش بھی ہیں...... بابا ہیں۔“ اس نے ثمر حیات کی بات کاٹی۔

”کچھ بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ویسے تو میں نے بات کر لی ہے پھر بھی اگر کوئی تھانے سے آ جائے تو ممتاز خان بات کر لے گا اور رواحہ ابھی تو مسکن دواؤں کے زیرِ اثر سو رہا ہے لیکن جب جاگے تو اسے سمجھا دینا کہ اسے کیا بیان دینا ہے۔“

”یہی ناں پاپا کہ وہ حملہ آواروں کو نہیں جانتا نا معلوم لوگ تھے۔“ اس کے لہجے میں غیر ارادی طور پر ہلکا سا طنز در آیا تھا لیکن ثمر حیات نے اگنور کر دیا۔

”اور پروفیسر صاحب کو میں نے کمرے میں بھیج دیا ہے، وہ بہت ڈسٹرب ہیں۔ تم ڈاکٹر سے پوچھ کر کھانے کے بعد انہیں کوئی سکون آور ٹیبلیٹ دے دینا۔ کچھ دیر سو جائیں گے تو بہتر محسوس کریں گے اور اپنا بھی خیال رکھنا...... ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے، رات کو گھر آؤ گے یا اُدھر ہی رکنا ہے؟“ ثمر حیات نے بات مکمل کر کے پوچھا۔

”پاپا میرا خیال ہے کہ بابا اور خدا بخش کو گھر بھیج دیں گے...... جواد اور میں اِدھر ہی رکیں گے۔“ عظام نے اپنا ارادہ بتایا۔

”اوکے سن......“ ثمر حیات نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اسے محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے چلا گیا۔ عظام انہیں وزیٹرز روم سے گزرتے اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر انٹرنس کی طرف جاتے دیکھتا رہا یہاں تک ثمر حیات اس کی

نظروں سے اوجھل ہو گیا تو بجل کو دوبارہ فون کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ رواحہ کے لیے، لیے گئے روم کی طرف بڑھا...... دروازہ نیم وا تھا وہ اندر داخل ہوا...... پیشنٹ بیڈ پر خدا بخش ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا جبکہ دائیں طرف دیوار کے ساتھ لگے صوفہ کم بیڈ پر بابا آنکھوں پر ہاتھ رکھے نیم دراز تھے۔ آہٹ پر انہوں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''بابا آپ پلیز لیٹے رہیں۔'' عظام نے انہیں اٹھنے سے منع کیا لیکن وہ اٹھ کر بیٹھ چکے تھے اور اب عظام کی طرف دیکھا۔

''تمہارے پاپا چلے گئے؟''

''جی انہیں کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ فارغ ہو کر پھر چکر لگائیں گے۔'' عظام ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''تمہارے پاپا بہت اچھے انسان ہیں عظام اور انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں ان کی گفتگو، اخلاق اور ان کی محبت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میرا رواحہ ٹھیک ہو جائے تو پھر انشاء اللہ ان سے ملاقات کے لیے تمہارے گھر آؤں گا۔''

''جی ضرور......'' عظام مدھم سا مسکرایا...... اور انہوں نے خدا بخش کی طرف دیکھا جو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کہیں جا رہے ہو کیا؟''

''جی صاحب، عظام ہے ناں آپ کے پاس تو میں کچھ دیر کے لیے گھر جاؤں گا سب کے لیے کھانا وغیرہ لے آؤں۔''

''نہیں چاچا اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا، ممتاز خان کے ساتھ کھانا بھجوا رہے ہیں...... آپ بھی لیٹ جائیں آرام کریں۔''

''آرام کیسے کروں عظام صاحب، دل کو کسی پل چین نہیں ہے...... بس رواحہ صاحب کی شکل آنکھوں کے آگے سے ہٹتی نہیں ہے۔ کیسے آنکھیں بند کیے بے بس سے پڑے ہیں...... اللہ ان ظالموں سے سمجھے۔''

''رواحہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا چاچا...... آپ دعا کرتے رہیں اور پریشان نہ ہوں۔'' عظام نے خدا بخش کو تسلی دی۔ خدا بخش دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا...... عظام نے رواحہ کے بابا کی طرف دیکھا جو پھر بہت پریشان نظر آنے لگے تھے۔

''بابا، رواحہ اب ٹھیک ہے آپ پریشان کیوں ہیں؟'' عظام نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''مسکن دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں ہے، امید ہے رات تک اسے روم میں منتقل کر دیں گے اور انشاء اللہ دو چار دن تک فارغ کر دیں گے۔ ابھی جواد اس کے پاس ہی ہے۔ ایک سے زیادہ افراد کو تو آئی سی یو میں نہیں رہنے دیتے باہر دوسرے دوست بیٹھے ہیں...... کچھ دیر تک میں چلا جاؤں گا...... آپ...... ریلیکس ہو جائیں پلیز......'' عظام نے کئی بار کے کہے ہوئے الفاظ پھر دہرائے تھے۔

''جانتا ہوں، انشاء اللہ رواحہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا عظام...... جن لوگوں کو اس نے دشمن بنا لیا ہے اگر انہوں نے دوبارہ رواحہ کو......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور بے بسی سے عظام کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کو تو عظام خاموش ہو گیا لیکن پھر اس نے انہیں تسلی دی۔

''انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ رواحہ ایک بار ٹھیک ہو جائے تو پھر سوچتے ہیں کچھ۔''

''کیا حل ہو سکتا ہے اس کا؟'' انہوں نے دلگرفتگی سے کہا۔

''تمہارے پاپا کہتے ہیں اس کا بہترین حل یہ ہے کہ رواحہ کو اور تمہیں کچھ عرصے کے لیے باہر بھجوا دیں...... یہ کچھ کتنے عرصے پر محیط ہوگا عظام، میں نہیں جانتا لیکن میں کیسے اتنا عرصہ رواحہ کے بغیر رہ پاؤں گا۔ تم نہیں جانتے، تمہیں نہیں پتا، میں جو یہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوں اور زندگی کے بازو میں بازو ڈالے چل رہا ہوں تو صرف اس لیے

کہ میرے ساتھ رواحہ ہے...... زندگی میرے اندر مر چکی تھی۔ عظام میں تو اپنے وجود کے لاشے کو صرف اس لیے گھسیٹ رہا تھا کہ ابھی باغِ رضوان میں زندگی کے درخت سے میری زندگی کا پتا نہیں ٹوٹا تھا اور مجھے اس وقت تک اس بے جان لاشے کو گھسیٹنا تھا جب تک پیغام اجل نہ آجاتا۔ میں تو فرشتۂ اجل کا منتظر تھا لیکن اللہ نے مجھے رواحہ دے دیا۔ اور میرے اندر جیسے زندگی کی چنگاری جل اٹھی، مجھے زندہ رہنے کا جواز مل گیا...... میں تو رواحہ کو دیکھ کر سانس لیتا ہوں عظام، وہ دور چلا گیا تو میری سانسیں تو میرے سینے میں ہی گھٹ جائیں گی۔''

وہ ہولے، ہولے جیسے خواب کے سے عالم میں بول رہے تھے اور ان کے الفاظ جیسے عظام کے دل کو گرفت میں لیے تھے۔ رواحہ صحیح تو کہتا تھا کہ وہ بابا کا عشق اور بابا اس کا عشق ہیں...... اتنی شدید محبت کو بھلا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

''ہم کہیں نہیں جائیں گے بابا...... اگر ہماری زندگی ہے تو کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر زندگی ختم ہوگئی اور سانسیں پوری ہوگئیں تو سات سمندر پار جاکر بھی موت سے نہیں بچ سکیں گے۔'' اور عظام کے تسلی بھرے لفظوں سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اُن کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا...... جو لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا...... نہ ایک سانس کم نہ ایک سانس زیادہ لیکن تمہارے پاپا تو جیسے پختہ ارادہ کیے بیٹھے ہیں کہ تمہیں اور رواحہ کو جتنی جلدی ممکن ہو سکے باہر بھجوادیں۔''

''ہاں، ان کا دل بھی تو ایک محبت کرنے والے باپ کا دل ہے ناں بابا جو اپنے بچوں کو...... (پروٹیکشن) تحفظ دینے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ بھلے اسے بچوں کی دوری ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے تو پاپا بھی ایسا ہی سوچتے ہیں شاید۔''

''باپ کا دل......!'' انہوں نے زیرِ لب کہا اور انہیں بابا جان یاد آ گئے۔ کیسے، کیسے تڑپا تھا اُن کا دل ان کی زندگی کے المیے پر...... کتنے نڈھال اور کمزور ہو گئے تھے وہ لیکن ان دنوں انہیں خیال ہی کب تھا کہ وہ ان کی طرف دیکھتے اور ان کی حالت پر غور کرتے، وہ تو خود بکھر گئے تھے، ٹوٹ گئے تھے اور بابا جان ہر لمحہ انہیں سنبھالنے کی سعی کرتے رہتے تھے وہ کہیں کھو سے گئے۔

اس روز جب انہوں نے چندا کو تیسری طلاق بھجوائی تھی تو جیسے کسی نے اُن کا دل سینے سے نوچ کر پھینک دیا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا...... سب امیدیں، گمان، آس، ہاں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ واپس پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ چندا ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گئی تھی...... لیکن کیا وہ واقعی ان کی زندگی سے نکل گئی تھی وہ تو اب بھی ان کی زندگی میں موجود تھی ان کی ہر سانس میں...... اس روز وہ بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔

''بابا جان میرا دل پھٹ جائے گا۔'' اور بابا جان نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا اور اُن کی آنکھیں بھی برس پڑی تھیں۔

''جانِ پدر حوصلہ کرو، ہمت باندھو، زندگی میں ایسے حادثات آتے رہتے ہیں اور انہیں برداشت کرنا ہی پڑتا ہے...... تقدیر سے نہیں لڑا جاسکتا جانِ عزیز...... تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہارا یہ بوڑھا باپ کیا کرے گا...... اس کے پاس تو تمہارے سوا اور کچھ نہیں ہے...... تم ہی اس کی واحد پونجی ہو...... اکلوتی متاع ہو۔'' وہ اس طرح کبھی جذباتی نہیں ہوئے تھے لیکن اس روز ہو گئے تھے۔ کتنی کوشش کی تھی انہوں نے کہ ایک بار چندا اُن سے مل لے۔ ایک بار پھر وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کریں لیکن وہ نہیں ملی تھی۔ پہلی طلاق بھیجنے کے بعد وہ کتنے پُر امید تھے کہ شاید اب...... شاید اب اسے خیال آجائے کہ اس نے مجھ پر غلط شک کیا...... شاید اپنے لیے نہ سہی، اپنی معصوم بیٹی کے لیے ہی رجوع کرلے لیکن اس نے رجوع نہیں کیا تھا اور وقت گزر گیا تھا۔ وہ پہلی طلاق کے بعد کتنی ہی بار اس کے گھر گئے تھے لیکن ہر بار پتا چلتا کہ وہ اپنی ممی کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی ہے اور یہاں صرف اس کے ڈیڈی ہیں۔

"وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے بابا جان...... میری بیٹی کو مجھے بتائے بغیر کہیں اور کسی دوسرے ملک میں لے جائے۔ میں کیس کردوں گا، مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کا پورا حق ہے۔"

"ہاں تمہیں حق ہے بیٹا...... لیکن کیس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے...... وہ ملک میں واپس آجائے تو میں بات کروں گا اس سے۔"

بابا جان نے انہیں نرمی سے سمجھایا تھا لیکن وہ واپس نہیں آئی تھی اور دوسری اور پھر تیسری طلاق بھی بھجوادی تھی انہوں نے...... اور وہ رشتہ جو بہت چاہ، بہت محبت اور شوق سے قائم کیا گیا تھا پھر کبھی نہ جڑنے کے لیے ٹوٹ گیا تھا...... اور وہ بلک، بلک کر روتے، تڑپتے...... اور بابا جان سے ان کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کے غم نے انہیں بھی اندر سے ڈھا دیا تھا۔ انہوں نے خود ا کیلے چندا کے گھر کے چکر لگائے تھے۔ اس کے ڈیڈی سے ملے تھے اور درخواست کی تھی کہ بچی کو باپ سے ملنے کا حق ہے۔ آپ کیوں ایک باپ کو اس حق سے محروم کرتے ہیں اور تب انہوں نے بابا جان کو بتایا تھا کہ چندا بہت اپ سیٹ تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے اپنی ممی کے ساتھ لندن بھجوا دیا ہے۔ جہاں ان کے کوئی کزن رہتے ہیں...... عدت تک اب وہ وہاں ہی رہے گی۔ انہوں نے اس سب کے لیے افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔

"مجھے اس سارے واقعے کا بے حد افسوس ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن۔ ہم اسے فورس بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

بابا جان نے یہ سب آکر انہیں بتایا تو وہ بالکل خاموش ہوگئے تھے۔ اب سارا سارا دن چپ بیٹھے رہتے تھے...... کالج جانا چھوٹ گیا تھا...... بابا جان کالج جاتے تو کئی بار خدا بخش کو فون کر کے ان کے متعلق پوچھتے...... گھر آکر ان کو کمپنی دیتے...... ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے، زبردستی انہیں باہر لے کر جاتے لیکن ان دنوں تو جیسے ان کے اندر سناٹے اتر آئے تھے۔ ایک جامد چپ تھی جو اُن کے ہونٹوں پر جم گئی تھی...... ان دنوں بابا جان ان کے لیے بے حد

...پریشان رہنے لگے تھے اور اس پریشانی نے انہیں بیمار کر ڈالا اور ان کی بیماری نے جیسے اس جامد چپ کو توڑ دیا۔

''نہیں بابا جان، آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔'' وہ تڑپ، تڑپ کر روئے تھے۔

''انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا لیکن وعدہ کرو تم بھی اس سب کو قبول کر لو گے اور خوش رہو گے۔'' انہوں نے وعدہ کر لیا تھا۔ بابا جان کی بیماری نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ اگر بابا جان کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کریں گے۔ اکیلے تنہا ان کا تو دم گھٹ جائے گا...... ان دنوں ایک بار پھر انہوں نے نمازیں شروع کر دی تھیں اور اللہ سے رو، رو کر بابا جان کی صحت و زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔

بابا جان ہولے، ہولے صحت مند ہو گئے تھے۔ اور وہ بابا جان کی خاطر خوش نظر آنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اندر مسلسل برسات جاری رہتی تھی۔ انہیں چندا سے بے شمار شکوے تھے بہت سے گلے تھے۔ اس نے ان کا اعتبار نہیں کیا تھا انہیں صفائی کا موقع دیے بغیر فیصلہ سنا دیا تھا اور اس نے فیصلہ کرتے ہوئے ایک بار بھی اپنی بیٹی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ جو صرف اس کی بیٹی نہیں تھی، ان کی بھی تھی۔ جسے صرف ماں کی نہیں باپ کی بھی ضرورت تھی لیکن چندا نے یہ سب نہیں سوچا تھا اور ان کے درمیان پہاڑ جتنے فاصلے حائل ہو گئے تھے...... لیکن اپنی بیٹی سے ملنے کا انہیں حق تھا اور وہ اس سے ملنا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ اس روز بابا جان کالج گئے تو انہوں نے چندا کے گھر فون کیا...... فون ملازمہ نے ریسیور کیا اور ان کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ لندن سے واپس آ گئی ہیں۔ اور اس روز وہ کئی مہینوں بعد اس کے گھر گئے تھے۔ ملازمہ نے انہیں لان میں بٹھایا تھا اور بچی کو وہاں ہی لے آئی تھی۔ انہوں نے .... بے تابانہ اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیا تھا ان چند ماہ میں وہ کتنی پیاری ہو گئی تھی۔ گول مٹول، سرخ و سپید گال، چمکتی روشن آنکھیں...... وہ اسے چوم، چوم کر تھکتے نہ تھے اور ملازمہ دور کھڑی تاسف سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

وہ آوازیں نکالتی تھی...... گدگداتے تو ہنستی...... سیٹی بجاتے تو خوش ہوتی...... انہوں نے اس کے ننھے، ننھے ہاتھوں کو بھی کئی بار چوما...... ان کا جی چاہ رہا تھا وہ اسے اب خود سے جدا نہ کریں۔ اور اسے لے کر چلے جائیں دور کہیں جہاں چندا انہیں ڈھونڈ نہ سکے لیکن پھر جیسے اُن کا دل کانپ گیا...... نہیں بھلا چندا کیسے رہے گی اس کے بنا اور یہ اتنی چھوٹی سی بچی بھلا ماں کے بغیر کیسے رہے گی انہیں لگا تھا کہ وہ یہ ظلم نہیں کر سکتے...... ورنہ ملازمہ تو جا چکی تھی اور وہ اگر چپکے سے اسے لے کر نکل جاتے تو......

انہوں نے اس کی پیشانی چومی تب ہی کسی نے بچی کو ان کے ہاتھوں سے لے لیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا...... وہ چندا کا کزن تھا...... اور بڑی کینہ توز نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اور بڑے استحقاق سے بچی کو گود میں لیے کھڑا تھا۔

''آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا...... اور نہ ہی بچی سے ملنے کی کوشش کرنا...... ورنہ......''

''ورنہ کیا...... یہ میری بچی ہے اور مجھے اس سے ملنے کا پورا حق ہے۔'' وہ اس کی بات پر حیران ہوئے تھے۔

''بالکل یہ تمہاری ہی بچی ہے اور تمہیں اس سے ملنے کا پورا حق ہے لیکن میں چاہتا ہوں تم اس حق کو استعمال نہ کرو...... اور بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی بیٹی ہے، اسی میں تمہاری بیٹی کی بھلائی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ وہ زندہ رہے اور خوش رہے تو پھر کبھی بھول کر بھی اس کا خیال دل میں نہیں لانا۔'' اس کے لہجے میں عجیب طرح کی سختی اور رعونت تھی۔

''لیکن کیوں...... تم مجھے اپنی بیٹی سے ملنے سے کیسے روک سکتے ہو...... میرا اور اس کا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ میری بیٹی ہے میں ضرور اس سے ملوں گا اور اگر تم نے مجھے ملنے سے روکا تو میں عدالت میں جاؤں گا۔'' انہوں نے احتجاج کیا تھا انہیں اس وقت چندا کا وہ کزن انتہائی برا لگا تھا بھلا وہ کون ہوتا ہے انہیں اپنی بیٹی سے ملنے سے روکنے والا۔

''بہت شوق سے۔'' اس کے لبوں پر بڑی مکارانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔'' جب تک عدالت فیصلہ کرے گی تمہاری بیٹی کی ہڈیاں تک گل چکی ہوں گی۔'' اس نے بے حد سفاکی سے کہا تھا۔

''میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اگر بیٹی کی زندگی اور خوشی چاہتے ہو تو اس کی زندگی سے نکل جاؤ...... یہ بہت خوش رہے گی اور شہزادیوں کی طرح پرورش پائے گی اور دوسری صورت میں پھر تم اپنے بیٹے کی طرح اس کی لاش بھی نہیں دیکھ پاؤ گے، گلا گھونٹ کے جنگل میں پھینک دوں گا...... میں اسے۔'' وہ پوری جان سے لرز گئے تھے۔

''نہیں، نہیں......'' ان کے لبوں سے پھنسی، پھنسی سی آواز نکلی تھی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے...... تم بھلا ایک اتنی چھوٹی معصوم سی بچی کو کیسے مار سکتے ہو؟'' انہوں نے اسے گود میں لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے تھے لیکن اس نے بچی کو پیچھے کر لیا تھا۔

''ہاں میں ایسا نہیں کروں گا لیکن اس کے لیے ایک ہی شرط ہے کہ تم اسے بھول جاؤ...... کبھی مڑ کر پیچھے مت دیکھنا اگر تمہیں اپنی بچی سے محبت ہے اور تم اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ورنہ......''

اس کا لہجہ پہلے جیسا ہی سفاک تھا۔ وہ جیسے کھڑے، کھڑے شل ہو گئے تھے آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی تھی اور اس دھند میں سامنے کھڑا شخص اور اس کے بازو میں موجود بچی اس دھند کے پیچھے جیسے چھپ سے گئے تھے۔

''نہیں......'' انہوں نے اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر کے کہا۔

''کیا نہیں......'' اس کی آواز انہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو پھر اس کی لاش بھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ گلا گھونٹ کر کسی جنگل میں پھنکوا دوں گا۔'' اس نے دوبارہ اپنی بات دُہرائی تھی۔

''نہیں......'' ان کے لبوں سے پھر نکلا تھا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے وہ بیٹھ گئے تھے۔ سر چکرا رہا تھا...... کچھ دیر بعد جب دل قابو میں آیا اور آنکھوں کے آگے سے دھند چھٹی تو انہوں نے دیکھا وہ بچی کو اٹھائے واپس اندر کی طرف جا رہا تھا، اُن کا دل اپنی بیٹی کو ایک بار پھر دیکھنے اور گود میں لینے کے لیے مچلا...... انہوں نے اٹھتے ہوئے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا لیکن پھر اسی انجانے خوف نے ان کے پاؤں جکڑ لیے... وہ لکڑی کا بھاری دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا اور وہ وہاں ہی کھڑے رہ گئے۔ انہیں لگا تھا جیسے وہ بالکل خالی ہو گئے ہوں۔ تہی داماں، خالی وجود کے ساتھ وہ سر جھکائے اس کے گھر سے نکلے تو اُن کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ سب کچھ جو چندا کے کزن نے ان سے کہا تھا، وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ ''اس نے ایسا کیوں کہا...... وہ کیوں نہیں چاہتا کہ میں اپنی بیٹی سے ملوں...... کیا وہ صرف مجھے دھمکا رہا تھا یا وہ سچ مچ ایسا ہی کرے گا۔ وہ اسے مار ڈالے گا۔ نہیں...... میری بیٹی زندہ رہے...... خوش رہے میں اس سے ملوں یا نہیں ملوں...... میرے لیے یہ ہی کافی ہوگا کہ وہ ہے۔ اسی دنیا میں موجود ہے۔ سانس لیتی ہے، جیتی ہے۔''

وہ جب اپنے خیالات میں ڈوبے گھر پہنچے تو بابا جان کالج سے آچکے تھے اور اب پریشان سے خدا بخش سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ انہیں آتے دیکھ کر وہ بے تابی سے ان کی طرف بڑھے تھے۔

''کہاں چلے گئے تھے میری جان؟''

''بابا جان میں اسے دیکھنے گیا تھا۔ وہ بہت پیاری ہو گئی ہے...... اس نے میری انگلی اپنی مٹھی میں پکڑ لی تھی...... میں اس کی ناک پکڑ کر ہلاتا تو وہ کھل کھل کر کے ہنسنے لگتی تھی۔ لیکن بابا جان...... وہ......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک گئے وہ انہیں چندا کے کزن کے متعلق بتانا چاہتے تھے کہ اس نے ان سے کتنی ظالمانہ باتیں کی ہیں...... لیکن انہوں نے بابا جان کے چہرے کو دیکھا جو بہت اشتیاق سے ان کی باتیں سن رہے تھے اور انہوں نے چپ سادھ

لی...... نہیں وہ بابا جان کو نہیں بتائیں گے......

''میں نے پہلے ہی انہیں کتنا پریشان کیا ہے...... اب اور پریشان نہیں کروں گا۔''

اور یہ چپ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ان کے اعصاب کمزور ہو چکے تھے۔ کبھی ان کا دل چاہتا وہ اس شخص کی باتوں کی پروا کیے بغیر اپنی بیٹی سے ملنے چلے جائیں بھلا وہ شخص اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک معصوم سی بچی کو مار ڈالے اس بچی کو جو اس کی کزن کی بھی بیٹی ہے صرف ان کی بیٹی نہیں ہے۔ لیکن جب بابا جان ان کی مسلسل چپ سے گھبرا کر کہتے۔

''چلو اپنی گڑیا سے ملنے چلتے ہیں۔''

تو وہ خوفزدہ ہو جاتے...... ان کے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا...... ان کی آنکھوں کے سامنے خون میں ڈوبی ننھے بچوں کی لاشیں آنے لگتیں...... وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے...... بابا جان کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیتے۔

''نہیں بابا جان نہیں......'' ان کی آواز بھی لرزنے لگتی تھی۔

ان کا ذہن ایک بار پھر اپنے مرکز سے ہٹ رہا تھا۔ وہ راتوں کو خوفناک خواب دیکھتے اور چیخ مار کر اٹھ جاتے تھے...... تب بابا جان ایک بار پھر انہیں ڈاکٹروں کے پاس لے کر جانے لگے تھے۔

''بابا جان میں ٹھیک ہوں...... آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔'' وہ انہیں یقین دلاتے لیکن پتا نہیں کیوں انہیں یقین نہیں آتا تھا، ان کی آنکھوں میں نمی پھیل جاتی تھی۔

''میں پریشان نہیں ہوں...... لیکن میں چاہتا ہوں تم بالکل ٹھیک ہو کر جاب کرو...... اور مصروف ہو جاؤ۔'' اور وہ سوچتے بابا جان صحیح کہتے ہیں۔ وہ اگر مصروف ہو جائیں گے تو یہ جو ان کا ذہن ہر وقت الجھا رہتا ہے شاید ان الجھنوں سے نجات مل جائے...... اور وہ بابا جان کے ساتھ چل پڑتے۔ موسم گرما کی چھٹیاں ہوئیں تو بابا جان شاید ان کے ڈاکٹر کے مشورے سے ہی ان کے ساتھ گاؤں آ گئے تھے۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں آئے تھے۔ یہاں پھپو تھیں اور بابا جان کے دو چار کے چند ایک رشتے دار ان کا قیام پھپو کے گھر تھا...... گاؤں کے ماحول میں ان کا دل بہل گیا تھا...... ڈاکٹر کی دی گئی دوائیاں بھی بابا جان با قاعدگی سے استعمال کرواتے تھے...... ہولے، ہولے ان کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اب وہ گھنٹوں ایک جگہ خاموش بیٹھے نہیں رہتے تھے۔ بلکہ دوسرے معاملات میں دلچسپی بھی لینے لگے تھے۔ انہوں نے اخبارات کے اشتہار دیکھ، دیکھ کر مختلف جگہوں پر جاب کے لیے اپلائی بھی کیا تھا لیکن خوابوں کا سلسلہ اب بھی باقی تھا...... وہ خواب میں دیکھتے کہ وہ چندا کا کزن ان کی گڑیا کا گلا گھونٹ رہا ہے اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ رہا ہے اور وہ لہولہان زمین پر پڑی ہے...... وہ چیخ مار کر اٹھ جاتے تھے۔

''تمہارے ذہن پر کیا بوجھ ہے...... کس بات سے خوفزدہ ہو جانم...... مجھے بتاؤ۔'' بابا جان انہیں گلے لگاتے پیار کرتے لیکن وہ ان سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتے کوئی خوف ان کا گلا گھونٹ دیتا...... اگر بابا جان سب سن کر چندا کے ڈیڈی کے پاس چلے گئے یا چندا سے جا کر کہہ دیا تو وہ لوگ پتا نہیں یقین کریں یا نہ کریں لیکن ضد میں آ کر اس نے ان کی بیٹی کو نقصان پہنچا دیا تو...... اور وہ بابا جان کو بھی کچھ نہ بتا سکے۔

موسم گرما کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور بابا جان کا کالج کھل گیا تھا۔ وہ واپس لاہور آ گئے تھے۔ پھپو نے بابا جان سے کہا تھا کہ وہ ان کی شادی کر دیں کسی بہت اچھی لڑکی سے تاکہ وہ چندا کا دیا دکھ بھول جائیں...... لیکن وہ جانتے تھے یہ دکھ ختم ہونے والا نہیں ہے...... اور بابا جان نے بھی بس سرسری ساذکر کیا تھا اور ان کے انکار پر خاموش ہو گئے تھے...... لاہور آتے ہی انہیں ایک پرائیویٹ کالج میں جاب مل گئی تھی اور وہ مصروف ہو گئے تھے...... اس مصروفیت نے ان کی ذہنی حالت پر اچھا اثر ڈالا تھا...... اور بابا جان بھی کسی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔

خدا بخش نے ایک روز انہیں بتایا تھا کہ انہیں بتائے بغیر بابا جان دو بار چندا کے گھر گئے تھے لیکن چوکیدار سے پتا چلا تھا کہ وہ سب لوگ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں...... اور انہوں نے سوچا تھا کہ یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ ورنہ کیا خبر وہ چندا کا کزن کیا کر گزرتا۔ زندگی کا ایک معمول شروع ہو گیا تھا۔ گھر، کالج اور پھر گھر...... وہ بابا جان سے ہر موضوع پر بات کرتے...... بابا جان بھی نئی کتابیں پڑھ کر ان سے ڈسکس کرتے، انہیں بھی پڑھنے پر اکساتے...... وہ کچھ پڑھتے کچھ نہیں لیکن بابا جان کی ڈسکشن دلچسپی سے سننے کی کوشش کرتے لیکن ان کے درمیان چندا یا اپنی بیٹی کے متعلق کوئی بات نہ ہوتی۔ دونوں اس موضوع پر بات نہ کرتے تھے۔ ہاں خدا بخش کبھی کبھی بے اختیار کسی بات پر چندا کو یاد کرتا اور وہ اگنور کر دیتے...... بظاہر زندگی کا یہ چیپٹر کلوز ہو چکا تھا لیکن کیا واقعی کلوز ہو گیا تھا...... شاید نہیں...... رات کو جب وہ بستر پر لیٹتے تو چندا کی کھنکتی ہنسی اس کی شوخیاں اور اس کی وارفتگیاں یاد آتیں اور گول مٹول سی سرخ و سپید گالوں اور چمکتی آنکھوں والی گڑیا کی قلقاریاں کانوں میں گونجتیں تو خود بخود ہی آنکھوں کے کونوں سے آنسو نکل نکل کر تکیہ گیلا کرنے لگتے۔

بابا جان کو بھی یقیناً چندا یاد آتی ہو گی اور انہیں اپنی پوتی کا خیال بھی آتا ہو گا جسے انہوں نے صرف دو تین بار ہی دیکھا تھا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنا درد چھپاتے تھے۔ انہوں نے اپنا درد چھپانا سیکھ لیا تھا...... وہ بابا جان کو دکھی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن جانتے تھے کہ بابا جان کو اُن کا دکھ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

''آپ اپنا خیال بالکل نہیں رکھتے۔ بابا جان آپ خوش رہا کریں...... میں ٹھیک ہوں، میں نے اس حادثے کو قبول کر لیا ہے۔ جان لیا ہے کہ میری تقدیر میں یہی لکھا تھا اور انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔'' اس روز وہ ان کے کمرے میں ان کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے اور انہیں شدت سے احساس ہوا تھا کہ بابا جان بہت کمزور ہو گئے ہیں...... وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔

''کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں خوش رہوں؟'' انہوں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''میں ایسا کیوں نہیں چاہوں گا بابا جان...... میری وجہ سے آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ بہت اذیت جھیلی ہے۔ اور اب جبکہ میں ٹھیک ہوں تو آپ بھی خوش رہا کریں۔''

''تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو شادی کر لو...... تمہارا گھر بس جائے گا...... تمہارے بچوں کو اپنے آنگن میں ہنستا بستا، کھیلتا دیکھوں گا تو سمجھو ہفت اقلیم کی دولت مل جائے گی مجھے۔'' اور وہ ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

''کیا دل کی اجڑی بستیاں پھر سے بس سکتی ہیں۔ کیا چندا کی جگہ وہ کسی اور کو دے سکتے ہیں۔''

دل میں تو خاک اڑتی تھی...... اور کبھی نہ ختم ہونے والی ویرانی تھی لیکن انہوں نے زخمی نظروں سے بابا جان کی طرف دیکھا۔

''بابا جان مجھے تھوڑا وقت دیجیے سنبھلنے کے لیے...... ابھی اتنی جلدی میں خود کو کسی نئی آزمائش کے لیے تیار نہیں پاتا لیکن وعدہ رہا بابا جان میں آپ کی خوشی کی خاطر......'' اور ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ اور بابا جان نے یک دم اٹھ کر انہیں گلے لگا لیا تھا۔

''جانِ پدر...... جانتا ہوں یہ بہت مشکل ہے ابھی کچھ وقت گزر جانے کے بعد شاید یہ اتنا مشکل نہ لگے لیکن وہ وقت آنے تک پتا نہیں میں رہوں گا یا نہیں...... میں تمہارا بستا گھر دیکھنا چاہتا ہوں جانم۔''

''بابا جان پلیز ایسا مت کہیں...... آپ کو اللہ لمبی زندگی دے۔'' انہوں نے تڑپ کر کہا تھا۔

''میں آپ کے بغیر اس اتنی ظالم دنیا میں سروائیو نہیں کر پاؤں گا...... مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ ایسی باتیں مت کیا کریں خدارا۔ جو آپ کا دل چاہتا ہے کریں۔'' انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن دل کو جیسے

کوئی مٹھی میں لیے بار، بار بھینچتا تھا اور اذیت کی لہریں پورے وجود میں سرائیت کر جاتی تھیں۔

بابا جان نے جب اُن کی پیشانی چوم کر انہیں خود سے الگ کیا تو ان کے چہرے پر ایک الوہی سی روشنی تھی...... اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''تھینک یو بیٹا......'' انہوں نے ایک بار پھر سے ان کی پیشانی چومی تھی۔

''مونا کی والدہ کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ ان کی کوئی بیٹی میری بہو بنے...... سچ پوچھو تو مجھے بھی وہ بچیاں پسند تھیں۔ اب مونا کی تو شادی ہو چکی ہے۔ دونوں چھوٹی ہیں تم جو کہو...... دیکھی بھالی بچیاں ہیں...... جانے پہچانے لوگ...... ان جانے اور غیر لوگوں میں کرنے سے ڈر لگتا ہے...... نہ جانے آنے والی کیسی ہو۔'' بابا جان پُرجوش ہو رہے تھے وہ سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے تھے...... لیکن اندر دل کی دنیا میں تلاطم بپا تھا۔

''ہاں تو تم نے بتایا نہیں کہ کون......؟''

''جو آپ کو پسند ہو بابا جان۔'' انہوں نے اپنا جھکا سر نہیں اٹھایا تھا...... مبادا بابا جان ان کی آنکھوں میں بکھرتی ویرانیاں دیکھ لیں۔

''تو ٹھیک ہے میں کل ہی جا کر مونا کی والدہ سے بات کرتا ہوں۔''

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ معلوم نہیں کتنی صدیوں کا سفر وہ طے کر آئے تھے۔ عظام نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو کینٹین والا لڑکا سب کے لیے چائے لایا تھا، ساتھ میں سینڈوچز بھی تھے...... عظام نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر بینچ پر رکھی اور خدا بخش سے کہا کہ وہ بابا کو چائے دے اور خود بھی پی لے۔

وہ ابھی تک خالی، خالی نظروں سے عظام اور خدا بخش کو دیکھ رہے تھے۔

''بابا آپ چائے پی کر وہ ٹیبلیٹ لے لیں۔ جو میں نے آپ کو دی ہے۔''

وہ چونکے اور سر جھٹک کر ماضی کے حصار سے خود کو باہر نکالا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

میں آئی سی یو میں جا رہا ہوں...... جواد اور علی وغیرہ کو بھیجتا ہوں۔''

''تم چائے نہیں پیو گے۔''

''نہیں، میں نے کچھ دیر پہلے ہی پی تھی۔''

''اچھا ڈاکٹر سے پوچھنا رواحہ کے متعلق کہ اس کے زخم کب تک ٹھیک ہو جائیں گے۔'' عظام نے سر ہلایا۔

''جی بابا پوچھ لوں گا، ویسے میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ انشاء اللہ تین چار روز تک فارغ کر دیں گے اور ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی کر دیں۔''

''میں چلوں عظام تمہارے ساتھ؟'' انہوں نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''نہیں بابا، آپ آرام کریں...... اس دوا سے آپ کو تھوڑی نیند آ جائے گی تو فریش ہو جائیں گے...... اور رواحہ تو یوں بھی سو رہا ہے۔''

وہ بات کر کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے دروازے کو ہلکا سا ناک کیا اور پھر ساتھ ہی دروازے کو کھول کر اندر قدم رکھا...... آنے والے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے عظام حیران رہ گیا اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

''ظفری......''

(جاری ہے)

نفیس لوگ

اُمِ ایمان

''ہارون......وہ...'' کہتے کہتے وہ رک سی گئی...... چائے پیتے ہارون جو اخبار پر سرسری نگاہ دوڑا رہے تھے چونک سے گئے۔

''کیا بات ہے رانیہ؟ کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟'' نفیس گلاسز میں سے جھانکتی ذہین آنکھوں نے رانیہ کے چہرے پر پھیلا تذبذب بھانپ لیا تھا جبھی اخبار میز پر رکھ کر وہ پوری طرح سے رانیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

''زینی آپا نے بیٹے کی منگنی کی ہے میں جا کر مبارک باد دینے کا سوچ رہی تھی اگر آپ ساتھ چلتے......'' مگر ان کا ہاتھ اٹھا کر ٹوکنا رانیہ کی زبان کو بریکس لگا گیا۔

''پلیز رانیہ میں روز، روز بیٹھ کر آپ کو ایک لیکچر نہیں دے سکتا۔ آپ میری سوچ، میرا وے آف لائف جانتی ہیں پھر بھی ہر تیسرے روز ایک فرمائش لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں اور طرح کا مینٹل لیول رکھنے والا بندہ ہوں...... یہ چاپلوسی قسم کے رشتے دار عجیب، عجیب سے لب و لہجے اور گندے سندے حلیے والے لوگوں کے درمیان لے جا کر آپ مجھے مینٹلی ڈسٹرب کریں گی اور کچھ نہیں...... آپ چلی جاتی ہیں تو اسی بات کو غنیمت جانیں کہ میں آپ کو منع نہیں کرتا۔''

نیپکن سے ہاتھ پونچھتے شوہر سے اپنے غریب رشتے داروں پر ایک لمبا سا لیکچر مزید سننا پڑا تھا رانیہ کو...... وہ آنسو چھپاتی بس سر جھکا کر بیٹھی رہ گئی تھی اور ابھی انہوں نے ٹیبل پر والٹ میں سے چند نوٹ نکال کر رکھے ہی تھے کہ جاتے ہوئے کوئی پھل، مٹھائی وغیرہ لے جائے یہ دیکھے اور جانے بغیر کہ ان کے الفاظ اور لہجے سے حقارت ٹپک رہی تھی، اس کی تکلیف رانیہ کے لیے اس قدر زیادہ تھی کہ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی ان پیسوں کو نہ دیکھا تھا تبھی جمیلہ آن ٹپکی تھی۔

''صاحب جی...... بی بی جی...... اللہ جوڑی سلامت رکھے جی...... میرا ابا بیمار ہے جی...... دوائی لینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ابا جی کی حالت بہت خراب ہے۔''

''دیکھ لیا، یہ ہوتا ہے نیچ لوگوں کو منہ لگانے کا نتیجہ...... ایک سے ایک بڑی ضرورت اور مسئلہ لے کر آن کھڑے ہوتے ہیں۔'' وہ ٹیبل پر رکھا بریف کیس اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے کچھ جتا کر بولے۔ رانیہ کو ان کی بات کا پس منظر سمجھ آ گیا تھا۔

اصل میں پرسوں ہارون اچانک آفس سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ رانیہ کے سر میں صبح سے ہی شدید درد تھا۔ جمیلہ نے جونہی کام سے فارغ ہو کر دبانے کی خدمات پیش کی تو وہ انکار نہ کر پائی حالانکہ ہارون کو ملازمین سے خاص قسم کی چڑ تھی، ان سے کسی بھی طرح کی بے تکلفی ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔

''انہیں کام کرنے کی مشین سمجھ لیں۔ وہ ہمارا کام کرتے ہیں اور ہم اس کا پے کرتے ہیں۔ گھریلو معاملات تو کیا، میں کسی بھی قسم کی بات چیت کے حق میں نہیں ہوں۔'' یہ ہارون کا شاہی فرمان تھا جو انہوں نے رانیہ کو ازبر کرا دیا تھا۔ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی جمیلہ نیچے کارپٹ پر ایزی حالت میں اور نیم دراز مساج کراتی رانیہ دونوں ہی چونک کر سیدھی ہوئیں۔

''تمہاری بیگم صاحبہ کو تو سمجھ نہیں آیا لیکن تم آئندہ مجھے بیڈ روم میں نظر مت آنا۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر جمیلہ کو تنبیہہ کیا وہ جل تو جلال تو کا ورد کرتی وہاں سے نکل بھاگی تھی پیچھے سے ہارون کی سخت سست کے لیے رانیہ رہ گئی تھی جس کے سر کا درد جو جمیلہ کے جادوئی مساج کی بدولت کم ہونے لگا تھا۔ اب پھر سے شدت اختیار کر رہا تھا۔

''گھر، گھر میں کام کرنے والی وہ غلیظ سی عورت...... کیا آپ کا یہ مقام ہے کہ اسے پاس بٹھا کر آپ مساج کروا رہی ہیں۔ ایسا کوئی پرابلم ہے بھی تو پارلرز کس مرض کی دوا ہیں؟ ہزار بار آپ سے کہا ہے کہ ملازمہ کے سر پر کھڑے ہو کر صرف کام کروائیں اور روانہ کر دیں اور آپ صوفے پر بٹھا کر اس کی گود میں لوریاں سن رہی ہیں۔''

''ہارون...... میرے سر میں بہت درد تھا، یقین کریں...... ورنہ میں کہاں ملازمین سے فری ہوتی ہوں۔ کبھی کوئی بات کرنی بھی پڑ جاتی ہے آخر کو وہ ہم انسانوں جیسے انسان ہیں۔'' وہ بے بسی سی بولی تھی۔ وہ بعد میں آ کر بات کروں گا کا کہہ کر روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد زینی آپا کا فون آ گیا تو وہ بھول بھال گئی تھی اس بات کو۔ اب صبح ہی صبح جمیلہ کی دھماکے دار انٹری نے صاحب بہادر کے موڈ کو مزید خراب کیا تھا۔ جمیلہ کا باپ ان کے گھر کا چوکیدار تھا جس کی بیماری کا المناک قصہ جمیلہ لے کر کھڑی تھی رانیہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہارون کے نہ ہونے کا یقین کیا اور میز پر دھرے کڑکتے نوٹوں میں سے ایک نوٹ نکال کر جمیلہ کو پکڑا دیا۔

''اب جلدی سے جاؤ اور خدا کے لیے ایک تو صاحب کے سامنے کوشش کیا کرو مت آیا کرو۔ اگر کبھی آنا بھی ہو تو زبان بالکل بند رکھنی ہے اور...... کپڑے بھی صاف ستھرے پہنا کرو۔'' وہ تنقیدی نگاہوں سے اس کے میلے کچیلے حلیے کا جائزہ لے کر بولی۔ جمیلہ اس کی بات سنے بغیر ہی نوٹ جھپٹ کر باہر نکل گئی تھی۔

بے انتہا خوب صورت اور وجیہہ ہارون کو شادی کے پانچ سال بعد بھی رانیہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ خوب صورت تھے۔ خوب صورتی پسند کرتے تھے تبھی ان کی

اماں بہت چھان پھٹک کر ان کے ٹکر کی حسین بیوی لے کر آئی تھیں۔ غریب گھر سے تھی تو کیا ہوا، ویسا حسن اور کہیں نظر ... بھی تو نہیں آیا تھا۔ شادی کے چھ ماہ بعد اماں خود تو بیٹی کے پاس سعودی عرب سدھار گئیں مگر اپنے بے حد عجیب و غریب بیٹے کی ذات کی الجھنوں میں رانیہ کو ڈال گئیں جو بلا کا نفیس تھا اور ارد گرد بھی نفاست پسند کرتا تھا۔ میلے کچیلے لوگوں سے اسے سخت چڑ تھی۔ رانیہ تو شادی کے تین سال بعد اس وقت حیران بلکہ پریشان رہ گئی جب اس نے دبے لفظوں میں ہارون سے تذکرہ کر لیا تھا کہ وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کو چیک اپ کرانا چاہتی ہے۔

''کیوں......؟'' وہ حیران تھے۔

''میں ماں بننا چاہتی ہوں ہارون...... مجھے بچے بہت پسند ہیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''مگر مجھے نہیں ہیں اس قدر گند پھیلاتے ہیں کہ نہ تو ماں صاف رہ سکتی ہے نہ ہی گھر۔'' ترنت جواب پر رانیہ ششدر رہ گئی تھی۔

''ہارون یہ تو ایک عورت کا حق ہے۔ پھر بچے سدا چھوٹے ہی تو نہیں رہتے' وہ بڑے بھی تو ہو جاتے ہیں اور بے شک گند پھیلاتے ہیں مگر صفائی سے بھی تو بچوں کو پالا جاتا ہے اور...... اور......'' وہ تیزی سے کہتے' کہتے رکی۔

''آپ بھی تو کبھی بچے رہے ہوں گے۔'' اس نے کہہ ہی دیا بلکہ وہ تو اور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ان کی ایک بات اور اس سرد بات کی ٹھنڈک نے اس میں جھرجھری دوڑا دی تھی۔

''ایسا ہے تو ٹھیک ہے تم مجھے چھوڑ کر اپنا الگ گھر بسا سکتی ہو۔'' اور اس ٹھنڈک میں اس کا وجود برف بنتا چلا گیا۔ آنے والے کئی سال اس کے لیے مزید کٹھن تھے ہارون اس پر بے دریغ پیسہ لٹاتے مگر انہیں غربت سے' گندگی سے، بے ترتیبی سے نفرت تھی۔ رانیہ پر اپنے رشتے داروں سے ملنے پر کبھی پابندی نہیں لگائی تھی مگر کبھی خود اس کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ ملازمین سے تو رویہ انتہائی تحقیر آمیز ہوتا کہ رانیہ بیچاری شرمندہ ہو کر رہ جاتی۔ اور رانیہ کے لیے خصوصی حکم تھا کہ وہ ہمیشہ بنی سنوری اور خوشبوؤں سے مہکتی رہے۔ کچن اور بیڈ روم کے لیے ان کا خاص حکم تھا کہ خانساماں کے سوا کچن میں... کوئی دوسرا ملازم نہیں جائے گا اور بیڈ روم کی صفائی رانیہ خود اپنی نگرانی میں کروائیں گی۔ ایک دنیا رانیہ کے نصیب پر رشک کرتی مگر اسے خود اپنے آپ پر ترس آتا۔

''کیا ہے رانی...... کسی مہارانی کی طرح ایک محل جیسے گھر میں گھومتی رہتی ہو۔ ایسا خوب صورت شوہر، دولت کی ریل پیل...... ایسے میں اگر ایک اولاد نہیں چاہتا تیرا شوہر تو کیا ایسی بات ہے' ہمیں دیکھ چار بچے ہیں۔ اور ایک وقت کی روکھی سوکھی مل جاتی ہے دوسرے وقت کے پھر لالے......'' یہ اس کی سگی بہن کے فرمودات تھے وہ کسی سے کہتی بھی تو کیا...... مگر دل میں ضرور کہتی کہ بھلے ہی میرا شوہر غریب ہوتا' واجبی شکل صورت کا ہوتا مگر دکھ سکھ بانٹنے والا تو ہوتا ناں...... اولاد کا سکھ تو دیتا ناں...... اب تو رشتے دار، دوست احباب اور ملازمین ہارون کی عادات کو جان کر اس کی عادت کے مطابق اس سے برتاؤ کرتے۔ رانیہ کے رشتے دار جو کبھی بڑے شوق سے ان کے گھر آتے تھے انہوں نے آنا ترک کر دیا تھا کہ داماد' بہنوئی کھانے کی میز تو بھر دیتا ہے مگر ماتھے کی شکنوں سے جتا ضرور دیتا کہ اسے ان کا آنا ناگوار گزرا ہے۔ ملازمین کسی روبوٹ کے مانند کام نبٹاتے اور رانیہ وہ تو تھی ہی گوشت پوست کی روبوٹ۔

چھوٹی بہن کی شادی سر پر تھی اور اماں نے اصرار کیا تھا کہ وہ کم از کم ایک ہفتہ تو آ کر رہے ان کے ہاں ...... اور اب صاحب بہادر سے اجازت لینے کا ایک بڑا مرحلہ اسے طے کرنا تھا۔

''ہوں...... ٹھیک ہے چلی جایئے گا۔ ویسے بھی مجھے پندرہ دن کے ٹور پر آؤٹ آف ٹی جانا ہے۔''

کتاب پر نظریں جمائے' جمائے جب انہوں نے آرام سے اجازت دی تو وہ گویا اندر تک جھوم گئی تھی۔ میکے میں رات گزارنا۔ بہن بھائیوں کے ساتھ کچھ وقت ایسے بتانا کہ کچھ پل کو ساری کلفتیں، سارے غم

بھول جائے۔ اس کا ایک ایسا خواب تھا جو چھ سال میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تھا۔ وہ کبھی ہفتے میں ایک بار ہی اماں کے گھر جاتی وہ بھی اسے رات رکنے کی ہرگز اجازت نہیں تھی۔ کتنی ہی دیر بے یقینی سے وہ اس مغرور نقوش سے تنے چہرے کو دیکھتی رہ گئی جس کو آج تک وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ ہارون نے اسے بتایا تھا کہ وہ چلی جائے کیونکہ ان کی شام کی فلائٹ تھی سو وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پہلے آفس اور پھر ٹور کے لیے نکلیں گے۔ اماں کے گھر آکر پہلے دو دن تو اسے اپنے ان تمام رشتوں کو اس مرعوبیت سے نکالنے میں لگے جو ہارون کی دولت اور روپے نے اس کے گرد کھڑی کر رکھی تھی۔ پھر جیسے ہی ان سب کو لگا کہ ہارون کی فطرت کا کوئی رنگ اس پر غالب نہیں آیا وہ سب بھی اس سے کھل مل گئے تھے۔ وہ سب بہن بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں کے لیے گفٹس لے کر آئی تھی۔ اور رات کو جب اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے رقم کا وہ لفافہ نکالنا چاہا جو اس نے بہن کی شادی کے تحفہ کی غرض سے دینا تھا وہ نہ ملا۔ بہت سوچنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے الماری سے وہ رقم والا لفافہ نکالنے کا سوچا تو تھا مگر نکالا نہیں تھا۔ بہت دیر موبائل بھی ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہی مگر وہ ہارون کو کہے بھی تو کیا کہے... وہ بھی شہر سے باہر تھا...... کیوں نہ میں کل خود جا کر رقم لے کر آجاؤں اور ایک نظر گھر کو بھی دیکھ آؤں گی۔ سالہا سال سے ملازم ہیں اس گھر کو سنبھالنے والے مگر مکینوں جیسا خیال کوئی نہیں رکھتا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو کر سوگئی تھی۔ اگلے دن وہ اماں کو کسی ضروری کام کا کہہ کر باہر نکل آئی اور مین روڈ سے ٹیکسی کر کے اسے پتا سمجھایا اور ہارون کے بارے میں سوچنے لگی کہ کیا تھا اگر ایک دفعہ ہی اس کے ساتھ آجاتے اس کے ماں، باپ کو ایک ڈھارس سی ہوجاتی۔ نعیم بھائی (بہنوئی) نے کیسے سارا کام سنبھال رکھا تھا اور اماں انہیں دعائیں دیتے نہ تھکتی تھیں۔ ٹیکسی ایک جھٹکے سے بتائے گئے پتے پر رکی تو وہ بھی اپنے خیالوں سے باہر آئی تھی۔ واپسی کا سفر ہمیشہ اور ہر انسان کے لیے ہی تھکا دینے والا ہوتا ہے یا صرف اس کے لیے تھا۔ روح و جسم میں اترتی اور اپنے پنجے گاڑتی تھکاوٹ کو محسوس کر کے اس نے سوچا تھا۔ ٹیکسی اب بھی وہیں تھیں وہ جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آئی تھی۔ جبھی گرنے کے انداز میں واپس آبیٹھی تھی۔ کچھ لمحے پہلے کے مناظر دماغ کی اسکرین پر کیا روشن ہوئے آنکھوں نے بھی دھوکا دیا اور اندر جے غبار کو دھکا دے کر باہر کا راستہ دکھایا۔ گیٹ پر چوکیدار کو نہ پا کر وہ مالکانہ حقوق سے ہی چوکیدار کی بے پروائی پر اسے ڈانٹنے کا سوچتی اندر آئی تھی۔ ہال میں آکر کچن میں کچھ کھٹر پٹر سنائی دی مگر اس کا دماغ چونکہ رقم کی طرف تھا سو پہلے اس نے بیڈروم کا دروازہ ہی کھولا تھا۔ اور وہاں وہی تھا اس کا نفیس شوہر جسے اس کا خاندان نفاست پسند کے نام سے بلاتا تھا اور اسے چھیڑتا تھا۔ کمرے میں بھی کسی ملازم کی آمد نہ پسند کرنے والا نفاست پسند اس وقت گھر کی ملازمہ کے ساتھ تھا۔ جس صوفے پر کبھی ایک بار وہ غلطی سے بیٹھی تھی اس پر کبھی شعوری طور پر نہ بیٹھنے والا ہارون اس گندی سندی جمیلہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹے ہوئے تھا جس کے بارے میں اس کا ارشاد تھا کہ "اسے کہو یہ کھانے کے وقت میرے سامنے نہ ہی آیا کرے۔ اس کی ندیدی نظریں، غلیظ حلیہ مجھے برداشت نہیں ہوتا۔" لباس و جسم اور گھر کی نفاست میں حد سے گزر جانے والے اس شخص سے کوئی پوچھتا کہ کاش ذرہ برابر ہی نفاست اس کے اندر ہوتی تو آج اس کی نصف بہتر کو مار ڈالنے والا دکھ برداشت نہ کرنا پڑتا۔ نفس کو راضی کرتے دو نفوس اس کی آمد سے بے خبر رہے تھے۔ رانیہ نے بے آواز جیسے کمرے کا دروازہ کھولا تھا ویسے ہی بند بھی کر دیا تھا کہ کچھ باتوں کا بھرم ہی رہے تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اپنا بھی دوسرے کا بھی۔ وہ اپنے شوہر کی نفسیات کو آج تک نہیں سمجھ پائی تھی اور آج اس کی ذات کی جو گرہ اس کے ہاتھ آئی تھی اس کی گرہ سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ پتا نہیں کھل سکنے والی یا باقی عادات کی طرح مبہم اسرار میں قید......





انکشاف

شیریں حیدر

"نہیں بھئی......" انہوں نے سر ہلا کر انکار کیا۔ "مجھے یہ لوگ پسند نہیں آئے۔"

"اچھے خاصے لوگ تو تھے ڈاکٹر صاحب!" ان کی بیگم رخسانہ نے کہا۔ "اکلوتا بیٹا ہے ان کا، نہ کوئی نند دیور کا ٹنٹنا نہ کوئی مسئلہ...... سب کچھ جو ان کا ہے، اس کی بلا شرکت غیرے ہماری بیٹی مالک ہوگی ایک دن۔ جانے آپ چاہتے کیا ہیں؟ اس سے پچھلا رشتہ اس لیے ٹھکرا دیا کہ لڑکے کے باپ نے آپ کو اپنے دانتوں

کا کوئی مسئلہ بتا دیا تھا۔ آپ کو لگا کہ وہ لوگ لالچی اور مفت خورے ہیں اور اس لیے آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے خاندان بھر کا دانتوں کا علاج مفت کروا سکیں۔''

''تو اس میں غلط کیا تھا...... کبھی سنا ایسا کہ کوئی کسی کے ہاں ان کی بیٹی کا رشتہ دیکھنے جائے اور لڑکی کے باپ سے وہیں بیٹھے بیٹھے مفت میں اپنے علاج کروانا شروع کر دے...... مجھ سے اپائنٹمنٹ لے لیتے اور کلینک پر آ جاتے مگر نہیں، ڈاکٹر کی فیس بچ جائے تو اور کیا!''

''کمال کرتے ہیں کاشف...... ارے بھئی جن سے رشتے داری ہو جائے، ان سے آپ فیسیں نہ بھی لیں تو کیا حرج ہے؟''

''نہ لیتا میں فیس...... مگر یہ سب تو اس وقت ہوتا ناں جب ہمارے اور ان کے بیچ رشتے داری بن جاتی، نہ کہ وہ مجھ سے علاج کروانا چاہ رہے تھے اسی پھیرے میں، جس میں وہ رشتہ دیکھنے آئے تھے۔''

''اتنی سی بات سے کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا کاشف جو آپ کو اُن کی بہت ساری اچھائیاں نظر نہیں آ رہیں اور اس ایک بات کو لے کر بیٹھ گئے ہیں آپ؟''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے...... اتنی سی بات ان کے مستقبل کے رویّے کو ظاہر کرتی ہے۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

''آپ بہت جلد انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔'' رخسانہ بیگم نے بھی غصے سے کہا۔

''جو بھی ہے رخسانہ مگر مجھے یہ رشتہ ہانیہ کے لیے قطعی مناسب نہیں لگا......'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔

''وہ لوگ ہمیں اپنے گھر آنے کا کہہ کر گئے ہیں، کم از کم ایک بار ان کے گھر جا کر دیکھیں تو سہی، ممکن ہے جو کچھ آپ کو ٹھیک نہیں لگ رہا، وہ ان کا گھر بار دیکھ کر ٹھیک لگنے لگے۔'' رخسانہ بیگم اصرار کرتی رہ گئیں مگر ڈاکٹر کاشف کی نہ، ہاں میں نہ بدلی۔

ڈاکٹر کاشف جتنے مشہور دانتوں کے ڈاکٹر تھے اتنے ہی وہ اپنی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے مریض جتنی بھی تکلیف میں آتے، ڈاکٹر کاشف ان سے مرض کے علاوہ بھی ایسی گپ شپ کرتے کہ مریض اپنی آدھی تکلیف بھول جاتا، ان کو ایک بار دکھا لینے والا مریض عمر بھر کسی اور ڈاکٹر کو دانت دکھانے نہ جاتا تھا اور نہ صرف خود ان سے متاثر ہوتا بلکہ دوسروں کو بھی ان کی مسیحائی اور خوش مزاجی کے ایسے قصے سناتا کہ لوگ انہی کے پاس اپنی دانتوں کی تکالیف کے لیے آتے تھے۔ انہوں نے دانتوں کی کاسمیٹکس سرجری میں اسپیشلائزیشن کی تھی اور اس میں ان کا نہ صرف شہر میں بلکہ پورے ملک میں نام تھا۔

☆☆☆

''میں نہیں سمجھ پائی کاشف کہ آپ کو اس رشتے میں کیا مسئلہ نظر آیا ہے، اچھے خاصے لوگ تھے اور مختصر سا گھرانا......'' رخسانہ بیگم نے رات کو ان سے بحث پھر سے شروع کر دی۔

''تم چیزوں کی خوب صورتی کو اور طرح سے دیکھتی ہو رخسانہ......'' انہوں نے رسان سے کہا۔ ''میرا انہیں دیکھنے کا انداز اور ہے، تم اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتیں۔''

''میں بھی تو جانوں آپ کا نقطۂ نظر؟'' انہوں نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔

''تم نے اس لڑکے کے دانتوں پر غور نہیں کیا ناں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''جب وہ مسکراتا ہے تو اس کے سامنے والے چاروں دانتوں کے اوپر کے مسوڑھوں کا حصہ سیاہ نظر آتا ہے اور اس کے بعد کے دو دانتوں میں اتنا وقفہ ہے کہ وہ دیکھنے میں برا لگتا ہے، سامنے کے دو دانتوں میں وقفہ تو عموماً دیکھنے میں آتا ہے مگر چار دانتوں کے بعد وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ کھل کر ہنسے گا تو اس کے باقی دانتوں کے عیب بھی نظر آنا شروع ہو جائیں گے......''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی کاشف......'' رخسانہ بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''اس چھوٹی سی بات کو لے کر آپ نے اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرا دیا ہے کہ

لڑکے کے دانت...... آپ کو تو لڑکے کی شخصیت اور اس کے خاندان کو دیکھنا چاہیے، وہ کوئی آپ کے پاس علاج کے لیے آیا تھا کہ آپ اس کے دانتوں کے امراض کی تشخیص کریں، میرا خیال ہے کہ میں اپنے گھر کے باہر بورڈ لگا دیتی ہوں کہ رشتہ دیکھنے کے لیے آنے والوں کا ہنسنا منع ہے......''

''تمہارے لیے یہ چھوٹی سی بات ہوگی، میرے لیے نہیں...... کسی کی شخصیت اس کی ظاہری وضع قطع کے بغیر کس طرح دیکھی جاسکتی ہے؟'' ڈاکٹر کاشف نے حتمی انداز میں کہا۔ ''میں کسی ایسے شخص کو اپنی بیٹی دے دوں جو عمر بھر جب بھی میرے سامنے آئے، مسکرائے یا ہنسے تو مجھے اپنی بے وقوفی پر دکھ ہو کہ میں نے بے سوچے سمجھے ایک ایسے لڑکے سے اپنی اکلوتی بیٹی بیاہ دی جس کے ماں باپ نے اس کے دانتوں کے عیب بھی وقت پر ٹھیک نہیں کروائے!''

''دانت پورے تو ہیں ناں اس کے، دانتوں کے عیب کوئی بڑی بات نہیں کاشف......'' رخسانہ نے ان کا مسئلہ سن کر رسان سے کہا۔ ''یہ معمولی خرابیاں انسان کے کردار اور شخصیت کی خرابیوں سے کہیں بہتر ہیں، انہیں تو عمر کے کسی حصے میں بھی درست کیا جاسکتا ہے......''

''ہرگز نہیں رخسانہ......'' وہ تقریباً دہاڑے۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں اگلے تین سال تک اس کے دانت ٹھیک کرتا رہوں اور پھر اس سے اپنی بیٹی کا بیاہ کروں؟ ہاہ! افسوس ہوتا ہے مجھے تمہاری کم عقلی پر......''

''شادی تو ہمیں اب جلد ہی کر دینی چاہیے، پہلے ہی وہ عمر کی پچیس بہاریں دیکھ چکی ہے، اس سے دیر کیا کی جائے، اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا سو وہ پورا ہوگیا، اس کی ہاؤس جاب بھی مکمل ہو رہی ہے۔''

''اس کے لیے رشتے ڈھونڈنے کا کام تمہیں دو سال پہلے شروع کرنا چاہیے تھا بیگم!'' انہوں نے طنز سے کہا۔ ''اب جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ کرنے کے بجائے ہر رشتہ چھان پھٹک کر دیکھنا ہوگا۔''

''اس کی پڑھائی کے دوران کس طرح اسے ان رشتوں کے جھنجٹ میں ڈال دیتی؟'' رخسانہ بیگم بھی تلملا گئیں۔ ''اس وقت آپ باپ بیٹی کہاں میری بات سنتے تھے...... اسی سب میں آپ لوگوں نے اس کی عمر پچیس سال کر دی ہے، اس کی اسکول کالج کی سہیلیاں دو، دو بچے گودوں میں لیے گھر گرہستی سنبھالتی ہیں، اس نے کبھی باورچی خانے کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' موقع ملا تو انہوں نے دل کے سارے پھپھولے پھوڑ دیے۔

''سونے دو گی اب تم مجھے یا نہیں؟'' انہوں نے کہہ کر کروٹ لی اور رخسانہ بیگم کے سارے سوال بے جواب رہ گئے۔

☆☆☆

پھر معلوم ہی نہ ہوا کہ کہاں سے اور کس طرح ڈاکٹر ساحر کا رشتہ آیا، کس طرح اسے قبولیت کی سند بخشنے میں دو دن نہ لگے کہ ساحر صرف نام کا ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے پورا ساحر تھا، وہ بولتا تو اس کی باتوں کے سحر میں سننے والے کھو جاتے۔ بیرون ملک پیدا ہونا اور امریکا کے بہترین اداروں سے تعلیم حاصل کرنا...... اس سے بڑھ کر کوئی اور کیا چاہتا اور پھر ہانیہ بھی ایک دو ملاقاتوں میں اس کی گرویدہ ہوگئی۔ ڈاکٹر کاشف کو بھی اس کے موتیوں جیسے لڑی میں پروئے ہوئے دانتوں پر کوئی اعتراض نہ تھا، گھرانا بھی اچھا تھا اور لڑکے کا مختصر خاندان...... رخسانہ بیگم کو یہ سب کچھ بھایا تھا کہ ان کی بیٹی بھرے پُرے خاندان میں نباہ کرنے والی نہ تھی۔

رشتہ چٹکیوں میں طے ہوا تھا تو چٹ منگنی، پٹ بیاہ بھی ہوگیا۔ ہانیہ خوش تھی تو ڈاکٹر کاشف اور رخسانہ بیگم کو بھی اطمینان تھا۔ بیٹی چند دنوں میں ان سے ہزاروں میل دور جانے والی تھی مگر دلوں کو اطمینان تھا کہ وہ جہاں بھی ہوگی، خوش ہوگی اور وہ خوش ہوگی تو ماں، باپ کے دل بھی خوش ہوں گے اور اس کے دور جانے کے باوجود اتنی اداسی نہ ہوگی۔ یوں بھی اب تو سوشل میڈیا نے دنیا کو واقعی ایک گاؤں جیسا کر دیا ہے جہاں فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے...... آپ اپنے پیاروں سے دن بھر رابطے میں رہ سکتے ہیں اور وہ بھی

مفا مفت۔ ہانیہ کو جا کر اپنے امتحانات دینا تھے اور وہاں کی یونیورسٹی سے اسپیشلائز بھی کرنا تھا۔ اپنی زندگی میں مصروف ہو جاتی تو اسے ماں باپ کی یاد بھی تب آتا تھی جب وہ فارغ ہوتی، پردیس کی زندگی کسی کو اتنا فارغ کب ہونے دیتی ہے بھلا!

ہانیہ نے وہاں جا کر پہلی بار ماں باپ سے اسکائپ پر بات کی۔ اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر اس نے گھوم پھر کر اپنا پورا گھر دکھایا، ماں باپ تو امریکا میں اپنے داماد کا اتنا عالیشان گھر دیکھ کر فخر سے پھولے نہ سمائے تھے...... اتنا اچھا داماد اور اس پر امارت کا تڑکا، اپنے احباب میں وہ سب کو بتاتے کہ ان کے داماد کے امریکا میں کیا انداز تھے اور کتنا بڑا گھر تھا، جس کے لان میں سوئمنگ پول بھی تھا اور ٹینس کورٹ بھی...... ہانیہ اپنی زندگی میں یوں مصروف ہوئی کہ اس کے دل میں کبھی کبھار ہی وطن کی یاد آتی، ساحر نے اسے اپنے سحر میں جکڑا یا امریکا کی تیز رفتار زندگی میں دوڑتے بھاگتے وہ مڑ کر دیکھنا بھول گئی۔

تین سال تک وہ ایسی مصروف رہی کہ اس کے پاس پاکستان جانے کا وقت بھی نہ نکلا۔ اپنے علیٰحدہ گھر کی آزادی تھی اور ساحر کے گھر میں ملازمین تھے تو اسے کبھی کوئی گھریلو کام بھی نہ کرنا پڑا۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ اب انہیں دو سے تین ہو جانا چاہیے، اللہ نے جلد ہی ان کی سنی اور اس نے فون کر کے اپنی ماں کو سب سے پہلے خوش خبری سنائی......

”بس اب آپ لوگ یہاں آنے کی تیاری کریں، اپنے نواسے یا نواسی کا یہاں آ کر استقبال کریں۔“

ڈاکٹر کاشف کے لیے اپنے کام سے اور رخسانہ بیگم کے لیے اپنے گھر سے وقت نکالنا، بقول ان دونوں کے ناممکنات میں سے تھا مگر ہانیہ اور ساحر کے اصرار کے سامنے ان کی زیادہ نہ چلی، یوں بھی جوں جوں وقت گزرا اور بچے کی ولادت کا وقت قریب آنے لگا تو انہیں احساس ہوا کہ ایسے مشکل وقت میں ہانیہ کو ان دونوں کی ضرورت ہوگی۔ ہانیہ کی ساس ان سے دور رہتی تھیں اور وہ بھی اپنا گھر چھوڑ کر نہ آ سکتی تھیں، اچانک ہی پروگرام بنا اور دنوں میں ویزے کی کارروائی پوری کی گئی...... وہ دن بھی آ گیا جب دونوں میاں بیوی اپنے نواسے کے لیے بے شمار سامان ہمراہ لیے عازمِ امریکا ہوئے۔

☆☆☆

’حاشر‘ کی پیدائش میں ابھی چند ہفتے تھے اس لیے ساحر نے اس وقت کو استعمال کیا اپنے ساس، سسر کو سیر سپاٹے کروانے میں...... ہانیہ بھی ان کے ساتھ ہوتی، سیر و تفریح کے علاوہ رخسانہ بیگم کو خریداری کے مواقع بھی میسر آئے تو ’حاشر‘ کی مزید خریداری کر لی گئی۔ ’حاشر‘ اس آنے والے بچے کا نام تھا جس کے نام کے بغیر اس کے بارے میں بات کرنا منع تھا، کوئی بات اس طرح نہیں کی جاتی تھی کہ آنے والے بچے کی یہ بات بلکہ ساحر اور ہانیہ کے درمیان گفتگو سن کر کوئی انجان شخص یوں محسوس کرتا جیسے کہ حاشر اس گھر میں رہنے والے بچے کا نام ہے...... سائنس کی ترقی کے باعث صرف بچے کی جنس ہی نہیں، وہ اس کے قد، رنگت، اندازاً وزن، آنکھوں اور بالوں کے رنگ تک سے واقف تھے اور انہیں علم تھا کہ بچے کو خدانخواستہ کوئی بیماری نہیں ہے...... البتہ ہانیہ کے خون کا گروپ ایسا تھا کہ جس کے باعث پیدائش کے دوران کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی تھی، اسی لیے ہانیہ نے اصرار کر کے ماں اور باپ دونوں کو بلوایا تھا۔

دنوں کا شمار پورا ہو چکا تھا، کسی بھی وقت اسپتال جانا پڑ سکتا تھا، رخسانہ بیگم نے بیٹی کا سارا سامان چیک کیا جو حاشر کے لیے لیا گیا تھا اور وہ بیگ بھی جانچا جو بیٹی نے اسپتال کے لیے تیار کیا تھا، اس کے مندرجات کی فہرست بھی سب سے اوپر موجود تھی۔ اپنی حیرت کو انہوں نے زبان دی تو ہانیہ نے بتایا کہ اس نے یہ سب کچھ انٹرنیٹ سے دیکھ کر تیار کیا تھا۔

”انٹرنیٹ نے تو ماؤں کے کردار کو بے معنی کر دیا ہے بچوں کی زندگی میں...... جن باتوں پر وہ لمحہ بہ لمحہ

اپنی ماؤں سے مشورے کرتے تھے اب انہیں ''گوگل'' کر لیتے ہیں۔'' رخسانہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

ڈاکٹر ساحر نے اپنے کام سے کچھ دن کی چھٹی لی تھی، جب اس نے کام پر واپس جانا شروع کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ ان کا داماد کتنا معروف تھا اور امریکا کے چند گنے چنے اور معروف دانتوں کے کاسمیٹک سرجنوں میں سے ایک تھا۔ اس بات پر وہ جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ گھر میں رات کے کھانے کے بعد طویل نشستیں چلتیں، وہ بتاتا کہ کس، کس نوعیت کے ناممکن آپریشن اس نے کیے تھے اور کیسے، کیسے لوگوں کے چہروں اور مسکراہٹوں کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے دل میں دانتوں کا کاسمیٹک سرجن بننے کا خیال اپنے ساتھ ہونے والے ایک حادثے کے باعث آیا تھا، اس کی تفصیل اس نے گول کر دی تھی۔ ساحر کی دی گئی معلومات ڈاکٹر کاشف کے لیے کافی گراں قدر تھیں، عمر میں ان سے کافی کم مگر اس کے کام کا تجربہ ان سے بہت بہتر تھا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر کاشف کو بہت پاپڑ بیلنا پڑتے کیونکہ پاکستان میں وہ تمام ٹیکنیک ناموجود تھیں جو ڈاکٹر ساحر اور اس جیسے لوگ وہاں استعمال کر رہے تھے۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا، ہانیہ رات باتیں کرتے، کرتے ماں کے پاس ہی سو گئی تھی تو ڈاکٹر کاشف اپنا تکیہ اٹھا کر لاؤنج میں آ گئے تھے۔ انہوں نے ٹی وی آن کر کے آواز ہلکی کی اور کوئی انگریزی معلوماتی فلم دیکھنے لگے، وہیں ان کی آنکھ لگ گئی۔ انہیں لگا کہ کسی نے انہیں پکارا تھا، انہوں نے مندی آنکھوں سے دیکھا، چند لمحے تو انہیں سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ تھے کہاں۔ پھر آنکھیں ماحول سے مانوس ہوئیں اور وہ اٹھ بیٹھے، رخسانہ بیگم انہیں پکار رہی تھیں۔ وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف لپکے جہاں ہانیہ درد کے مارے ماں کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی اور وہ اسے سنبھال رہی تھیں...... وہ فوراً بھاگے اور ساحر کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑا ڈالا، اندر سے آوازیں آئیں اور چند لمحوں میں دروازہ کھل گیا مگر دروازہ کھولنے والا ساحر نہیں، کوئی اور تھا......

''کیا ہوا انکل؟'' اس کی آواز تو ساحر جیسی تھی اور طرز تخاطب بھی، انہوں نے حیران ہو کر سوچا۔

''وہ...... وہ...... ہانیہ!'' الفاظ ان کے منہ میں ہی تھے کہ وہ بھاگ کر اس کمرے میں گیا جہاں ہانیہ تھی، واپس لوٹا تو وہ فون پر بات کر رہا تھا، اسپتال والوں کو فوراً ایمبولینس بھجوانے کو کہہ رہا تھا، ایڈریس بتا رہا تھا، فون بند کر کے اس نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا جو حیرت سے ابھی تک منہ بھی نہ بند کر سکے تھے۔

''آپ کو بھی اگر ساتھ چلنا ہے تو تیار ہو جائیں انکل...... پانچ منٹ میں ایمبولینس پہنچ جائے گی۔''

کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا، ڈاکٹر کاشف نے کمرے کا رخ کیا تا کہ تیار ہو جائیں۔ پورے پانچ منٹ میں ایمبولینس موجود تھی۔ رخسانہ بیگم بھی تیار تھیں، ایمبولینس کے تعاقب میں ساحر گاڑی میں ان دونوں کو ساتھ لیے جا رہا تھا۔ رخسانہ بیگم منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہی تھیں، ڈاکٹر کاشف کو کچھ یاد نہ تھا کہ ارد گرد کیا ہو رہا تھا...... وہ تو مسلسل ساحر کو گھورے جا رہے تھے جو خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا، ہاں وہ ان سے بات کرتے ہوئے کترا رہا تھا مگر اب اس کے منہ میں پورے دانت تھے، وہ منہ جو اس وقت دانتوں سے بالکل خالی تھا جس وقت ڈاکٹر کاشف نے اسے دروازہ دھڑ دھڑا کر جگایا تھا......

ڈاکٹر کاشف کو سمجھ میں آ گیا تھا کہ کس نوعیت کے حادثے کے باعث اس نے دانتوں کا کاسمیٹک سرجن بننے کا فیصلہ کیا ہوگا اور یہ کہ امریکا جیسے ملک میں ٹیکنالوجی اتنی آگے ہے کہ ڈاکٹر کاشف جیسا ماہر دانتوں کا ڈاکٹر بھی دھوکا کھا گیا تھا...... دانتوں کی ساخت اور نقائص کے باعث کئی اچھے رشتوں کو رد کرنے والے ڈاکٹر کاشف اپنی بیوی تو کیا، خود سے بھی نظر نہیں ملا پا رہے تھے۔



ارلز کورٹ، لندن

چھبیس دسمبر 1987ء

وہ پچھلے کچھ عرصے سے اپنے باپ سے اس مسئلے پر بات کرنے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن اسے اس کے ردِعمل میں اٹھنے والے طوفان کا اندازہ نہیں تھا۔

وہ کرسمس کی چھٹیوں پر گھر آئی تھی۔ اور اس کا باپ، اس کی بہن کے اقوامِ متحدہ کے ایک مشن کے ساتھ رضا کار ڈاکٹر کے طور پر جنگ زدہ علاقے

ناولٹ

تیسرا حصہ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی کھرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو۔۔ مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔


Downloaded From
Paksociety.com
Reading
Section

میں روانگی کی خبر پر اداس تھا۔ ایما، غزہ جارہی تھی۔
پتا نہیں ایما کو ایسے خطرناک کام کرنے کا کیوں شوق تھا...... اور پتا نہیں اس کے بعد بھی وہ ایما اور ڈیڈی یوں اس طرح ایک جگہ اکٹھے ہوسکیں گے یا نہیں۔
اپنے طور پر تو...... اس نے دن اور وقت بھی بہت سوچ کر منتخب کیا تھا۔ ڈیڈی کھانے کی میز پر ایما کا اسپیشل ڈنر لگنے کے انتظار میں عربیک بریڈ کے ٹکڑے توڑ کر خاص اپنے لیے تیار کیے ہوئے حمس میں لگا، لگا کر کھارہے تھے۔ ایما اوون کا دروازہ کھولے روسٹ میں چھری چھو کر گوشت کے اندر تک پک جانے کا یقین کررہی تھی...... کھلنے والے اوون سے تقریباً تیار ہوجانے والے لیمب روسٹ کی خوشبو، لپٹیں بن کر اٹھ رہی تھی...... ایما اپنے خوابوں کے مشن پر روانگی سے پہلے اپنی ماں سے سیکھے امورِ خانہ داری کے تمام گُر آزمالینا چاہتی تھی۔ وہ جتنے دن یہاں تھی کم ازکم اتنے دن ان کے باپ کو اس کے ہاتھ کا پکا تازہ کھانے کو مل سکتا تھا۔ بعد میں تو وہ بازار کے تیار کھانے ہی گرم کر کے کھایا کریں گے۔
حالانکہ ساری عمر وہ دونوں اپنے باپ کے ہاتھ کا پکا کھا کر ہی بڑی ہوئی تھیں۔ ان کی ماں اینابیلا کو پکانے کا شوق تھا...... لیکن اینابیلا نے دیکھا تھا ان کا ریاضی دان شوہر جوزف گیبرئیل اکثر اپنے الجھے ہوئے مضمون کی پیچیدگیاں لبنانی کھانوں کی ہوشربا مہک میں سہولت سے حل کرپاتا ہے۔ کوکنگ اس کی واحد راہِ فرار تھی۔ یعنی جہاں وہ تازہ دم ہوجاتا۔
چار سال ہوئے اینابیلا ایک رات سو کر دوبارہ نہیں اٹھ سکیں۔
اب جوزف گیبرئیل کو یقین تھا۔ ان کی زندگی کی کل کمائی ان کی بیٹیاں ہی ہیں۔ اینابیلا کے بعد وہ دونوں باپ کے اور بھی قریب آگئی تھیں۔ وہ ان کے باپ کم اور دوست زیادہ تھے۔ اور انہیں بھی اپنی دونوں بیٹیوں پر فخر تھا۔
ایما نے کنگز کالج لندن سے ایمرجنسی میڈیسن میں ریزیڈنسی ختم کرلی تھی لیکن اسے شروع ہی سے ریڈ کراس اور ڈاکٹرز وداؤٹ بارڈرز جیسی تنظیموں کے اس کام نے متاثر کیا تھا جو وہ افریقا اور تنازعات کا شکار ملکوں میں لوگوں کی مدد کے لیے کرتی تھیں۔ ریزیڈنسی ختم ہونے سے کچھ ماہ پہلے عالمی ادارۂ صحت کے ایک رضا کار مشن کے لیے trauma physicians کی ضرورت کے اشتہار نے اسے اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع دلوادیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، وہ کیا کررہی ہے۔
ایما کے غزہ جانے کا سن کر جوزف گیبرئیل کا دل ڈوب گیا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹی اپنی اصلی مٹی کی طرف کھنچ رہی ہے۔ وہ زمین جسے جوزف گیبرئیل نے کبھی اپنا نہیں سمجھا تھا، اس کے بارے میں خود فیصلے کرنا ان کی بیٹی کا حق ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی بیٹی اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب نہیں کرے گی۔
جوزف گیبرئیل کے آبا کا اصلی وطن لبنان تھا اور اصلی عقیدہ عیسائیت کی میرونائٹ کیتھولک شاخ۔ وہ ایک مزدور پیشہ لبنانی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ لبنان میں انیس سو اٹھاون کی خانہ جنگی سے کئی سال پہلے ہی جوزف گیبرئیل کے والدین نے اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح اپنے ذہین اور غیر معمولی بیٹے کے مستقبل کے لیے ترکِ وطن کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ نقل مکانی شام سے مصر اور پھر سوڈان سے ہوتے ہوئے برطانیہ جا کر ختم ہوئی تھی۔ جوزف گیبرئیل کا بچپن اور لڑکپن بیروت، دمشق، قاہرہ اور اسکندریہ کے تعلیمی اداروں میں گزرا تھا۔ انہوں نے اپنے ماں، باپ کو اپنے اچھے مستقبل کے لیے سخت جدوجہد کرتے دیکھا تھا۔ ریاضی کے مضمون میں ان کی غیر معمولی استعداد انہیں برطانیہ کے بہترین تعلیمی اداروں تک لے گئی تھی۔ جہاں پیچیدہ پرابلمز کے حل ڈھونڈتے وہ طالب علم سے استاد بنے اور اب تحقیق کے کام میں عزت کمارہے تھے۔
اپنے شعبے کے کئی ماہرین کی طرح وہ کوئی ایک

مذہب پرست انسان ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن اچھے اور برے، صحیح اور غلط کی تمیز کرنا انہوں نے اپنے لبنانی والدین سے سیکھا تھا۔ وہ خاندانی اقدار پر یقین رکھتے تھے۔ مسلمانوں سے سماجی تعلقات ان کے بچپن کی خوشگوار یادوں کا حصہ تھے۔ اور یہی کشش ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی محسوس ہوتی تھی۔ جن کے کئی اچھے دوست مسلمان تھے اور جن سے وہ اپنی بیوی اینا بیلا کی زندگی میں اپنے گھر میں منعقد ہونے والی کئی چھوٹی موٹی تقاریب میں ملاقات کر چکے تھے۔ جوزف کو یقین تھا کہ ایما میں صحیح راستے کی پہچان کی صلاحیت موجود ہے۔

''ڈیڈی، میرے پاس بھی آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' یہ سبرینہ تھی، ان کی چھوٹی بیٹی...... اس نے اپنی بڑی بہن کی خوشی پر راضی ہونے والے باپ کا دل بہلانے کو یونہی اپنے تھیلے سے کچھ برآمد کیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی تھی کہ ابھی، ابھی اس کے باپ کی مہربان آنکھوں کی روشنی ایک دم بجھ گئی ہے اور لیموں کے تراشوں اور سلاد کے پتوں پر خوشبودار لیمب روسٹ سے سجی ڈش پیش کرتے ایما کے ہاتھ میز سے ہٹنا ہی بھول گئے ہیں۔

یہ ردِعمل اس کی توقع کے برعکس تھا۔

اس مختصر سی ڈائننگ ٹیبل کے گرد اتنی خاموشی چھا گئی تھی کہ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

''کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟'' جوزف گیبرئیل کی کمزور آواز نے اسے سخت صدمے سے دوچار کر دیا۔ وہ کس سے مخاطب تھے...... شاید کسی سے بھی نہیں۔ اس نے گھبرا کر ان کے چہرے کو غور سے دیکھا اور دنگ رہ گئی۔

انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی پیٹھ نہیں ٹھونکی...... وہ کتنی باکمال بیٹیوں کے باپ تھے۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے ایما کے محنت سے بنائے روسٹ کو چھری کانٹے سے کرید رہے تھے۔ انہیں بھوک نہیں رہی تھی پھر اس نے انتہائی صدمے کی کیفیت میں اپنے باپ کو بھنچا بھنچا ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر میز سے اٹھتے اور ڈائننگ روم سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ وہ اچانک ہی بوڑھے لگنے لگے تھے۔

ایما کسی مستعد میزبان کی طرح صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ آج اس کی ساری محنت بیکار...... گئی تھی۔ وہ دم بخود سی میز کے کنارے اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

''کیا اس نے کوئی غلطی کر دی ہے؟''

رات گئے جب وہ میز سے اٹھی تو اتنی مایوس نہیں تھی۔

''وہ انہیں منا لے گی، انہوں نے آج تک ان کو کسی بات سے منع نہیں کیا۔''

لیکن ڈیڈی کے مان جانے کے کوئی ارادے نہیں تھے۔

وہ جو دنیا میں ہونے والے ہر واقعے کی کوئی سائنسی توجیح، اعداد کی جمع تفریق سے نکال سکتے تھے۔ اس مسئلے کے کسی بھی پہلو کو اس کی آنکھ سے دیکھنے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے اور وہ لندن یونیورسٹی کے رائل ہالووے اسکول آف میتھ میٹکس کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ایک باپ بھی تھے۔ اور اس کی خودسر آنکھوں میں ابھرتے چیلنج کے نتائج بہت دور تک دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹیوں کی انفرادی آزادی کے حق میں تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ اس فیصلے کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ سارے دن کی بحث کے بعد وہ اس کے پاس سے اٹھے تو اور بھی دلگرفتہ اور متفکر تھے۔

اسے ان کی ناراضی بالکل ناجائز لگتی، بے جا ضد...... وہ انہیں کیسے سمجھاتی وہ اب بڑی ہو گئی ہے۔ سارا ایڈنبرا اس کے خیالات کی قدر کرتا ہے اور وہ جو تمام زندگی دوسروں کو ان کی مرضی کے خلاف چلانے سے منع کرتے آئے ہیں جو بنیادی انسانی حقوق اور انسانی مطابقت کے فلسفے کے علم بردار ہیں۔ وہ کیوں اس کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے؟

وہ اتنی ضدی سی ہو رہی تھی کہ ایما کو اس سے بات کرتے خوف آ رہا تھا۔

ان دنوں پکاڈلی سرکس میں ہولناک آتش زدگی ہوئی تھی، ایما سولہ، سولہ گھنٹے اسپتال میں لگا کر آتی پھر بھی اس کے پاس بیٹھ کر اسے سمجھانا نہیں بھولتی تھی۔

''تم اسے کچھ وقت تو دو...... اسے آزما تو لو...... دیکھو کوئی جلد بازی مت کرنا۔'' کبھی وہ کہتی۔

''تم ان میں سے نہیں ہو سبرینہ...... تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں...... ہوسکتا ہے تمہیں مسلمان ہونا پڑے۔''

کبھی وہ اسے جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی۔

''میں اگلے کچھ مہینوں میں چلی جاؤں گی تو ڈیڈی کتنے اکیلے ہوجائیں گے، تم قریب رہو گی تو... کم از کم انہیں تسلی تو رہے گی۔'' ایما نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا تھا اور اب بھتے سے اکھڑتا دیکھ رہی تھی۔

''کیوں، میں ہی کیوں سوچوں، تم کیوں نہ سوچو...... تم نہیں جارہیں انہیں چھوڑ کر؟ تم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ تم زندہ واپس آؤ گی یا نہیں...... تمہیں تو نہیں روکا انہوں نے۔'' اس کے انداز میں کس قدر بدگمانی تھی۔ ایما کچھ دیر صدمے کی زیادتی سے کچھ بول نہیں سکی پھر کہنے لگی۔

''اچھا تم اپنے مستقبل کا سوچو، تمہارا ریسرچ کا خواب، تمہارا پی ایچ ڈی کا خواب، تمہیں دوبارہ ایسا موقع نہیں ملے گا۔''

''نہیں چاہیے مجھے ایسا موقع...... مجھے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' اس نے ایما کو ہکا بکا کردیا تھا۔

''شاید واقعی ڈیڈی کے انکار نے اسے اتنا ہرٹ کردیا ہے۔'' نئے سال کا پہلا دن فیصلے کا دن تھا۔ اتنے دنوں سے گھر میں جو تناؤ جاری تھا ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ڈیڈی کے طویل لیکچر کے جواب میں کہا تھا۔

''آپ مجھے خوش نہیں دیکھنا چاہتے۔''

جوزف گیبرئیل اس کی آنکھوں میں اتری سرکشی دیکھ کر دنگ رہ گئے...... کون تھا کوئی جس نے اسے اس حد تک جانے پر مجبور کردیا تھا؟ اس کے بعد انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ جیسے اب ان کا اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہو۔

یہ ان کے گھر کی سب سے ناخوشگوار کرسمس تھی جو ختم ہوگئی تھی۔

''ڈیڈی، دراصل ایک پتھر دل راہب ہیں، وہ اپنی بیٹیوں کو نن بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔'' حالانکہ اس ایک واقعے سے پہلے اس نے کبھی اتنے منفی انداز میں اپنے باپ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

اسے صبح، صبح روانہ ہونا تھا ابھی تک وہ بستر پر بیٹھی ایما کے ساتھ ہوئی شام کی جھڑپ پر غصے میں بل کھا رہی تھی۔ کیا تھا جو وہ ایک بار اس پر اعتبار کر کے دیکھ لیتے۔ اسے رونا آگیا۔

اس کے کچھ کپڑے ایما کی الماری میں تھے لیکن ایما کے کمرے کی روشنی بجھی ہوئی تھی۔ شاید وہ سو چکی تھی۔ وہ پلٹنے کا سوچ رہی تھی لیکن اسٹڈی سے باہر آتی آوازوں نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ بے دھڑک دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ اوندھی پڑی بوتل کے پاس گلاس میں لبالب بھرا مشروب چھلک کر میز کے شیشے سے بہتا ہوا نیچے قالین میں جذب ہورہا تھا۔ وہ سفید بالوں والا سر، شکنوں سے بھری پیشانی، کسی نامعلوم بوجھ سے ڈھلک جانے والے کندھے...... وہ آخر اپنا کیا کچھ ہار کر بیٹھے تھے...... کوئی اسے بھی تو بتاتا۔

ایما کے اجلے ہاتھ، محبت سے ان کی پیٹھ سہلا رہے تھے، وہ آہستہ، آہستہ ان کے کان میں کیا کہہ رہی تھی۔ سبرینہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

مگر وہ یہ جانتی تھی کہ جس دن اس کے باپ کے دل کی دھڑکن پہلی بار بے ترتیب ہوئی اس کی میڈیسن پڑھنے والی بہن نے اس گھر میں ہر اس چیز پر پابندی لگادی تھی جو سیال تھی۔ یاد ہواں...... شاید وہ ان کے قریب چلی جاتی شاید وہ ان کا حال پوچھتی اگر وہ ایما کو یہ کہتے ہوئے نہ سن لیتی۔

''میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ لیکن آپ اسے مت روکیں۔ وہ تجربہ کرنا چاہتی ہے اور شاید فیصلہ کرچکی ہے۔''

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ ایما کو زور کا چانٹا لگا دے آخر اسے کیا حق ہے اس کے باپ کو اس سے بدگمان کرنے کا۔ وہ ہوتی کون ہے؟ لیکن وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ وہ دو قریبی لوگوں کی آپس کی بات تھی۔ وہ ان کی اکائی کیسے توڑتی۔

''فکر مت کریں، وہ خوش رہے گی آپ اسے جانتے نہیں؟'' ایما کی کمزور تسلی میں یقین کا کس قدر فقدان تھا، وہ اس کا چہرہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ اس کا ارادہ کسی کو نیچا دکھانے کا نہیں تھا۔ پتا نہیں، انہوں نے اسے اس کی ضد کیوں سمجھ لیا ہے۔ وہ ایک لفظ بولے بغیر کمرے سے باہر آگئی۔

وہ ساری رات جاگی تھی پھر بھی صبح کے نزدیک اس کی آنکھ لگ گئی۔ الارم کی آواز پر جاگی تو کمرے کے پردوں کے پیچھے اندھیرا ابھی مکمل طور پر چھٹا نہیں تھا۔ اس نے بددلی سے بستر چھوڑ دیا۔ نیند کی کمی کو نیم گرم پانی میں بہا کر وہ باہر آئی۔ کپڑے بدلے اب وہ روانگی کے لیے تیار تھی۔

لیکن ہاں، وہ آخری دفعہ ڈیڈی کی بدگمانی دور کرنے کی ایک کوشش تو کر سکتی ہے۔ اس نے ان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کچن میں جھانکا جہاں ایما تیز، تیز ہاتھوں سے انڈے پھینٹ رہی تھی۔ اس کی صبح کی شفٹ تھی۔ وہ ساری عمر ایما کے نظم وضبط اور سلیقے پر حیران ہوتی آئی تھی۔ اس نے ماں کے جانے کے بعد اس گھر کو ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ایک مصروف ڈاکٹر، ایک مہربان بیٹی، ایک دوستوں جیسی بہن...... پتا نہیں وہ اتنی مکمل کیسے تھی۔

سبرینہ کچن کے دروازے سے ہٹ آئی۔

''لیکن ڈیڈی اس سے ناراض بھی تو نہ ہوں ناں...... اس نے کون سا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ دیانت داری سے ارادہ کر کے باپ کے کمرے کی طرف بڑھی تھی اور اس کے قدم ایما کی آواز پر پتھر ہو گئے تھے۔

''وہ ساری رات جاگ کر ابھی سوئے ہیں، پلیز تم اندر مت جاؤ۔'' خشک آواز، ناراض لہجہ......

اس نے بدگمانی کی زبردست لہر کو خود پر چڑھتے محسوس کیا۔ اس کی اکلوتی بہن سرد مہری کا ہر رنگ پہنے بہت مصروف دکھائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آہستگی سے کچن میں آگئی۔ کاؤنٹر کے قریب پڑے اونچے اسٹول کے پاس پہنچ کر اس نے ایما کی مصروف اور ناراض پشت کو غور سے دیکھا تھا۔

ایما نے پھینٹے ہوئے انڈے کا آمیزہ فرائنگ پین میں ڈال کر اس میں کٹا ہوا پنیر گرانا شروع کر دیا تھا۔

سبرینہ نے ریفریجریٹر کا دروازہ کھول کر پیالے میں دودھ انڈیلا اور کارن فلیکس ڈال او ناشتا کرنے لگی۔

وہ ایما کے اگلے سوال کی منتظر تھی لیکن ایما کو اس کے کچن میں آبیٹھنے سے کوئی غرض نہیں لگتی تھی۔

اس نے ٹھنڈے دودھ میں اکڑے ہوئے کارن فلیکس چباتے اس کی لاتعلق نظر آنے والی پشت پر غور کیا۔ ایما کا چھوٹے، چھوٹے پیلے پھولوں والا نیلا ایپرن بالکل اکڑا ہوا تھا، اس کے چہرے کے ہر تاثر کی طرح بے شکن اور ناقابلِ فہم، وہ ایما کی نصیحتوں سے ہمیشہ چڑتی آئی تھی لیکن آج اسے لگا اس کا دل کہیں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اس نے یونہی کوئی بات کرنے کی غرض سے چمچ کو پیالے میں گھما کر چھوڑ دیا۔

''میں ان سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتی۔''

''وہ بہت مشکل سے سوئے ہیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' ایما کا جواب واضح تھا، اس کی تنی ہوئی پشت پر اس ملاقات سے انکار پڑھنا بالکل مشکل نہیں تھا۔

''تم جلدی کرو، تمہاری ٹرین نکل جائے گی۔''

وہ سچ مچ سہم گئی...... یہ ایما کے لہجے میں کتنی اجنبیت تھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو، تم کچھ نہیں کھاؤ گی؟'' اس نے ایما کے کچن سے نکلنے کے ارادے میں حائل ہونا چاہا تھا اور ناکام رہی تھی۔

''نہیں، مجھے جلدی اسپتال پہنچنا ہے۔'' وہ

کاؤنٹر کے کنارے اکیلی بیٹھی خود کو بہت ہی فالتو لگی۔
اس نے کبھی سوچا نہیں تھا...... ایما دراصل اس سے کبھی ایسی ناراض نہیں ہوئی تھی۔ ساری عمر اس نے اسے احتیاط سے چلنے کے سبق پڑھائے تھے لیکن ساری عمر وہ سبرینہ کے ہر خطرناک کھیل میں اس کے ساتھ شریک رہی تھی۔

''پھر آج کیا نیا ہوا ہے؟'' اس کے پاس فرصت سے بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔
وہ اپنا بیگ گھسیٹ کر سیڑھیوں سے نیچے لائی مگر ڈیڈی کے کمرے کے بند دروازے کے باہر ذرا دیر کو رکی ضرور۔

''کیا واقعی ایما نے سچ بولا ہے اگر وہ اندر چلی جائے تو؟''

اس کی توقع کے بالکل برخلاف، ایما کہیں سے نکل کر آئی تھی۔ وہ اسی لباس اور ایپرن میں تھی۔ یعنی وہ صرف اس کے ساتھ بیٹھنے سے بچنے کے لیے کچن سے فرار ہوئی تھی۔

اس کے اٹھتے قدم سست اور پھر تیز ہوئے اس نے نقصان کے گہرے احساس کے ساتھ اپنے گھر کے بیرونی دروازے کا ہینڈل چھوا تھا اور اس کے صدمے کی انتہا نہ رہی جب ایما کو اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کے لیے تیزی سے لپک کر آتے ہوئے پایا۔
دروازہ کھلتے ہی یخ بستہ ہوا کا تیز جھونکا خوب گرم اور آرام دہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ اپنا پاؤں دروازے کی دہلیز سے باہر رکھتے اسے زبردست جھرجھری آگئی۔ وہ اپنی ایڑیوں کے بل پر پلٹی تھی۔
''ایما......؟ تم۔'' وہ اٹک گئی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور کیوں......
''ڈیڈی سے کہنا میں......'' پھر جیسے ڈیڈی کو کچھ بھی پیغام دینے کا خیال بالکل بے معنی لگا...... وہ ایما کی غیر محبت بھری نظروں کے سامنے خاموش کھڑی رہ گئی۔
ایما کو شبہ تھا وہ کچھ تو کہے گی، کوئی یقین دہانی، کوئی تسلی دیتا جملہ، کوئی امید دلاتی بات...... لیکن اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے اگلے الفاظ نے اسے مایوس کر دیا۔

''اچھا ایما......'' وہ جیسے بہ مشکل مسکرائی۔ ''میں ایسٹر بریک پر شاید نہ آؤں۔'' ایما صدمے کی زیادتی سے چور، چور تھی۔ اسے پتا تو تھا پر اسے یقین نہیں تھا۔
''خیریت سے جاؤ۔'' ایما نے کہا تو اسے لگا جیسے کہتی ہو۔ ''خبردار جواب واپس آئیں۔'' سبرینہ کو لگا اگر اس نے فوری قدم باہر نہ نکالے تو ایما اس کے رخصت ہونے کا انتظار کیے بغیر دروازہ بند کر لے گی۔
اس کے اپنے گھر کا دروازہ...... وہ ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ ہوا کے زبردست دباؤ سے اس سے بھی زیادہ زوردار آواز سے بند ہوا جتنا ایما کا ارادہ تھا۔ اور دروازے کے ساتھ سبرینہ گیبرئیل کا دل بھی...... سیاہ بادلوں میں چھپا آسمان برس پڑنے کو بے تاب تھا۔ ٹھنڈی یخ ہوائیں، درختوں کی ننگی شاخوں پر شور مچاتی پھر رہی تھیں۔ وہ اپنے گرمائش بھرے گھر کے ٹھنڈے یخ بند دروازے کے باہر اس برف سی خالی اور تنہا سڑک پر بالکل اکیلی کھڑی تھی۔ اسے صورتِ حال کی یہ سنگینی بالکل پسند نہیں آئی۔
کچھ دیر کو اسے لگا وہ کمزور پڑتی جا رہی ہے اور اسے کمزور ہی تو نہیں پڑنا تھا۔ اس نے اپنی ابل پڑنے کو بے تاب آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ اسے کنگز کراس اسٹیشن سے آٹھ بجے کی ٹرین پکڑنی تھی اور آج یقیناً اس کی ٹرین چھوٹ جانے والی تھی۔ وہ ثابت قدمی سے اپنا سوٹ کیس برف سے ڈھکے فٹ پاتھ پر گھسیٹتی رہائشی مکانوں کی لین عبور کر کے مین روڈ پر آگئی تھی اور ٹیکسی روک کر سامان رکھتے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔
''وہ اتنی کمزور نہیں کہ ایسی معمولی رکاوٹوں سے حوصلہ ہار جائے۔'' اس یخ بستہ شام کو اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے میں چابی گھماتے بھی وہ یہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

لیکن شاید یہ اس کے ارادے کی کمزوری تھی کہ

واپسی کے چند دنوں میں اسے اندازہ ہوگیا...... ارادے کرنا اور ان پر عمل کرنا، دو مختلف باتیں ہیں...... وہ اپنے باپ اور بہن کی محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ پائے گی۔

یہ ماسٹرز کا آخری سمسٹر تھا۔ لائبریری سے کتابیں نکلواتے، واپس کرتے، اپنے تھیسز کو آخری شکل دیتے، اس کا ذہن جیسے اسی ایک نکتے کو سلجھا، سلجھا کر تھک گیا تھا۔ اس کے استاد حیران تھے۔ وہ نالائق طالبہ لگنے لگی تھی۔ پڑھائی سے جی چرانے والی، کام نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈنے والی۔

''کیا حرج ہے، اگر وہ ڈیڈی کی بات مان لے، حالانکہ......'' اس کے اندر سے پھر احتجاج کی آواز بلند ہوئی۔

''ڈیڈی کو اب اس کی زندگی میں اس حد تک دخل اندازی بند کر دینی چاہیے۔'' پھر وہ سوچتی۔

''یہ کتنی بڑی حماقت ہے...... وہ ایک نئی چوٹی سر کرنے کے شوق میں کیا کرنے جا رہی ہے۔ ایما ٹھیک کہتی ہے۔ وہ اس کی دنیا نہیں...... زندگی ایسے تجربات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔''

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے عجیب و غریب ایڈونچر سے دست برداری کا اعتراف کرتی۔ ایما کو فون کرتی...... وہ واپس آگیا۔

☆☆☆

22جون 1989ء

وہ جولائی کی گرم ترین دوپہر تھی۔

اس کے کمرے کا پنکھا آگ برساتے، برساتے کتنی دیر پہلے لوڈ شیڈنگ کی زد میں آگیا تھا۔ پسینہ کبھی اس کے سر کے بالوں سے بہتا اس کی گردن بھگوتا اور کبھی کمر پر سانپ کی طرح رینگتا، ایڑیوں تک بہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اس نے زمین سے چھت تک تنا بھاری پردہ ہٹا دیا۔ کھڑکی کی موٹی گرل کے باہر غصے میں لال پیلا ہوتا سورج کائنات کی ساری تمازت، ایک ساتھ انڈیل رہا تھا جھلسا دینے والی دھوپ کے نیچے آم اور امرود کے درختوں کے جھنڈ، کیاریوں میں ننھے پودے اور لان کی سوکھی خشک گھاس جیسے سب کاربن ڈائی آکسائڈ کی زیادتی اور گرمی کی مارے سے کمھلا گئے ہوں۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ کھول کر، گرم لو کے تھپیڑوں کو اندر آنے کا راستہ دیا...... ہوا کے گرم تھپیڑے نے لمحے بھر کو پسینے سے تربتر اس کی قمیص کو چھوا اور ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس پیدا کر کے گزر گیا۔

سردی، گرمی، دھوپ، چھاؤں جیسے قدرتی عوامل ایک عرصہ پہلے اس پر اثر انداز ہونا بند ہو گئے تھے۔

زندگی اگر سکون سے چلتے، چلتے اچانک شعلوں کی زد میں آجائے...... انا، خودداری اور عزتِ نفس جیسے لایعنی الفاظ، دن رات کے بے معنی تعاقب میں کہیں دم سادھ کر بیٹھے ہوں اور ہر آتی جاتی سانس بقا اور فنا کے درمیان تنی ہوئی وہ رسی بن جائے جس پر چلنے والے کا کسی بھی لمحے منہ کے بل گر جانا یقینی ہو تو انسان اپنی جبلت میں موجود بقا کی بنیادی خواہش اور ضبطِ نفس کے درمیان کے سارے سمجھوتے خود بخود کر لیتا ہے۔

اس کا محبوب اپنے اونچے محل کی سب سے اوپری منزل پر...... آگ برساتے کمرے کے بندا سے سی کو دیکھ کر ہنستا تھا اور اس نے کہا تھا۔

''آسائشوں سے منہ پھیر کر ہم ان کا کیا نقصان کرتے ہیں...... یہ رعایت تب تک ہے، جب تک تم کوئی فیصلہ نہیں کر لیتیں...... تم اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتیں۔ یہ میں جانتا ہوں۔''

اس کا چہرہ پسینہ، پسینہ تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے پسینہ پونچھنا چاہا لیکن رک گئی۔ اس کی کھڑکی کی گرل کے پار دور درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے وہ اچانک ہی نکلی تھی۔ اور اب آم کے ایک گھنیرے درخت کی طرف جا رہی تھی، جس کے سائے میں بیچے موسمی پھولوں کے ننھے پودے ابھی اگنے شروع ہی ہوئے تھے۔ اس نے اپنی مٹیالے رنگ کی چادر سر پر مزید آگے کھینچ کر ارد گرد دیکھا تھا پھر کیاری کے سرے پر ایڑیوں کے بل بیٹھ کر دلجمعی سے کچھ اکھاڑنے لگی

تھی۔ شاید فالتو جڑی بوٹیاں......

سبرینہ نے پہلے بھی اسے چلچلاتی دوپہر میں آم کے درختوں کے پیچھے سے برآمد ہوتے اور کیاری، کیاری جھک کر پھولوں، پودوں اور پتوں کا حال پوچھتے دیکھا تھا۔ وہ رکتی پھر جھکتی پھر اٹھ جاتی۔ سر سے پاؤں تک ایک بڑی سی چادر میں لپٹی اس عورت کے ہاتھ میں، ہمیشہ جڑی بوٹیاں اکھاڑنے والی کوئی چیز ہوتی تھی۔ پتا نہیں وہ مالکوں میں سے تھی یا نوکروں میں سے...... سنسان گرم دوپہروں میں چلچلاتے سورج کے نیچے بے قدر لوگوں کی کھیتیاں ہری رکھنے کے جتن میں مگن کتنی دیر تیز، تیز ہاتھ چلانے کے بعد اس نے جیسے تھک کر ہاتھ میں پکڑا اوزار پھینک دیا اور ستانے کے انداز میں سوکھی زرد گھاس پر بیٹھ کر چادر سے خود کو پنکھا جھلنے لگی۔

اس کے انداز میں ایک الگ سی تمکنت تھی۔ اس کا دور سے نظر آتا چہرہ جیسے طویل مسافتوں کی دھوپ سہہ کر بھی پوری طرح سنولایا نہیں تھا۔

گو وہ اس سے بہت دور تھی اور اتنے فاصلے سے اس کا چہرہ صاف دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اسے لگا کہ جب وہ دھیان سے بیٹھی ہاتھ کی لکیروں کو، زمین کی بے رس گھاس کو، درخت پر غل مچاتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی اس نے ایک نظر اٹھا کر سامنے کھڑی اس تاج محل جیسی عمارت کی سب سے اوپر والی منزل کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہی کچھ سوچتی نظر سبرینہ کے کمرے کی کھڑکی پر بھی پڑی تھی اور گزر گئی تھی۔

سبرینہ کو شک ہوا کہ اس نے کھڑکی کے شیشے کے پیچھے لوہے کی گرل کے پار جالی سے چہرہ لگائے اسے ضرور دیکھا ہے۔ وہ اداس سی پلٹتی نظر جیسے کسی موجودگی کے احساس سے چونک کر دوبارہ اس کھڑکی تک واپس آئی اور ٹھہری تھی کتنی دیر وہ اس کھڑکی کو دیکھتی رہی۔

پھر سبرینہ کو لگا وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کہیں دور کچھ اور دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسی جھلسا دینے والی دوپہروں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر کون سی ریاضتیں حاصل کرتی تھی۔

پھر جیسے وہ ہوش کی دنیا میں اچانک آئی اور... ہڑبڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی...... جیسے آج سے پہلے وہ کبھی اتنی بے خبری سے یہاں اتنی دیر آ کر نہ بیٹھی ہو...... تاخیر ہو جانے کی گھبراہٹ تیز، تیز قدموں میں لپٹی اس کی واپسی کی رفتار سے نمایاں تھی...... وہ درختوں کی اوٹ میں غائب ہو چکی تھی۔ وہ اکثر اسی طرح غائب ہو جاتی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اس پُراسرار محل میں، اپنے نادیدہ گناہ کی سزا کاٹتے، اسے ابھی کئی صدیاں نہیں گزری تھیں۔ پچھلے ایک سال میں اس نے کئی بار زندگی کی اس پلٹ جانے والی بازی کا دوسرا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ کئی بار اس کا پچھتاوؤں میں ڈوبا دل اس سے بے رحم کھیل کھیلنے لگتا۔ اگر اس روز اس نے ایما کی سرد مزاجی پہ لڑائی کرنے کا فیصلہ کیا ہوتا...... اگر اس دن برفباری رکتی ہی نہیں...... اگر اس کی ٹرین چھوٹ جاتی یا ٹرینیں ایک دن کے لیے ایڈنبرا جانا بند ہو جاتیں۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایسا ''اگر'' دوبارہ اس کی زندگی میں کبھی آنے والا نہیں تھا۔

یہ نئی دنیا، جہاں فاروق فیروز خان اور اس کے طاقتور باپ اور بھائیوں کی حکومت تھی۔ ابھی دریافت کا سفر طے کر رہی تھی اور پتا نہیں کتنا سفر باقی تھا۔

بجلی آ گئی تھی...... پنکھا چل گیا تھا۔ پسینہ سکھانے کے لیے تو کافی ہی تھا کم از کم...... وہ کہاں، کہاں کا سفر کر کے لوٹی تھی۔

☆☆☆

ایسی ہی ایک سنسان دوپہر تھی جب وہ اپنے کمرے کی بند کھڑکی کے باہر دور کسی مشین سے ایک تواتر سے بلند ہوتی کو، کو کی مسلسل آواز سن رہی تھی۔

''اچھی'' کے مطابق یہ گیہوں پیسنے والی چکی کی آواز تھی جو صرف رات کو ہی کام کرنا بند کرتی تھی۔ اس آواز کی عادی ہو جانے کے باوجود وہ اتنی سخت چڑ گئی تھی کہ اسے ایما کے خط ملنے کی خبر نے بری طرح جذباتی کر دیا۔ فضائی ڈاک سے موصول ہونے والا خط فاروق

کے ملتان والے ایڈریس پر بھیجا گیا تھا۔ یہ وہی ایڈریس تھا جو سبرینہ نے ایڈنبرا چھوڑتے ہوئے ایما کو لکھے اپنے آخری خط میں بھیجا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کبھی نہ کبھی تو وہ اس رہائش گاہ پر دنیا کے سب سے بہترین اور ذہین، ترقی پسند آدمی کی محبوب بیوی بن کر رہے گی۔

ایسا بھلا کہاں ہو سکا تھا......؟ وہ جس جگہ قید تھی، وہ اس کی دنیا کی سوچ سے دور، ایک ایسا علاقہ تھا جہاں اس کے پچھلوں کا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وہ اپنی چمکدار، مہنگی امپورٹڈ گاڑی سے اتر کر چمکتے فرش روندتا، دبیز ایرانی قالینوں کو پاؤں کی ٹھوکروں کے نیچے کچلتا، کمرے میں آیا تو سخت بپھرا ہوا تھا۔

اس آہنی قلعے میں جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی، آسمان تک اونچی موٹی دیواروں میں چنی ذرا سی لڑکی کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ اپنے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت کرے۔

”کیا سمجھتی ہے وہ فاروق فیروز خان کو؟ آخر وہ شے کیا ہے؟“ غضب کی شدت سے بلند ہوتی آواز میں، رعونت بھری بدتمیزی سے چلاتا، وہ جو منہ میں آیا بولتا چلا گیا تھا۔

وہ سہم کر دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

وہ ”شے“ نہیں ہے، یہ نکتہ اٹھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ اپنے متکبر دماغ کی ساری گندگی، اس کے منہ پر الٹ کر پاؤں پٹختا باہر نکل گیا تھا۔

اس نے اس کے جانے کے بعد سر اٹھایا۔

اس بڑے ڈیل ڈول والے طاقتور شخص کو ذرا سا کانٹا چبھو کر اس نے پہلی بار جانا تھا کہ ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی میں جیت چیونٹی کی کیونکر ہو سکتی ہے۔ مگر وہ اس انوکھی مسرت سے زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہو سکی۔

اس نے دیکھا جو لفافہ اس کے گھر سے آیا تھا۔ اس شخص کی وحشت کا شکار ہو کر پرزے، پرزے ہوا قالین پر بکھرا پڑا تھا۔

اس نے بے ساختگی میں جھک کر، وہ ان گنت پرزے سمیٹے۔ محبت سے جوڑ کر پڑھے اور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔ ایما کی ہینڈ رائٹنگ پہچاننے کے باوجود اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو اس نے پڑھا ہے وہی درست بھی ہے۔

وہ یہاں آنے کے بعد ابتدائی چند دنوں کے سوا ہر روز روئی تھی مگر اس بری طرح اتنی شدت سے پہلی بار روئی تھی۔

یہ سب اس کے گناہ ہیں جو ایک، ایک کر کے سامنے آگئے ہیں۔

اب وہ آواز دے کر بلائے تو کسے؟ فرار ہو کر جائے تو کہاں؟ وہ انتظار کرنے والی آنکھیں تو اب رہی نہیں...... اس کے باپ نے اس کی نافرمانی کی سزا خود ہی اس کے لیے تجویز کر دی تھی۔

”وہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔“

☆☆☆

لیکن آنے والے دنوں میں اسے اندازہ ہوا کہ وہ آزادی کے سنہری خواب سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی اخبار، کتابیں، کاغذ، قلم جیسی ہر چیز سے دور کر دی گئی تھی۔ اتنے بڑے محل کے اس حصے میں جہاں سے آگے جانے کے راستے پر اس نے ہمیشہ اسلحہ بردار گارڈز کو تعینات پایا۔ ٹی وی، ریڈیو نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ جب کبھی کھڑکی کے شیشے کے ادھر لوہے کی موٹی گرل سے سر ٹکا کر باہر جھانکتی تو دور فاصلے پر کسی مکان سے لکڑیوں کے چولھے پر شام کا کھانا پکنے کی خوشبو اسے زندگی کی گرمائش کا احساس دلاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا، وہ... کڑکڑاتے گھی میں لہسن کے بگھار کی حسین مہک والے کچے مکانوں کے اندر جا کر وہاں رہنے والوں کی دنیا کو قریب سے دیکھے...... ان کے دیگچے میں ڈھکن اٹھا کر جھانکے۔ نمک، مرچ کا اندازہ لگائے اور انہیں صاف، صاف بتا دے کہ وہ ان کے گھر کے کھانے کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ آخر وہ ایسی ہی کوئی ریسرچ کرنے یہاں آنا چاہتی تھی ناں......

مگر اس کے باہر نکلنے پر سخت پہرا تھا۔

انہیں کیا ڈر تھا...... پتا نہیں......

وہ انہیں کیا نقصان پہنچا سکتی تھی...... پتا نہیں، وہ محسوس کر رہی تھی۔ فاروق کی غیر موجودگی میں اس کے بڑے بھائی کا قیام رہائش گاہ کے اس حصے میں طویل ہونے لگا ہے۔ اس کی اپنی بیوی ان کی خاندانی رہائش گاہ میں رہتی تھی۔

فرقان، فیروز معظم خان کا سب سے بڑا بیٹا جو اپنے دو چھوٹے بھائیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر جب دل چاہتا، وقت بے وقت اس کا دروازہ بجانے اور دروازہ کھول کر کمرے تک چلا آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی لپک عجیب تھی۔

کون تھی وہ...... سڑک پر پڑا ہوا نوٹ......؟ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ فاروق یہ برداشت نہیں کر پائے گا۔ فاروق واقعی یہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔

وہ ایک تکلیف سے بھری خوفناک رات تھی۔

فاروق اسے روئی کی طرح دھنک کر شہر کے لیے نکل چکا تھا۔ بجلی غائب تھی اور اس کی کھڑکی کے نیچے علاقے کے سارے کتے ایک ساتھ مل کر بھونک رہے تھے۔ اس خالی محل کے لمبے دالانوں میں دبے قدموں چلنے پھرنے والے ملازم کام سمیٹ کر کب کے اپنے کوارٹرز میں جا چکے تھے۔ وہ اس شخص کے ہاتھوں پٹ کر جہاں کچھ دیر پہلے گری تھی وہاں گھپ اندھیرے کے باوجود وہ جانتی تھی اب خون کا دریا تھا۔ اسے اتنی گہری چوٹ بھی نہیں آئی پھر اتنا خون...... درد کی زبردست لہر کے ساتھ ایک اجنبی خوف اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ کہیں اس کا کوئی بہت بڑا نقصان نہ ہو جائے۔

اس رات سبرینہ گیبرئیل فاروق خان بجلی کی عدم موجودگی میں گھپ اندھیرے میں پڑی، اپنے ہی خون کے تالاب میں ڈوب کر مر گئی ہوتی مگر وہ نہیں مری......

اس نے تکلیف سے دوہری ہوتی کوکھ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے گھپ اندھیرے میں زمین پر پڑے، پڑے ہی کمرے کا دروازہ کھلتے اور کسی کو اندر آتے دیکھا تھا...... موم بتی کی روشنی میں نظر آنے والا وہ ایک دوپٹے کا ہیولہ سا تھا جو اسے نظر آیا تھا...... کسی نے کسی کو پکارا تھا۔ کوئی بھاگا تھا کوئی...... اسے یاد رہی تو صرف ایک ناقابلِ بیان درد کی طویل رات...... جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

کسی عورت کی آواز...... جو مقامی زبان میں کہہ رہی تھی۔

''ہائے شوہدی، ایہد ابال تے مر گیا اے۔ اے تے نیلی تھی گئی اے۔'' (ہائے بیچاری...... اس کا بچہ تو مر چکا ہے۔ یہ تو نیلی پڑ گئی ہے۔)

طبی سہولتوں سے عاری، ترقی کے کم ترین معیار پر بھی پورا نہ اتر سکنے والے اس علاقے میں جہاں کوئی سند یافتہ ڈسپنسر بھی دستیاب نہیں تھا۔ ولایت پلٹ، ولایت یافتہ چوہدریوں کی بیچاری رعایا، اپنے چھوٹے موٹے دکھ درد کا علاج، نیم حکیموں سے کروانے کی بھی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ سنگ مرمر کی وسیع و عریض رہائش گاہ کے باہر پیٹ کا ایندھن بھرنے کو لوگ اپنے بچے تک فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس اونچے محل کی دیواروں میں اس کا چھ مہینے کا مرا ہوا بچہ گاؤں کی ان پڑھ دائی نے لالٹین کی روشنی میں نہ جانے اس پر کتنے پہاڑ توڑ کر اس کی کوکھ سے نکالا تھا۔

اس کی جان تو بچ گئی تھی لیکن دل میں اگنے والی ننھی سی امید کا پودا خاموشی سے مر گیا تھا۔ ہوش ٹھکانے آتے ہی اسے ایک ایسے زبردست نقصان کا احساس ہوا تھا جو شاید اس شادی نام کے کل جوئے کا حاصل جمع، بن سکتا تھا۔

اس نئی روح کے دنیا میں آنے کے فیصلے میں، اس کی رضا شامل نہیں تھی لیکن اس کے آنکھ کھولے بغیر آخری دم دینے کی تکلیف اسے بار، بار اسی کند چھری سے چیرتی رہی، جس نے اندھیری حبس زدہ رات کی ٹمٹماتی، ناکافی روشنی میں اس کے بچے کو ٹکڑے، ٹکڑے کر دیا تھا۔

فاروق خبر سن کر بھی کئی دن اس کے پاس آنے کا وقت نہیں نکال سکا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا پھر بھی اس

رات اسے فاروق سے ایک ایسی سیاہ اور ناقابلِ بیان نفرت محسوس ہوئی جو اس کے آس پاس کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی...... دنیا تہس نہس کر سکتی تھی۔

فاروق کو کوئی افسوس نہیں تھا...... اسے ایک غیر ملکی عورت سے، اپنے خاندان کا وارث چاہیے ہی نہیں تھا۔ اس کے باپ، دادا اور بھائیوں نے اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے خاندانی عورتوں سے شادیاں کی تھی۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ خاندانی عورت ہی ان کے خون کو بیرونی آلائشوں سے پاک رکھ سکتی ہے۔

فاروق آیا تو...... سبرینہ کو لگا وہ کسی بات پر بے اندازہ خوش ہے۔ اسے خوشی کی وجہ جاننے میں دلچسپی نہیں تھی، اسے چند بول ہمدردی کے سننے کی توقع تھی۔ ویسی ہی سہی جیسی وہ اپنی ریس کی گھوڑی کے بیمار پڑ جانے پر سبرینہ کی طرف سے سننے کا خواہش مند رہ چکا تھا اب نہیں بلکہ شروع دنوں میں......

وہ اپنے باپ کے باغات پر اگنے والے، رس دار پھلوں کے حقوق اگلے کچھ سالوں کے لیے ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کو ٹھیکے پر دینے کے بے اندازہ بڑے کاروباری سودے کے قانونی نکات طے کرنے امریکا جا رہا تھا۔

فاروق کے وجود سے اٹھتی کلائیو کرسچین کی خوشبو اسے خوفزدہ کر رہی تھی...... وہ توقع کے برخلاف اچھے موڈ میں تھا...... مگر وہ نہیں تھی۔

اس کی جسمانی طاقت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔ عنایت دائی کی چھریوں کے زخم، ابھی پوری طرح بھرے نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ہمدردی کے چند جملے سننے کی منتظر ہی رہی...... اسے پتا ہونا چاہیے تھا، آج وہ جس چونچال موڈ میں ہے اسے رات بھر کے ساتھ کے لیے...... اس کے خالی اور زخم، زخم وجود کی حاجت ہو بھی نہیں سکتی۔

وہ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا۔ وہ کہاں گیا تھا۔ وہ کہاں جاتا تھا...... یہ جاننے کی اسے خواہش نہیں رہی تھی۔ اس کے ہوش ٹھکانے آ چکے تھے۔

☆☆☆

فاروق کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سبرینہ سے تعلق اتنی جلدی پیچیدہ ہو جائے گا...... اس کو یہ بھی نہیں لگتا تھا کہ انہیں شادی ہی کرنی پڑ جائے گی......

جب وہ پاکستان سے سردیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس ایڈنبرا آیا تو سبرینہ اپنی بہن اور باپ کو دکھی کرنے والے فیصلے پر سخت احساسِ جرم کا شکار تھی...... اسے لگا اگر اس نے آگے بڑھ کر صورتِ حال کو نہ سنبھالا تو وہ اپنا راستہ بدل لے گی۔

اگلے چھ مہینے اس نے سبرینہ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا...... اس نے اپنی گرم جوش محبت کے اندھے طوفان سے اس قابل پروفیسر کی ذہین بیٹی کا اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دوبھر کر دیا تھا۔ ان دنوں فاروق اس کا ایسا دیوانہ بنا ہوا تھا کہ اس کی صراحی دار گردن کی باریک خوب صورت کھال کے پار سے گزرتے مشروب کا رنگ تک دیکھ کر اچھل پڑتا تھا......

وہ عیسائی تھی لیکن زیادہ مذہبی قطعاً نہیں...... پھر اس کا مشرقی پس منظر، رومان سے بھرپور، موسیقی سے لبریز محبت کے اس سنہری جام کو کسی باقاعدہ تعلق میں بدلنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔

وہ بے حد عجیب لڑکی تھی۔ اور اسے اپنا بنانے کو فاروق پاگل ہوا جا رہا تھا۔ جب ہر کوشش ناکام ہو گئی تو آخری سمسٹر ختم ہوتے ہی فاروق نے اسے شادی کی پیشکش کر ڈالی۔

کرسمس کے بعد سے اس کی اپنے باپ اور بہن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی...... ایما کے آخری فون سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ جس رضا کار مشن پر غزہ جا رہی تھی...... وہ ملتوی ہو کر مئی سے شروع ہو رہا تھا۔ ڈیڈی ایک بڑی ایجوکیشن کانفرنس کے لیے کوپن ہیگن جانے والے تھے۔

پھر بھی وہ ایڈنبرا چھوڑنے سے پہلے، ایک بار اپنے باپ اور بہن کو یہ تسلی دینا چاہتی تھی کہ اس نے کوئی

غلط فیصلہ نہیں کیا...... وہ ایک ایسی جگہ جا رہی ہے...... جہاں ترقی یافتہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جانے والا معاشی ترقی اور سماجی بھلائی کا سہانا خواب حقیقت بنایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ اس نے ایک صحیح فیصلہ کیا ہے لیکن جب وہ فاروق کو ڈیڈی اور ایما سے ملوانے اپنے گھر پہنچی تو گھر کے بند دروازے کے باہر کئی دنوں کے اخبارات اٹھائے جانے کے منتظر تھے۔ اس نے ایما کے اسپتال فون کیا تو پتا چلا، ایما ڈیوٹی پر نہیں ہے...... اس نے ڈیڈی کا معلوم کرنے کے لیے ان کے کالج سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ سے باہر ہیں۔ ایما نے یقیناً جھوٹ نہیں بولا تھا۔

مگر وہ پچھلے کتنے دنوں سے، اپنے باپ سے بات کرنے کو ترس رہی تھی...... وہ جھوٹ موٹ ہی سہی، ان کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ وہ کوئی غلطی نہیں کر رہی ہے لیکن اپنے گھر کے بند دروازے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں اس لیے نہیں کہ اس کے گھر والے موجود نہیں تھے بلکہ اس لیے کہ فاروق کے سامنے اس کی کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔

”ہونہہ...... ایسے تھے اس کے گھر والے...... اسے یہ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ کہاں ہیں۔“

جس دن اس نے فاروق کے ساتھ جہاز کے پروں کے نیچے رہ جانے والے، سرسبز اور حسین ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ کو الوداع کہا اس دن اگست انیس سو اٹھاسی کا آخری سورج ڈوب رہا تھا اور اسے اپنے باپ اور بہن سے ملے کئی مہینے ہو چکے تھے۔

☆☆☆

یکم ستمبر 1988ء

وہ پاکستان اترے تو سیاسی موسم گرم تھا۔ ملک میں نئے عام انتخابات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ فاروق کے خاندان کی سیاسی مصروفیات بے انتہا بڑھی ہوئی تھیں۔ پھر بھی فاروق کے رعب اور دبدبے والے باپ کو شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ ان کے خاندان میں غیر ملکی عورتوں سے شادیاں ہوتی آئی تھیں۔

شادی ملتان سے کچھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ان آبائی زمینوں پر ہوئی جو تین پشت پہلے فاروق کے بزرگوں کو برطانوی راج سے کسی نامعلوم خدمت کے عوض انعام میں ملی تھیں۔

سبرینہ نے ڈیولپمنٹ اکنامکس میں ماسٹرز کے دوران، اس زرخیز اور رنگارنگ کہانیوں سے بھرے...... پُراسرار جنوبی ایشیا کی جو تصویر اپنے دماغ میں بنائی تھی۔ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کا یہ جنوبی علاقہ بالکل ویسا نہیں تھا۔ تحقیقی کتابیں لکھنے والے آپ کو کبھی یہ نہیں بتاتے کہ جس بے رنگ اور بے بو دنیا کا وہ ذکر کر رہے ہیں، اس میں رہنے والے وجود، کتابوں میں درج بے معنی نمبر نہیں گوشت پوست کے زندہ انسان بھی ہیں۔ جن کی تہذیب، جن کا تمدن، زندگی کی گرمی سے بھرپور خوشحال اور آسودہ چہروں میں دوڑتا ہے۔

اسی ثقافت کی خوش نما اوڑھنی اوڑھے، کانوں میں رس گھولتے، سُریلے قہقہوں، کسی اجنبی زبان میں سنائے گئے گیتوں اور نتھنوں سے ٹکرانے والی مہنگی اور پُراسرار خوشبوؤں کا میلا سجائے بیٹھی وہ سنڈریلا اپنے پرنس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس کی نہ بہن سوتیلی تھی نہ باپ......

شادی اس کی توقع سے کہیں زیادہ اختصار سے ہوئی پھر بھی اسے لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ خواب، جو تب تک خواب رہتا ہے جب تک آنکھ کھل نہ جائے اور اس کا اثر تب تک زائل نہیں ہوتا جب تک انسان حقیقت سے آنکھیں چار کرنے پر راضی نہ ہو جائے۔

شادی کے ریسپشن پر اس کی ملاقات پہلی بار فاروق کے گھرانے کی عورتوں سے ہوئی۔ اس کی ماں، اس کی دادی، اس کے بھائی اور کزنز کی بیویاں...... نوجوان لڑکیاں...... جن میں سے کئی کالج، یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ کوئی لاہور میں، کوئی ملتان میں، کوئی کہیں اور...... بہترین لہجے میں انگلش بولتی، وہ کہیں سے بھی کسی کم تعلیم یافتہ ملک کی

پیداوار نہیں لگتی تھیں۔

فاروق اسے مسکراتا دیکھ کر اس کے پاس آیا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لڑکیاں ہر فیلڈ میں آگے ہیں۔ تم دیکھنا، اگلے کچھ عرصے میں ہماری اپنی اسٹیفی گراف اور مارٹینا نیوراٹی لووا ہوں گی۔" یہ وہ سال تھا جب ٹینس کی دنیا میں گراف اور نیوراٹی لووا کے جادوئی گیم پر سائنسی تحقیق ہو رہی تھی اور وہ تیسری دنیا کا ذہین، ترقی پسند اسے یقین دلا رہا تھا کہ اس کا خاندان تعلیم اور ترقی کا کس قدر دلدادہ ہے۔ وہ مسکراتا تھا اور جان لے لیتا تھا۔ اس نے کتنی بار اپنا دل، اپنی آنکھوں میں دھڑکتا پا کر خود کو ڈپٹنے کی کوشش کی تھی۔ کیا وہ سولہ سال کی لڑکی کی طرح بی ہیو کر رہی ہے۔ کتنی بار اس روز وہ اپنے محبوب کی طبیعت کی جولانی پر نثار ہوئی تھی اسے یاد نہیں۔

"پلیز ایسے آنکھیں پھاڑ کے مت دیکھو بھابی سبرینہ...... سب جانتے ہیں تم باہر سے آئی ہو مگر یہاں ہماری کوئی عزت ہے، خدا کے لیے کچھ لحاظ کرو...... وہ رات کو تمہارے پاس ہی آئے گا۔"

یہ پاس کھڑی فاروق کی بجی بنی، خوشبودار اور تیز طرار کزن تھی۔ آئی شیڈ اور مسکارے سے بوجھل نقلی پلکوں کے پیچھے چمکتی ہوئی کاٹ دار مسکراہٹ اور رائل بلیو شیفون کی باریک تہ سے جھانکتے اس کے سپید، دودھیا بازو...... سبرینہ کی نظر پلٹی تو اپنے سرخ نیل پالش میں رنگے، حسین ناخنوں والی انگلیوں کی انگوٹھیوں میں الجھ گئی۔ جو اس کے ہاتھ کی بیرونی طرف سجائی گئی مہندی کے پیچیدہ ڈیزائن کا رستہ کاٹ رہی تھیں۔

اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا غیر مناسب حرکت سرزد ہوئی ہے...... کیا ابھی، ابھی اس نے اسی حق کے بدلے اپنی زندگی گروی نہیں رکھی۔

شادی کا ہنگامہ ٹھنڈا ہوا تو فاروق اسے لے کر گھومنے نکل پڑا۔

اسے بھوربن کا قیام، اسی خواب کا حصہ لگا جسے مسلسل دیکھنے کے بعد اس کی آنکھیں جیسے عادی نہیں ہو پا رہی تھیں۔

ملائم، چمکدار، پھسلتے فرش والے بڑے بڑے ہال...... دیواروں پر بجی قیمتی پینٹنگز...... زمین سے چھت تک آئینوں سے آراستہ دیواریں...... مہنگے دبیز قالین...... چھت سے لٹکتے بلوریں فانوس...... اور تخت طاؤس جیسے شاہانہ صوفوں پر دھنستے، ابھرتے، فرانسیسی سوٹوں اور کلف لگی شلوار قمیص پر قیمتی واسکٹس میں ہوانا کے سگار پیتے معزز دکھائی دینے والے رئیس...... وہ اس ملک کی کون سی کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے اسے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ ان کا تعلق اس ملک کے کسی ایسے طبقے سے ہے جو اقلیت میں ہوگا۔

تو پھر وہ پاکستان کون سا ہے جہاں دنیا کی مجموعی آبادی کے چار فیصد انسان غربت کی کم سے کم حد ایک ڈالر یومیہ سے کم پر زندہ رہتے ہیں۔ اناج کے ہر دانے سے لپٹے کئی بھوکے غربت کی بدنما لکیر تلے پیدا ہو کر اسکول جانے کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ جہاں دو تہائی بچے کبھی پرائمری اسکول کی شکل نہیں دیکھتے۔ انسانی ترقی کے اعشاریوں، ہیومن ڈیویلپمنٹ انڈیکس میں جس ملک کا نمبر ایک سو اٹھتر میں ایک سو چھتیسواں ہو وہ ملک جو پندرہ سے بیس لاکھ پناہ گزینوں کی میزبانی کا بوجھ اٹھائے اسلحے کے انبار جمع کیے بیٹھا ہے۔ جس کی ترقی اور معیشت کے پہیے کسی اور کے کاروباری ٹینڈر کھولنے اور بند کرنے کے محتاج چلے آ رہے ہیں۔ وہ ملک جس کی عوامی سیاست خلط ملط ہو چکی ہے۔ وہی عوامی سیاست جسے اس نے بہت قیمتی فیبرک کی شلوار قمیص پر واسکٹ پہنے، ہوٹل کی لابی، ڈائننگ ہالز اور باربی کیو کی ہوشربا خوشبو کے دوران اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کرتے، پچھلے دو دنوں میں خوب اچھی طرح دیکھا تھا۔

"تو پھر حقیقت کو کتابوں میں زیادہ ہی خوفناک

بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔'' اس نے فاروق کی بات کو غور سے سنتے، اس کی آنکھوں کی والہانہ چمک سے مسحور ہوتے اپنے اردگرد کی فضا میں موجود حد سے بڑھی ہوئی خوشگوار توانائی کو طمانیت بھری سانس کے ساتھ خود میں... بھر کر بے اختیار ہی مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

سبرینہ گیبریئل پریوں کی کہانیاں سن کر بڑی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے خود کو پہلی بار اقتصادیات کی کتابوں کے خشک اعداد و شمار... سے آزاد کر کے سچ مچ کے رنگین خواب دیکھنے کی اجازت دی تھی۔

خوشگوار ہلکورے لیتی سجی شام کی رعنائی چرانے وہ اب ہوٹل کی بالکونی میں آبیٹھے تھے۔ ڈوبتے سورج کی جادو بھری حلاوت کا مزہ دیتی کافی کے دوسرے ہی گھونٹ پر فاروق کو یاد آیا تھا کہ اس کا ابھی اسی وقت ہوٹل کی لابی میں ایک اہم شخصیت سے ملنا کتنا ضروری ہے۔ اہم شخصیت جس کو اس نے آج دوپہر کے بوفے لنچ کے دوران میں دریافت کیا تھا اور جو اس کے خاندان کا کوئی اہم بزنس کانٹیکٹ ہونے کے ساتھ اسلام آباد کا ایک اہم بیوروکریٹ بھی تھا، جسے آج ابھی اپنی کچھ ضروری میٹنگز نمٹا کر واپس اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا۔

فاروق منٹوں میں واپس آنے کا کہہ کر عجلت میں اٹھ کر گیا تھا مگر اس کی ادھوری کافی کی پیالی پر اب انتظار کی تہ گاڑھی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اندر اگر رنگوں کا سیلاب تھا تو باہر قدرت کا بیش قیمت حسن ستمبر کی خوشگوار ہوا سے اپنے ہونے کا خراج وصول کر رہا تھا۔ جسے کافی کا دوسرا پیالہ ہاتھوں میں بھرے، بھوربن کے پانچ ستارہ ہوٹل کی بالکونی میں اکیلی بیٹھی وہ اپنے اندر اتارنے کی کوشش میں ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ جس دنیا سے آئی تھی، وہاں ستمبر کی ان تاریخوں تک موسم خزاں کی خنک ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی تھیں۔

یقیناً ہوٹل بنانے کے لیے جگہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ پہاڑوں پر دور تک بچھا سبزہ جاتی شام کی کمزور پڑتی دھوپ کے ساتھ، کسی بھی انسان کو یہاں گھر بنانے کے خواب دیکھنے پر آمادہ کر سکتا تھا مگر لمحوں کی گدگدانے والی شاعری کو ایک اجنبی آواز نے درہم برہم کر دیا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔''

سلک کے کرتے پاجامے میں ملبوس، کندھے پر شاہانہ انداز سے تہہ کی ہوئی شال ڈالے، ویسی ہی جیسی اس نے لندن میں کچھ انڈین دوستوں کے گھروں میں فرشی نشست والی محفلِ موسیقی میں لوگوں کو پہنے ہوئے دیکھی تھی۔

درمیانے قد کا وہ شخص جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے۔ ایک زبردست مسکراہٹ سے لبریز چہرہ لیے اس کی اجازت کا انتظار کیے بغیر اس کرسی پر بس بیٹھ ہی چکا تھا جو کچھ دیر پہلے فاروق نے خالی کی تھی۔ ایسے اہتمام سے کندھے پر شال لٹکائے اس نے پاکستان آنے کے بعد اب تک صرف ایک ہی شخص کو دیکھا تھا اپنے آپ کو فخر سے کسان کہہ کر متعارف کروانے والے فاروق کے باپ، اپنے فادر ان لا کو جن کے بارے میں فاروق نے ایڈنبرا میں اسے بتایا تھا کہ انہیں اپنی زمینوں سے زیادہ سیاست اور اپنے وراثتی شوق پورے کرنے میں دلچسپی ہے۔

''شاید یہ شال یہاں سماجی مرتبے کی نشانی ہوتی ہے یا پھر سیاستدانوں کا یونیفارم......'' سبرینہ نے پیشانی پر شکن لائے بغیر حسین شام اور خوشبودار کافی کا آسودہ رومان ملیامیٹ کرنے والے شخص کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

''اوہ، کتنی خوب صورت مسکراہٹ ہے آپ کی...... میں وہاں لابی سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔'' وہ اس کے سامنے کرسی سنبھال کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ چکا تھا۔ اس کی انگلیوں میں دبے سگار کی یہ قسم ابھی، ابھی سبرینہ نے اندر لابی کے سگریٹ نوشوں کے لیے مخصوص حصے

میں کئی اہم نظر آنے والے ہاتھوں میں دیکھی تھی۔ جو شاید لیے بھی ہوتے ہوں گے۔

''مجھے کہنے دیجیے کہ میں نے اتنی خوب صورت مسکراہٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

اس کی انگلش ہر قسم کے ایکسینٹ سے پاک تھی۔

سبرینہ کو حیرت نہیں ہوئی۔ اس کے وجود سے کسی بے حد مہنگے پرفیوم کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر ہاتھ میں کافی کا کپ تھامے اس عجیب سے شخص کو دیکھتی رہی پھر اسے ہنسی آگئی۔

''تھینکس......'' اس نے اپنی بے ساختہ ہنسی کو خوش اخلاق مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کی مگر اسے تعریف سے زیادہ اس کے انداز پر ہنسی آرہی تھی۔

''کیا میں آج رات کی بال میں آپ کے ساتھ ڈانس کرسکوں گا۔'' اسے اور ہنسی آگئی...... وہ کوئی پاگل تھا اور پتا نہیں اسے کیا سمجھ رہا تھا۔

''آپ کی صورت سے لگتا ہے، آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔''

اس نے دیکھا، اس عجیب سے گول مٹول چہرے کی زبردست مسکراہٹ ایک دم چرمراگئی تھی۔ اس کے بال اڑے کشادہ ماتھے پر اب ناگواری کی شکنیں تھیں جیسے اسے اپنا مذاق سمجھا جانا، مذاق میں بھی پسند نہیں آیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہنس کیوں رہی ہو؟'' سبرینہ کو اس کے جلتی سگریٹ کی طرح بجھ جانے والے موڈ پر ترس آگیا۔

''معاف کیجیے میں یہاں اپنے شوہر کے ساتھ ہوں۔'' اس نے مصنوعی لحاظ داری کی کوئی کوشش بھی ضروری نہیں سمجھی۔ ''میں صرف اپنے شوہر کے ساتھ ہی ڈانس کروں گی۔ آج رات یا کسی بھی رات کی...... کسی بھی بال میں۔'' اپنے جملے کے آخری حصے کو جما، جما کر مسکراتے ہوئے کہہ کر وہ فصیح الدین مانڈوی والا کے چرمراتے ہوئے موڈ پر مزید غور کیے بغیر ایک حتمی سا ایکسکیوزمی کہنے کے بعد اپنی چیزیں اٹھا کر اپنا مذکورہ شوہر تلاش کرنے اٹھ کر جاچکی تھی۔ یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں تھا۔ واقعی...... سبرینہ گیبرئیل جہاں سے آئی تھی وہاں یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوگا لیکن فصیح الدین مانڈوی والا اس پانچ ستارہ ہوٹل میں اپنی تمام بزنس اینٹی ٹیز کے چیف ایگزیکٹوز کو لے کر اس مہنگے آر اینڈ آر...... ریسٹ اینڈ ریکری ایشن ٹرپ پر صرف ضروری بزنس میٹنگ کرنے نہیں آیا تھا...... کچھ اچھا وقت گزارنے بھی آیا تھا۔ اسے یہ معلوم کرنے میں صرف پانچ منٹ لگے کہ وہ جو بھاری برٹش لہجے میں، ابھی ابھی اسے اس کی اوقات یاد دلا کر گئی تھی۔ وہ دراصل کس کی بیوی ہے اور ہوٹل کے کس فلور کے کس کمرا نمبر میں ٹھہری ہوئی ہے۔

فاروق نے سبرینہ کو لابی میں آتے دیکھا۔ وہ جس سے بھی ملاقات کرکے آیا تھا۔ اس ملاقات نے اس کے مزاج پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ یہ ایک خوش قسمت دن تھا۔ دور سے آتی آسمانی شیفون کے نفیس سے ڈریس اور چوڑی دار پاجامے میں، وہ ایسی آفاقی اپسرا لگ رہی تھی کہ فاروق کو اپنی خوش قسمتی پر نئے سرے سے رشک آنے لگا۔

سبرینہ کو اس کا بیوروکریٹ دوست تو کہیں نظر نہیں آیا لیکن وہ خود جیسے کسی خوشگوار احساس کے تحت خوامخواہ ہی مسکراتا اس کے دل میں اترا جارہا تھا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان بھی اسے لگا اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔ وہ ان آنکھوں میں جگمگاتی ہر تحریر پڑھ سکتی تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی وہ اس سے ایک ایسا برتی، ایسا زبردست تعلق محسوس کررہی تھی جسے کسی لفظ، کسی لمس کی حاجت نہیں تھی۔ کاش وہ اپنے باپ کو دکھا سکتی کہ اس نے کیسا شاندار شخص اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

''او ڈیڈی کاش آپ مجھے خوش دیکھ سکتے، کاش آپ بھی یہاں ہوتے۔''

☆☆☆

فصیح مانڈوی والا زیادہ دیر بالکونی میں نہیں بیٹھ

سکا۔ اسے اندر جانا تھا۔ وہ مضحکہ اڑاتی اپسرا اسے چیلنج کر کے کہیں جا نہیں سکتی تھی۔ ہوٹل کے کشادہ دبیز قالینوں والے آراستہ ہال میں ہونے والی شام موسیقی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ فرشی نشست پر خوشبوؤں سے مہکتے نازک وجود اپنے، اپنے عزیز رشتوں کے ساتھ معروف گلوکاروں کے دل پسند گیتوں سے لطف اندوز ہوتے مست ہوئے جا رہے تھے۔

ایک مناسب ٹپ ہوٹل استقبالیہ کے رکن کے ہاتھ پر رکھ کر اسے فاروق فیروز خان اور اس کی ہوشربا بیوی کے برابر نشست حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ گانے والے کی آواز میں آواز ملا کر لہکتے، مسکراتے، بگڑے رئیسوں کی طرح، اپنے سر پر وار کر، گانے والی پر نوٹ نچھاور کرتے اس شخص کے انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ فاروق فیروز نے اپنی بیوی سے دھیان ہٹا کر اس سے جان پہچان بڑھانے والی گفتگو شروع کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

سبرینہ گیت کے بول سمجھنے سے قاصر تھی مگر جادو بھرے گیت کی دل کو چھو لینے والی دھن میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ جس نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کے پہلو میں کسی دوسرے کی محبت کا گیت خوب اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

اس نے بالکونی میں ملنے والے مسخرے کو بے تکے انداز سے گانے والے پر کرنسی نوٹ نچھاور کرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی کہ اس کا محبوب شوہر اس مسخرے سے گفتگو کر رہا تھا۔ شاید ان کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔

اگلا پورا دن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ سرور سے بھری شام کو پہلا جھٹکا تب لگا جب اسے پتا چلا اس کے شوہر نے اسی مسخرے کو اپنے کمرے میں شام کی چائے پینے کی دعوت دے رکھی ہے۔ سبرینہ اس ہنی مون ٹرپ کو بزنس میٹنگ بنانے پر الجھ گئی تھی...... لیکن فاروق کا خیال تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں...... وہ ایک طویل اور ناخوشگوار شام تھی۔ نئے، نئے لوگوں سے ملنے کی شوقین ہونے کے باوجود وہ ٹھیک سے نہیں جان پائی کہ اسے اس مسخرے میں کیا برا لگ رہا ہے۔ جس کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک اسے دیکھتے ہی مزید تیز ہو گئی تھی۔ سبرینہ سر سے پاؤں تک بہترین پاکستانی لباس میں تھی مگر اسے لگا مسخرے کی آنکھیں کم لباسی کا احساس دلا رہی ہیں۔ وہ دونوں باہمی دلچسپی کی بات کر رہے تھے۔ زمینوں کی، اسٹاکس کی، کاروبار... کی، ملکی حالات کی...... اور کچھ تھا جو ٹھیک نہیں تھا۔ پھر فاروق کو ہوٹل کے استقبالیہ سے آنے والی ایک ضروری فون کال نے مہمان سے معذرت کر کے نیچے لابی میں کسی ایمرجنسی ملاقات کے لیے کمرے سے باہر جانے پر مجبور کر دیا۔

مسخرہ تنہائی ملتے ہی بھرپور مسکراہٹ اور انتہائی خوش مزاجی کے ساتھ ذاتی سوال پوچھنے لگا۔

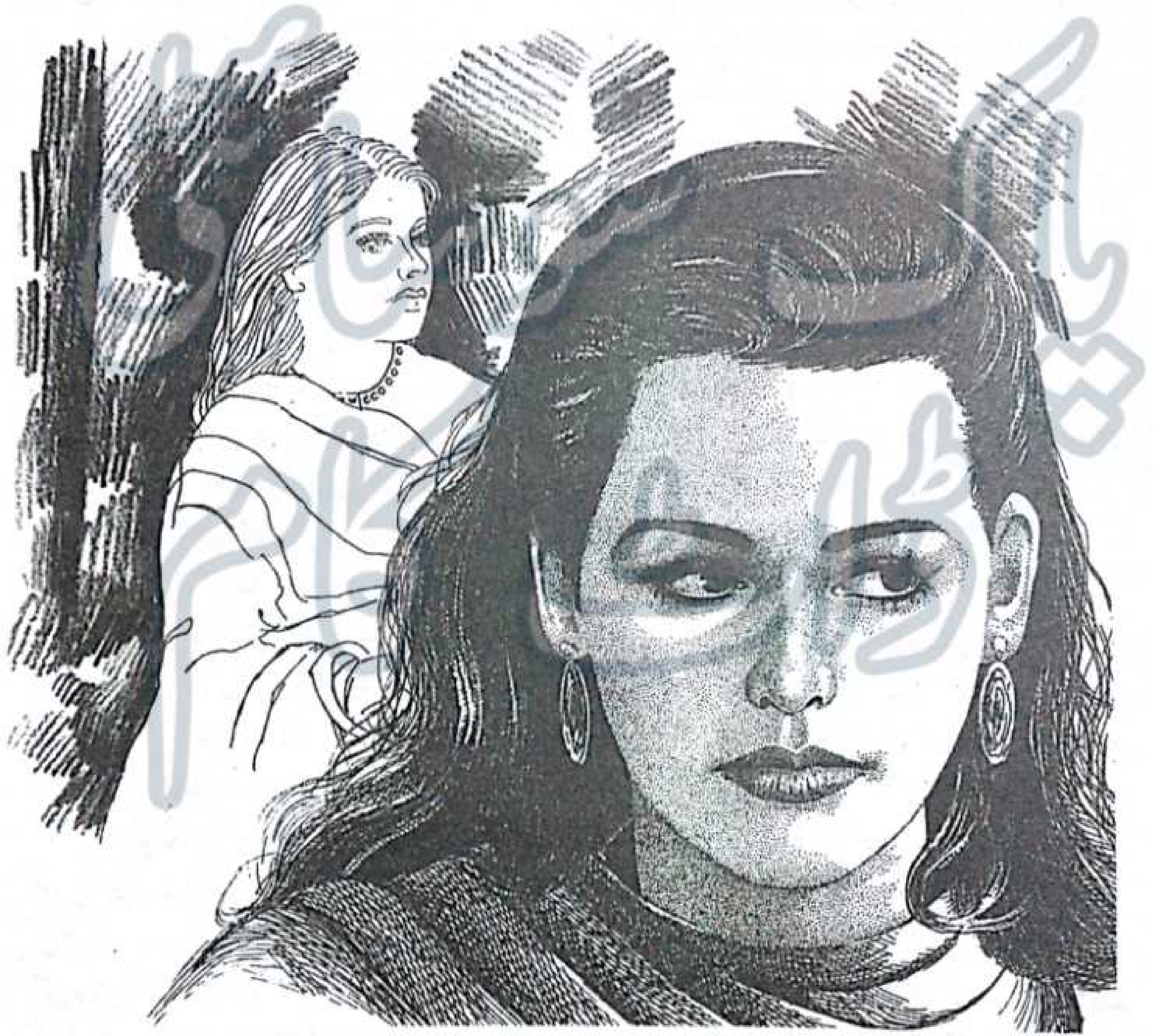
سبرینہ کو بے حد عجیب احساس ہوا۔ فاروق نے واپس آنے میں بہت دیر لگا دی تھی۔ روم سروس کا خوب اکڑی ہوئی کلف لگی وردی والا مؤدب ویٹر پُرتکلف چائے کی ٹرالی لا چکا تھا۔ جسے مہمان کو پیش کرنے کی روایت سے آگاہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر مسخرے کو ''چائے لیجیے'' کا مشورہ دیا تھا۔

وہ بار، بار اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال رہی تھی۔ اس کے انتہائی ذاتی اور بے تکے سوالوں کے جواب میں کوئی سخت بات کہنے سے خود کو باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر وہ اسے کیوں بتاتی کہ اس کا فاروق سے عشق کتنے عرصے میں شادی تک پہنچا تھا۔ حتیٰ کہ جس وقت مسخرے نے اس کے منہ سے روکتے، روکتے بھی پھسل جانے والے ٹکڑا توڑ جواب پر بے وجہ ہی اونچا سا قہقہہ لگاتے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تھی...... فاروق نے واپس کمرے میں قدم رکھا تھا۔ مسخرہ اٹھتے، اٹھتے بدمزہ ہوا تھا۔ سبرینہ کی جان میں جان آئی تھی۔

(باقی آئندہ)

اک نئی روشنی

فرحین عثمان



سورج کی تپش کے ساتھ، ساتھ اب زمین بھی آگ اگل رہی تھی۔ بس سے اتر کر یہاں تک آتے، آتے اس کے پاؤں جلنے لگے تھے۔ پسینے میں شرابور وہ اس بوسیدہ بلڈنگ تک پہنچ ہی گئی اور اب دوسری منزل چڑھ رہی تھی۔

''السلام علیکم......'' تھکن کے باوجود اس نے بہت مسکراتے ہوئے خالہ کو سلام کیا اور اندر داخل ہوگئی۔ گرمی تو اندر بھی تھی لیکن سایہ بھی بڑی نعمت ہے

کہ دھوپ سے خلاصی ہوئی۔ خالہ کے گھر میں حسب توقع اور حسبِ روایت خاموشی کا راج تھا۔ اس گھر کے مکین زندگی گزار نہیں رہے تھے بلکہ زندگی انہیں گزار رہی تھی۔ یہ ثوبیہ کا ذاتی خیال تھا۔ اس کے جیسی لڑکی کے لیے ایسا ماحول کبھی، کبھی ناقابلِ برداشت ہونے لگتا۔ وہ فطرتاً خوش مزاج اور زندہ دل تھی پر یہاں آ کے چڑچڑی ہونے لگی تھی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر کمرے سے باہر آئی تو خالہ کھانا گرم کیے اسی کا انتظار کر رہی تھیں، دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ خالو اس وقت اپنے کام پر ہوتے تھے۔ شام میں ان کی واپسی ہوتی اور تب ثوبیہ کو یہ دو کمروں اور ایک لاؤنج پر مشتمل فلیٹ مزید چھوٹا لگنے لگتا۔ کھانا ختم کر کے وہ واپس کمرے میں آگئی۔ یہ خالہ کا کمرا تھا جو فی الحال ثوبیہ کی بھی قیام گاہ بنا ہوا تھا اور دوسرا کمرا خالو کی ملکیت...... بس گھر کے یہی دو مکین تھے اور شاید دونوں ہی بولنے کی عادت میں مبتلا نہیں تھے بس ضرورتاً زبان کا استعمال کیا کرتے...... باہر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی یا لوگوں کے باتیں کرنے کی تو وہ آوازیں اسے بیزار کرنے کے بجائے سکون کا باعث بن جاتیں کہ کم از کم اس بلڈنگ میں نارمل انسان بھی بستے تھے، ہنسنے بولنے، رونے والے ورنہ خالہ، خالو کی یکسانیت بھری ایک روٹین اسے اکتائے رکھتی۔

باہر ایک چھوٹا سا ٹیرس بلکہ مختصر سی بالکونی جو مکمل طور پر گرل سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن وہاں جانے پر خالو کی طرف سے پابندی تھی۔ اسے خالہ نے بتایا تھا کہ وہ بھی وہاں صرف کپڑے لٹکانے جاتی تھیں اور حیرت ثوبیہ کو تب ہوتی جب وہ باہر کی طرف نظر اٹھائے بغیر اندر آجایا کرتیں تو ثوبیہ کڑھتی کہ کیا باہر والے انہی کے نکلنے کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ بس خالو کا آرڈر تھا سو خالہ کے لیے پتھر پر لکیر تھا۔

یہاں آنے سے پہلے تک ان سب باتوں سے وہ قطعی لاعلم تھی۔ اس کی یہ چھوٹی خالہ بیاہ کر دوسرے شہر (کراچی) گئی تھیں وہ گاؤں بہت کم آتی تھیں۔ کبھی کبھار خاص، خاص موقعوں پر...... ثوبیہ ان سے کم ہی ملی تھی اور خالو کو تو وہ تین یا چار مرتبہ ہی دیکھ پائی تھی۔

اماں، بانو خالہ کی باتیں بتایا کرتیں۔ وہ چھوٹی بہن کو بہت یاد کرتی تھیں جو بیاہ کر بہت دور چلی گئی تھیں اور ثوبیہ کے نزدیک تو وہ بہت خوش قسمت تھیں کہ گاؤں کے بجائے کراچی جیسے بڑے شہر میں رہ رہی تھیں۔ دور کے ڈھول سہانے کے مصداق دور سے لگائے گئے اندازے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ قریب ہونے پر حقیقت واضح ہوجاتی ہے اور اب ثوبیہ کو خالہ بڑی صبر والی لگتی تھیں جو ایسی قید بامشقت والی زندگی گزار رہی تھیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی اس کو بہت پسند آئی یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ سیٹ ہوگئی تھی۔ پڑھائی بھی اچھی چلنے لگی۔ گاؤں سے ہی اس نے بی اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ثوبیہ بڑی تھی گھر میں دو چھوٹی بہنیں اور دو بھائی اور تھے۔ اماں ہنسنے بولنے والی خاصی ملنسار خاتون تھیں۔ آگے پڑھنا ثوبیہ کا خواب تھا اور اچھا ہوا کہ والدین نے اسے اجازت بھی دے دی۔ ابا کو بس اس کا ہاسٹل میں رہنا مناسب نہیں لگا تو یہ اماں اور ابا کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ وہ خالہ کے گھر رہ جائے جو یونیورسٹی کے قریب کسی علاقے میں تھا۔ بانو خالہ اور خالو سے بات ہوئی ابا کی تو انہوں نے بھی ہمت بندھائی اور یوں وہ ابا کے ساتھ بانو خالہ کے فلیٹ میں آگئی۔ ایڈمیشن تو ہو ہی چکا تھا ابا اس کو چھوڑ کر دو دن بعد واپس گاؤں چلے گئے تھے۔ وہ حیرت سے بانو خالہ اور ان کے گھر کو دیکھتی رہی تھی۔ اتنا تنگ و تاریک فلیٹ، دیواروں کا جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا، وہ تو بچپن سے کچھ اور ہی تصور کرتی آئی تھی اور خالہ کی خاموشی یا بہت ہی آہستہ آواز میں بات کرنا، بے رنگ آنکھیں...... وہ تو ایسے رہ رہی تھیں جیسے قید کر کے لائی گئی ہوں۔ کسی بہتری کی امید اور تبدیلی کے بغیر وہ ان کا موازنہ اماں سے کرتی اور حیران پریشان ہوجاتی۔ جلد ہی اسے وجہ

بھی سمجھ آگئی۔ خالو بہت مختلف قسم کے آدمی تھے۔ انہیں اپنی بیگم کا کہیں آنا، جانا، ملنا ملانا بالکل پسند نہیں تھا اور اس کی اماں تو بہت زندہ دل اور ملنسار خاتون تھیں ان کے ہاں محلے والیاں آتی جاتی رہتیں اور وہ بھی سر پر چادر تان کر آس پڑوس میں ہو آتیں۔ ابا کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔

اسے یہاں کے ماحول کا عادی ہونے میں تھوڑی مشکل پیش آرہی تھی اس نے اماں سے بھی ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولیں۔

''ہر کسی کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور شوہر کی تو ماننا ہی پڑتی ہے اور بانو اسی طرح بہت خوش ہے، ہر ضرورت پوری کرتا ہے شوہر اس کی۔ اچھا کماتا ہے، بس اولاد کی کمی ہے وہ اللہ کی مرضی......''

''خیر چلو یہ تو خالہ کا مسئلہ ہے، میں نے تو بس دو سال پورے کرنے ہیں۔'' اس نے خود ہی خاموشی کی چادر اوڑھ کر سارا دھیان پڑھائی کی طرف لگالیا۔

☆☆☆

ایک سمسٹر گزر چکا تھا وہ مطمئن تھی۔ یونیورسٹی میں ٹائم اچھا گزر رہا تھا۔ گھر میں خالہ پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتیں اس کا پورا خیال رکھتیں مگر اس کے باوجود وہ چاہ کے بھی اب تک ان سے فرینک نہ ہو پائی تھی۔ بہت نپا تلا ہی بولنا پڑتا تھا۔

☆☆☆

چھٹیاں ہوئیں تو ابا آکر اس کو گھر لے گئے، گھر آکر اس نے سکھ کی سانس لی۔ گھر کا ویسا ہی خوشگوار ماحول تھا اور اب تو خالہ کے گھر سے آنے کے بعد اسے اپنے گھر کے در و دیوار بھی آزادی سے مسکراتے محسوس ہوتے تھے۔ وہاں تو ہر چیز ہی پر اداسی چھائی رہتی۔

ایک دو دن کے آرام کے بعد اس نے اماں اور بہنوں سے خوب باتیں کیں۔

''ہائے اماں، آپ کی بہن تو وہاں سمجھیں ظالم دیو کی قید میں ہیں۔''

''بری بات ثوبیہ! انہی کے گھر میں رہ رہی ہو اور ان کے بارے میں ایسی باتیں...... خاموش ہو جاؤ۔'' اماں نے پیار بھرے لہجے میں ڈپٹ دیا لیکن وہ بھی مستقل خاموشی سے ایسی بیزار ہو کر آئی تھی کہ زبان اب قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

''اماں، سچ کہہ رہی ہوں، بہت خوش قسمت ہیں آپ، ابا کا ساتھ ملا...... پر خالہ کے ساتھ ایسا کیوں ظلم کیا نانا ابو نے؟''

اماں کو بھی اس بات پر ہنسی آگئی لیکن ثوبیہ کی زبان کو بریک لگ کے نہیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

خوب مزے لے کر کے تمام چھٹیاں گزار کر وہ واپس کراچی آگئی۔ اس کا ارادہ تو اماں کو بھی ساتھ لانے کا تھا۔ دل تو اماں کا بھی بہت کرتا تھا بہن سے جا کر ملنے کا لیکن بہن اور بہنوئی پر بوجھ ڈالنا اور اب تو ثوبیہ بھی رہ رہی تھی، گھر بھی چھوٹا تھا تو وہ بس سوچ کر ہی رہ گئیں۔ ان کو لانے کا ارادہ ثوبیہ نے اس لیے کیا تھا کہ شاید اماں، بہن کی زندگی میں کوئی تبدیلی لاسکیں۔

لیکن ایک دن انہونی ہو ہی گئی۔ خالہ کے گھر مہمان آگئے۔ ان کی جیٹھانی اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ چلی آئیں۔ جیٹھانی ذرا چالاک سی خاتون لگ رہی تھیں جبکہ خالہ ان کے آگے اور معصوم اور زیادہ مظلوم سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ثوبیہ کو گہری نظروں سے دیکھتی رہیں جبکہ ان کا بیٹا ثوبیہ کو خالو جیسا ہی لگا۔ اور خالو کے بھائی تھوڑے مختلف مزاج کے لگے۔

رات کھانے کے بعد مہمانوں کی واپسی ہوئی تھی اتنے عرصے میں اس گھر میں یہی تبدیلی آئی تھی۔

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا۔ پڑھائی کی مصروفیت بڑھ گئی تھی لیکن کبھی، کبھی ثوبیہ ایسے سونے ماحول سے گھبرا جاتی۔ ابا نے اس کے لیے پیسے بھیجے کہ خالہ کے ساتھ جا کر گرمیوں کے کپڑے خرید لینا۔ ثوبیہ نے خالہ سے بات کی، خالہ نے خالو سے اور پھر بازار جانا بھی ایک مسئلہ بن گیا۔

خالو کو بیوی کے بازار جانے پر بھی اعتراض تھا کیونکہ خالہ کی ضرورت کی چیزیں وہ خود ہی لا دیا کرتے تھے۔ ثوبیہ شدید کوفت کا شکار ہوئی۔

''تو کیا میں ان کی چڑیا کو وہیں گم کر آؤں گی جو پریشان ہو رہے ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

خالہ، ثوبیہ کو اداس دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں اِدھر خالو کو راضی کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔

''کوئی مسئلہ نہیں خالہ، میں یونیورسٹی سے ہی کسی فرینڈ کے ساتھ جا کر کپڑے خرید لوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔'' ان دونوں کو پریشان کرنا بہر حال اس کا مقصد نہیں تھا اور تھوڑی ہی دیر میں خالو نے خالہ کو اس کے ساتھ بازار جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ خوش ہو گئی لیکن وہاں جا کر اسے اندازہ ہوا کہ خالہ کو ساتھ لا کر واقعی اس نے غلطی کی تھی۔ خالہ بہت ڈری سہمی سی تھیں اور ہر پانچ منٹ بعد وہ گھڑی دیکھتے ہوئے اسے واپس چلنے کا کہنے لگتیں۔ کپڑوں کی خریداری میں بھی کوئی مشورہ نہیں دے پا رہی تھیں۔ ان کی ایسی حالت کے پیشِ نظر تھوڑی ہی دیر میں اسے گھر واپس آنا پڑا اور گھر آ کے پتا چلا خالو کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی وہ بے چین اور فکر مند ان کے واپس آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور بیچاری خالہ اپنے گھر واپسی پر ایسے خوش ہو رہی تھیں جیسے انہیں واقعی خدشہ تھا کہ وہ اب کبھی گھر نہیں آ سکیں گی۔

ثوبیہ کو آج یہ دونوں میاں، بیوی نارمل دنیا سے بہت مختلف لگے۔ کچھ تو تھا ایسا کہ یہ خوف میں مبتلا تھے۔ وہ سوچتے، سوچتے تھک گئی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔

☆☆☆

گرمی اور پڑھائی دونوں زوروں پر تھیں، ثوبیہ مصروف ہو گئی۔ خالہ اس کا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ اماں سے فون پر بات بھی کم، کم ہوتی تھی۔ تھوڑی مصروفیت میں کمی آئی تو اس نے اماں کو تفصیلی فون کیا اور یہاں ایک بڑی خبر اس کی منتظر تھی۔

''اماں...... کیا کہہ رہی ہیں، میری بات پکی ہو گئی؟ لیکن کب؟'' اماں سے دوستی اپنی جگہ لیکن زیادہ تفصیل وہ نہ پوچھ پائی کہ کس سے طے ہوئی۔ اسے اندازہ تھا کہ اماں، ابا جلد اس کی کہیں منگنی کر دیں گے کیونکہ اس کے گاؤں میں اس کی ہم عمر لڑکیوں کی شادیاں ہو رہی تھیں۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اس سے پوچھے اور بتائے بغیر ہی ہاں ہو گئی لیکن کہاں......؟ یہ کوئی بتا نہیں رہا تھا۔ یقیناً اس کی پڑھائی سے اس کا دھیان نہ ہٹ جائے اسی وجہ سے اسے کوئی نہیں بتا رہا تھا۔ چلو یہ پہیلی تو اب گھر جا کر ہی سلجھنا تھی۔ لیکن ایک یقین اس کے اطمینان کا باعث بنا ہوا تھا کہ اس کے والدین نے جو بھی فیصلہ کیا ہوگا وہ اس کی بہتری کے لیے ہی کیا ہوگا۔

☆☆☆

لیکن ثوبیہ کا یہ اطمینان محض چند روزہ ہی ثابت ہوا جب اس کی دوست ہما کا فون آیا۔ وہ اس کی بچپن کی دوست تھی جس کی شادی پچھلے سال ہو چکی تھی۔

سلام دعا، حال احوال کے بعد ہما نے اسے مبارک باد دی بات پکی ہونے کی اور اس کی اگلی بات ثوبیہ کے پیروں سے زمین کھینچنے کے لیے کافی تھی۔

''کل چاچی نے بتایا کہ تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے تمہارے خالو کے بھتیجے سے۔''

اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اماں کو فون کیے بیٹھی تھی۔ یونیورسٹی کے ایک کونے میں وہ روہانسی ہو کر اماں سے اس بارے میں پوچھ رہی تھی اور اماں کا سکون قابلِ دید تھا۔

''ہاں بیٹا...... تیری بانو خالہ کی خواہش تھی اور بانو اور رشید (خالو) کے بھروسے ہم نے یہ رشتہ طے کر دیا۔ تمہارے ابا بہت خوش ہیں۔''

وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ لڑکا بالکل خالو کے جیسا ہے تو وہ بھلا کیسے رہ پائے گی اس کے ساتھ لیکن اماں کی آخری بات......

"ابا بہت خوش ہیں۔" نے اس کی زبان پر تالے لگادیے تھے۔ البتہ وہ خالہ سے ناراض تھی، بے حد ناراض، سب جانتے ہوئے بھی انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

"کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" خالہ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح محبت بھرا دھیما، دھیما سا اب اسے خوش نہیں کررہا تھا۔

"سر میں درد ہے۔" سر درد تو اب مستقل ساتھی بن گیا تھا اس کا۔

"اوہ، کھانا کھالو، میں چائے بنادیتی ہوں پھر آرام کرلینا۔" خالہ اور ثوبیہ کھانا کھارہے تھے فرق صرف یہ تھا کہ پہلے ثوبیہ، خالہ کے بولنے کی منتظر رہتی تھی، اب خالہ، ثوبیہ کو سننا چاہتی تھیں اور اس کی طرف سے مسلسل خاموشی ہوا کرتی تھی۔

"نادر آیا تھا آج اسی کے لیے کریلے بنائے تھے بس کھانا کھاکے چلا گیا۔"

پتا نہیں کریلے کڑوے تھے یا نادر کا ذکر ثوبیہ سمجھ نہیں سکی۔

"بڑا پیارا بچہ ہے۔" خالہ اسے بتارہی تھیں۔

"آپ کی عینک کتنی پرانی ہے؟" وہ بہت بے تکا سوال پوچھ بیٹھی، مقصد صرف موضوع بدلنا تھا جب آج تک خالہ اور اس کے درمیان ایسی باتیں نہیں ہوئیں تو اب ثوبیہ کو کوئی شوق نہیں رہا تھا۔

"ہاں کیا......؟ عینک، ہاں پرانی ہوگئی ہے رشید سے کہوں گی، بدلوادیں۔" خالہ عینک اتار کر دوپٹے سے صاف کرنے لگیں۔

"چھوٹا تھا تب میرے پاس رہا کرتا تھا، تمہارے خالو پر گیا ہے پورا۔"

خالہ پھر شروع ہوچکی تھیں اور پتا نہیں پیار ان کو خالو پر آرہا تھا یا نادر پر، وہ بہت محبت سے ذکر کررہی تھیں۔

"اور اسی وجہ سے نادر مجھے سخت ناپسند ہے کہ وہ خالو پر گیا ہے۔"

محبت

محبت کی قبر پر اقرار کا
کتبہ لگا رہا ہے......وہ
جس......نے
برسوں پہلے اقرارِ محبت
سن کر کہا تھا
محبت......
کیا ہوتی یہ؟
بے جاں جذبوں کی عبارت
یا......!
بے معانی لفظوں کا
مجموعہ!
ہاں شاید اک کھلونا ہے
محبت!
اور وہ جو تردید کرتے ہوئے
لوٹ گیا تھا
آج......!
صدیوں کے سفر سے لوٹا ہے
تو......
سرخ آنکھیں لیے
محبت کی قبر پر سرِ تسلیم خم کیے

از: عطیہ زہرہ، پنجاب

یہ بات صرف وہ سوچ سکی، بول کر خالہ کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

پھر اگلی چھٹیوں میں جب وہ گھر آئی تو خالہ، خالو اور نادر کے سب گھر والے بھی آگئے اور منگنی کے بجائے نکاح کردیا گیا۔ وہ انکار کرکے اپنی تعلیم کو طعنہ نہیں دلانا چاہتی تھی، والدین نے اس کی خواہش پوری کی تھی اب اسے والدین کی خواہش پوری کرنا تھی۔

ماسٹرز کمپلیٹ ہونے ہی والا تھا۔ اب یہ اس کا خالہ کے گھر کا آخری چکر تھا۔

اس نے پورے دو سال تقریباً گزار لیے تھے اب اس کو خاموشی بری نہیں لگتی تھی۔ اداسی باہر سے زیادہ اب اس کے اندر جگہ بنا چکی تھی۔

''ثوبیہ بہت خاموش ہوگئی ہو بیٹا۔'' خالہ اب اکثر اس سے پوچھنے لگی تھیں۔

اور وہ ہر بار خالہ کو یہی جواب دیتی کہ میں آپ کے جیسی ہوگئی ہوں۔ آپ بھی تو بہت کم بولتی ہیں۔

اب تو خالو بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ ثوبیہ پہلے جیسی نہیں لگتی۔ پریشان رہتی ہے وہ اکثر آئس کریم لے آتے۔ اس کا دل بہلانے کو ایک دو بار باہر گھمانے بھی لے گئے پر ثوبیہ کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ وہ چاہ کر بھی اب زیادہ نہیں بول پا رہی تھی۔

اسے خالہ سے بہت گلے شکوے تھے خالہ نے کیوں نادر کو اس پر مسلط کیا تھا جبکہ وہ جانتی تھیں کہ خالو جیسی طبیعت والے کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے لیکن یہ سب وہ خالہ کو نہیں بتا سکتی تھی۔

اس دن اس کا آخری پیپر تھا، ابا کو اس نے پہلے ہی بلوا لیا تھا اب وہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ دو سال پہلے آنے والی ثوبیہ اور آج جو جا رہی تھی میں بہت فرق تھا خالہ کے گھر کی بے رونقی وہ ساتھ لے کر جا رہی تھی۔ خالہ اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''تمہارے خالو بہت چھوٹے تھے جبھی سے اماں سے زیادہ اپنی آپا کے قریب تھے۔ آپا بہت زندہ دل شوخ و چنچل لڑکی تھیں۔ یہ لوگ گاؤں میں رہتے تھے پھر اللہ جانے آپا کو کیا سمائی، کس نے بہکایا کہ وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ رات کے اندھیرے میں...... کہنے والے کہتے تھے کہ شہر سے کوئی لڑکا آیا تھا وہ بھگا کر لے گیا۔ وہ تو چلی گئیں لیکن باقی رہ جانے والے گھرانے کی زندگی عذاب بن گئی۔ باپ طعنے دینے لگا ماں کو...... ہر وقت لڑائی دنگا فساد رہتا گھر میں۔ اماں، بیمار ہو کے مر گئیں۔ ابا نے خاموشی میں باقی دن کاٹے۔ رشید نے ان سب باتوں کا بہت اثر لیا۔ زمانے کے طعنوں سے یہ لوگ گھر بار چھوڑ چھاڑ اس شہر میں آگئے۔ ڈھیروں وقت گزر گیا لیکن رشید کا وہ ڈر نہ نکل سکا۔''

ثوبیہ سارے کام چھوڑ چھاڑ خالہ کے ساتھ آ بیٹھی۔

''بس بیٹا اسی لیے خالو مختلف ہیں، ذرا لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ میں نے بھی انہیں بدلنے کی کوشش نہیں کی، اولاد ہوتی تو شاید بہل جاتے بس...... ہم نے سب سے کنارہ کشی اختیار کر کے زندگی گزار دی۔''

''تو یہ وجہ ہے خالہ، آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کبھی؟''

''بس بیٹا دوسروں کے راز نہیں کھولنے چاہئیں۔ نادر ایسا صرف دیکھنے میں لگتا ہے' اصل میں ایسا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا وہ بالکل نارمل انسان ہے اور تو بھی تو بانو نہیں ہے تو کیوں گھبراتی ہے، تیرے پاس تو روشنی ہے، علم کی روشنی، تو تو دل بدل سکتی ہے پھر کیوں پریشان ہوتی ہے میری بیٹی۔''

ثوبیہ کے چہرے پر شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس کا مطلب.. خالہ اس کے دل کی حالت سے واقف تھیں۔ اس کے خوف اور گھٹن سے بھی اور خالہ نے کتنی بڑی بات کر دی تھی۔ تعلیم کی روشنی...... ہاں اس کے پاس تھی علم کی شمع، وہ اندھیرا کم کر سکتی تھی اور جس طرح اس نے خاموشی سے ابا، اماں کا فیصلہ قبول کیا تھا ایسے ہی اب عقل و شعور سے اپنے اور نادر کے لیے آسانیاں پیدا کرنا تھیں۔ تعلیم ہی تو شعور سکھاتی ہے، معاشرے میں رہنے کے طور طریقے بتاتی ہے اور ذہنوں کو کشادہ کرتی ہے۔ واقعی اس کے پاس تو بہت روشنی تھی۔

وہ اپنے آنسو پونچھ کر خالہ کے گلے لگ گئی۔ ابا اور خالو کہیں گئے ہوئے تھے۔ آج اس کے اور خالہ کے درمیان فاصلے ختم ہوگئے تھے۔ خالو سے بھی اسے کوئی گلہ نہیں تھا، نہ اپنی قسمت سے...... اس کے پاس نئی روشنی تھی کٹھن سفر میں اجالا کرنے کے لیے۔

بہشتی زیور

ہاجرہ ریحان

میری اُن سے صرف ایک ہی دفعہ ملاقات ہوئی تھی...... وہ بھی جب میں بہت چھوٹی تھی اور وہ ملاقات بھی ایسی تھی کہ جس نے میرے ذہن پر کوئی بہت گہرا اثر نہیں چھوڑا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ شام کو کھانے کی میز پر سب جمع تھے...... چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے...... میں نے جھٹ سے کسٹرڈ کی ڈش پر ہاتھ مارنا چاہا تو چھوٹی پھپو نے مجھے ٹوکا۔

''ارے لینے دو بچی ہے...... دل چاہ گیا ہے تو کیا ہوا۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

''جی نہیں، ہم نہیں چاہتے کہ ابھی سے یہ سب تہذیب تمیز بھول جائے...... آخر کولڑکی ہے...... کسی اور کو ہو نہ ہو ہمیں اپنی ناک بہت عزیز ہے۔'' پھپو جو ہر وقت جلی کڑھی رہتی تھیں کھٹ سے بولیں۔

انہوں نے بڑے اطمینان سے چھوٹی پھپو کے بات مکمل کر لینے کے بعد ایک خالی پیالہ اٹھا کر اس میں کسٹرڈ لبالب بھرا اور چھوٹا چمچہ رکھ کر میرے آگے رکھ دیا...... میں کبھی امی تو کبھی چھوٹی پھپو کو دیکھتی۔

''بہشتی زیور...... خبردار...... تم کچھ نہیں کہو گی۔''

انہوں نے امی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ امی کو پیار سے بہشتی زیور کہا کرتی تھیں...... کیونکہ امی پورے خاندان میں اپنے سگھڑاپے کی وجہ سے مشہور تھیں...... 'بہشتی زیور' نے مسکرا کر اجازت دے دی اور میں مزے میں کسٹرڈ میں ڈوب گئی مگر ایک احساس ہو گیا تھا کہ ان کے سامنے رہنا بڑوں کے درمیان تناؤ کا سبب بن سکتا ہے۔ لہٰذا میں خود ان سے چھپنے لگی تھی۔ وہ اس بار آخری دفعہ پاکستان آئی تھیں۔ کوئی بہت ہی خاص بات بتانے...... ہاں صرف بتانا مقصود تھا کیونکہ فیصلہ وہ کر کے آئی تھیں۔

وہ فیصلہ انہوں نے پہلی ہی رات بھری محفل میں سنا دیا تھا...... جس پر پورے خاندان میں چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں...... بڑے بوڑھے بہت ناراض تھے۔ جوان اُن کو نظر انداز کرتے اور ہم جیسے بچے ویسے ہی ان کی بارعب شخصیت کے زیرِ اثر ان سے دور، دور ہی رہتے تھے...... ان کو خاندان بھر کی مخالفت کا سامنا رہا مگر وہ ضد پر اڑ چکی تھیں۔

اب یاد کرتی بھی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں کوئی بہت زیادہ جاذبیت نہیں تھی۔ بس سڈنی میں رہنے کی وجہ سے شاید ہر کوئی ان سے ویسے ہی رعب میں آجاتا تھا۔ پڑھی لکھی تھیں مگر جس طرح کا ٹھہراؤ ان کی شخصیت میں تھا، مجھے وہ بڑی اچھی لگی تھیں...... بات کرنے سے پہلے ذرا دیر کو مخاطب کو غور سے دیکھتیں کہ جیسے اندازہ لگا رہی ہوں کہ ان کی بات کو سمجھا جائے گا یا نہیں...... ہاں باتیں بڑی نپی تلی کرتی تھیں...... وہ ہمارے گھر میں ہی ٹھہری ہوئی تھیں اس لیے رشتے داروں کا تانتا بندھا رہتا تھا...... سب کو ان سے شکایت بھی تھی مگر سڈنی سے آئی ہوئی مخلوق کو دیکھنے کا شوق بھی بہت تھا...... رشتے دار تو سب ہی تھے مگر اصل دوستی ان کی شاید صرف امی سے تھی اور امی بھی جب تک وہ پاکستان میں رہیں ان کو مکمل تحفظ دیتی رہیں...... انہوں نے جب اعلان کیا تو ڈیڑھ ہفتہ لوگوں کی مخالفت پر امی کے ساتھ رات میں بیٹھ کر گپ لگاتیں اور آخر کار وہ چلی گئیں مگر کر گزریں جو اُن کو کرنا تھا...... ان سے پورا خاندان ناراض تھا اس ایک کام کے بعد ان کا نام لینا ممنوع ہو گیا...... اور اگر کبھی لیا بھی جاتا تو بڑے ہتک آمیز انداز میں......

سڈنی میں ان کا گھر جو انہوں نے صرف اپنی کمائی سے بنایا تھا...... پاکستان سے جانے والوں کے لیے جائے پناہ بنا رہا...... جب بھی کوئی گھومنے جاتا اُن کے گھر میں قیام ہوتا...... اکثر پڑھنے کے لیے جانے والے خاندان کے نوجوان بچے، بچیاں اُن کے ہاں سال بھر تک رہے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے سب کا بار اٹھا لیتی تھیں...... اکیلی تھیں جو کماتی تھیں کافی بچا کر رکھتی تھیں اور مہمان نوازی پر خرچ کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی خاندان میں اب ان کے بارے میں بات کرنا ممنوع تھا...... جو بھی آسٹریلیا کا سفر کرتا سب کو اندر ہی اندر پتا ہوتا کہ ٹھکانا کدھر ہو گا مگر پھر بھی اس پر کوئی کھلے لفظوں بات نہیں کرتا تھا...... اکثر تو کہتے کہ ان کو پتا ہی نہیں کہ ایسی کوئی خاتون بھی ہیں خاندان میں مگر جیسے ہی سڈنی کا سفر باندھا جاتا اچانک سے ان کو فون بھی ہو جاتا اور رہنے کے لیے جگہ کی ڈیمانڈ بھی کر دی جاتی تھی...... کچھ یوں جیسے یہ ان پر احسان ہی تو ہے کہ پاکستان سے لوگ ان کے ہاں ٹھہریں گے...... میری دماغی رو ان کی طرف بھی بھٹک کر نہیں گئی...... میں نے شاذ و نادر ہی ان کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہوگا...... ہاں میں بھی اگر سڈنی جاتی تو شاید۔

مگر پھر امی کے انتقال کے بعد جب کچھ خطوط جو کہ امی نے کچھ ایسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے یعنی کہ وہ مجھے نہ ملتے اگر میں غور نہ کرتی کہ یہ اصل میں ردی نہیں کچھ بہت ہی اہم خطوط ہیں...... اتنے اہم کہ کئی، کئی دفعہ پڑھے گئے ہیں جیسے امی اکثر ان خطوط کو کھول کر پڑھتی رہی ہوں...... مجھے حیرت ہوئی...... ہم اپنے والدین کو کتنا اونچا درجہ دے دیتے ہیں...... کوئی درویش کوئی بزرگ ہوں جیسے...... مگر اصل میں تو وہ بھی بیچارے انسان ہی ہوتے

ہیں جو کبھی بچے رہے تھے اور پھر انہوں نے بھی جوانی میں قدم رکھا تھا...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنی لمبی مسافت ہو اور کبھی ٹھوکر نہ کھائی ہو...... امی سے صرف دو سال بڑے ہونے کے باوجود وہ امی سے بچوں کی طرح پیش آتی رہیں...... مجھے یہ سوچ کر ہی ہنسی آ گئی...... کوئی میری امی کو بھی بچہ سمجھتا تھا...... حیرت ہے۔

مگر ان خطوط میں ایک عجیب بات تھی...... جیسے کرداروں نے کروٹ لے لی تھی...... میں نے دو چار دفعہ یقین کرنے کے لیے دیکھا کہ خط کس کی طرف سے آئے ہیں...... جوابی خطوط سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جو امی نے ان کو لکھا ہوگا...... ان کا انداز بہت ہی حلیم اور درویشانہ تھا...... لکھائی پختہ تھی اور کچھ جملے اور اندازِ بیاں ایسا تھا کہ میں پڑھ کر واہ، واہ کر اٹھی...... دل میں ایک خلش سی بھی محسوس ہوئی۔ وہ دوستی وہ بے تکلفی جو شاید میں اپنے دوستوں سے چاہتی تھی...... وہ آئیڈیل دوستی جو میں ڈھونڈتی رہی ہوں مجھ سے پہلے میری امی نے کسی سے قائم کرلی تھی...... ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا تھا کہ امی نے ان کو اپنی ہر خواہش، غصہ، جلن، دل میں اٹھنے والی ہر ایک لگن کے بارے میں بتایا...... انہوں نے اسی حساب سے جواب دیا...... ان کے جوابات میں صرف خیال تھا یہ نہیں کہ انہوں نے امی کو جانچا ہو...... مجھے حیرت ہوئی...... بہشتی زیور بھی ایسا سوچ سکتی ہیں؟ کیا واقعی امی نے ایسا کچھ ان کو لکھا تھا جس پر ان کا یہ جواب آیا تھا...... یعنی کردار بدل گئے تھے۔ وہ امی کو بہشتی زیور کہتی تھیں مگر خود ایک بہشتی دوست کی طرح امی کو انسان ہونے اور اس پر شرمندہ نہ ہونے کا سبق بھی دیتی رہتی تھیں...... شاید ایک اچھا دوست ہونے کے لیے آپ کا برا ہونا بھی ضروری ہے...... اس طرح آپ اچھائی اور برائی کو جانچتے نہیں...... بلکہ بس دل کی بھڑاس نکال لینے دیتے ہیں...... ان دونوں کے خطوط میں وقت اور زمانے کا کوئی تصور نہیں تھا...... یہ دونوں وقت کی قید سے آزاد ہوکر ایک دوسرے کو لکھتی رہی تھیں...... جس میں دن اور تاریخ کے بجائے اس ایک لمحے میں دل میں اٹھنے والی لہروں کا تذکرہ تھا۔

اور پھر میرا ان کا ایک الگ ہی رشتہ بن گیا جیسا کسی قاری کا کسی مصنف سے بن جاتا ہے...... حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ امی کے انتقال پر ان کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی...... یعنی کوئی افسوس کا اظہار کوئی بات...... انہوں نے فون تک کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ ہمارا خاندان بھی ان سے بے پروا ہی رہا تھا...... کیونکہ مجھے ان کے خطوط امی کے انتقال ایک سال بعد ملے تھے تو اس سے پہلے میرے ذہن میں بھی کبھی ان کا خیال تک نہیں آیا تھا...... مگر مجھے دیر ہوگئی کہ کل ہی میں نے ان کے سڈنی میں انتقال کی خبر سنی...... ان کے انتقال پر میں نے دل میں جہاں یہ سوچ کر خوشی محسوس کی کہ آج وہ بہشتی زیور سے مل رہی ہوں گی...... دونوں کتنا خوش ہوں گی...... وہیں دل بہت اداس بھی ہوگیا تھا...... اس بات پر میں سوچتی ہی رہ گئی کہ ان کو فون کروں شاید وہ مجھے پہچان سکیں...... آج صبح ان کی بہن اور ہماری رشتے کی تبسم خالہ کا فون آیا کہ وہ اپنا بڑا سا گھر اپنے بچے کے نام کرگئی ہیں جو شاید انہوں نے زیادتی کی ہے بھلا اس بچے کو یہ سب دینے کی کیا ضرورت تھی؟

مجھے بڑی حیرت ہوئی یہ جان کر کہ ان کی کوئی اولاد بھی تھی...... یہ بات تو کبھی نہیں سنی تھی میں نے...... میں خاموشی سے تبسم خالہ کو سنتی چلی جارہی تھی...... انہوں نے ایک دم چونک کر کہا۔

''اوہو اب تو تم بڑی ہوگئی ہو...... تم سے کیا چھپانا......'' میں نے گہری سانس لی...... وہ راز جس پر میں کئی دن سے سوچ رہی تھی جو خاندان بھر میں گردش کرتا رہا تھا مگر آج بالآخر مجھ پر فاش ہونے کو تھا...... تبسم خالہ پھر سے گویا ہوئیں۔

''اصل میں باجی نے شادی تو کی نہیں تھی...... اسی لیے ہم سب ناراض تھے ان سے کہ یہ بچہ...... ان کا ہوتا تو جان سے عزیز رکھ لیتے...... مگر دیکھو ناں خاندان میں ناک کٹوا دی انہوں نے ہماری...... اور اب اسی کو اپنی تمام جائداد دے گئیں...... جو ان کا کچھ بھی نہیں تھا۔''

''جی ہاں...... بہشتی جو تھیں۔'' میں نے ہلکے سے جواب دیا۔

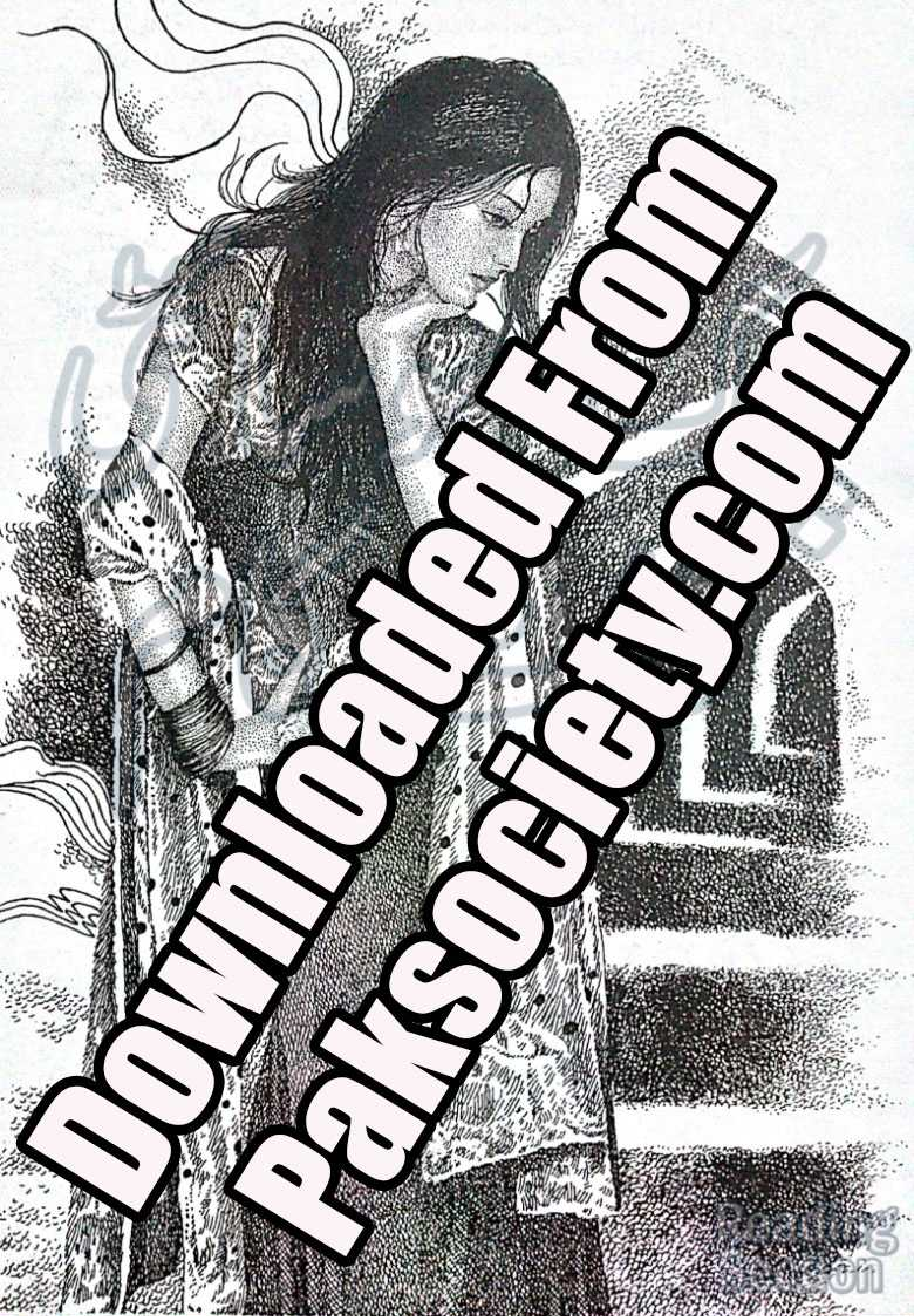
گم شدہ محبت

انجم انصار

انسان نہ کچھ ہنس کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی سیکھتا ہے یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل سے پہلے ربڑ ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلاوا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر......



اللہ ہی جانے میں نے اخبار کے دفتر میں جاب کیوں کرلی تھی...... اور اخبار بھی وہ جس کو نکلے ہوئے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا...... اور مجھے وہاں کا شور شرابا دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی مچھلی بازار میں آبیٹھی ہوں۔

شور شرابا، غل غپاڑا...... مجھ کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ اور یہاں تو ہر وقت کا ہوحق کا ماحول تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ہر وقت سر اٹھائے رہتی مگر اکثر لوگ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارلیا کرتے ہیں...... اسی طرح میں نے بھی مارلی تھی۔ اور اب اس کا افسوس بھی میں خود ہی منا رہی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے میں یعنی صبا رحیم ایک پروڈکشن ہاؤس میں اسکرپٹ ایڈیٹر کی جاب پر فائز تھی...... سیلری بہت زیادہ اچھی نہیں تو اتنی بری بھی نہیں تھی۔ پروڈکشن ہاؤس گو بہت بڑا نہیں تھا...... مگر سال، ڈیڑھ سال میں ڈیڑھ سو اقساط کا ایک سوپ اور چند ڈرامے تیار کرہی لیتا تھا۔

اس پروڈکشن ہاؤس میں میرا یہ کام تھا کہ اچھے رائٹرز کے مسودوں کو اس پروڈکشن ہاؤس کے مفاد کے تحت انہیں خراب بلکہ بے حد خراب کروں...... (میں واقعی یہی سمجھتی تھی) جب ہمارے باس اے ون مسودے کو دیکھ کر جھنجلا کر کہتے۔

''افوہ...... اس سوپ میں امی، ابا، نانی، نانا کے کرداروں کی کیا ضرورت ہے نکالو انہیں......'' تو میں واقعی پریشان ہوکر انہیں سمجھایا کرتی۔

''سر...... ان کرداروں کے سہارے اصل کہانی چل رہی ہے۔''

''بھئی گولی مارو انہیں...... یہ اماں، ابا، نانا، نانی جیسے سپورٹنگ کرداروں کو لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا...... ہر ڈرامے میں ایک ہی جیسے روتے، رُلاتے ہوئے ہوتے ہیں، بعض جگہ تو ڈائیلاگز تک تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں...... میں تو بور ہوچکا ہوں اب ان سب سے......''

''مگر ہمارے سوپ سے تو نانی کا کردار نہیں نکل سکتا...... وہ قدم، قدم پر ہیروئن کو بچائے گی۔'' میں حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کرتی۔

''میں نے کہا ناں...... نہیں...... تو اس کا مطلب نہیں ہی ہوا کرتا ہے۔ کوئی ایسا سین لکھ دو جس میں ہیروئن صبح اٹھ کر اپنا خواب خود اپنے آپ کو سنائے...... کہ نانی اسے خواب میں کیا بتا کر گئی ہیں۔''

کبھی باس کو اس بات پر غصہ آجاتا...... کہ ڈرامے میں آؤٹ ڈور مناظر کیوں ڈالے گئے ہیں...... خواہ مخواہ کا خرچہ۔

''سر ہیروئن کو اپنے ہیرو سے ملاقات کے لیے باہر تو جانا ہی ہوگا ناں...... اب وہ اپنے گھر والوں کے سامنے تو ہیرو کو نہیں بلاسکتی۔'' میں ڈرامے کی نزاکت اور باریکیاں ان کے گوش گزار کرتی۔

''کیوں نہیں گھر بلاسکتی...... ہمارا ڈرائنگ روم کا سیٹ آخر کس کام آئے گا...... اگر نہیں بلاسکتی...... تو بلائے بہانے سے بلائے...... خوشی میں بلائے یا پریشانی میں بلائے...... اسے جو بھی بکواس کرنی ہو ہمارے اسی سیٹ پر کرے......''

''سر...... محبت بکواس نہیں ہوتی...... محبت بھرے اتنے خوب صورت مکالمے تو اس ڈرامے کی جان ہیں۔''

''پلیز مس صبا......! ایسی باتیں کرکے آپ میری جان نہ جلائیں۔ آپ کا یہ کام ہے کہ پروڈکشن کے بجٹ کے حساب سے اسکرپٹ میں تبدیلیاں کریں...... اور بس......''

''مگر سر! اس سے تو اصل کہانی ہی تبدیل ہوجائے گی۔''

''ہوجانے دو......''

''رائٹر ناراض ہوجائے گی۔''

''نہیں ہوگی ناراض......''

''نہیں سر، مجھے پکا پتا ہے ان باتوں سے رائٹرز ناراض ہوجاتی ہیں، مرد رائٹر شاید نہیں ہوتے ہوں مگر خواتین

رائٹرز زیادہ حساس ہوتی ہیں انہیں تو چھوٹی، چھوٹی باتیں بہت بڑی محسوس ہوتی ہیں‘‘۔ میں بھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اصل بات کہنے سے باز نہ آتی۔

’’ارے بھئی کہاناں، نہیں ناراض ہوں گی وہ...... کہ ہم زیادہ تر ان رائٹرز کو لیتے ہیں جنھوں نے ٹی کے لیے پہلے لکھا نہ ہو...... یا زیادہ نہ لکھا ہو...... وہ ذرا چوں چرا نہیں کرتیں۔‘‘

’’اگر کچھ کہا تو پھر......‘‘ میرا خود کا رائٹر ہونا منہ ماری سے باز نہ آتا۔

’’اگر ایسا کچھ ہو تو کہہ دینا کہ لے جاؤ اپنا اسکرپٹ...... ہمیں نہیں چاہیے تمہارا اسکرپٹ...... اچھا ہے اس مد میں بھی ہمارے کچھ پیسے بچ جائیں گے۔‘‘

’’مگر سر یہ کہانی تو اپروو ڈ ہے...... ہم رائٹر کو کیسے اس کا اسکرپٹ واپس کر سکتے ہیں؟‘‘

’’جب ہم نے اس اسکرپٹ میں اتنی زیادہ تبدیلیاں کرلی ہیں تو پھر وہ ان کا اسکرپٹ رہا کہاں......؟ اب تو اگر کوئی ان سے پوچھے گا بھی کہ آگے کیا آئے گا تو وہ نہیں بتا سکتیں...... کہ ہم ہر قسط کو شوٹ پر لے جانے سے پہلے اس میں اتنی تبدیلیاں کر دیتے ہیں کہ ہمیں خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔‘‘

’’مگر سر اس طرح تو سوپ کی قسط ہلکی ہو جائے گی۔‘‘

’’یہی تو ہم چاہتے ہیں...... کہ ایسا ہلکا پھلکا سا سوپ پیش کیا جائے جسے سب شوق سے دیکھیں......‘‘ وہ میری بات کا رخ ہی موڑ دیتے...... ’’بھئی بھاری یا بوجھل ڈرامے سر میں درد کر دیا کرتے ہیں۔‘‘

’’سر...... چینل کی دنیا میں آپ کا ایک اچھا نام ہے...... آپ کے پروڈکشن سے ماٹھی اقساط بنا کر بھیجی جائیں گی تو کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔‘‘ میں انہیں اپنے تئیں ڈرانے کی بھی کوشش کرتی...... اور ایک رائٹر کسی دوسرے رائٹر کے حق کے لیے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

’’مس صبا...... آپ اپنے کام سے کام رکھیں...... پریشانیاں پالنے اور پوسنے کے لیے نہیں ہوا کرتیں...... کہ یہ ہوا تو وہ ہو جائے گا اور یہ ہوا تو ویسا ہو جائے گا...... کوئی کیا کہے گا...... اور کیا سنے گا...... جیسی چیزوں کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔‘‘

’’جی سر......‘‘ میں سر جھکا لیتی...... جس کا مطلب یہی ہوتا کہ آپ نے بجا فرمایا۔

’’ارے ہمارا آئیڈیا اپروو ہے...... چینل سے آن ائر جانے کی ڈیٹ کنفرم ہو چکی ہے...... اب ہمیں کسی کی پروا نہیں ہے۔‘‘ وہ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ میری ہر بات کو اڑاتے ہوئے کہتے۔

’’جی سر...... اگر سوپ کی اقساط ہلکی بھی بن جائیں تو آپ کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ لائٹ چیزیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔‘‘

’’رائٹ...... اب سمجھی ہو تم...... ہمیں کسی کی بھی کوئی پروا کرنی ہی نہیں ہے...... کوئی بھی سوپ کی تمام اقساط باقاعدگی سے تو نہیں دیکھ سکتا...... اس میں ہلکی قسطیں بھی آسانی سے چل جاتی ہیں۔‘‘

’’جی سر......‘‘ میں مزید تبصرے سے گریز کرتی۔

’’مس صبا...... تم یہ سمجھو کہ سوپ کا بنانا ایسا ہی ہے کہ اپنا جنگل ہے اور اپنا گھوڑا ہے۔ جب گھوڑا سرسبز میدانوں میں بھاگتا ہے تو کبھی دھیمی رفتار سے بھی چلے گا اور کبھی صحرا سے بھی گزرے گا...... اور کبھی ندی نالوں کو بھی پھلانگے گا۔‘‘

’’اوکے سر......‘‘ میری زبان کے ساتھ میرا سر بھی اثبات میں ہلنے لگتا...... مگر میرا دل ہمہ وقت مجھ سے یہی کہتا...... صبا رحیم تم اپنی جاب سے انصاف نہیں کر رہی ہو...... جو تمہیں کرنا چاہیے تھا...... جو تمہاری سیٹ کا تقاضا تھا‘

وہ تم بالکل نہیں کر رہی ہو...... بلکہ تم کرسکتی ہی نہیں ہو۔

یہ حقیقت بھی تھی...... اس جاب کو جوائن کرنے سے پہلے میری آنکھوں میں بہت سے خواب تھے...... اور میں بہت کچھ کرنا چاہتی تھی...... یہ میری دلی خواہش تھی کہ اچھے اسکرپٹ کو مزید خوب صورت ترین بنادوں...... سین خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو...... مگر اس میں شامل ہر کردار اپنا بھرپور تاثر چھوڑے اور کسی کردار کے بارے میں یہ نہ کہا جائے کہ یہ بھرتی کا کردار تھا...... مگر میں تو ایک اچھی چیز کو برا بنانے میں ماہر ہو رہی تھی۔

اگر کسی رائٹر کا فون آجاتا اور وہ پوچھتی کہ اس کے اتنے اچھے لکھے ہوئے مکالمے کیوں نکال دیے گئے تو میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہتی ...... ''ہم نے نہیں نکالے...... وہ شاید ایڈیٹنگ میں نکل گئے ہوں گے......'' وغیرہ...... کہ اپنا الزام کسی دوسرے کے سر پر ڈالنے کی وبا یہاں عام تھی۔

مجھے...... پروڈکشن ہاؤس میں جاب کرنا اب ایک دردِسری لگنے لگا تھا کہ اگر کسی کی اچھی چیز کو برا بنانا گناہ ہے تو میں بھی اس گناہ میں برابر کی شریک ہو رہی تھی۔

اپنی بہترین سہیلی سے مشورہ کیا تو اس نے برملا کہا کہ...... ''ایسی جاب پر تو فوراً لات ماردینی چاہیے...... تم وہ سب کر رہی ہو جو تمہیں ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔''

اور یوں میں نے وہ جاب فوراً چھوڑ دی...... اور باس نے بھی مسکرا کر مجھے بائے، بائے کہا کہ شاید وہ مجھے سر پھری لڑکی ہی سمجھتا تھا۔

مگر مجھے حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا کہ جس دوست نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا...... اس نے فوراً ہی وہ جاب جوائن کرلی کہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے کہ تیر کھانے والے جب پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ان کی اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوا کرتی ہے...... اگر میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا تو یہ کوئی نئی یا انہونی بات نہیں ہوئی تھی۔

میری خاص الخاص دوست صادقہ جس کو میں سب سے اچھی، سب سے زیادہ مخلص اور سب سے بہترین مشورہ دینے والی دوست سمجھا کرتی تھی...... وہ میری جگہ پر فوراً آگئی تھی...... اور ہٹ دھرمی علیحدہ کہ مجھے فون کر کے وہ یوں احسان ڈھار ہی تھی۔

''صبا...... تم نے یہ جاب چھوڑ کر بالکل صحیح فیصلہ کیا...... ایسے لوگوں کے ساتھ تم واقعی کام نہیں کرسکتی تھیں...... ایک تو تمہاری کوالیفکیشن کے حساب سے وہ تمہیں بہت کم سیلری دے رہے تھے...... دوسرے تم میں ہر ایک کے ساتھ مکس ہونے کا ہنر ہے ہی نہیں...... میں تو جاب لیس تھی...... مجھے تو یہ سیلری بھی چلے گی...... دوسرے میں اپنے آپ کو ہر رنگ میں ڈھال سکتی ہوں۔''

تب میں کلس کر رہ گئی مگر اسے مبارک باد ضرور دی کہ جتنی پُرخلوص تم اپنے دوستوں کے لیے ہو اللہ کرے اس کا اجر تمہیں اس جاب کے طفیل ضرور ہی ملے...... آمین۔

یہ خیال مجھے بہت بعد میں آیا کہ میرے دل میں باس کے خلاف کدورت پیدا کرنے والی یہ صادقہ ہی تھی جو اپنی جاب کی تلاش کے لیے ہر طرف ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

''بھئی جب نوکری کرتی تو نخرہ کیسا ؟''

''بیچارہ باس...... صرف اسکرپٹ میں کاٹم پیٹم کو ہی تو کہہ رہا تھا...... ورنہ میری ایک دوست...... جس پروڈکشن ہاؤس میں جاب کرتی تھی...... وہاں تو اس سے دو چار رائٹرز کی لکھی ہوئی کہانیوں کو مکس کرنے کو کہا جاتا تھا...... اور وہ چپ چاپ کر دیا کرتی تھی...... کہ بعض نوکریوں میں صرف ہاتھ ہی نہیں بیچے جاتے بلکہ دماغ بھی گروی رکھ دیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

نہ دماغ اجازت دے رہا تھا اور نہ ہی دل گواہی دے رہا تھا...... مگر پھر بھی اس نے ہامی بھر لی تھی۔
ماں کا دیا ہوا تصویر کا لفافہ، اس نے دیکھے بغیر دراز میں ڈال دیا تھا۔ ایک ایسا لڑکا جس نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ، اپنی مرضی اپنی پسند اور اپنے حساب سے کیا تھا آج ماں کے سامنے بے بس ہو کر کہہ بیٹھا تھا۔

''جو آپ کی پسند وہ میری بھی......''

''سچ کہہ رہے ہو ناں تم......''

''میری یہ مجال کہ آپ کے روبرو جھوٹ بولوں گا۔''

''تو پھر میں ہامی بھر لوں؟''

''ارے ابھی تو آپ نے لڑکی بھی نہیں دیکھی صرف تصویر دیکھ کر ہی سارا معاملہ طے کر بیٹھی ہیں۔'' اسے ماں کی جلد بازی پر ہنسی آئی۔

''میرے بیٹے کا رشتہ کوئی منع کر سکتا ہے بھلا......'' وہ فخر سے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کیا پتا...... ہو کوئی ایسا......''

''تو وہ پاگل ہی ہو گا۔''

''اور اللہ کسی پاگل سے میرا ناتا نہ جوڑے......'' وہ بے پروائی سے کہتا ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔
اور وہ اپنے وجیہہ بیٹے کو یوں مسکراتا دیکھ کر از خود مطمئن سی ہو گئیں۔

''ضرور اس نے تصویر دیکھ لی ہو گی...... لڑکی بھی تو بلا کی حسین ہے، کیسی کٹارا سی تو آنکھیں ہیں اس کی...... یقیناً دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا ہو گا۔ ہاں جب ہی تو......'' سلمیٰ بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر مطمئن سی ہو گئیں...... اور ملازمہ کو چائے کے لیے کہا...... یہ ان کی ہمیشہ کی عادت تھی...... کہ جب وہ زیادہ خوش ہوا کرتیں تو وقت کا خیال کیے بغیر بھی چائے ضرور پیا کرتی تھیں۔

☆☆☆

میں نے چائے کا مگ خالی کر کے ٹرے میں رکھا ہی تھا کہ فرزانہ کی قصداً کھنکھار پر اسے مڑ کر دیکھا جو کیبن کے دروازے پر کھڑی مجھے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے......؟ آفس کے ٹور پر نکلی ہو کیا......؟ بگ باس نہیں آئے ابھی......؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

''کیا تم کہیں جا رہی ہو؟'' اس نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے میری بات سنی ہی نہیں ہو۔

''ہو سکتا ہے، چلی جاؤں...... مگر بات تو دل کے لگنے کی ہے ناں......''

''کیا دل لگ گیا......؟'' اب اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''ہوں...... زیادہ تو نہیں لگا......'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو کب جا رہی ہو......؟''

''یہ تو میں ابھی بتا نہیں سکتی......''

''اس کا مطلب ہے...... چھپا رہی ہو......''

''نہیں بھئی...... اگر کسی نئی جاب پر گئی تو میں بھلا کیوں چھپاؤں گی...... سب سے پہلے تو اپنے فرینڈز سے ہی شیئر کروں گی ناں میں......''

''میں جاب کی بات نہیں کر رہی؟''
''تو پھر کس کی بات کر رہی ہو؟''
''میں تمہاری شادی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں کہ کب کر رہی ہو شادی......؟''
''فرزانہ جب سے تم انگیجڈ ہوئی ہو بس تم یہی چاہتی ہو ہر لڑکی کی شادی جلدی سے ہو جائے۔''
''ہاں تو اس میں برائی کیا ہے......؟''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر ہر کام کی طرح اس کا بھی وقت مقرر ہے...... جب وہ وقت آئے گا تو دیر بھی نہیں لگے گی۔''
''اور لوگ جو تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے پھر رہے ہیں وہ سب بکواس ہے کیا......؟'' وہ دہاڑی۔
''تمہیں یہ سب باس نے بتایا ہوگا ناں......؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں...... وہی کہہ رہے تھے۔''
''انہیں خبریں گھڑنے کی عادت تو ہے ناں...... تو تم سمجھ لو...... کہ آج کی ان کی نئی خبر یہی ہے کہ میں شادی کر کے یہ اخبار چھوڑ رہی ہوں۔''
''تو کیا ایسا کچھ نہیں ہے......؟'' فرزانہ اب حیرت سے پوچھ رہی تھی۔
''یار اگر میری مرضی کی جاب مل گئی ناں تو میں ویسے ہی یہ جاب چھوڑنا چاہ رہی ہوں۔''
''کیا مطلب ہے، تمہارا یہاں بھی دل نہیں لگ رہا؟''
''نہیں...... اور کبھی کبھی تو بہت ہی دل گھبرا سا جاتا ہے۔''
''یہ بات تم اس لیے کہہ رہی ہو...... کہ اخبار کی اشاعت کم ہے۔ اخبار پاپولر بھی نہیں ہے۔''
''ہاں، یہ باتیں بھی ہیں...... مگر دل لگنے کی بات تو علیحدہ ہوتی ہے، کام کر کے مزہ آیا کرتا ہے...... مگر یہاں تو دومنٹ میں ایسی کی تیسی ہو جایا کرتی ہے۔''
''باس...... نے تو کبھی تمہیں کچھ نہیں کہا۔''
''پر ان کا رویہ...... جو دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے مجھ سے وہ بھی نہیں دیکھا جاتا۔''
''اچھا اب اتنی نازک اور حساس مت بنو...... تمہاری وجہ سے ہم سب کا جو دل لگا ہوا ہے۔'' فرزانہ نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔
''اچھا اور بگ باس کیا کہہ رہے تھے۔'' میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔
''صبو...... مجھے لگتا ہے بگ باس تمہیں چاہنے لگے ہیں۔'' فرزانہ ایک آنکھ دبا کر شرارت سے بولی۔
''سر توڑ دوں گی میں ابھی ان کا......'' مارے طیش کے میں کھڑی ہوگئی۔
''ارے رکو...... میری پوری بات تو سنو......'' وہ مجھے شانوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولی۔
''اچھا جلدی بکو......'' غصہ میرا کم نہیں ہو رہا تھا۔
''وہ دراصل بگ باس کہہ رہے تھے...... ہم چاہتے ہیں کہ صبا رحیم کلرڈ پیج کی ماڈلنگ کو بھی لک آفٹر کریں......'' (وہ ان کے ہی لہجے میں بول رہی تھی)
اور فرزانہ کی پوری بات سن کر ہی مجھے ہنسی آگئی۔ سر فرید کا تکیہ کلام ہم چاہتے ہی تھا......اور اس کو ہمارے آفس ورکرز، کس طرح استعمال کیا کرتے تھے کہ ہنسی آجایا کرتی تھی اور اس وقت میں فرزانہ کی بات پر یوں کھلکھلا کر ہنس رہی تھی کہ ساری ٹینشن کی کثافت اس ہنسی میں کہیں دور بہہ گئی تھی۔

''تھینکس گاڈ...... تمہارے چہرے پر ہنسی تو آئی۔'' اب فرزانہ اس سے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

بات کر کے وہ واقعی ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھیں۔ صبا کی ماں شہناز کا مہذب لہجہ انہیں دل سے پسند آیا تھا۔ سلمیٰ بیگم فون کر کے بڑی طمانیت سی محسوس کر رہی تھیں...... اور اپنے آپ سے خود ہی باتیں کرتے ہوئے وہ بے حد مسرور سی تھیں۔ سبین گھر میں داخل ہوئی تو وہ چائے پی رہی تھیں۔

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟'' اس نے ماں کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے اب...... آج تو میں اپنے آپ کو بے حد فریش محسوس کر رہی ہوں۔''

''بھائی جان کہاں ہیں؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی نکلا ہے کہیں......''

''آج تو میں صاف، صاف بات کرنے آئی ہوں...... آخر وہ چاہتے کیا ہیں...... اپنی سسرال میں چار جگہ تو میری سُبکی ہوئی ہے۔''

''سبین تمہاری سسرال کی خواتین کچھ زیادہ ہی ایکٹو ہیں...... میں نے تمہاری خلیہ ساس کی لڑکیوں کی تعریف کر دی تھی اور شاید کسی کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ بھی پھیر دیا تھا تو انہوں نے ہر جگہ یہ کہہ دیا کہ میں نے اپنے بیٹے کا رشتہ ان کے ہاں دیا ہے...... اور تمہاری جیٹھانی کی ماں کا پُرسا دینے میں ان کے گھر گئی...... تو یہ کہہ دیا گیا کہ میں ان کی چھوٹی بہنوں کو دیکھنے کے لیے گئی تھی...... حد ہو گئی ہے لوگ موقع تک کا لحاظ نہیں کرتے۔''

''اماں اب ہر شخص ہر بات کو اپنے ذہن کے حساب سے سمجھتا ہے...... تو کیا کریں...... اب تو ہر جگہ ہی ایسا ہو رہا ہے...... بات کچھ کہو اور اس کے معنی و مطالب دوسرے نکالے جاتے ہیں۔''

''یہ بات تو خیر تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... لفظوں کی ہیرا پھیری نے زندگی ضیق کر کے رکھ دی ہے۔''

''بھائی جان نے بھی کچھ کم پریشان نہیں کر رکھا ہے...... اگر ان کی کوئی پسند ہے تو صاف بتا کیوں نہیں دیتے۔''

''اس کی کوئی پسند نہیں ہے۔'' اماں نے مسکرا کر کہا...... لہجہ وثوق بھرا تھا۔

''جھوٹ بول رہے ہیں وہ... اگر ایسا ہوتا تو ہم نے جو درجنوں لڑکیوں کی تصویریں دکھائی تھیں...... وہ ان میں سے کسی کو تو اوکے کرتے...... اب اگر بڑا بھائی ہی شادی سے یوں بھاگے گا تو چھوٹا بھائی تو اس سے زیادہ بھاگے گا ناں...... اب یہ بھی کوئی نیا بہانا ہو گا ان کا...... سچی...... میں تو اب تھک گئی ہوں...... کوئی بھلا ایسا کیا کرتا ہے......؟'' بڑی بہن کی پسند تو سب کی پسند ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو اکلوتی بہن کی رائے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''اب وہ اپنے بہنوئی کی پسند کو پسند جو کر بیٹھے ہیں۔'' ظفر کمرے میں ساس کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے تو موضوعِ سخن سن کر بولے۔

''آپ نے کس کو دکھا دیا......؟'' سبین نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک لڑکی مجھے اچھی لگی تھی...... ممانی کو تصویر دکھائی تو انہیں مجھ سے بھی زیادہ اچھی لگی تھی...... ہے ناں مامی۔''

''بالکل......'' سلمیٰ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ...... آپ کو شادی کے بعد بھی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں...... ماشاء اللہ...... بہت اچھے جا رہے ہیں اور آپ کی ساس بھی......'' سبین نے ماں کی کھنچائی کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بات تو پوری سن لو...... اور احسان مانو میرا کہ میں اپنے سالے صاحب کے لیے دیکھ رہا تھا...... کہ شادی نہ کر کے سب کو پریشان جو کر رکھا ہے موصوف نے۔''

''اماں...... میں نے آپ کو پروین کی تصویر بھی تو دکھائی تھی...... اور اس کی پھوپی سے آپ کی ملاقات بھی کروائی تھی...... وہ لڑکی اچھی نہیں لگی آپ کو؟'' سبین نے پوچھا۔

''لڑکی تو وہ بھی اچھی تھی...... مگر اس کی پھوپی کی گفتگو کچھ عجیب سی لگی کہ ان کی بھابی کے نخرے بہت ہیں، اگر رشتہ قبول بھی کرلیا تو ابھی شادی نہیں کریں گی...... خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ باؤلی ہو رہی ہیں۔''

''ارے ایسی باتیں کیں انہوں نے......؟'' سبین کو حیرت ہو رہی تھی۔

''اب بتاؤ سگی پھوپی ایسی باتیں کرے گی تو پتا نہیں وہ لوگ کیسے ہوں گے...... تم یہ اس لڑکی صبا کی تصویر دیکھو...... ظفر نے اس کے آفس سے اپنے ٹرمز کی بدولت حاصل کی ہے۔ دیکھو کتنی پیاری سی لڑکی ہے۔''

''ہاں تصویر تو واقعی بہت ہی اچھی ہے مگر بعض لوگوں کی تصویریں اصل سے زیادہ اچھی آتی ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... تصویر اور اصل میں فرق ہوتا ہے...... مگر ظفر نے تو یہ لڑکی آفس میں دیکھی ہے...... مگر پھر بھی تمہیں تو جانا ہوگا۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ...... میں کیوں پہلے جاکر دیکھوں......''

''وہ اس لیے کہ آپ اکلوتی اور بڑی بہن ہیں...... اور آپ کی رائے کی بھی بہت اہمیت ہے۔'' ظفر نے بیوی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں سبین...... لڑکی والوں کے گھر جانا تو تمہیں ہوگا...... اس لیے پہلے تم جاکر دیکھ لو......'' اماں نے کہا۔

''جی نہیں، پہلے آپ اپنے لاڈلے سپوت سے پوچھ لیجیے۔ کتنی دفعہ ہو چکا ہے ایسا کہ ہمیں لڑکی پسند آگئی...... اور انہوں نے منع کردیا۔''

''اب یہ تو وہ کہہ رہا تھا کہ جس سے دل چاہے کردیں...... مگر اب مجھ سے مت پوچھیں...... میری کوئی پسند نہیں ہے۔''

''مگر گزارہ تو انہیں ہی کرنا ہوگا......'' سبین کا لہجہ پریشان سا تھا۔

''جس لڑکی کا مشاہدہ میں کر رہا ہوں، وہ تو مجھے کافی سوبر سی لگ رہی ہے۔''

''پھر بھی دیکھ بھال کر رابطہ کریں...... آج کل جو ہوتا نہیں وہ دکھائی دیتا ہے...... اور جو دکھائی دیتا ہے...... وہ ہوتا نہیں۔''

''تو یہ ہے سبین...... تمہارا یہ نقطۂ نظر ہر لڑکی پر لاگو نہیں آتا...... آج بھی اچھی سے اچھی لڑکی موجود ہے...... مگر دیکھنے والے کی آنکھ چاہیے۔''

''اور آپ کی آنکھوں نے اسے پاس کردیا ہے؟''

''صرف پاس ہی نہیں کیا...... بلکہ اسے پوزیشن بھی دے دی ہے۔'' بیوی کو تپانے کے لیے ظفر تمسخر سے بولے تو سلمٰی بیگم بھی مسکرانے لگیں کہ جب ظفر نے انہیں لڑکی کی تصویر اور اس کا بائیوڈیٹا لاکر دیا تھا تو وہ انہیں بھی بہت پسند آئی تھی...... اور انہوں نے دل ہی دل میں کہا تھا کہ ''میرے بیٹے کے لیے ایسی ہی شاہزادی جیسی شان والی لڑکی ہونی چاہیے۔''

☆☆☆

''اگر کسی کا لڑکا اچھا پڑھ لکھ جاتا ہے تو ان کے گھر والوں کے دماغ اسی حساب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ اب سلمٰی بیگم نے دو مرتبہ آنے کو کہا...... اور پھر ضروری کام کا بہانہ کر کے منع کردیا۔'' شہناز اپنی بہن فرح سے کہہ رہی تھیں۔

''آپا...... اگر وہ آتے، آتے اپنا ارادہ تبدیل کر رہی ہیں تو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آکر بھی مطمئن نہ ہوں۔''

''اگر مطمئن نہ ہوتیں...... تو رابطہ ہی کیوں کرتیں۔''
''ذی حیثیت بیٹوں کی مائیں...... اتراتی تو ہیں ناں......'' فرح نے بہن سے کہا۔
''مگر تمہاری شادی نہ ہونے کی وجہ...... صرف تمہارا اترانا تھا، ایم اے انگلش تم نے کیا کرلیا تھا کہ تمہیں کوئی اپنے پاسنگ کا ہی نہیں لگتا تھا۔''
''مگر آپا...... مجھے اس بات کا کبھی کوئی ملال تو نہیں ہوا۔''
''مگر مجھے تو ہے...... والدین کے بعد تم میری ذمے داری تھیں...... اور میں سرخرو نہ ہوسکی......'' شہناز نے آہ بھر کر کہا۔
''اُفوہ...... اب تو آپ میرے لیے آزردہ نہ ہوں...... جبکہ جانتی بھی ہیں کہ میری عمر کی خواتین اب نانیاں، دادیاں ہیں۔''
''ہاں...... یہی تو سوچتی ہوں میں...... کہ مجھے ہر بات تمہاری نہیں ماننی چاہیے تھی کچھ اپنی بھی چلانی چاہیے تھی۔''
''ہاں...... اب چلایئے گا ناں آپ اپنی...... صبا کے سلسلے میں، میں بھی دیکھتی ہوں کہ وہ آپ کی کتنی مانے گی۔''
''مانے گی کیسے نہیں...... یہ رشتہ مجھے اچھا لگ رہا ہے...... اور مجھے دل سے پسند آرہا ہے...... پتا نہیں کیوں...... لڑکے کی تصویر دیکھ کر ہی دل اس کی جانب کھنچا جارہا ہے...... یہ تصویر میں نے لڑکے کی فیس بک سے لی ہے...... کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں......''
''وہ اس لیے کہ لڑکا ہے ہی خوب صورت......'' فرح نے ہنس کر کہا۔ ''خوب صورتی میں تو کشش ہوتی ہی ہے۔''
''یہ مت کہو...... بعض مرتبہ خوب صورت بھی خوب صورت دکھائی نہیں دیتا...... پتا نہیں کیوں...... جب سے یہ تصویر آئی ہے...... مجھے یہ لڑکا اپنا...... اپنا سا لگ رہا ہے۔''
''آپا...... آپ صبا کے مزاج سے واقف ہیں...... اور پھر بھی آپ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی فکر میں ہیں...... لڑکے کی اچھی تصویر کیا آگئی کہ آپ کا اس پر دل تک آگیا ہے...... جبکہ اس کی نخریلی ماں ایک دو مرتبہ فون کر کے ایسی خاموش ہوگئیں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔''
''ہاں...... پتا نہیں...... وہ اب تک آئیں کیوں نہیں......''
''تو پھر دفع کریں آپ، نہیں آتیں تو نہ آئیں...... ہماری بچی کے لیے کوئی رشتوں کی کمی ہے کیا......؟''
''تمہارے بہنوئی زندہ ہوتے...... تو مجھے واقعی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ مگر بیٹی کوئی بٹھانے کی چیز تھوڑی ہوتی ہے۔''
''آپا...... یہ بات تو آپ مانتی ہیں ناں...... کہ جلد بازی میں غلط سلط جگہ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ سکون سے اچھی جگہ شادی کی جائے...... چاہے اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔''
''ہاں...... بالکل مانتی ہوں...... مگر اس سکون کا دورانیہ اتنا طویل نہیں ہونا چاہیے...... کہ شادی کا وقت ہی نکل جائے......''
''کوئی نہیں نکلا جارہا وقت......'' فرح نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور ٹی وی کا ریموٹ گھمانے لگی کہ بڑی بہن کی بعض باتیں تو اس کا سر ہی گھما کر رکھ دیا کرتی تھیں اور...... وہ لاجواب سی ہو کر رہ جاتی تھی...... کہ آخر اس کی شادی کی عمر بھی...... تو ہر رشتے پر ناکرہ (منع کرنا) پھیرنے کے سبب نکل ہی گئی تھی۔

☆☆☆

آفس کے لنچ ٹائم میں...... آج ساجد بے وقوفانہ جوک سنا رہا تھا اور فرزانہ ہنسے چلی جارہی تھی۔ میں چپ چاپ چائے پی رہی تھی...... ہنسی تھی نہ مسکرائی تھی...... اور نہ ہی کچھ بولی تھی۔

''لگتا ہے پرانے لطائف آج یہ بوری بھر کے لایا ہے۔ پچاس روپے کلو کے حساب سے۔'' جاوید کسی کام سے باہر نکلا تو دھیرے سے کہتا ہوا گیا...... ہلکے سے ہلکے جوک چٹکلے بھی زیادہ گئے ہوں گے مگر فرزانہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بے وقوفانہ جوک بھی پہلے اس نے کبھی نہیں سنے تھے۔ وہ ہنس، ہنس کر پاگل سی ہو رہی تھی۔ ساجد...... جب بولتے بولتے رکا...... تو فرزانہ نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔

''کیا بات ہے، تمہیں ہنسی کی بات سن کر بھی ہنسی نہیں آتی؟''

''نہیں......''

''کیوں......؟''

''اس کی ایک وجہ ہے۔''

''بتاؤ گی نہیں......'' وہ دلار سے بولی۔

''اگر بتادی تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''پکا...... بالکل ناراض نہیں ہونے والی...... تم فرماؤ......''

تب میں نے اپنی مسکراہٹ دبائی...... اور پھر اپنا پرس بھی اور دھیرے سے کہا۔ کہیں ساجد نہ سن لے......

''فرو...... محبت کا یہی ویک پوائنٹ ہے کہ وہ گھٹیا بندے سے بھی ہو جاتی ہے...... تب اس کی ہر بات بڑی اعلیٰ لگا کرتی ہے...... حالانکہ وہ ہوتی نہیں...... جیسے آج کے یہ جوک......'' جملہ مکمل کر کے میں نے بھاگنے میں دیر نہیں لگائی کہ مجھے پتا تھا کہ اب وہ بکتی جھکتی میرے پیچھے دوڑے گی۔

☆☆☆

''کل اپنے ساتھ صرف کیک اور بوکے لے جانا...... مگر یہ کم لگ رہا ہے مجھے......'' سلمیٰ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

''مگر اماں...... کل تو ہمارا...... صبا کے گھر پہلا وزٹ ہی تو ہے۔'' سبین نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو کیا تمہارا خیال ہے...... میں پچاس چکر لگانے کے بعد وہاں رشتہ دوں گی...... تم نے اور ظفر نے اپنی تسلی کر لی ناں...... اور تمہارا بھائی اس معاملے میں بالکل ہی نہیں بول رہا ہے۔ تو کیا خیال ہے رشتہ بھی دے دیتے ہیں۔''

''نہیں اماں...... ایک ملاقات میں کسی کے بارے میں خاطر خواہ اندازہ نہیں ہوتا...... اگر لڑکی دیکھنے میں کچھ زیادہ ہی اچھی لگی تو بھائی جان کی تصویر دے دیں گے...... ورنہ ایسے ہی چکر لگا کر واپس آجائیں گے۔''

''میں تو چاہ رہی تھی...... کہ ہم پہلی مرتبہ صبا کو دیکھنے جا رہے ہیں تو کوئی تحفہ اس کے لیے بھی لے جاتے۔''

''نہیں اماں...... اب ایسا بھی نہیں ہوتا...... بس ہم ایسے ہی جا رہے ہیں ناں...... اور بس......''

''مگر میں تو ایسے ہی کبھی کسی کے ہاں نہیں جایا کرتی......''

''پیاری اماں...... ہمیں اس اجنبی لڑکی کی نہ پسند معلوم ہے نہ اس کی عادت کے بارے میں جانتے ہیں...... تو ہم خواہ مخواہ ہی اس کے لیے گفٹ لے کر کیوں جائیں۔'' سبین نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہاں اماں...... سبین ٹھیک کہہ رہی ہے...... ابھی آپ تحائف کو رہنے ہی دیں......'' ظفر نے بھی بیوی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں تم دونوں کیسی باتیں کر رہے ہو، کیوں نہیں اچھا لگے گا اسے...... جو چیز محبت سے لے کر جاتے ہیں، اسے سب پسند کرتے ہیں...... اور یہ بات تو تم اس کے آفس کے عبداللہ صاحب سے بھی اچھی طرح معلوم کر چکے ہو کہ نہ تو اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر ہے اور نہ ہی وہ اس ٹائپ کی لڑکی ہے۔ پورے آفس میں سارے لڑکے اس

سے بات کرنے میں محتاط رہتے ہیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے...... مگر آپ کو پہلے آنٹی کو فون کر لینا چاہیے تھا کہ آپ ان کے ہاں...... ان کی لڑکی کی وجہ سے آنا چاہ رہی ہیں۔'' ظفر نے ساس سے کہا۔

''وہ تو میں نے کر لیا......'' اماں نے طمانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' سبین نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''جب ہم معلومات کر رہے تھے...... تب میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے صبا کی ماں کو فون کیا...... تو انہوں نے بہ اصرار مجھے اپنے ہاں آنے کو کہا۔''

''تو کیا انہیں معلوم ہے کہ ہم کل کس مقصد کے تحت اُن کے ہاں جا رہے ہیں؟''

''ارے میرا بچہ...... آج کی مائیں بڑی سمجھدار ہیں...... اگر کوئی کنوارے لڑکے کی ماں کسی لڑکی والے کے ہاں جانا چاہتی ہے تو وہ بخوبی سمجھ جاتی ہیں۔''

''اگر نہ سمجھیں تو......؟'' ظفر نے پوچھا...... اور بیوی کی طرف دیکھا جو بڑی ناسمجھی سے ماں کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

''بیٹا...... اگر ایسی بات نہ ہوتی...... تو ان کے بار، بار فون نہ آتے...... کہ آپ کب آ رہی ہیں ہمارے گھر؟''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے بھی...... بھائی جان کا پورا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیا ہوگا۔'' سبین ہنسی۔

''بالکل...... اور کرنا بھی چاہیے تھا۔'' سلمیٰ بیگم نے کہا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان لوگوں کو ہمارے بھائی جان کا رشتہ قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔'' سبین نے کہا۔

''ہو سکتا ہے...... وہ یہ بھی کہہ دیں...... کہ آپ اپنے بیٹے کو ساتھ کیوں نہیں لائے......'' ظفر نے کہا تو سبین مسکرا کر بولی۔

''اب آپ یہ مت کہہ دیجیے گا کہ وہ نکاح خواں کی غیر موجودگی کا بھی نوٹس لے لیں گی۔''

☆☆☆

موسم بہت خوشگوار تھا...... بارش وقفے، وقفے سے ہو رہی تھی۔ سو موڈ بھی بڑا اچھا تھا...... میں اپنی دوست سے موبائل پر بات کرتے ہوئے باہر نکل رہی تھی کہ خالہ نے ٹوکا۔

''ارے آج کہاں جا رہی ہو تم...... رکو گھر میں...... کام ہے تم سے۔''

''خالہ...... مجھے ضروری کام نمٹانے ہیں آج......'' موبائل پر ہاتھ رکھ کر میں نے دھیمے سے کہا۔

''اپنی سہیلی کو ٹال دو ناں آج...... کل وِل چلی جانا......''

''نہیں ٹال سکتی ناں......''

''اوفوہ...... تمہیں تو سمجھانا بھی دوبھر ہے۔'' خالہ کو غصہ ہی آ گیا تھا۔

''اچھا خالہ کل کا سارا دن آپ کے ساتھ...... سچی میں۔'' ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر میں نے کہا۔

''ارے بھئی...... تم اپنے مزاج کے حساب سے چلتی ہو، تمہیں دوسرے کی بھلا کیا پروا......''

''سچی میں...... کل بالکل پورا دن آپ کے ساتھ...... کل کا سنڈے...... برباد کرنے کے لیے پکا پکا......'' اور خالہ ہنس دیں...... مگر اپنی بات پر اڑی رہیں...... جس پر مجھے حیرت بھی تھی۔ خالہ سے منت کر امی کو سلام اور خدا حافظ کرتے ہوئے میں نے قدم باہر ہی نکالا تھا کہ وہ مجھے جاتے دیکھ کر چونکنا سی ہوگئیں۔

''صبو...... بیٹا......'' سبزی بنانے کا من پسند کام روک کر بولیں۔
''جی امی......'' میں نے تابعداری سے کہا۔
''صبو بیٹا......'' لہجے میں شیرینی گھول کر پھر پکارا گیا۔
''جی امی جی......'' میں نے پھر کہا۔
''صبو...... میں سوچ رہی ہوں......'' وہ پھر رک کر مجھے دیکھنے لگیں۔
''جی امی...... جلدی کہیے ناں...... مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اب کے میں نے لاڈ سے کہا۔
''آج اگر نہ جاؤ تو......؟''
''مجھے زارا کے ساتھ اپنا سی وی دینے کہیں جانا ہے اور دو چار کام اور نمٹانے ہیں۔''
''اچھا...... اگر آج جلدی آجاؤ تو......؟''
''آج کیا خاص بات ہے؟'' میں نے پلٹ کر پوچھا تھا۔
''تمہارے لیے سرپرائز ہے۔'' وہ ہنسیں۔
''مگر مجھے سرپرائز اچھے نہیں لگتے۔''
''یہ اچھا لگے گا۔'' باور کرایا گیا۔
''سوری صد امید نہیں ہے کہ میں جلد آسکوں گی...... اور اگر نہ آسکی تو آپ فرح خالہ کے ساتھ مال چلی جایئے گا۔'' اور میں اپنی بات کہہ کر اتنی تیزی سے نکل گئی تھی کہ اُن کا جواب تک نہیں سنا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ انہیں ایک بڑی برانڈ کے اسٹور میں لگی سیل سے چادریں لینی تھیں...... اور دوسرے ڈیزائنرز ٹاپ کی سیل سے کرتے وغیرہ...... اس طرح کی شاپنگ کرنے میں، میں بور...... مگر امی اور فرح خالہ دونوں بڑا انجوائے کیا کرتی تھیں۔
اور آج قدرے دیر سے گھر جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ گھر جا کر کڑک سی چائے پی کر اپنے کمرے میں آرام کروں گی مگر باہر گیٹ کے عین سامنے ایک اجنبی سی گاڑی پارک دیکھ کر حیرت سی ہوئی۔
''یہ آج ہمارے گھر کون آیا ہے؟''
''مہمان تمہارا انتظار کر رہے ہیں...... چینج کر کے آجانا۔'' اندر گئی تو فرح خالہ نے بڑی رازداری سے کہا۔
مگر میں اسی حلیے میں اندر چلی گئی۔
''اچھا تو یہ ہیں صبا......'' مہمان خاتون کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے سوالیہ نظروں سے امی کو دیکھا۔ امی نے ان سب کا تعارف مجھ سے کرانے کے بعد کہا۔
''بیٹا آج یہ لوگ بطورِ خاص تم سے ملنے آئے ہیں۔''
اب میری نظر ان ظفر صاحب پر تھیں جو مجھے بغور دیکھ رہے تھے...... مجھے ان کی شکل جانی پہچانی سی لگی۔
''آپ کو شاید میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''
''جی ہاں...... وہ اس لیے کہ میرا اور آپ کا آفس ایک ہی بلڈنگ میں ہے۔'' ظفر صاحب متبسم لہجے میں بولے۔ ''میں آپ کے پروڈکشن ہاؤس کی بات کر رہا ہوں۔''
''جی، وہ میرا آفس تھا مگر اب نہیں......''
''مگر میں نے تو آپ کو چند دن پہلے بھی وہاں دیکھا تھا...... بڑا اچھا سا پروڈکشن ہاؤس ہے وہ...... اور......''
''میں نے کہا ناں کہ میں وہ چھوڑ چکی ہوں......'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''مگر کیوں......؟'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

''یہ میرا پرسنل میٹر ہے......'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے اب آپ کہیں جاب نہیں کر رہی ہیں......'' ان کے ساتھ آئی ہوئی خاتون جن کا نام سبین بتایا گیا تھا اب براہِ راست مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''میں نے ایک اخبار جوائن کیا ہے......مگر شاید میں کسی پروڈکشن ہاؤس میں چلی جاؤں...... یہاں دراصل میرا دل نہیں لگ رہا ہے۔''

''اور کیا مشاغل ہیں آپ کے؟''

''کچھ بھی نہیں......گھر میں بور ہوتی ہوں تو خوب سوتی ہوں۔''

''کوکنگ سے کچھ دلچسپی؟''

''بالکل بھی نہیں......کچن میں جا کر تو مجھے ڈپریشن سا ہوتا ہے۔ اب فرح خالہ مجھے کڑک سی چائے بنا کر دیں گی......تو میں سوؤں گی۔''

''ذرا بھی بناوٹ نہیں ہے، جو بات دل میں ہو......وہی کرنے کی عادی ہیں آپ۔'' اب وہ لڑکی ستائشی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ہاں، میں ایسی ہی ہو مگر عموماً ایسی عادتیں پسند نہیں کی جاتیں۔'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گئی۔

''صبو پلیز بات چیت میں ذرا نرم رویہ رکھنا......'' فرح خالہ نے باہر آ کر مجھے سمجھایا تھا مگر اندر جاتے ہی میں ان کی بات بھول گئی تھی۔

''کیوں آئے ہیں یہ لوگ......؟'' میرا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

''رشتہ مانگنے......''

''میرا رشتہ لینے کیوں آئے ہیں۔'' میں ایک دم ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔
''لڑکیوں کے کیا رشتے نہیں آتے......؟'' فرح خالہ مجھے سمجھا رہی تھیں۔
''مگر میرا کیوں لائی ہیں؟'' میرے لہجے میں ہنوز تناؤ تھا۔
''وہ اس لیے کہ میرا رشتہ تو آنے سے رہا اس پکی عمر میں......اب تمہارا ہی آئے گا، چاہے وہ کہیں سے بھی آئے۔اور یہ لڑکا بظاہر تو اچھا ہی دکھائی دے رہا ہے۔''
''آپ جا کر منع کر دیں......'' میں نے کہا۔اور چائے کا کپ لے کر وہیں لاؤنج میں چلی گئی...... جہاں میری ایک دوست کا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈراما ایک چینل پر آرہا تھا۔
میں ڈراما دیکھنے میں محو تھی...... کہ اچانک ہی کیبل کی لائٹ چلی گئی۔ٹی وی بند کیا......تو اب امی کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔
''آپ اپنے بیٹے کی تصویر چھوڑ جائیں......میں صبا سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گی۔''
''ہمارے بھائی نے تو ہم پر چھوڑ دیا ہے......وہ تو فون پر بات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔''
''تو میں کون سی تیار ہوں۔'' میں نے کمرے میں جا کر کہا۔
''کیا مطلب......؟'' سبین نے حیرت سے کہا۔
''پلیز......آپ لوگ اپنا ٹائم ضائع نہ کریں...... کہ میں کسی سے شادی نہیں کر سکتی۔''
''ارے بیٹا......ہم تو بہت محبت سے آئے ہیں......تم بات کرنا چاہو تو بات کر سکتی ہو......'' ان کی والدہ نے تصویر کا لفافہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
''آنٹی آپ سو فیصد ٹھیک کہہ رہی ہوں گی......مگر مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے بیٹے سے بات کروں......'' میں نے لفافہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے بھی اپنی شادی کے تمام معاملات اپنی ماں کے سپرد کر کے رکھے ہیں، ہمارے بیٹے کی طرح۔''
''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' میں کہنے کو رکی۔
امی نے مجھے گھورا......اور فرح خالہ نے ہاتھ دبایا۔
''آنٹی میری منگنی ہو چکی ہے۔'' میں نے برملا کہہ دیا۔
''کیا......؟'' اب وہ حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔
''ہاں......میری بچپن میں ایسی زوردار منگنی ہوئی تھی...... کہ آج بھی ایسی کسی کی نہیں ہوا کرتی ہو گی۔''
''اوہ......تو تم انگیجڈ ہو؟'' انہوں نے حیرت سے امی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''بچپن کی منگنی تھی......کب کی ختم ہو چکی۔'' امی نے دھیمے لہجے میں آواز بلند کی۔
''اوہ تو پھر کیا ہوا......آج کل تو نکاح ٹوٹ جاتے ہیں۔'' اب ظفر صاحب اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے۔اور میں ایک ٹرانس کی صورت میں کہہ رہی تھی جیسے کسی روبوٹ کا بٹن دبا دیا ہو۔
''بات زبان کی ہوتی ہے......بات دل کی ہوتی ہے......اور وعدے اس لیے نہیں کیے جاتے کہ انہیں......ایفا نہ کیا جائے اور جب جانے والے نے کہا تھا کہ وہ آئے گا......تو وہ آئے گا......ہاں ضرور آئے گا...... اسکی صورت میں......میں انگوٹھی کے دائرے سے کیسے نکل سکتی ہوں۔''
''کیا تم منگنی کی قیدی ہو......'' سبین کا لہجہ بھی تمسخرانہ تھا۔

''آپ جو دل چاہے سمجھ سکتی ہیں۔ میرا جب شادی کا وقت آئے گا...... تو ہو جائے گی۔''

''اوہ تو یہ بات ہے......'' ان کے لہجے سے آہ بلند ہوئی تھی...... اور وہ مجھے ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''اٹھیے اماں...... ہمیں نہیں معلوم تھا یہاں بھی کسی پروڈکشن ہاؤس کے ڈرامے چل رہے ہیں۔'' سبین کا لہجہ خاص سفاکانہ تھا۔

تب میں سرعت سے وہاں سے نکلی...... اور سیدھی اپنے بیڈ روم میں جا گھسی جہاں اپنے تکیے میں اپنا منہ چھپا کر اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالنی تھی۔

''کتنی بدتمیز لڑکی تھی...... وہ صبا...... کیسے اکھڑ لہجے میں منع کر دیا اس نے، کوئی ایسے کہا کرتا ہے بھلا...... گھر آئے مہمانوں کا تک کچھ خیال نہیں۔'' سلمٰی بیگم گھر آ کر برہمی کا اظہار کر رہی تھیں۔

''مجھے تو ابنارمل سی لڑکی لگی وہ...... کیسے غصے سے کمرے میں داخل ہو کر اپنی ماں کو منع کر رہی تھی...... ارے جب منگنی کر کے لوگ بھاگ گئے...... تو کوئی نہ کوئی تو وجہ ہوگی ہی ناں...... توبہ ہے جا کر خوار ہی ہوئے۔'' سبین بول رہی تھی بلکہ ظفر کو خوب سنا رہی تھی۔

''میں نے تو آفس میں ہر شخص سے پوچھا تھا کہ اس لڑکی کی کسی سے کوئی منگنی کوئی چکر ہے تو بتا دو...... تو سب نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا اس لڑکی کے لیے ایسی بات کوئی کر ہی نہیں سکتا......'' ظفر الگ روہانسا ہو کر صفائیاں پیش کر رہا تھا۔

''ظاہر ہے اگر نارمل لڑکی ہوتی تو اتنی خوب صورت ہونے کے باوجود ابھی تک کنواری تو نہ ہوتی۔'' سلمٰی بیگم کا غصہ ہی کم نہیں ہو رہا تھا۔

''مجھے تو پورا گھرانا ہی سائیکی لگ رہا تھا...... ارے بھئی...... جب تمہاری لڑکی شادی کی خواہش مند ہی نہیں ہے...... تو لوگوں کو خود ہی منع کر دو...... مگر وہ تو ہم سے کھیل رہی تھیں...... کہ مشورہ کر کے جواب دیں گی...... اور کئی مہینے ہمارا صبر آزمانے کے بعد ٹکا سا جواب دے دیتیں۔'' سبین کو وہاں کی ہر بات پر تاؤ آ رہا تھا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں وہاں چلی کیوں گئی۔'' سلمٰی بیگم اب اپنے وہ تحائف بڑی بے رغبتی سے الماری میں پھینک رہی تھیں...... جنہیں وہ بڑی محبت سے اپنے ساتھ بیگ میں رکھ کر لے گئی تھیں۔ حالانکہ بیٹی نے منع بھی کیا تھا۔

☆☆☆

''دیکھا آپا...... صبو نے اس دفعہ بھی وہی کیا...... جو وہ چاہتی ہے۔'' فرح خالہ نے غصے سے کہا۔

''گھر آئے مہمانوں کے ساتھ کوئی اس طرح کیا کرتا ہے...... جبکہ پتا بھی ہے۔ بچپن کی منگنی کا کوئی نام نشان تک نہیں ہے۔ پانچ سال پہلے جب معلوم ہوا تھا عامر امریکا میں ورجینا میں ہے مگر جب معلومات کروائی گئی تو وہ ورجینا چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔''

''فرح جسے شادی کرنی ہو تو وہ رابطے میں رہتا ہے...... اور جب کوئی کسی قسم کا تعلق ہی نہیں رکھے تو اس کا انتظار کرنا تو پاگل پن ہی ہے ناں......''

''تو پھر یہ صبو یہ سب کیوں کر رہی ہے؟''

''سارے پاگل میرے ہی حصے میں تو آئے ہیں...... مگر اب تم ان لوگوں سے متعلق کوئی بات بھی اس کے سامنے نہ کرنا...... ورنہ وہ خواہ مخواہ چڑ جائے گی۔'' شہناز نے سمجھایا۔

مگر فرح خالہ دکھ بھرے لہجے میں بڑبڑا رہی تھیں۔

☆☆☆

اور میں لاؤنج میں بیٹھی ان کی باتیں سن کر کانٹوں پر چل، چل کر لہولہان ہو رہی تھیں۔
امی کو بارہا منع کیا تھا...... کہ وہ میری شادی کے لیے پریشان نہ ہوں اگر وہ میری قسمت میں ہوا تو وہ ضرور واپس آئے گا مگر وہ گاہے بہ گاہے کسی نہ کسی کو رشتے کے روپ میں بلا لیا کرتی تھیں...... اور تب میری یادوں کے زخم ہرے سے ہو جاتے تھے......
وہ میری ذہنی حالت سے باخبر ہوتے ہوئے جانے کیوں وہ سب کر لیا کرتی تھیں...... جس سے میں بے حد دکھی سی ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

وہ واقعی دکھی سی ہو گئی تھیں۔ کتنے عرصے بعد کوئی لڑکی انہیں دل سے پسند آئی تھی اور اس نے کہہ دیا کہ وہ تو کسی کی منتظر ہے...... اور منتظر بھی ایسے شخص کی...... جس کے آنے کی امید خود اس کے گھر والوں کو نہیں تھی۔
''کیا بات ہے، سب بڑے خاموش سے ہیں......'' وہ باہر سے آیا تو اماں کے ساتھ بڑی بہن، بہنوئی کو یک دم خاموش بیٹھا دیکھ کر متحیر سا ہوا۔
''نہیں کوئی بات نہیں ہے۔'' سین آپا کا لہجہ بھی خاصا مغموم سا تھا۔
''کوئی خاص بات ہے کیا کل بھی سب خاموش تھے اور آج بھی سب خاموش ہیں۔''
''نہیں بھائی...... بس اپنی معلومات پر افسوس ہو رہا ہے۔''
''کیسی معلومات......؟''
''ایک لڑکی اچھی دکھائی دی...... تو اس کے گھر چلے گئے۔''
''اور گھر جا کر پتا چلا کہ وہ شادی شدہ تھی۔'' اس نے جملہ مکمل کر دیا۔
''نہیں بھائی...... ایسی بات نہیں تھی۔'' سین نے پہلی مرتبہ منہ کھولا۔
''وہ شاید سائیکی تھی۔''
''تو جب آپ جانے بوجھے بغیر ہر گھر میں جانے کو تیار ہو جاتی ہیں...... تو ایسا ہی ہونا تھا۔''
''اس کے گھر والے تو بہت اچھے تھے...... مگر وہی ٹیڑھی سی تھی۔''
''قصور اس کا نہیں آپ کا ہے۔''
''مگر ان کی ماں نے ہمیں بلایا ہی کیوں...... قصوروار تو ان کی ماں ہوئی ناں......'' سین نے کہا۔
''ہر ماں کے لیے اس کی بیٹی میں خوبیاں ہی ہوا کرتی ہیں۔''
''مگر ہم تو جا کر زچ ہی ہوئے۔''
''چلیں اچھا ہے، اب کچھ عرصے میرا پیچھا چھوڑیں...... اور اگر زیادہ ہی شوق آ رہا ہے تو ہنی کے لیے لڑکی دیکھنا شروع کر دیں۔'' اس نے کہا اور موبائل پر کال آتی دیکھ کر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''صبا یہ روٹیاں ہاٹ پاٹ میں واپس کیوں رکھ دی ہیں تم نے؟'' امی تفکر بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔
''بھوک نہیں ہے مجھے۔'' پانی پی کر ...... میں بے وجہ ٹی وی کے سامنے آ بیٹھی تھی اور بظاہر بڑی رغبت سے ٹی وی بھی دیکھ رہی تھی مگر ٹی وی پر کیا آ رہا تھا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ہر چینل پر جگمگاتی شب کسی تاریک رات کی شکل اختیار کرتی نظر آ رہی تھی۔
سلمٰی بیگم کی باتیں عجیب دھار والے لہجے میں مجھے کچوکے دے رہی تھیں۔ ''تم جیسی لڑکی کو منحوس کہتے ہیں جس

سے ناتا جوڑ کر کوئی بھاگ جائے اور پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھے...... اس کی اوقات دو کوڑی کی بھی نہیں ہوتی ہے۔''
وہ تو گھر جا کر شکر کر رہی ہوں گی...... کہ کس سیاہ بخت لڑکی کے گھر وہ چلی گئی تھیں...... جو اتنی بد نصیب ہے کہ زندگی کے ہر محاذ پر سب کچھ اچھا ہوتے ہوتے اچانک ہی برا ہو جاتا ہے۔
اب میں اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے یہ سب بلاوجہ سوچے جا رہی تھی۔ ٹی وی پر کسی کردار نے ایک زوردار تھپڑ کسی کو مارا...... اور مجھے یوں لگا جیسے وہ تھپڑ میرے لگا ہو اور پھر میں بلاوجہ ہاتھوں کے ناخن کترنے لگی...... جیسے اپنی کھسیاہٹ چھپا رہی ہوں۔
''صبا بیٹا...... اپنی جاب تم نے خود چھوڑ دی ہے...... کوئی نکالی تو نہیں گئی تھیں؟'' امی نے میرے قریب بیٹھ کر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔
''ہاں...... میں نے اپنی جاب خود چھوڑی ہے۔'' میری آواز ایسی تھی جیسے کسی روبوٹ میں سے آ رہی ہو...... ''تو پھر اس کا اتنا غم کیوں منا رہی ہو۔'' اب وہ میرے ہاتھوں کو ملائمت سے تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
یہ ان کی چاہت کا بڑا خوب صورت انداز ہوا کرتا تھا...... اور مجھے یوں لگا کرتا...... جیسے وہ میرے ہاتھوں سے میری تمام پریشانیاں اپنے ہاتھوں میں منتقل کر رہی ہوں۔
''امی...... پر دکھ تو مجھے ہے ناں......'' اب میں نے اپنا سر ان کے شانے سے لگا دیا تھا...... اور آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر باہر آ چکے تھے۔
''میری اتنی ٹیلنٹڈ بیٹی ہے...... اس کے لیے جاب کی کیا کمی...... اور موجودہ جاب تو یقیناً پہلے سے بھی بہتر ہوگی۔''
آس کے دیے روشن کرنے میں تو وہ ہمیشہ کی ماہر تھیں...... کوئی بات، کوئی مسئلہ کتنا ہی ٹیڑھا اور کیسا ہی تلخ کیوں نہ ہو...... وہ اس میں سے مثبت سرا ڈھونڈ ہی لیا کرتی تھیں۔
''امی...... مجھے اپنی پرانی والی جاب یاد آ رہی ہے......'' اب میں اس بچے کی طرح رو رہی تھی...... جس کے ہاتھوں سے کسی نے اس کا من پسند کھلونا چھین لیا ہو۔
میری آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر وہ بے کل سی ہو گئیں اور اپنی ہتھیلیوں میں آنسو سمیٹ کر بولیں۔
''اتنی خوب صورت آنکھوں میں آنسو ذرا اچھے نہیں لگتے۔''
''آنکھوں میں تو آنسو ہی آیا کرتے ہیں۔'' روتے ہوئے مجھے ان کی بات عجیب سی لگی۔
''نہیں میری گڑیا...... ہنستی ہوئی آنکھیں سب سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہیں...... اور میری یہ دعا ہے کہ تمہارے لبوں کے ساتھ تمہاری آنکھیں بھی ہنستی رہیں۔ ہاں خبردار...... اب جو تم روئیں۔''
''جب کچھ اچھا نہیں لگتا...... تو رونے کو ہی تو دل چاہتا ہے ناں۔''
''میری شہزادی جو ہوتا ہے...... وہ ہمیشہ اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ جب میں پریشان نہیں ہوں...... تو میری بیٹی کیوں پریشان ہو رہی ہے۔'' اب امی کی انگلیاں میرے بالوں سے ہوتے ہوئے سر پر اس طرح گھوم رہی تھیں کہ مجھے واقعی آسودگی سی محسوس ہونے لگی۔
میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر صوفے کی پشت پر رکھ لیا۔
اب وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں قرآنی آیات پڑھ کر میری پیشانی پر دم بھی کر رہی تھیں...... انہوں نے ان لوگوں کا ذکر تو کیا کوئی حوالہ تک نہیں دیا تھا...... جیسے ہمارے گھر کوئی آیا ہی نہ ہو...... اب وہ ہلکے، ہلکے میرے سر کا مساج کر رہی تھیں...... اور میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں...... مگر وہ منظر بہت روشن سا مجھے نظر آ رہا تھا...... جب

عامر خانزادہ نے ڈھیر سارے گلابی گلاب دیتے ہوئے کہا تھا۔
''دیکھو...... جیسا تمہارا رنگ ہے، ان گلابوں کا رنگ بھی ایک دم ویسا ہی ہے۔''
''اچھا تو تم یہ کہنا چاہتے ہو...... میں نے ان پھولوں کا رنگ چوری کیا ہے......'' ایک معصوم سی بچی کی سوچ یہی ہو سکتی تھی۔
''نہیں تم نے نہیں...... بلکہ ان پھولوں نے تمہاری نقل کی ہے۔'' وہ ہنسا تھا...... اور اس کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی تھی۔
پھر جب وہ آٹھویں کلاس کی کتابوں کا بیگ میرے لیے لایا تو میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔
''میں تو پانچویں جماعت کا امتحان پاس کر کے چھٹی جماعت میں جاؤں گی...... یہ آٹھویں جماعت کی کتابوں کا میں کیا کروں گی؟'' تو وہ بڑی سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے بولا تھا۔
''امی کہہ رہی ہیں...... صبا جب پڑھ لے گی...... تو وہ اسے بیاہ لائیں گی...... تو تمہیں جلدی، جلدی پڑھنا ہوگا۔''
''کیا تم بھی ایک سال میں دو کلاسیں پاس کیا کرو گے؟'' میں نے حیرت کے ساتھ ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔
''ہاں، بالکل...... اور میرا بس چلے تو اس سے بھی تیز......'' اور میں اس بات پر کتنا ہنسی تھی...... کہ ہنستے، ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
آنسو شاید...... میری آنکھوں میں ہی ٹھہر گئے تھے...... اور اب پھسل کر گالوں پر آئے...... تو ہڑبڑا کر میں نے آنکھیں کھولیں۔
میں کتنی دیر سوتی رہی تھی...... اور امی سامنے صوفے پر کھانے کی ٹرے لیے بیٹھی تھیں...... کہ کب میری آنکھ کھلے...... اور وہ مجھے کھانا دیں۔
''آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں...... یہ تو آپ کے آرام کا وقت ہوتا ہے......'' میں نے انہیں اپنی جانب بغور دیکھتے پا کر پوچھا۔
''تم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا ہے...... تم بھوکی بیٹھی رہو...... بھلا میں کیسے کچھ کھا سکتی ہوں۔'' وہ میرے سامنے ٹرے رکھتے ہوئے بولیں۔
میں نے چونک کر انہیں دیکھا...... ان کے چہرے کی بے چینی کسی صورت کم نہیں ہو رہی تھی...... ان کا یہ ملال کہ میں بھوکی ہوں...... ان کے چہرے سے عیاں تھا۔
''میں آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گی...... بھوک بھی بہت لگ رہی ہے...... پتا نہیں کیسے میری آنکھ لگ گئی۔'' ان کی خوشی کی خاطر...... میں نے نارمل انداز میں کہا اور وہ خوش ہو گئیں۔
''کریلے قیمہ اچھا ہے ناں......'' انہوں نے اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر میرے منہ میں رکھا۔
''بہت مزے کا ہے...... کل آفس میں بھی لنچ کے لیے دیجیے گا...... میں یہی لے کر جاؤں گی۔''
''میں نے پہلے ہی رکھ دیا ہے۔ بس تم خوش رہا کرو...... کوئی فکر اور پریشانی جھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''پریشانی تو خود چل کر آئی...... میری سہیلی صادقہ نے کیوں میرے ساتھ سیاسی گیم کھیلا۔''
''بیٹا...... سیاست تو اب ہر ادارے میں گھس آئی ہے...... دوسروں کے خیر خواہ اب کم، کم ہی نظر آتے ہیں...... سب کو اپنا مفاد اس لیے عزیز رہنے لگا ہے کہ وہ بھول گئے ہیں کہ سب کا رازق صرف اللہ ہے اور اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آتی...... اور صادقہ جیسے لوگ تو ہر جگہ ہیں...... اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہی

نہیں ہے۔ کسی کو گرا کر آگے بڑھنے والے...... خود بھی گر جایا کرتے ہیں۔''
''مگر یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے...... کہ ٹرین کا ڈبا میرا ہی کیوں کٹ جاتا ہے......'' اب مجھے اپنے بچپن کی باتیں پھر زور شور سے یاد آرہی تھیں...... کہ کیسے، کیسے خوب صورت وعدے تک ایفا نہیں کیے گئے تھے...... کلاس میں فرسٹ میں آتی مگر ٹیچرز پرنسپل کی بیٹی کو ہمیشہ فرسٹ کی رپورٹ دیتیں۔
''اب پرانی باتوں پر کڑھنا چھوڑ دو...... کہ رات گئی بات گئی......''
''امی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں وہ لڑکی ہوں...... جس کا کوئی ماضی ہے ہی نہیں۔''
''بیٹا ماضی میں جینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا......''
''مگر...... ماضی...... زندگی کے ساتھ تو چلتا ہے ناں......'' میں نے منطق جھاڑی۔
''نہیں چلتا...... بری باتوں اور بری یادوں کو آگ لگا دینی چاہیے۔'' امی نے پھر نوالہ بنا کر...... اپنے منہ میں رکھنے کے بجائے میرے منہ میں رکھ دیا۔ اور میرے حلق میں آگ سی لگ گئی۔ کتنے ہی پانی کے گلاس چڑھا گئی...... مگر جلن بدستور تھی۔
''میری بچی...... تم یہ کیوں بھول جاتی ہو...... کہ جرنلزم میں تم نے ٹاپ کیا تھا...... ڈیپارٹمنٹ میں کوئی تمہارے مقابلے کا نہ تھا...... اب تم جس اخبار میں جاب کر رہی ہو...... یہاں تمہیں لکھنے کے مواقع بھی زیادہ ملیں گے......اور تم ترقی بھی خوب کرو گی۔ دیکھ لینا...... میری بات ضرور پوری ہو گی۔''
''مگر امی...... یہاں میرا دل ہی نہیں لگ رہا ہے...... ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نالائق اسکول میں آگئی ہوں ایسا اسکول جہاں کے شرارتی اور بدتمیز بچے بھی ایک دوسرے پر الزام دھرتے رہتے ہوں اور اساتذہ بھی اپنی آئی دوسروں پر ڈالتے رہتے ہوں تو وہاں پر میرا دل کیسے لگ سکتا ہے۔''
''بیٹا...... نئی جگہ دل مشکل سے ضرور لگتا ہے...... مگر لگ جاتا ہے...... یہاں کا ماحول اچھا بھی ہو جائے گا اور اس شور شرابے کی تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔'' وہ مجھے تسلی دیتیں...... مگر میری سوچیں...... کسی پل مجھے چین نہ لینے دیتیں......اور اس کی ایک بڑی وجہ میری موجودہ جاب بھی تھی۔
اخبار کی ہڑبونگ سی حالت دیکھ کر...... مجھے اتنا اندازہ تو ہو رہا تھا کہ یہ اخبار کبھی اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں ہو گا...... مجھ سمیت سب ہی اپنا وقت گزار رہے تھے مگر میں یہ بھی سوچا کرتی...... کہ اس سے کم درجے اور بہت معیار کے اخبار بھی اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی وقت نہیں لگا پاتے...... تو یہ بھی اٹھے گا تو ضرور...... زندگی بس عجیب سی چل رہی تھی...... پنجاب سے واپس آنے کے بعد میرا یہاں کراچی میں دل نہیں لگ رہا تھا...... نہ گھر میں، نہ جاب میں۔
''صبو جب تم پنجاب میں تھیں...... تو تمہارا وہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اور بس نہیں چل رہا تھا کہ کراچی ہی آجاؤ......'' خالہ نے کہا۔
''ہاں...... مجھے واقعی ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے کوئی آوازیں دے، دے کر بلا رہا تھا کہ آجاؤ...... کہ انکھیاں اڈیکدیاں......''
''ارے بیٹا...... خوابوں میں رہنا چھوڑ دو...... آج کل تو خون کے رشتے کسی کو یاد نہیں کیا کرتے...... تو پھر غیر کیوں کسی سے محبت کریں گے۔'' فرح خالہ کا لہجہ خاصا تلخ تھا...... اور وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں میں بخوبی سمجھ رہی تھی۔
''آپ تو یہ بھی کہتی ہیں کہ اب شادی کے بندھن بھی مضبوط نہیں ہوا کرتے......'' میں نے ان کی بات ہنسی میں اڑائی...... کہ اپنے خوابوں کے کچلنے والوں کو کچھ تو کہوں۔
''ہاں...... ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے......'' ان کا لہجہ شاید اس لیے بھی وثوق بھرا تھا کہ ان کی دو قریبی

سہیلیوں کو طلاق کے وار سہنے پڑے تھے۔
''پیاری خالہ! اگر مفروضوں پر یقین کرنا شروع کر دیں تو زندگی کٹھن ترین ہو جائے گی۔ اس لیے کسی کی کوئی سچی بات...... کوئی پیارا سا وعدہ بھی بڑا پکا ہوا کرتا ہے۔'' میں نے اپنے ہاتھ میں پڑے کنگن کو گھماتے ہوئے کہا۔
''صبو بیٹا...... ! اب تو ارمانوں کے رنگ کچے ہیں...... وعدے، قسمیں، سب کب کے اڑن چھو ہو چکے ہیں...... آج کے لڑکے شادی کے نام پر بھی اچھے پیکج کے ساتھ بیوی کا حصول چاہتے ہیں...... ظاہر داری ان دنوں اِن ہے...... اور تم پرانی باتوں کو پکڑے بیٹھی ہو۔'' میری بات سن کر فرح خالہ ہنس پڑی تھیں اور بڑے عجیب سے لہجے میں بولیں۔
''کیا مطلب ہے آپ کا...... کیا اب خوشی کا کوئی رنگ نہیں رہا......'' میں روہانسی سی ہو گی۔
''خوشی کا رنگ ضرور ہے...... مگر یہ صرف اس وقت نظر آتا ہے جب یہ آپ کے پاس ہے...... مٹھی میں جو ہے وہ آپ کا...... ورنہ آپ کا ہاتھ خالی......''
''اوہ...... تو یہ بات ہے......'' میری آواز مجھے خود تک کو سنائی نہیں دی۔
''بیٹا...... جب خوشی روٹھ جائے تو وہ خوشی ہی کہاں رہی۔'' فرح خالہ کو بھی دل جلانے کے شاید سارے ہی طریقے از بر تھے۔
''کیسی خالہ ہیں آپ؟ اپنے آپ کو میرا بیسٹ فرینڈ بھی کہتی ہیں...... مجال ہے کہ کبھی مجھے ذرا جو خوش ہونے دیں۔'' میرا سسکتا سا لہجہ شکایتی ہو جاتا۔
''صبو بیٹا...... ہمیشہ دماغ سے سوچا کرو...... دل سے سوچنے والے ہمیشہ نقصان اٹھایا کرتے ہیں۔''
''اللہ نہ کرے...... میرے ساتھ ایسا کچھ ہو......'' میں دکھ بھرے لہجے میں کہتی۔
''بیٹا تم یہ چاہتی ہو...... کہ میں ان پودوں میں بھی پھول کھلنے کی تمہیں خوش خبری سناؤں جو نہ صرف جل چکے ہیں...... بلکہ وہ نکال کر کچرے میں ڈالنے کے قابل ہیں۔'' میں ان کی بات پر بس انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''تو کتنا قابل ہے...... یہ تو میں جانتا ہوں مگر تو ماننا ذرا مشکل سے ہے۔ یہ بھی مجھے پتا ہے۔'' فرید صاحب اپنے موبائل سے لگاتار میسجز کیے جا رہے تھے مگر ان کے کسی میسج کا کوئی جواب نہ پا کر تمسخر سے خود ہی ہنسے اور بڑبڑائے۔
''کب تک...... آخر کب تک...... دیکھتا ہوں...... میں بھی...... ہاں اپنے چھوٹے بھائی کی تو بہت سنتا ہے ناں، اس سے بھی کہوں گا۔''
دوسری طرف وہ بے نیاز شخصیت تکیہ اپنے چہرے پر رکھے بے خبر سونے میں مصروف تھی۔ اور فرید کا ملال بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کا یہ خواب تھا کہ اس کا اخبار اپنی جگہ بنا لے...... جو بات لوگوں کے دلوں میں ہو...... وہ اس کے اخبار میں نظر آئے...... مگر وہ تو ذرا بھی کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔
سچ بولنا کتنا مشکل ہوا کرتا ہے، یہ بات اسے یہاں آ کر پتا چلی تھی۔ اس کے اپنے بھائی کتنی بار اسے یہ مشورہ دے چکے تھے کہ یہ اخبار بند کر کے ان کی طرح کوئی پیٹرول پمپ کھول لے۔
''میں تو آگ بجھانا چاہتا ہوں...... اپنے اخبار کے ذریعے سے...... بزنس میں نہیں کر سکتا...... میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کے کھولتے ذہنوں کو ٹھنڈا رکھوں۔''
''فرید بھائی، ٹھنڈی ٹھار تو بوتلیں ہوا کرتی ہیں...... اخبار نہیں اور اگر اخبار ٹھنڈے نکلنا شروع ہو گئے...... تو ان کی جگہ ردی ہوا کرتی ہے...... ان کو کوئی پڑھے گا بھی نہیں......'' قہقہوں کے شور میں مشورے دیے جاتے۔

''کرنا تو کچھ ہے ہی...... چاہے کچھ بھی ہو۔'' مارے غصے کے اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ پر مارا...... اور موبائل جیب میں ڈالا اور باہر نکل گیا۔ اس وقت وہ بینک جا رہا تھا۔ بینک منیجر سے مشورہ کرنے......

☆☆☆

''اللہ...... آج تو بہت دیر ہو گئی ہے۔'' شہلا اسکول سے باہر نکلی تو اسے احساس ہوا۔

وہ شہر کے ایک بڑے اسکول میں کیشئر کلرک تھی...... مہینے کی شروع کی تاریخوں میں اسے اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی۔ اور یوں بھی وہ اسکول کی دونوں شفٹوں کے لیے کیشئر کا کام کرتی تھی۔ جس میں اس کا کام نہ صرف طلبا طالبات کی فیس لینا تھا...... بلکہ ان کو بینک میں بھی جمع کروانا تھا...... مطلوبہ بینک برانچ اس کے اسکول کے قریب ترین ہی تھی...... اس لیے یہ اضافی کام...... اسے کبھی کام لگا ہی نہیں...... اور دوسری بڑی بات یہ تھی کہ اس بینک کا منیجر حارث اسے بے تحاشا اچھا لگنے لگا تھا...... اور اسے یوں لگتا جیسے اس کا آئیڈیل اسے مل گیا ہو...... حارث سیدھا سادہ نیک طبیعت لڑکا تھا...... جو اپنے کلائنٹ کا بے حد خیال رکھا کرتا تھا...... گاہے بہ گاہے انہیں چائے بھی پلا دیا کرتا تھا...... اور حارث کے اچھے اخلاق کو شہلا نے اپنے لیے پسندیدگی سمجھ لیا...... اور یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر بے وجہ بھی بینک کے چکر لگا لیا کرتی تھی...... بینک کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی...... تو تاسف سے آہ بھر کر رہ گئی...... بینک کا ٹائم تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ ''اُف...... میرا نصیب...... آج اس کو دیکھنا میرے مقدر میں ہی نہیں تھا۔'' اب وہ بڑبڑاتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف چل رہی تھی۔

''کل اسکول جانے سے پہلے بینک جاؤں گی...... اور یہ پیسے اکاؤنٹ میں جمع کرواں گی۔ اب کون واپس لے جائے...... اسکول کی یہ ذمے داری گھر ہی لے جاتی ہوں۔''

وہ بہ مشکل بس اسٹاپ تک ہی پہنچی تھی کہ بوندا باندی شروع ہو گئی...... اس نے پرس بغل میں دبا کر دونوں ہاتھوں کا چھجا سا بنا لیا...... اور دور سے آنے والی کوچز کو دیکھنے لگی...... یہ رش کا ٹائم تھا...... پہلی کوچ رکے بغیر ہی چلی گئی...... اور دوسری اور تیسری اتنی بھری ہوئی تھیں کہ وہ پائدان پر ڈنڈا پکڑ کر کھڑی ہونے کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ بوندا باندی کچھ تیز ہوئی...... تو وہ پریشان ہوئی...... اور سامنے سے آنے والی کالی کار کو ٹیکسی سمجھ کر ہاتھ دے دیا...... گاڑی جب قریب آئی تو وہ شرمندہ سی ہوئی...... بارش اب دھواں دھار ہو رہی تھی اور گاڑی پاس آ کے رک گئی تھی۔

اس سے قبل کہ وہ معذرت کر کے پیچھے ہٹ جاتی...... گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے حارث اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''ارے مس...... آج آپ اتنی تاخیر سے اپنے اسکول سے نکلی ہیں؟''

''ہاں آج دیر ہو گئی۔''

''اتنی زیادہ دیر؟'' اس کے لہجے میں حیرت گھلی ہوئی تھی۔

''جی......'' وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔

بادل زور سے گرجا اس اثنا میں ایک اور کوچ بھی آ گئی تھی۔ حارث کو ہاتھ ہلا کر اس نے ویگن کو رکنے کا اشارہ کیا...... مگر وہ رکے بغیر ہی چلی گئی۔

''آپ کہاں جائیں گی......؟'' حارث نے یہ سب دیکھ کر پوچھا۔

''ناظم آباد......''

''میں اُدھر سے ہی گزروں گا...... آئیں آپ......'' جملہ کہنے کے ساتھ ہی حارث نے گاڑی کا دروازہ کھول

دیا اور شہلا سرعت سے بڑھ کر یوں بیٹھ گئی کہ اگر اس نے رسماً بھی انکار کیا...... تو وہ برا مانے بغیر آگے بڑھ جائے گا۔ راستے میں وہ خاموش تھا...... مگر شہلا کو اس کا وجود بولتا ہوا لگ رہا تھا۔
اور جب مین روڈ سے اندر گلی در گلی مڑنے کا وہ بتا رہی تھی تو اسے یوں لگا جیسے اسے پریشانی سی ہو رہی ہو...... یا پھر شہلا کا ہی یہ احساس تھا۔
''بس یہاں ہی روک دیں......'' اپنے گھر سے پہلے ہی قدرے چوڑی گلی میں اس نے گاڑی کے داخل ہونے کے بعد کہا۔
''کیا آپ یہاں ہی رہتی ہیں؟''
''جی یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی میرا گھر ہے...... مگر آپ کی گاڑی...... آگے نہیں جا سکے گی۔''
بارش رک گئی تھی...... حارث نے بھی جیسے اس کی بات مان کر...... گاڑی فوراً ہی روک دی تھی۔
وہ پرس سینے سے لگائے...... دوپٹا لپیٹ کر تیزی سے آگے بڑھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا...... اس کا خیال تھا...... وہ گاڑی سے ٹیک لگائے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا ہوگا۔
مگر وہ الجھ سی گئی...... نہ وہ تھا...... اور نہ اس کی گاڑی...... شاید وہ اس کے اترتے ہی تیزی سے روانہ ہو گیا تھا۔
''اوہ...... اتنی جلدی چلا گیا...... وہ...... اسے تو رکنا چاہیے تھا......'' آگے بڑھ کر اس کے ساتھ پیدل ہی اس کے دروازے تک آنا چاہیے تھا۔
دل نے جیسے دہائی دی اور آنسو من ہی من میں ٹپک پڑے...... اس نے پھر مڑ کر دیکھا...... جیسے کہ اب وہ وہاں ہی کھڑا ہو گا وہ تو شاید اس کے اترتے ہی تیزی سے چلا گیا تھا۔
''ذمے دار لوگوں کے پاس اتنا ٹائم کہاں ہوا کرتا ہے۔'' اس کے دماغ نے جیسے اسے سمجھایا۔
''کوئی بات نہیں......'' وہ تیزی سے اپنی تنگ سی گلی میں مڑتے ہوئے اپنے آپ سے بولی۔
''حارث...... آج تم مجھے چھوڑنے آئے، کل تم یقیناً...... میرے گھر بھی آؤ گے...... سب کے ساتھ چائے بھی پیو گے......'' اپنے اس خیال پر وہ خود ہی شرما گئی۔

☆☆☆

''آ رہا ہوں اماں...... بس دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں میں...... مجھے معلوم ہے...... آج آپ کا اپائنٹمنٹ ڈاکٹر الوینہ کے ساتھ ہے۔'' حارث گاڑی تیز چلاتے ہوئے اپنی ماں سے موبائل پر بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''سوری اماں...... کیا بتاؤں اب آپ کو...... بعض دفعہ...... ذرا سی ہمدردی مہنگی پڑ جاتی ہے...... میں سمجھ رہا تھا...... بارش میں کسی کو مین روڈ پر اتارتا ہوا چلا جاؤں گا...... مگر اب گلیوں میں گھومنے میں جو وقت ضائع ہوا ہے...... اس کا تدارک تو نہیں ہو سکتا۔''
''اب گاڑی کو جہاز کی طرح مت اڑانے لگنا...... تم آرام سے آؤ...... میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' ماں نے فون بند کرنے سے پہلے اسے ہدایت دینی ضروری سمجھی اور وہ بھی کسی فرمانبردار بیٹے کی طرح سبک خرامی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

☆☆☆

شہلا بھوک کی کچی تھی...... گھر میں داخل ہوتے ہی کھانے اور چائے کی پکار مچا دیتی تھی...... مگر آج وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی...... اور مسکراہٹ اور خوشی اس کے اندر پھوٹی پڑ رہی تھی۔
''آپا...... آپ اسکول سے ہی آ رہی ہیں ناں......؟'' راحیلہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ اسکول سے ہی آتی ہوں میں۔'' وہ گڑ بڑا کر بولی..... جیسے چھوٹی بہن نے اسے حارث کے ساتھ گاڑی میں آتا ہوا دیکھ لیا ہو۔

''آج آپ کے اسکول کے ایڈمنسٹریٹر اشفاق صاحب کا کوئی چار مرتبہ فون آچکا ہے..... وہ آپ کو پوچھ رہے تھے۔''

شہلا نے اپنے پرس سے اپنا موبائل نکالا..... تو یک دم سر تھام لیا۔ اشفاق صاحب کی کئی مسڈ کالز موجود تھیں اور اس کا موبائل سائلنٹ پر تھا۔

سرعت سے نمبر ملا کر اس نے انہیں کال کی..... تو وہ انتہائی برہم لہجے سے اسے یہ باور کرا رہے تھے کہ اگر بینک کا وقت ختم ہو گیا تھا تو اسکول کے بچوں کی فیس وہ اسکول کے لاکر میں رکھ کر کیوں نہیں گئی۔

''سر میں نے سوچا صبح اسکول آنے سے پہلے بینک میں جمع کرواتی ہوئی آجاؤں گی۔''

''اور اگر کوئی آپ کا پرس لے کر بھاگ جاتا تو..... نقصان تو ہمارا ہی ہوتا ناں.....''

''سر میں اپنا پرس اپنے ساتھ لگا کر چلتی ہوں..... اور پھر دوپٹا بھی لپیٹ لیا کرتی ہوں..... کسی کو کیا پتا میرے پرس میں کیا ہے۔''

''صرف ایک پستول دیکھ کر آپ از خود اپنا پرس دے دیتیں..... اور یہ بھی کہتیں کہ میری جان بخشی کرو..... اور اسکول کی فیس لے لو.....''

''سوری سر..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ان کی تقریر تو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''آئندہ ایسی کوئی غلطی نہ ہو.....'' وہ دہاڑنے والے انداز میں بولے۔

''جی سر..... اوکے سر..... بہتر سر..... آئندہ ایسا ہی ہوگا.....'' کہہ کر اس نے موبائل بند کر کے گہری سانس لی۔

''آپا..... کھانا لاؤں..... یا صرف چائے.....؟'' راحیلہ نے اس سے پوچھا کہ پریشانی کی کوئی بھی بات ہوتی تو سب سے پہلے اس کا حلق بند ہو جایا کرتا..... کوئی کتنا ہی اصرار کرتا..... اس سے دو لقمے نہ کھائے جاتے..... کہ بے حد حساس جو تھی وہ۔

''بہت بھوک لگ رہی ہے..... فوراً کھانا لاؤ.....'' اس نے پرس الماری میں رکھ کر بے تابانہ لہجے میں کہا۔

''آپا آج ڈانٹ کھا کر آپ کا پیٹ نہیں بھرا کیا.....؟'' راحیلہ کا لہجہ شرارتی سا تھا۔

''ہاں، آج خوشی کا کوٹہ بہت زیادہ ہے۔'' وہ طمانیت سے مسکرا کر بولی اور راحیلہ کو اس کے اس انداز پر خاصی حیرت ہوئی تھی۔

☆☆☆

حیرت تو کیا پریشانی بھی شروع، شروع میں تو بہت ہوتی تھی مگر اب مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ کسی بیڈ لسلڈ سرکاری گرلز اسکول میں جب ہیڈ مسٹریس چھٹی پر ہوں تو عموماً بدشوق ٹیچر کلاسز میں نہیں جایا کرتیں..... اور ایسے میں ان کی کلاس کے بچوں کا شور پورے اسکول کو ڈسٹرب کیا کرتا ہے اور آج ہمارے آفس کا ماحول بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔

فرزانہ اپنے کیبن میں بیٹھ کر جگمگاتے سے ناخن لگا رہی تھی..... آج شام کو اسے کسی فنکشن میں جانا تھا۔

''یہ ناخن کس کو گاڑنے ہیں..... جو اتنی محنت کی جا رہی ہے۔'' میں نے راؤنڈ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''میرے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں..... اور خوب صورت کو مزید خوب صورت بنانا چاہیے۔''

''مگر مجھے تو بڑھے ہوئے ناخنوں سے ہی وحشت ہوتی ہے۔'' میں نے کندھے اچکا کر برا سا منہ بنایا۔

''وہ اس لیے مائی ڈیئر کہ اللہ نے تمہیں فرصت سے بنایا ہے..... اور تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''پھر دو سینگ بھی لگالو...... کہ جب بس نہ چلے تو سینگ ماردو......'' میں ہنس کر آگے بڑھ گئی۔
مگر ساجد کا قہقہہ دیر تک سنائی دیتا رہا۔
''کیا کل اخبار نہیں نکلے گا...... یا آج کا اخبار دوبارہ چھاپ دیا جائے گا؟'' سب کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے دیکھ کر میں نے پوچھا۔
''جیسے آج کل حالات چل رہے ہیں...... پندرہ دن پرانے اخبار کی ڈیٹ چینج کر کے اسے دوبارہ بھی چلایا جاسکتا ہے۔'' جاوید نے کھی کھی میں رائے دی۔
''اب ایسی باتیں فرید صاحب کے سامنے مت کر دینا...... ورنہ وہ کھنچائی کرنے میں ٹائم نہیں لیا کرتے......''
''آج بگ باس آئے ہی نہیں ہیں...... جب ہی تو یہ سب بکواس ہو رہی ہے......'' فرزانہ اپنے جگمگاتے ناخنوں پر پھونکیں مارتے ہوئے اب مین لاؤنج میں آگئی تھی۔
اور آج کا دن نہ جانے کیوں...... مجھے بے حد عجیب سا لگ رہا تھا۔ خواہ مخواہ کی گھبراہٹ سی ہو رہی تھی...... ایسا خیر اکثر میرے ساتھ ہوا کرتا تھا۔
آج آفس میں آنے کے بعد فرید صاحب اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ ان کا بے وجہ کا شور کم تھا...... ورنہ ان کی آواز دیگر آوازوں پر ہمیشہ غالب رہتی تھی۔
فرزانہ کا تو خیال تھا کہ وہ یقیناً ابھی آئے ہی نہیں ہیں...... پیون (چپراسی) جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ آچکے ہیں...... پیون کے جھوٹ کے لاتعداد قصے بھی سب کو از بر تھے۔ ناعمہ اور ساجد نے، اپنے کیبن چھوڑ کر وہیں لاؤنج میں آکر چائے پی رہے تھے۔ یہاں کوئی رپورٹر کسی فیملی اداکارہ کا نہ صرف انٹرویو کر رہی تھی بلکہ اس کی تصاویر بھی بنائی جارہی تھیں...... فرید صاحب کی زوردار چھینکوں کی آواز جب باہر آئی تو سب کو یقین ہو گیا کہ موصوف آفس میں ہی تشریف رکھتے ہیں...... مگر سب ورکرز کو اس بات پر خاصی حیرانی ہو رہی تھی کہ موصوف آخر چیخنے چلّانے سے باز کیوں ہیں......
''لگتا ہے سر کی طبیعت خراب ہے۔'' فرزانہ نے اپنے آفس فیلوز کو SMS کرنے شروع کر دیے۔
''یہ تو اچھی بات ہے مگر ہوا کیا ہے؟''
''شاید آواز بیٹھ گئی ہوگی۔''
''نہیں بھئی، چھینک کی آواز تو آواز کی رفتار سے بھی تیز تھی۔''
''پھر منہ میں چھالے نکل آئے ہوں گے۔''
''نہیں بھئی ڈکرانے والے چھالوں اور سالوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔''
''پھر تو راستے میں چالان ہوا ہے اور وہ بھی زبردست سا......''
''ارے بیگم سے لڑائی ہوئی ہوگی اور انہوں نے بغیر ناشتے کے ان کو روانہ کر دیا ہے۔''
مزیدار میسجز کا خوب تبادلہ ہو رہا تھا...... اور ہنسی کا دورانیہ بڑھتا ہی جا رہا تھا...... اس سے قبل کہ یہ ہنسی کے گول گپے...... پٹاخوں کی صورت اختیار کرتے فرید صاحب کی آواز سنائی دی...... پرانے لب و لہجے کے ساتھ مگر نئے انداز میں......
''ابے یہ کی ہے تم نے رپورٹنگ...... کچی عمر کی لڑکیوں کو ورغلانے والوں کی تصاویر میں سب کے چہرے چھپے ہوئے ہیں اور معصوم بچیاں جن پر ظلم ہوا ہے...... ان کے کلوز اپ لگا دیے گئے ہیں۔'' فرید صاحب کا چیخنا...... آج مجھے خاصا برحق لگ رہا تھا۔

''سر ایسا ہی ہوتا ہے...... اخبارات کیا...... ٹی وی کے چینلز دیکھ لیں...... مجرموں کو چادر اڑھا کر دکھایا جاتا ہے اور جن کے ساتھ ظلم ہوتا ہے ان کی بڑی، بڑی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔''

''مگر اب ہم ایسا ہر گز نہیں کریں گے۔''

''سر اخبار ویسے ہی نہیں چل رہا ہے...... اگر کچھ نیا کرنے کو کہیں گے تو یہ اخبار بند ہو جائے گا۔''

''ہو جانے دو بند مگر ہمیں مظلوموں کا ساتھ دینا ہے...... ان کی مدد کرنی ہے، حق دار کو اس کا حق دلوانے کے لیے سعی کرنی ہے۔''

''مگر یہ سوچ کب آئی آپ کے دماغ میں؟'' نیوز ایڈیٹر نے ہمت کر کے پوچھا۔

''آج ہی آئی ہے صبح دس بج کر بیس منٹ پر۔''

''جس شخص کی مونچھیں ہمہ وقت سوا نو بجا رہی ہوتی ہیں...... وہ دس بج کر بیس منٹ پر کوئی اچھی بات بھی سوچ سکتا ہے حیرت......؟'' فرزانہ نے میرے موبائل پر ایس ایم ایس کیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے...... پہلے اسے ہٹلر کی طرح مونچھوں کو بارہ بجے کے ٹائم پر سیٹ کرنا چاہیے تھا......'' میں نے بے پروائی سے میسج سینٹ کیا۔

فرزانہ کی ہنسی نکلی جسے اس نے کمال مہارت سے زبردستی کی کھانسی میں مدغم کیا...... ورنہ سر فرید اپنی بات روک کر میری اور فرزانہ کی جانب دیکھنے لگتے تھے۔

''سر کیا اب ہم ہر رپورٹنگ میں ان ہی اصولوں کا خیال رکھیں گے؟'' نیوز ایڈیٹر ان سے مزید معلومات لے رہا تھا۔

''اب سب کا تو مجھے پتا نہیں...... اس رپورٹ کو دیکھ کر میرے ایک دوست کو غصہ آیا تھا...... تو میں نے تم لوگوں کو بھی سمجھا دیا کہ میرے دوست کا یہ کہنا ہے کہ سچ کا ساتھ دینے والے ہمیشہ آگے بڑھا کرتے ہیں۔''

''مگر سر، ایسے لوگ کبھی پیچھے بھی کر دیے جاتے ہیں۔''

''ایسے امتحان تو ہر ایک کی زندگی میں آتے ہیں...... اور ان امتحانوں میں سرخرو ہونے کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ناں......'' فرید صاحب کی تقریر میں آج نیا ہی رنگ تھا...... اور اب میں بڑی عقیدت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''سر آپ کے اخبار میں تو ہر روز ہی کوئی نیا امتحان نظر آتا ہے...... یاد ہے ہم نے شہر کی ایک معروف شخصیت کے ہاں چوری کی رپورٹ میں لکھ دیا تھا کہ چور پانچ کروڑ نقد اور پتا نہیں کتنے کلو سونا لے گئے...... اور بعد میں ان کی ناراضی جھیل کر ہم نے اگلے روز کے اخبار میں یہ نیوز لگائی تھی کہ چور صرف پچاس ہزار لے کر گئے تھے اور یہ رقم بھی کسی نے مذکورہ شخصیت کے پاس امانتاً رکھوائی تھی......'' علی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''سر......! پھر آپ نے معافی علیحدہ مانگی تھی...... ورنہ انہوں نے اخبار بند کروانے کی آپ کو دھمکی دے ہی دی تھی......'' جاوید نے اس سے بھی بڑا قہقہہ لگا کر کہا۔

یہ دو جملے تھے...... یا پٹرول بم...... آفس کا ماحول یک لخت ہی بدل گیا۔

''تم دونوں یہاں باتیں بنانے اور دوسروں کو تپانے کے لیے بیٹھے ہو ناں...... ہر وقت کی ٹھی ٹھی، ہر وقت کی کھی، کھی...... کرنے کے لیے میرا ہی دفتر رہ گیا ہے کیا......؟'' فرید صاحب اپنے پرانے لب و لہجہ...... پر آ گئے اور دہاڑنے والے انداز میں بولے۔

''نو سر......'' جاوید اپنی مسکراہٹ داب کر بولا۔

''ابے...... باتیں بنانے کے لیے بیٹھا ہے ناں...... یہ کر...... تو کسی چینل کو جوائن کر لے...... وہاں بیٹھ کر جتنا

مہمانوں پر غرا کر آئے گا ناں...... اتنا ہی تو کامیاب اینکر ٹھہرے گا......"

"ریکلی سر......!" جاوید نے انتہائی معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ اور ہم سب کی ہنسی نکل گئی۔

"ہونہہ اینکر بنے گا تو...... اپنی شکل دیکھی ہے...... شکل پر ہمیشہ سڑے ہوئے بارہ بجے رہتے ہیں۔"

"سڑے ہوئے بارہ کا مطلب ساڑھے بارہ بنتا ہے۔" فرزانہ نے میرے موبائل پر SMS بھیجا۔

"کوائٹ......" مجھے سر فرید کے غصے کا اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ مزید اوپر جانے والا تھا۔

اور پھر وہ واقعی اتنا چیخے...... اتنا کہ سب خود اٹھ کر اپنے، اپنے کیبن میں چلے گئے...... فرید صاحب جو آج صبح سے خاموش تھے انہوں نے از خود قفل توڑ کر اپنا کوٹا مکمل کر لیا تھا۔

جاوید اور علی منہ بنائے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور فرید صاحب نارمل انداز میں اب چائے پی رہے تھے...... اور اپنے موبائل پر کسی سے ہنس، ہنس کر ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

"دیکھ لیا تم...... آج گھر جا کر یہ بگ باس اپنی بیوی سے نہ پٹا تو میرا نام بدل دینا......"

"دیکھ لینا تم...... کل جب یہ آفس آئے گا ناں تو اس کو فوڈ پوائزن ہو گا......" فرزانہ، علی اور جاوید کو دلچسپ میسج بھیج کر ان کا کلیجا ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

مگر مجھے یہ سب بہت برا لگ رہا تھا...... اخبار کے مالک کو تو اپنے ورکرز کی سب سے زیادہ عزت کرنی چاہیے...... مگر یہاں تو ہر ایک کی عزت آنی جانی شے کے مانند ہو گئی تھی...... کہ کبھی آ گئی اور کبھی چلی گئی۔

"اگر سر فرید...... کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات کریں گے تو اسی وقت ان کے منہ پر استعفیٰ مار دوں گی۔" میں نے اپنے آپ کو از خود سمجھاتے ہوئے کہا۔

مگر یہ ایک طرح سے اچھی ہی بات تھی...... کہ خواتین ورکرز کے ساتھ وہ اس بے ہنگم انداز میں گفتگو نہیں کیا کرتے تھے...... سر فرید کی گفتگو کو سدھارنے کے لیے ہمارا اسٹاف اب باہم مشورے کیا کرتا...... جس میں مجھے فرزانہ کی رائے سب سے زیادہ پسند آئی تھی کہ انہیں کسی تعلیم بالغان سینٹر میں ایڈمیشن دلوایا جائے اور اخلاقیات کا دوسالہ ڈپلوما کسی دوسرے شہر سے کروایا جائے۔

"علی یہ سموسے آ گئے ہیں...... چٹنی کے ساتھ...... جلدی آ جاؤ...... جاوید...... میں نے غلطی سے پزا آرڈر کر دیا تھا...... اور میں پزا کھاتا ہی نہیں ہوں...... جلدی سے آ جاؤ......" ماحول کی تلخی دور کرنے میں فرید صاحب زیادہ ٹائم نہیں لیا کرتے تھے۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں سب نے ہنستے مسکراتے ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے یوں سموسوں اور پزا پر دھاوا بولا کہ مجھے کہنا پڑا۔

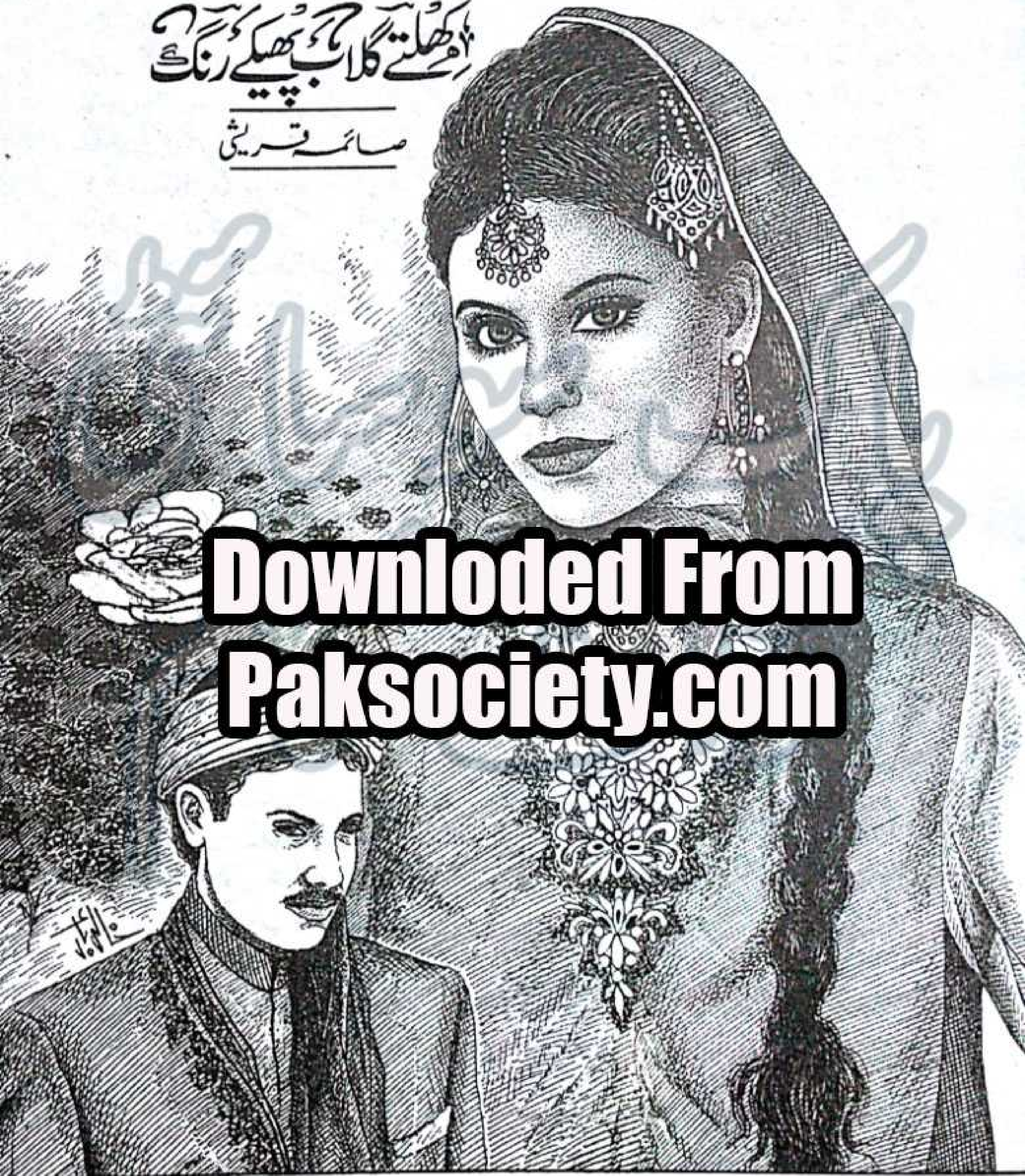
"جس فوڈ پوائزن کی پیشگی اطلاع دی جا رہی تھی مجھے لگتا ہے وہ رخ بدل کر تم لوگوں تک آنے والا ہے۔"

اور ایسے میں علی اور جاوید...... اپنے اوپر دم کرتے ہوئے جس انداز میں کھا رہے تھے فرزانہ کی آنکھوں میں ہنستے، ہنستے آنسو تک آ گئے۔

یہ کھٹا میٹھا سا ماحول تھا ہمارے اخبار کے دفتر کا...... جس کا نام تو بہت اچھا سا تھا...... مگر ہم سب نے لاڈ بھرا نام جان رکھ چھوڑا تھا۔ جو ہماری جان جلاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہماری جان سولی پر آ جاتی تھی اور جس کے ساتھ ہماری جان میں جان بھی آ جاتی تھی۔

یوں روزنامہ جان، ہم سب کی جان کا مان بھی بن جاتا تھا۔

(جاری ہے)



ابھی وہ کسی امتحان کے کمرے میں آ کھڑی ہوئی تھی...... جہاں کی در و دیوار بلکہ ہر چیز کو وہ متعجب نظروں سے دیکھے جا رہی تھی...... نئے رشتوں کے دل میں وہ اپنے لیے کیا مقام حاصل کرتی ہے...... کتنی قدر اس کا نصیب بنتی ہے۔ وہ مان، وہ عزت، وہ اپنائیت اور اعتبار حاصل کرنے میں کتنی کامیاب ہوگی۔

اسی قسم کی بے شمار سوچیں ہزاروں وسوسے لیے اس نے نئی زندگی کی دہلیز پھلانگ کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔

اس کے اوپر غضب یہ ہوا کہ لال جوڑے میں سر جھکائے بیٹھی گلشن کو جو پہلا سبق پڑھایا گیا تھا وہ مرد کی خامیوں کا تھا۔ اور یہ سب کہنے والی وہ کون ہستی تھی اس سے گلشن بے خبر تھی لیکن اتنا سمجھ رہی تھی کہ اس ہستی کی زندگی کا تجربہ انتہائی تلخ رہا ہوگا...... اس کی تلخی بھری سرگوشیاں جاری تھیں۔ گلشن مسلسل پہلو بدل رہی تھی۔

کچھ تو پہلے ہی دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی اماں اور بابا کو چھوڑتے وقت جو دلی کیفیت تھی وہ ابھی تک اسی کے حصار میں تھی اس پر ان ڈراتے والی نصیحتوں نے اسے مزید ہلا دیا تھا۔

"دیکھ گلشن، مرد ناں بڑا ہی دغاباز ہوتا ہے، اس کو جتنا خوش رکھو یہ اتنا ہی ناخوش رہتا ہے، یہ موقع کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہتا ہے، پل بھر میں رنگ بدل لیتا ہے اور سارا الزام عورت پر ڈال دیتا ہے کہ عورت نے اس کو گمراہ کیا ہے۔ تو جتنا دب کر رہے گی ناں اتنا ہی خوار ہوگی...... جتنا سر کو جھکائے گی ناں اتنا ہی زمین میں دھنسائی جائے گی یہ مرد ذات ہوتی ہی ایسی ہے، احسان فراموش...... تو جتنی جلدی اپنے قدم یہاں جمائے گی ناں، فائدے میں رہے گی...... مرد کے قدموں میں بیڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں۔"

اور اُدھر اماں نے کہا تھا۔

"گلشن اپنی خوش اخلاقی اور پیار سے اپنے شوہر کے ساتھ، ساتھ باقی سب کو بھی اپنا اسیر کرنا...... ہر بات کا جواب ضروری نہیں ہوتا...... اپنے شوہر کا ساتھ دے گی ناں تو دیکھنا ایک دن وہ تیرا ساتھ دے گا۔"

شاید ہر انسان اپنے تجربے کو سامنے رکھ کر ہی نصیحت کرتا ہے۔ دوسروں کے تجربوں سے ہم سبق حاصل کر سکتے ہیں...... اچھے سے اچھا اور کبھی برے سے بھی اچھا...... دھڑکتے دل اور وسوسوں میں گھرے جذبات کے ساتھ گلشن نے نئی زندگی، نئے رشتوں کا آغاز کیا تھا...... ہر قدم محتاط، ہر بات سے پہلے سوچ، نئے گھر کے طور طریقے سیکھنے کی کوشش میں دن گزرنے لگے تھے۔

☆☆☆

عمران اچھا انسان تھا لیکن سو فی صد اس کی مرضی کے مطابق نہیں تھا۔ اور اماں نے کہا تھا کہ "جس طرح ہم کسی کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے اسی طرح دوسرے لوگ بھی ہماری مرضی کے حساب سے نہیں ہو سکتے...... لیکن اگر تم نے اپنی زندگی کامیاب بنانی ہے تو اپنے ہم سفر کی جو، جو باتیں، عادتیں، تمہاری مرضی کی ہوں ان سے خوش ہو جانا۔ اس کے ساتھ، ساتھ اس سے وابستہ رشتوں کا بھی احترام کرنا تاکہ وہ تمہیں عزت دے...... اور عزت، پیار سے کئی گنا بڑی دولت ہوتی ہے۔" گلشن نے اماں کی بات کو اپنے پلو سے باندھ لیا تھا۔ وہ عمران کی نیچر کو سمجھنے کی کوشش کرنے میں لگ گئی تھی۔ اور کسی حد تک مطمئن بھی تھی...... لیکن......

کبھی، کبھی وہ چند تلخ نصیحتیں جو سرخ جوڑے کو زیب تن کیے بیٹھی گلشن کے اندر انڈیلی گئی تھیں اس کو بے چین کر دیتی تھیں...... عمران کا گھر کوئی اتنا برا نہیں تھا...... رہن سہن میں بھی کوئی خاص بناوٹ نہیں تھی۔

عمران تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا...... اور لاڈلا بھی...... اس وجہ سے گلشن کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا......

نزہت بھی روایتی ساس سے ہٹ کر تھیں اور عباس بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے سسر تھے۔ گویا گلشن کو کوئی دقت نہیں تھی...... کوئی روک، رکاوٹ ایسی نہیں تھی جو دلوں میں تلخی گھولتی...... یوں گلشن کی یہ زندگی بھی بہت پُرسکون طریقے سے گزرنے لگی۔ اور مرد کے بارے میں جو پہلا تاثر اسے دیا گیا تھا وہ غلط ثابت ہونے لگا۔ عمران ایک خاموش طبع لیکن محبت کرنے والا شوہر ثابت ہو رہا تھا۔ گلشن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ بہنوں اور ماں باپ کے ساتھ بھی اس کا رویہ اچھا ہوتا تھا اور گلشن بھی یہی کوشش کرتی کہ اس کی بہنوں اور ماں، باپ کے معاملے میں عمران کو کسی شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔ یوں اس کی زندگی کی یہ گاڑی اپنی سُبک رفتاری سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔

"آؤ، آؤ بیٹی رک کیوں گئی ہو؟" معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر گلشن ساس کے کمرے میں

گئی...... جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی یہ اس کا معمول تھا۔ اگر نزہت، ساس زیادہ دیر تک اپنے کمرے میں رہتیں تو گلشن ان کے پاس ہی چلی جاتی تھی۔ کچھ دیر رک کر اُن کا حال احوال پوچھ کر چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ واپس آجاتی...... آج بھی جب وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں کسی اور کو دیکھ کر جھجک گئی...... تو نزہت نے اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے پکارا...... وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس آکھڑی ہوئی...... اور سامنے چیئر پر بیٹھی اس عورت کی طرف دیکھا۔

''السلام علیکم......'' دوسرے پل اس کی نظریں اپنے اوپر محسوس کرکے گلشن نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، جیتی رہو......'' مسکراتے ہوئے اس نے دعا دی تو اس آواز پر گلشن چونکی تھی۔ چہرہ اجنبی لیکن آواز مکمل طور پر شناسا سی لگی۔ گلشن متعجب نظروں سے کالی چادر میں ملبوس اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھی ایک بھرپور نظر گلشن کے سراپا پر ڈالی تو لمحہ بھر میں گلشن اس کی ان نظروں سے خوفزدہ ہوگئی۔

''بیٹا بیٹھو ناں...... یہ عمران کی پھپھو ہیں، ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔'' نزہت کے انکشاف پر گلشن نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''میں بھی آپ کو پھپھو ہی کہوں گی۔'' دوسرے پل گلشن خوش دلی سے بولی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں...... یہ تمہاری بھی پھپھو ہی ہیں ناں......'' ان کے بولنے سے پہلے نزہت مسکراتے ہوئے بولی۔

''پھپھو آپ کا نام کیا ہے اور اتنے دن تک کہاں تھیں آپ...... میں نے تو آج پہلی بار دیکھا آپ کو اور آنٹی کہہ رہی ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔'' سلام کے جواب اور چھوٹی سی دعا کے بعد وہ نظریں اس پر جمائے مسلسل خاموش تھیں تو گلشن کو ان کی آواز سے شناسائی کا وہم ہونے لگا۔ اپنے وہم کو دور کرنے کی غرض سے وہ ان سے مخاطب ہوئی۔

''بیٹا یہ رضیہ پھپھو ہیں اور پہلی بار اس لیے دیکھا کہ ولیمے کی صبح ان کو دبئی جانا تھا اپنے بیٹے کے پاس...... آج ہی واپس آئی ہیں۔'' دوبارہ نزہت نے ہی جواب دیا تو گلشن الجھن آمیز نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ وہ شاید جان بوجھ کر کسی بات کا کوئی جواب نہیں دے رہی تھیں۔

''اچھا بیٹا تم بیٹھو، پھپھو کے ساتھ باتیں کرو، میں ابھی آتی ہوں۔'' اس کی الجھن ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہی اور وہ اٹھ کر چلی گئیں ان کے جاتے ہی گلشن نے بے ساختہ پہلو بدلا...... اور کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ تو نہ جانے کیوں گلشن کو اُن کی مسکراہٹ کچھ طنزیہ لگی اور یک لخت ہی دل کسی انجانے خوف کی زد میں آنے لگا۔

☆☆☆

''کتنا وقت ہوگیا ہے تمہاری شادی کو......؟'' نزہت کے جاتے ہی رضیہ اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

''جج...... جی ڈھائی مہینے......'' نہ جانے کیوں گلشن ان کی نظروں سے خوفزدہ ہورہی تھی...... رضیہ کے اس دوسرے فقرے نے گلشن کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا کہ دلہن بنی گلشن کو جو ''نصیحتیں'' کی گئی تھیں وہ رضیہ پھپھو نے ہی کی تھیں۔

''کیسی گزر رہی ہے؟'' وہ دوبارہ مخاطب ہوئیں۔

''جی پھپھو اللہ کا شکر ہے بہت اچھی...... سب لوگ بہت اچھے ہیں......'' دوسرے پل وہ قدرے اعتماد سے بولی۔

''اچھا...... ماشاء اللہ، ماشاء اللہ......'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

رضیہ پھپھو کا رویّہ ان کا انداز کچھ ایسا تھا...... جو گلشن کو چونکا رہا تھا۔ رضیہ پھپھو ایک پہیلی کی طرح اس کے سامنے تھیں...... اور وہ مسلسل ان کے رویّے کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔ بظاہر ٹھیک تھیں، گلشن ان کے لہجے میں تلخی محسوس کررہی تھی لیکن سمجھ نہیں پارہی

تھی کہ رضیہ پھپھو کا رویہ صرف اس کے لیے ایسا ہے یا سب کے لیے؟

''اور عمران...... اس کا رویہ کیسا ہے؟ ڈھائی ماہ ہوگئے ہیں کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا ناں؟''

رضیہ اپنی چادر کو فولڈ کر کے دوپٹا سر پر جماتے ہوئے اس سے استفسار کر رہی تھیں۔

''جی پھپھو عمران تو بہت اچھے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں۔'' کچھ جھجکتے، کچھ شرماتے ہوئے گلشن شوہر کے بارے میں بتانے لگی۔

''اچھا......'' رضیہ اب کے کھل کر مسکرائی تھیں۔

گلشن نے بے انتہا حیرت سے ان کی مسکراہٹ کو دیکھا۔

''ایک مرد...... اچھا اور خیال رکھنے والا...... بہت بھولی ہو بہو بیگم......'' پھر وہی کڑوا کسیلا لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

''نہیں رضیہ پھپھو، ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا......'' بہت ساری ہمت مجتمع کر کے گلشن نے جواب دیا۔

''تم ابھی چھوٹی ہو...... کوئی تجربہ نہیں...... لیکن سچ یہی ہے......'' رضیہ اب قدرے ناگواری سے بولیں۔

''پھپھو جس طرح ساری عورتیں اچھی نہیں ہوتیں اس طرح سارے مرد بھی برے نہیں ہوتے۔'' گلشن اپنی بات پر قائم تھی۔

''اونہہ...... تو کل کی لڑکی میرے ساتھ بحث نہ کر، زمانہ دیکھا ہے میں نے اور ان مردوں کو بدلتے بھی...... یہ بس صرف عورت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں، کوئی مار کٹائی کر کے اور کوئی فضول چونچلوں سے...... لیکن سمجھ جائے گی تو بھی......'' رضیہ انتہائی نفرت آمیز لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔ ان کی باتوں پر اندر ہی اندر گلشن دہل گئی۔ اور پھر خاموش رہی...... ورنہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے بابا ایسے نہیں ہیں، انہوں نے کبھی اماں کو دھوکا نہیں دیا...... اور نہ ہی عمران ایسا ہے...... لیکن وہ خاموش رہی...... اس کو خاموش ہی رہنا تھا۔

کیونکہ اماں نے کہا تھا۔ ''ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا...... کبھی، کبھی خاموش ہونا پڑتا ہے، خاموش رہنے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔'' رضیہ اپنی بات کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تھیں اور گلشن آج مزید الجھ گئی تھی۔

☆☆☆

''عمران......'' دن بھر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ عشا کی نماز ادا کر کے کمرے میں آئی اور شوہر سے مخاطب ہوئی لیکن پھر خاموش ہوگئی۔

''ہوں...... کیا بات ہے......؟'' اس کے پُرسوچ انداز کو دیکھتے ہوئے عمران اس سے پوچھنے لگا۔

''کیا آپ کبھی مجھے چیٹ کریں گے؟'' انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ مضطرب انداز میں اس سے استفسار کر رہی تھیں۔

''ہیں...... کیا مطلب......؟'' عمران نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

''مطلب...... مم...... میرا مطلب ہے کیا کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ کی زندگی میں کوئی اور آجائے اور......'' بات کرتے، کرتے گلشن نے عمران کے الجھن آمیز چہرے کی طرف دیکھا...... اور بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''کسی نے آنا ہوتا تو پہلے آتی، اب تم ہو میری زندگی میں تو کسی اور کے لیے جگہ نہیں ہے۔'' عمران پُرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔

''تھینک یو سوچ عمران...... بس مجھے یہی یقین چاہیے......'' مدھم شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ گلشن بولی۔

''یہ اچانک خیال کیسے آیا اور وہ بھی اتنی جلدی...... صرف ڈھائی مہینے بعد ہی......'' عمران اس کی مسکراہٹ کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے۔ شوخ لہجے میں پوچھنے لگا۔

''بس یوں ہی خیال آگیا...... میں نے سنا ہے کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں......'' گلشن قدرے سنجیدگی سے بولی تو عمران دل کھول کر ہنسا...... اور گلشن جو رضیہ پھپھو کے بارے میں پوچھنے کے لیے تمہید باندھ رہی تھی عمران کے قہقہے کے بعد ارادہ ملتوی کر دیا...... لیکن

عمران کی طرف سے اس کو تسلی ہو چکی تھی کہ وہ اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کرے گا۔

☆☆☆

''السلام علیکم..... پھپھو کیسی ہیں آپ.....؟ اور آنٹی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' صبح صبح گلشن اپنے کمرے کی صفائی کر کے کچن کے ساتھ بنے ہال میں داخل ہوئی جہاں رضیہ اور نزہت بیٹھی صبح کی چائے کے ساتھ لطف اندوز ہو رہی تھیں..... اور ساتھ ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔ وہ ساس کو آنٹی ہی کہتی تھی جس پر نزہت کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ رضیہ نے ایک بھرپور نظر اس کے سراپا پر ڈالی۔

''بیٹا میں تو اب بہتر ہوں، تم نے ناشتا کیا؟'' نزہت اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کرنے لگیں جبکہ رضیہ خاموشی سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

''ہاں آنٹی..... عمران آفس گئے ہیں ناں تو ان کے ساتھ ہی کر لیا تھا۔'' قدرے جھجکتے ہوئے وہ ان کو بتانے لگی تو نزہت مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر رضیہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''رضیہ تم اپنے سوٹ نکال دینا..... میں ایک دو کام باقی ہیں تو کر کے جاؤں گی ٹیلر کے پاس تو دے آؤں گی..... اور گلشن تم نے بھی سوٹ سلوانا ہے تو نکال دینا.....'' وہ رضیہ کو کہتے، کہتے گلشن کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے بھی مخاطب ہوئیں۔

''ہاں آنٹی مجھے دو شرٹس سلوانی ہیں..... میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟'' اب وہ رضیہ پھپھو کی نظروں سے گھبرا رہی تھی..... لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ رضیہ پھپھو اس کو اتنی کریدنے والی نظروں سے کیوں دیکھتی ہیں۔ اتنی باریک بینی سے اس کا معائنہ کیوں کرتی ہیں، نہ کسی سے پوچھ سکتی اور نہ ہی ان کی ان خاموش لیکن گہری نظروں کی تاب لا سکتی تھی۔

''ہاں ضرور چلو..... اپنی پسند سے سلوا لینا.....'' نزہت نے ہامی بھری تو وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

''گلشن تم خوش ہو ناں.....؟ بیٹا کسی قسم کی کوئی پریشانی تو نہیں ناں.....؟'' تقریباً چار، پانچ گھنٹے کے بعد کاموں سے فارغ ہو کر نزہت، گلشن کے ساتھ ٹیلر کے پاس کپڑے دینے گئی تھیں تو واپسی پر چند ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے گلشن سے پوچھا۔

''نہیں آنٹی..... مجھے تو کوئی پریشانی نہیں، الحمدللہ میں بہت خوش ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور عمران کا رویہ بھی ٹھیک ہے ناں.....؟'' ان کے سوال پر گلشن نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کک..... کیا مطلب آنٹی؟ کیا عمران کی میرے ساتھ زبردستی شادی ہوئی ہے؟'' گلشن رک، رک کر ساس سے پوچھنے لگی۔

''نن..... نہیں بیٹا.....'' یک لخت ہی وہ بوکھلا گئیں۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں.....'' دوسرے پل وہ سنبھل کر پھر گویا ہوئیں۔

''پہلے پھپھو اور اب آپ بار، بار عمران کے میرے ساتھ رویّے کا کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' وہ منہ بسورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''نہیں بیٹا..... ایسی کوئی بات نہیں ہے، مجھے رضیہ کا نہیں پتا کہ اس نے کیوں پوچھا لیکن میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ عمران تھوڑا سا بے پروا اور لاابالی ہے، اتنا دھیان نہیں دیتا۔'' وہ اسے بتانے لگیں تو گلشن نے سکون کی گہری سانس لی۔

''آنٹی آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' وہ دونوں دوبارہ چل پڑی تھیں تو اپنے سے دو قدم آگے چلتی نزہت بیگم کو دیکھتے ہوئے گلشن قدرے جھجک کر بولی۔

''ہاں ضرور پوچھو.....'' انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور بولیں۔

''آنٹی، رضیہ پھپھو کا ایک ہی بیٹا ہے کیا؟'' وہ ساس کے ساتھ کھڑی اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی دبئی میں جاب کرتا ہے..... اور سال میں ایک دفعہ رضیہ اس سے ملنے

جاتی ہے۔'' وہ چند پل کی خاموشی کے بعد بولیں اور دوسرے لمحے قدم بڑھا دیے تو گلشن جو مزید بھی جاننا چاہ رہی تھی پھر ہمت نہیں کر پائی...... اور ان کے ساتھ خاموشی سے قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

اور پھر...... غیر محسوس طریقے سے وہ رضیہ پھپو کو آبزرو کرنے لگی...... رضیہ پھپو ہمہ وقت ایک عجیب سی تلخی میں گھری رہتی تھیں...... اس نے محسوس کیا کہ رضیہ پھپو بھتیجے عمران اور بھائی عباس سے کھنچی کھنچی، چپی رہتی ہیں...... ان دونوں سے کم، کم بات کرتی تھیں اور جب کرتیں تب بھی ان کا لہجہ سپاٹ ہوتا...... آنکھوں میں تلخی ہوتی...... جبکہ بھاوج کے ساتھ رضیہ کی خوب بنتی تھی۔ روز بروز رضیہ پھپو اس کے لیے ایک پہیلی بنتی جارہی تھیں...... یوں تو وہ جیسی تھیں گلشن کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا...... لیکن عمران کے بارے میں کوئی بھی نیگیٹو بات گلشن سے کہنے میں وہ ایک لمحہ بھی نہ لگاتی تھیں...... عمران باہر جاتا تو رضیہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتیں اور پھر گلشن ہمہ وقت بے چینی میں گھری رہتی...... وہ ذرا سی دیر لگاتا تو رضیہ اس سے پوچھتیں۔

''بتا کر گیا تھا کہ کہاں جارہا ہے...... تم نظر رکھا کرو...... مرد کا کیا بھروسا......'' تب یہ باتیں تیر کی طرح گلشن کے دل میں کھب جاتیں...... لیکن وہ رضیہ پھپو کی اس بدگمانی کے پیچھے کی وجہ کو سمجھ نہیں پارہی تھی۔ اس کے دل میں اس کے شوہر کے لیے وسوسے ڈالنے کے پیچھے ان کا کیا مقصد ہے وہ اس بات سے پریشان ہورہی تھی...... لیکن مشکل یہ تھی کہ جب بھی وہ ان کے بارے میں کچھ بھی پوچھنے کے لیے تمہید باندھتی...... عمران یا نزہت بیگم سرسری جواب کے بعد خاموش ہوجاتے تو اس کی بھی ہمت ٹوٹ جاتی...... رضیہ پھپو کے رویے کے باعث وہ مسلسل الجھن کا شکار تھی۔ لیکن سمجھ نہیں پارہی تھی کہ رضیہ پھپو کو اس کے ساتھ کوئی بیر ہے یا ان کی اپنی کوئی پرابلم ہے۔

☆☆☆

''عمران میں سوچ رہی ہوں کہ سب کو کوئی نہ کوئی گفٹس دیں......'' وہ کچن میں شام کی چائے کے ساتھ ہلکا پھلکا کچھ کھانے کے لیے بھی بنارہی تھی جب عمران کچن میں داخل ہوا تو وہ جو سوچ رہی تھی عمران سے کہہ دیا۔

''کیوں......؟'' وہ فرائیڈ چکن چیز کا پیس اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے حیرت سے بولا۔

''کیونکہ میں جب سے یہاں آئی ہوں ہم نے کسی کو کوئی گفٹ نہیں دیا...... گفٹ دینے سے محبتیں بڑھتی بھی تو ہیں ناں......'' مصروف انداز میں گلشن اس کے متعجب چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ہماری محبت میں کہاں کمی نظر آئی جو گفٹس سے پوری ہونے جارہی ہے۔'' عمران شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کو گفٹ دینے یا خود لینے کی بات نہیں کررہی...... میرا مطلب ہے ہم مل کر سب کو گفٹس دیتے ہیں......'' گلشن نے چونک کر عمران کے انداز کو دیکھا اور گفٹس کی بات کو کلیئر کیا تھا۔

''اچھا...... ہاں سوچ تو اچھی ہے لیکن کوئی موقع بھی تو ہو۔''

''موقع کا کیا ہے کوئی نہ کوئی بہانہ بن جائے گا گفٹ دینے کا ویسے بھی خلوص ہی سب سے بڑا بہانہ ہے۔''

''دیکھو تحفہ سوچ سمجھ کر دینا چاہیے کیونکہ کوئی بھی تحفہ ہمارے خلوص اور معیار کے ساتھ، ساتھ تحفہ لینے والے کی ہمارے نزدیک ویلیو اور دل میں اس کے مقام کو بھی بہت اچھی طرح واضح کردیتا ہے...... اس لیے اگر کچھ دن صبر کرلو تو......'' عمران نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے، میں نے فوراً ابھی گفٹس دینے کا نہیں کہا صرف بات کی ہے......'' گلشن ابلتے ہوئے قہوے میں دودھ ڈالتے ہوئے بولی۔

''اوکے...... کتنی دیر ہے چائے میں......؟''

عمران باہر جانے لگا تو اس نے پوچھا۔
''ہاں بس پانچ منٹ تک لے کر آتی ہوں......''
وہ مکمل طور پر چائے کی طرف متوجہ تھی۔
''میں تب تک چینج کرلوں، مجھے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے......'' عمران اس کو کہہ کر چلا گیا اور ہنستی مسکراتی گلشن، عمران کے باہر جانے کا سن کر خواہ مخواہ کے وہموں میں پڑنے لگی اور رضیہ پھپو کی تلخیوں کی... بازگشت سے گھبرانے لگی۔

☆☆☆

''میں نے محسوس تو کرلیا تھا لیکن بس موقع کی تلاش میں تھی...... تمہارا تجسس برحق ہے اور تمہیں جاننے کا پورا حق ہے......'' نزہت بیگم مدھم آواز میں گلشن سے مخاطب تھیں۔
''شکریہ آنٹی...... میں اس لیے ڈر رہی تھی کہ کہیں میری بات کو غلط نہ سمجھا جائے، یہ نہ تصور کیا جائے کہ پھپو کا یہاں رہنا مجھے پسند نہیں......لیکن رضیہ پھپو کا رویّہ مجھے اب بہت بے چین کرتا ہے۔'' بہت دنوں تک گلشن، رضیہ کو نوٹ کرتی رہی......ان کی مردوں کے لیے تلخی، بے اعتباری روز بروز اس پر واضح ہوتی چلی گئی۔ پہلے پہل وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید اس کی اور عمران کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہے اس لیے ان کا رویّہ ایسا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس پر یہ بات کھلنے لگی کہ رضیہ پھپو کو اس سے نہیں عمران سے مسئلہ ہے۔ ان کی اصل تلخی جو انتہا پر ہوتی اس وقت کھل کر سامنے آنے لگتی جب وہ عمران کے اچھے رویّے کا ذکر کرتی......تو وہ جو اپنے ہم سفر کے پیار، اس کے اعتبار سے خوش ہوتی تھی رضیہ پھپو کے ایک ہی جملے...... سے ''مرد کا کیا بھروسا'' سے سب ملیا میٹ ہو جاتا...... اور آج بالآخر اس کو موقع مل گیا تو ساس سے کھلے لفظوں میں ان کے بارے میں پوچھنے لگی۔
''نہیں، ایسی بات نہیں ہے......تم بہت اچھی ہو اور کوئی بھی تمہارے بارے میں اس قسم کی رائے نہیں رکھتا......نہ ہی رضیہ کو تم سے کوئی پرابلم ہے......''

نزہت بیگم اس کے متعجب، پُرتجسس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔
''وہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں ناں آنٹی کہ پھپو کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں نے محسوس کیا ہے اور بہت بار دیکھا بھی ہے پھپو، انکل اور عمران سے کھنچی، کھنچی رہتی ہیں۔ حالانکہ انکل ان کے اکلوتے بھائی اور عمران اکلوتے بھتیجے ہیں۔'' گلشن آج کھل کر اپنی الجھن بیان کررہی تھی۔
''ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔
''لیکن کیوں؟'' ان کی چپ اور لیے دیے انداز کے باعث گلشن مزید الجھ رہی تھی جبھی قدرے جھنجلا کر بولی۔
''رضیہ کی بہت چھوٹی عمر میں بات طے کردی گئی تھی۔ لیکن معاملات کچھ ایسے الجھے کہ بات شادی تک پہنچی ہی نہیں......اور اس لڑکے کی طرف سے انکار ہو گیا......رضیہ چونکہ ذہنی طور پر اسی سے شادی کے لیے تیار تھی۔ اس رشتے کے ختم ہونے کی وجہ سے بہت الجھ گئی......بہت ضدی ہوگئی اور پھر وقت گزرا تو رضیہ نے بغاوت کرکے سب کی مرضی کے خلاف کسی اور سے شادی کرلی......نکاح کرکے اس کے ساتھ گھر آئی۔ تمہارے انکل اور عمران کے دادا جان نے بنا ایک لفظ کہے اس سے منہ پھیر لیا اور یوں وہ واپس چلی گئی......تقریباً آٹھ مہینے گزرے ہوں گے کہ رضیہ واپس آگئی۔ اس مہربان نے اپنی اصلیت دکھادی تھی......پھر باپ اور بھائی کی باتیں......اس کی طرف سے ملنے والے طلاق کے پیپرز، رضیہ کو مردوں سے چڑ ہونے لگی......بس تب سے آج تک رضیہ مردوں پر اعتبار کے خلاف ہے۔''
''اور پھپو کا بیٹا؟'' گلشن جو رضیہ کی کہانی سن رہی تھی یک لخت پوچھنے لگی۔
''ہاں، جب رضیہ سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی تب وہ ماں بننے والی تھی......'' نزہت بیگم کے رضیہ کے بارے میں تاثرات وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔
''آنٹی، آپ رضیہ پھپو کو صحیح سمجھتی ہیں؟'' گلشن نے اُن کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اُن سے

دریافت کیا۔

''اس کے ساتھ جو ہوا اس میں کسی حد تک اس کی اپنی ضد اور نادانی بھی تھی لیکن وہ یہ سمجھتی نہیں ہے۔ نہیں سمجھتی تو ٹھیک ہے لیکن دوسروں کے معاملے میں اس کو اپنی کڑواہٹ نہیں شامل کرنی چاہیے۔ اس معاملے میں وہ سراسر غلط کرتی ہے...... '' نزہت بھی شاید نند کی تلخیوں کی زد میں تھیں۔

''آنٹی شاید اس میں رضیہ پھپو کی غلطی نہیں ہے...... اتنا کچھ ہونے کے بعد وہ اپنی تلخی کو کسی بھی طرح سے چھپا نہیں سکتیں...... '' گلشن کو حقیقت میں رضیہ پھپو کے لیے دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

''ہاں شاید...... ایسا ہی ہے...... '' انہوں نے گہری سانس لی اور گلشن کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔

''تم کوشش کرنا کہ رضیہ کی ان باتوں پر اسے کوئی جواب نہ دو...... اور نہ ہی اس کی ان باتوں پر کان دھرو...... دیکھو بیٹا اپنی احتیاط اچھی ہوتی ہے...... یہ احتیاط بعد کی خواری اور بدنامی سے بچالیتی ہے۔'' وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے اس کو سنبھل جانے کا مشورہ دینا نہ بھولی تھیں۔ گلشن نے اثبات میں سر ہلایا لیکن سوچوں کا محور مسلسل رضیہ پھپو ہی تھیں۔

☆☆☆

وقت تیزی سے گزرتا رہا تھا گلشن کی احتیاط اور نزہت کی وقتاً فوقتاً نصیحتوں کے باعث گلشن اور عمران کی ازدواجی زندگی ایک خوشگوار راہ گزر پر رواں دواں تھی...... اور رضیہ اسی موڈ، اسی کڑواہٹ کو دل میں لیے زندگی گزارے جا رہی تھیں...... گلشن، عمران کی طرف سے کافی حد تک مطمئن تھی...... خوش تھی، ہر چیز میسر تھی لیکن کبھی کبھی رضیہ کی تیز اور تیکھی نظریں اس کو سہا دیتی تھیں۔

آہستہ آہستہ گلشن سسرال میں وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی جس کے بعد سب کچھ اس کا ہو رہا تھا۔ بھروسے جیت رہی تھی...... سب خوش تھے کہ اچانک...... گلشن کا دل بے چین رہنے لگا۔ ایک انجانا سا خوف اس کے اردگرد پھیلنے لگا۔ دن رات ایک اضطراب اس کے اندر کھلبلی مچائے ہوئے تھا۔

عمران کو اس نے اکثر راتوں کو کروٹیں بدلتے دیکھا...... اکثر اکیلے بیٹھے ہوئے مسکراتے دیکھا۔ اس نے اپنے ساتھ اس کے سرسری رویے کو محسوس کیا۔

غیر محسوس طریقے سے اس کی نظریں ہمہ وقت عمران کی کھوج میں چاروں اور دوڑتی رہتیں...... کچھ ایسا ہونے لگا تھا جو گلشن کو مغموم اور عمران کو مسرور کیے جا رہا تھا۔

ایک بے اطمینانی سی اس کے اندر ڈیرے ڈال رہی تھی...... بے سکونی بن بلائے مہمان کے مانند وارد ہو رہی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ جو وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں صرف کرتی تھی اب اکثر ٹہلتے اور سوچوں میں گم گزرنے لگا تھا۔

''نہیں، یہ غلط ہے، جھوٹ ہے، عمران مجھے دھوکا نہیں دے سکتا...... رضیہ پھپو کی یہ بات غلط ہے، سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے...... '' ٹہلتے ہوئے مسلسل وہ ایک ہی تکرار میں خود کلامی کر رہی تھی۔ لیکن آج دل اپنی ہی اس دلیل کی نفی کر رہا تھا...... وہ کبھی یقین نہ کرتی اگر ثبوت اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو...... کبھی وہ رضیہ پھپو کی باتوں کو نہ جھٹلاتی اگر اس کی آنکھوں کے سامنے عمران کے ادا کیے گئے الفاظ نہ ہوئے تو...... اس لمحے وہ کس اذیت سے گزر رہی تھی وہی جانتی تھی...... دل اس لمحے زلزلوں کی زد میں تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں...... میرا دل کرتا ہے میں تمہیں دیکھوں...... تمہیں سامنے بٹھا کر تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں...... مجھ سے ملوگی ناں؟ میں تمہارے ساتھ ملاقات کا منتظر ہوں زارا...... پلیز مجھے مایوس نہ کرنا...... فقط عمران۔'' ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین پر اس کی نظر جمی تھی...... عمران کے فون نے سارے شکوک کو رد ہونے سے روک دیا تھا...... اس پل گزرے دنوں کی نسبت گلشن کے اندر دہلا دینے والا بھونچال آیا تھا۔

''میں کیا کروں......؟'' گلشن کا وجود ڈھیری

ہو رہا تھا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟'' وہ ابھی تک ایک بے یقینی کے حصار میں تھی......ان جملوں میں عمران کی.... بے قراری، اس کا پیار اور شوق بہت اچھی طرح واضح تھے اور یہی بے قراری، بے اختیاری گلشن کو تکلیف سے... دوچار کر رہی تھی...... وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ عمران کیوں نہیں اور اتو الو ہوگیا ہے...... اس کی وفا میں کہاں کمی دیکھی عمران نے؟ کہاں کوتاہی برتی اس نے؟ موبائل ہاتھ میں پکڑے وہ میسجز چیک کیے جا رہی تھی۔

''آج دل اداس ہے زارا پتا نہیں کیوں......''

''دن بھر مصروف رہا تھا اس لیے بات نہیں کرسکا۔''

''تم کہاں ہو زارا...... دو دن سے کوئی رابطہ نہیں...... خیریت ہے ناں......؟''

گلشن میسجز پڑھ رہی تھی...... پھٹی، پھٹی نظروں سے وہ عمران کی کسی اور کے لیے بے قراری کو دیکھ رہی تھی۔ اپنی ہی دنیا کو تہ و بالا ہوتے دیکھ رہی تھی لیکن...... وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

رضیہ پھپو کی ساری باتیں ٹھیک تھیں کیا؟ انہوں نے جو کہا تھا کہ مرد دغاباز ہوتا ہے، وہ سچ تھا ناں...... دل میں عجب سا درد اٹھا تھا، گلشن کراہ بھی نہیں سکی تھی...... بے اختیار بہتے آنسوؤں کو پونچھ بھی نہ سکی تھی...... دوسرے پل اس نے موبائل کو بیڈ پر پھینکا تو وہ اچھل کر نیچے جا پڑا...... اور بیک کور کے کھلتے ہی موبائل کی بیٹری باہر نکل گئی۔ اور موبائل بند ہوگیا...... کچھ دیر تک وہ اس بکھرے ہوئے موبائل کو دیکھتی رہی...... اس لمحے اس کو اپنا آپ بھی اس موبائل کی طرح بکھرا ہوا، ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا...... یک لخت اس نے بے دردی سے اپنی آنکھوں کو رگڑ کر آنسوؤں کو پونچھا اور آگے بڑھ کر موبائل کو اپنی اصلی حالت میں کر کے محتاط انداز میں واپس سرہانے کے پیچھے رکھ دیا...... اور دوبارہ اپنی نارمل روٹین میں مصروف ہونے کی.... تگ و دو کرنے میں لگ گئی۔

☆☆☆

محاسبہ

جب ہم رات کو سونے کے لیے بستر پر جائیں تو صرف پانچ منٹ سکون سے اپنی ذات کا محاسبہ کریں کہ آج صبح سے اٹھ کر اب تک کیا کچھ کیا؟ دن کی ابتدا کیسے کی، کہاں گئی، کون آیا، کس سے کیا بات ہوئی تو آپ یقین کریں کچھ باتیں ایسی ہوں گی جن کو سوچ کر آپ کو خوشی ہوگی اور کچھ باتیں ایسی ہوں گی کہ آپ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گی کہ اگر آج ایسا نہ ہوتا یہ بات نہ بولی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا...... اپنا یہ محاسبہ آپ کو کون سی باتیں کرنے اور بہت سے عمل کو روکنے کا سبب بنے گا یہ میرا اپنا تجربہ ہے۔

مثلاً یہ کہ آج ارم کا فون آیا تھا۔ وہ جب اپنی نند کی برائیاں کر رہی تھی تو باتوں، باتوں میں، میں بھی اپنی جیٹھانی کی برائیاں کرنے لگی۔ وہ باتیں صحیح ضرور تھیں لیکن اگر میں ایسا نہ کرتی تو اچھا ہوتا کیونکہ بہرحال غیبت تو ہوگئی ناں...... شام کو جب نجمہ آئی وہ اپنی دوست کی شکایتیں کر رہی تھی، میں بھی ہاں میں ہاں ملاتی رہی بلاوجہ کا گناہ مول لیا، مجھے تو اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ صبح ماسی نے برتن دھوتے ہوئے گلاس توڑ دیا میں نے اس کو بہت ڈانٹا تھا بلاوجہ کچھ زیادہ بول گئی کل اس کو تو ضرور سوری کرلوں گی...... آج جب بڑی بھابی کا فون آیا اور وہ نہ آنے کی شکایت کر رہی تھیں میں نے بھی خوب کھری، کھری سنائی لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ میں چپ ہو جاتی، وہ بڑی ہیں مجھے ان کا احترام کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر آپ نے دن میں کچھ اچھے کام کیے مثلاً کسی بیمار کی عیادت کو گئی ہوں، مالی کے بیمار بچے کے لیے کچھ رقم دی ہو، ڈرائیور کی بیٹی کی شادی میں شرکت کی ہو، ماسی کو بخار ہونے کی وجہ سے جلدی چھٹی دے دی ہو اور خود اس کے بدلے کا کام کرلیا ہو...... مہمانوں کی اچھی طرح خاطر مدارت کی ہو، بچوں کے لیے گفٹ خریدا ہو تو یقیناً اچھے کاموں کو سوچ کر خوشی ہوگی اور غلط کاموں اور غلط باتوں کو سوچ کر خفت اور شرمندگی محسوس ہوگی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا خیال ضرور آئے گا۔ بہنوں سے درخواست ہے کہ وہ ایسا کر کے دیکھیں۔ میں خود بھی روز ایسا کرتی ہوں اور اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

مرسلہ: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

''کیا بات ہے گلشن..... کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں چپ، چپ ہو.....'' شام کا وقت تھا اور وہ سب کے لیے چائے بنا کر لائی تھی..... اور اپنا مگ پکڑے خاموشی سے بیٹھی تھی تبھی رضیہ پھپو نے اس سے استفسار کیا تو وہ چونک گئی..... وہ جانتی تھی کہ رضیہ پھپو ہمہ وقت اس کی اور عمران کی ٹوہ میں لگی رہتی ہیں۔

جب بھی عمران باہر جاتا، کسی سے کال پر بات کرتا، ذرا دیر سے جاگتا تو رضیہ پھپو کی سوالیہ نظریں گلشن کی طرف اٹھنے لگتیں۔ لیکن گلشن نے کبھی رضیہ کی ان سوالیہ نظروں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن آج رضیہ پھپو کی آنکھوں میں جھانکتے سوالوں کے جواب وہ ڈھونڈنے لگی تھی۔ مسلسل سوچ، پریشانی کی سلوٹوں کو رضیہ پھپو کی نظروں نے بھانپ لیا کہ ضرور کوئی بات ہے، تبھی موقع ملتے ہی وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

''نن..... نہیں پھپو..... کوئی بات نہیں.....'' اس اچانک سوال پر گلشن قدرے بوکھلا کر بولی۔

''اگر کوئی بات ہے تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو..... میں نے تو پہلے دن ہی کہہ دیا تھا۔ یوں سمجھو بتا دیا تھا کہ مردوں پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا.....'' رضیہ پھپو دبے لفظوں، دھیمی آواز کے ساتھ اسے کہہ رہی تھیں اور چائے کا کپ پکڑے گلشن کے ہاتھ کانپے تھے۔ وہ کپ کو ہونٹوں سے لگائے خالی، خالی نظروں سے رضیہ پھپو کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

وقت اللہ کے حکم سے اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا لیکن اس کی بے چینیوں کی رفتار دگنی ہو چکی تھی..... عمران کے روتے میں، اس کے لیے وارفتگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا جو گلشن کے لیے جان لیوا تھا۔ وہ ہر گزرتے دن، ہر پل میں بے اعتباری کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی، بدظن ہوتی جا رہی تھی لیکن..... کسی سے شکایت کا ایک لفظ تک نہ کہہ سکتی تھی۔

''شاید رضیہ پھپو ٹھیک ہی کہتی ہیں۔'' مسلسل ایک ہی سوچ نے اس کی راتوں کی نیند، دن کا چین حرام کر رکھا تھا۔

''گلشن.....'' ابھی وہ کمرا صاف کر کے کچھ دیر آرام کی غرض سے بیٹھی تھی کہ نزہت بیگم کی آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی آنٹی.....'' وہ باہر جانے لگی تو وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

''بیٹا سب خیریت تو ہے ناں.....؟'' وہ اس کی طرف بڑھتی متفکرانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

''ہاں آنٹی، سب ٹھیک ٹھاک ہے، کیوں کیا ہوا؟'' گلشن متعجب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''بیٹا صبح سے کمرے سے باہر نہیں آئیں..... اور پھر رضیہ بھی کہہ رہی تھی کہ تم شاید پریشان ہو؟ اس لیے مجھے فکر ہو رہی تھی.....'' وہ اس کی طرف دیکھتے صاف گوئی سے بولیں۔

''نہیں آنٹی ایسی تو کوئی بات نہیں..... میں ٹھیک ہوں..... اور مجھے کوئی پریشانی نہیں، رضیہ پھپو کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' گلشن مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلانے لگی۔

''صحیح کہہ رہی ہو ناں؟'' وہ ابھی تک بے یقینی کی زد میں تھیں۔

''ہاں، ہاں آنٹی، میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں.....'' وہ اب قدرے بشاش انداز کو اپناتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، بیٹا خوش رہا کرو.....'' وہ اب مطمئن ہو چکی تھیں۔

''جی آنٹی..... میں خوش ہوں.....'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور نزہت بیگم کچھ دیر وہاں رکیں پھر واپس چلی گئیں..... اور وہ اپنے آپ کو یقین دلانے میں لگ گئی کہ وہ واقعی خوش ہے۔

☆☆☆

''گلشن کیا کر رہی ہو؟'' عمران کمرے میں داخل ہوا تو گم صم بیٹھی گلشن کی طرف سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گلشن؟'' وہ غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے اسی پوزیشن میں رہی تو عمران نے سر تا پیر اس کے بیزار، گم صم انداز کو دیکھتے ہوئے دوبارہ اسے پکارا۔

''جج..... جی.....'' یک لخت وہ بوکھلا گئی۔

''کیا ہوا؟'' عمران اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے استفسار کرنے لگا۔

''کچھ نہیں..... آپ کب آئے.....؟'' دوسرے پل وہ نارمل ہو چکی تھی۔

''میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی آیا ہوں.....'' عمران اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے اس کو بتانے لگا۔

''اچھا..... آپ چینج کرلیں..... میں چائے لاتی ہوں پھر کھانا کھائیں گے.....'' گلشن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہ مشکل مسکراتے ہوئے بولی۔

''اور جب فارغ ہو جاؤ ناں تو.....'' گلشن جاتے، جاتے پلٹی اور عمران کی طرف دیکھنے لگی۔

''میری یہ شرٹ پریس کر دینا.....'' عمران ہینگر کے ساتھ لگی نیوی بلیو شرٹ کو نکال کر سائڈ پر رکھی چیئر پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں، کہیں جانا ہے کیا؟'' گلشن نے شرٹ کو دیکھا۔ یہ عمران کی نئی شرٹ تھی جو دو دن پہلے اس نے خریدی تھی..... لیکن درحقیقت یہ شرٹ اس کی طرف گفٹ آئی تھی..... گلشن جانتی تھی کہ یہ کہاں سے آئی ہے..... عمران کی شرٹ کے حوالے سے جھوٹ پر گلشن کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔

''میں نے آپ کے لیے شرٹ خریدی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ جب ہم ملیں تو آپ یہی شرٹ پہن کر آئیں۔'' ہارٹ اسمائل کے ساتھ یہ میسج گلشن کی نظروں کے سامنے ابھرا۔

''ہاں زارا..... ضرور..... اور جب ہم ملیں گے تو میں بھی تمہارے لیے ڈریس لے کر آؤں گا..... تم شرٹ میرے آفس کے ایڈریس پر بھیج دینا.....'' عمران کے تفصیلی اور فسوں خیز رپلائے نے گلشن کے پیروں تلے سے زمین کو ہلا کر رکھ دیا تھا.....

ابھی شرٹ دیکھتے ہی گلشن ایک بار پھر اپنی بے قدری کے احساس تلے دبنے لگی تھی۔

''ہاں کل ایک ضروری میٹنگ ہے.....'' عمران کا انداز انتہائی سرسری تھا۔

''میں کل گیارہ بجے پارک میں آپ کا انتظار کروں گی۔''

''پارک میں؟ او کے ٹھیک ہے..... پھر لنچ ساتھ کریں گے.....'' یہ دو میسجز گلشن کو کسی پل چین نہیں لینے دے رہے تھے..... وہ شکایت تب کرتی جب عمران کے اس کے لیے رویے میں کوئی فرق ہوتا..... وہ دوغلے پن میں ماہر تھا۔ گلشن ایک اور جھوٹ پر کٹ کر رہ گئی۔

''میں کر دوں گی.....'' اتنا کہہ کر وہ فوراً باہر نکل گئی..... کیونکہ عمران کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اس کے اندر کڑواہٹ گھولنے لگی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت کسی تلخی سے اپنے خیالات خراب کرے..... اس لیے مسلسل خاموش تھی۔

☆☆☆

وہ رات اس نے کانٹوں پر بسر کی تھی..... کسی پل چین نہ تھا۔ مسلسل کروٹیں، بے کلی اور الجھن نہ اس کو سونے دے رہے تھے، نہ چین سے بیٹھنے..... کبھی بستر پر کروٹیں، کبھی چہل قدمی.....

''گلشن کیا بات ہے، کیوں نہیں سو رہی ہو؟'' بالآخر عمران بول پڑا۔

''نیند نہیں آرہی ہے.....'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

''کیوں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....؟'' عمران متفکرانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا تو اس کے اس انداز نے گلشن کا حلق تک کڑوا کر دیا۔ کاش وہ بول سکتی..... بول سکتی کہ یہ جھوٹا پیار نہ جتاؤ..... اس سے کہہ سکتی کہ تم بھی عام مردوں کی طرح کے اِک عام سے مرد ہو..... لیکن وہ خاموش تھی کسی مصلحت کے تحت..... گلشن کو خاموش ہی رہنا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں..... سوری آپ کو ڈسٹرب

''گلشن؟'' وہ غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے اسی پوزیشن میں رہی تو عمران نے سرتا پیر اس کے بیزار، گم صم انداز کو دیکھتے ہوئے دوبارہ اسے پکارا۔

''جج...... جی......'' یک لخت وہ بوکھلا گئی۔

''کیا ہوا؟'' عمران اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے استفسار کرنے لگا۔

''کچھ نہیں...... آپ کب آئے......؟'' دوسرے پل وہ نارمل ہو چکی تھی۔

''میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی آیا ہوں......'' عمران اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے اس کو بتانے لگا۔

''اچھا...... آپ چینج کرلیں...... میں چائے لاتی ہوں پھر کھانا کھائیں گے......'' گلشن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہ مشکل مسکراتے ہوئے بولی۔

''اور جب فارغ ہوجاؤ ناں تو......'' گلشن جاتے، جاتے پلٹی اور عمران کی طرف دیکھنے لگی۔

''میری یہ شرٹ پریس کردینا......'' عمران ہینگر کے ساتھ لگی نیوی بلیو شرٹ کو نکال کر سائڈ پر رکھی چیئر پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں، کہیں جانا ہے کیا؟'' گلشن نے شرٹ کو دیکھا۔ یہ عمران کی نئی شرٹ تھی جو دو دن پہلے اس نے خریدی تھی...... لیکن درحقیقت یہ شرٹ اس کی طرف گفٹ آئی تھی...... گلشن جانتی تھی کہ یہ کہاں سے آئی ہے...... عمران کی شرٹ کے حوالے سے جھوٹ پر گلشن کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔

''میں نے آپ کے لیے شرٹ خریدی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ جب ہم ملیں تو آپ یہی شرٹ پہن کر آئیں......'' ہارٹ اسمائل کے ساتھ یہ میسج گلشن کی نظروں کے سامنے ابھرا۔

''ہاں زارا...... ضرور...... اور جب ہم ملیں گے تو میں بھی تمہارے لیے ڈریس لے کر آؤں گا...... تم شرٹ میرے آفس کے ایڈریس پر بھیج دینا......'' عمران کے تفصیلی اور فسوں خیز ریپلائے نے گلشن کے پیروں تلے سے زمین کو ہلا کر رکھ دیا تھا......

ابھی شرٹ دیکھتے ہی گلشن ایک بار پھر اپنی بے قدری کے احساس تلے دبنے لگی تھی۔

''ہاں کل ایک ضروری میٹنگ ہے......'' عمران کا انداز انتہائی سرسری تھا۔

''میں کل گیارہ بجے پارک میں آپ کا انتظار کروں گی۔''

''پارک میں؟ اوکے ٹھیک ہے...... پھر لنچ ساتھ کریں گے......'' یہ دو میسجز گلشن کو کسی پل چین نہیں لینے دے رہے تھے...... وہ شکایت تب کرتی جب عمران کے اس کے لیے رویّے میں کوئی فرق ہوتا...... وہ دوغلے پن میں ماہر تھا۔ گلشن ایک اور جھوٹ پر کٹ کر رہ گئی۔

''میں کردوں گی......'' اتنا کہہ کر وہ فوراً باہر نکل گئی...... کیونکہ عمران کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اس کے اندر کڑواہٹ گھولنے لگی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت کسی تلخی سے اپنے خیالات خراب کرے...... اس لیے مسلسل خاموش تھی۔

☆☆☆

وہ رات اس نے کانٹوں پر بسر کی تھی...... کسی پل چین نہ تھا۔ مسلسل کروٹیں، بے کلی اور الجھن نہ اس کو سونے دے رہے تھے، نہ چین سے بیٹھنے...... کبھی بستر پر کروٹیں، کبھی چہل قدمی......

''گلشن کیا بات ہے، کیوں نہیں سو رہی ہو؟'' بالآخر عمران بول پڑا۔

''نیند نہیں آرہی ہے......'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

''کیوں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟'' عمران متفکرانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا تو اس کے اس انداز نے گلشن کا حلق تک کڑوا کردیا۔ کاش وہ بول سکتی...... بول سکتی کہ یہ جھوٹا پیار نہ جتاؤ...... اس سے کہہ سکتی کہ تم بھی عام مردوں کی طرح کے اِک عام سے مرد ہو...... لیکن وہ خاموش تھی کسی مصلحت کے تحت...... گلشن کو خاموش ہی رہنا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں...... سوری آپ کو ڈسٹرب

کر رہی ہوں...... صبح آپ نے آفس بھی جانا ہے۔''
گلشن ،عمران کی نیند سے سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر بولی اور چند لمحوں بعد کمرے سے باہر نکل گئی...... تو نیند کے غلبے کے باوجود عمران نے حیرت سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

وہ سوئی ہی نہیں تھی کہ جاگتی...... آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے رات بسر کی تھی۔ فجر کی اذان اس نے صحن میں کھڑے ہو کر سنی تھی...... پیروں کو گھسیٹتی وہ واش روم میں گھسی تھی ،وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے جانماز پر کھڑی ہوگئی۔

وہ آج اپنے لیے ہمت مانگ رہی تھی۔ سجدہ ریز آنکھوں سے بہتے پانی کے ساتھ وہ اللہ کے حضور جھکی اپنے اور عمران کے درمیان اعتبار کو زندہ رکھنے کی دعائیں مانگے جارہی تھیں...... نہ جانے کتنی دیر گزر گئی......شاید وہ روتے ،روتے وہیں سوگئی تھی...... کہ یک لخت ہی اس کو ہوش آیا...... وال کلاک پر نظر ڈالی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ دوسرے پل وہ وہ جس تیزی سے اٹھی خود ہی چکرا گئی۔ فوراً اپنے کمرے میں آئی تو عمران شاید آفس جا چکا تھا۔ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر ساس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''السلام علیکم آنٹی......'' نزہت بستر میں ہی بیٹھی تھیں وہ اندر داخل ہوئی تو اُن کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا...... کیسی طبیعت ہے اب؟''
وہ اس کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتی اس سے پوچھنے لگی تو گلشن نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

''ٹھیک ہوں آنٹی...... اور عمران......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''فکر نہ کرو، عمران آفس چلا گیا ہے۔ میں نے ناشتا بنادیا تھا اسی نے بتایا تھا کہ تم رات بھر سوئی نہیں ہو شاید طبیعت خراب ہے۔'' نزہت اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں تو گلشن اُن سے نظریں چرا گئی۔

''نہیں آنٹی ایسی بات نہیں ہے، طبیعت ٹھیک ہے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے...... میں آپ کے لیے بھی چائے بناؤں؟'' وہ ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں بنادینا......'' مختصراً جواب دیا اور گلشن وہاں سے کچن کی جانب بڑھ گئی...... جبکہ نزہت بیگم کی نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆☆☆

اس نے جلدی ،جلدی سارے کام نمٹائے ......اپنے کمرے میں آئی اور ایک سادہ سا کاٹن کا سوٹ نکال کر بیڈ پر رکھا اور واش روم کی جانب بڑھ گئی......کچھ دیر بعد فریش ہو کر آئی ،بال سنوارے کپڑے بدل کر...... بڑی سی کالی چادر میں اپنا آپ لپیٹ لیا......اور اپنا پرس اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''آنٹی میں کچھ دیر کے لیے باہر جارہی ہوں...... پندرہ ،بیس ،منٹ تک آجاؤں گی۔'' آج سے پہلے وہ کبھی اکیلی باہر نہیں گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ نزہت سے کوئی باز پرس کرتیں وہ بغیر کوئی موقع دیے وہاں سے نکل چکی تھی۔

اتنے عرصے میں پہلی بار وہ ہمت سے باہر نکلی تھی...... اکیلی...... چادر میں اپنے آپ کو لپیٹے......وہ قدم بڑھا رہی تھی...... لیکن دل...... رک ،رک کر چل رہا تھا...... مسلسل ایک خوش فہمی ایک یقین کو وہ اپنے ساتھ دھکیل رہی تھی...... تقریباً دس منٹ کی واک کے بعد وہ متوقع پارک کا گیٹ عبور کر رہی تھی...... محتاط انداز میں وہ قدم آگے بڑھا رہی تھی......اور بالآخر اس مخصوص جگہ پر پہنچ گئی جس کی نشاندہی کی گئی تھی...... وہاں تین بنچ لگے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر پھولوں سے بھی کیاریاں منظر کو دلکش بنا رہی تھیں...... وہ ایک بنچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی...... نظریں راہداری پر جمی تھیں......جہاں سے اس ٹائم اکا دکا لوگ آجا رہے تھے......اور وہ چہرہ ڈھانپے بیٹھی تھی۔

نہ جانے کتنے لمحے بیتے تھے۔ وہ انتظار کی سولی پر لٹکی تھی...... یک لخت اس کے وہم پر یقین کی مہر ثبت

ہوگئی...... اس کو اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پلکیں جھپک، جھپک کر اس نے کیاریوں کی دوسری طرف بنی راہداری پر چلتے، کھوجتی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے نیوی بلیو شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس اس شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اپنے اعتبار کا خون ہوتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر اس سے کچھ دیکھا نہ گیا...... نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے۔ جس کے لیے اس کے اعتبار کو قتل کیا گیا نہ یہ کہ وہ کتنی دیر وہاں رکے گا...... وہ جس طرح چھپ چھپا کر یہاں آئی تھی، اسی طرح خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

آج کی شام کا انتظار گلشن کو بہت شدت سے تھا۔ گن، گن کر وہ پل گزار رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی، دیکھنا چاہتی تھی کہ آج عمران کے تاثرات کیسے ہوں گے...... گلشن کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہوگا...... وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سے بے وفائی کے بعد عمران اس سے کون سے جذبات رکھتا ہے وہ جاننا چاہتی تھی...... رضیہ پھپو کی باتیں...... ساری باتیں سچ ثابت ہو رہی تھیں...... گلشن کی ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ چاہتوں کے دیے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ بے یقینی کی منزل کی طرف رواں دواں تھی...... کیا وہ...... اب عمران پر اعتبار کر سکے گی؟ کیا اس کا ساتھ اسی خوشی، اسی چاؤ سے نبھا سکے گی؟ وہ اپنے آپ سے مسلسل پوچھے جا رہی تھی۔

''السلام علیکم ...... کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو عمران کو بیڈ پر لیٹے دیکھا...... نہ شوز اتارے گئے تھے نہ چینج کیا گیا تھا۔ تو اس نے متعجب نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وعلیکم السلام...... ہاں ٹھیک ہوں بس کچھ تھکان سی محسوس ہو رہی ہے اس لیے لیٹ گیا۔'' عمران نے کسلمندی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''اچھا میں چائے لے کر آتی ہوں، آپ ریسٹ کر لیں کچھ دیر......'' گلشن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد گلشن واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے اور لوازمات سے سجی ٹرے تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھا جو ابھی تک اسی پوزیشن میں لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ ٹرے میں چائے کے ساتھ اہتمام نے اس کو چونکا دیا تھا۔

''آپ کی میٹنگ کیسی رہی؟'' ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

''نن نہیں...... وہ، وہ میٹنگ کینسل ہوگئی تھی......''

وہ خواہ مخواہ بوکھلا رہا تھا۔

''اچھا کیوں؟ پھر کب ہوگی؟'' گلشن چائے کے کپ کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سے استفسار کرنے لگی۔

''مجھے نہیں پتا......'' اس کا لہجہ اکھڑا تھا...... اور اس سے پہلے کہ گلشن مزید کوئی پوچھ گچھ کرتی وہ کپ ہاتھ میں پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا...... کپ ٹیبل پر رکھا اور واش روم میں گھس گیا...... گلشن کے چہرے پر ایک انتہائی تلخ مسکراہٹ در آئی...... وہ بیٹھی مسلسل کسی سوچ میں گم تھی...... وہ اب اس چھپن چھپائی کے کھیل سے اکتا چکی تھی...... اب وہ اس چوہے بلی کے کھیل کو ختم کرنا چاہتی تھی...... وہیں بیٹھ کر وہ عمران کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی تھی...... انتظار...... انتظار...... نہ جانے کیوں لمبے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جو بیٹھی ہوئی تھی اب اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتے ہوئے مسلسل ہاتھوں کو مروڑے دے رہی تھی۔ تقریباً پچیس منٹس کے جان لیوا انتظار کے بعد عمران واش روم سے باہر نکلا...... ٹاول سے اپنے سر کو رگڑتا ہوا وہ اپنی تھکاوٹ اتار رہا تھا۔ اور وہ اپنی سوچوں میں اتنی مگن تھی کہ شاور کے پانی کی آواز اس تک نہیں پہنچ سکی۔ حواس میں ہوتی تو شاید انتظار کی اذیت کم ہو جاتی...... جو درد، جو اذیت، ہمارے نصیب میں لکھے جاتے ہیں کسی بھی طرح ہم تک پہنچ ہی جاتے ہیں...... ہماری اپنی کوتاہی سے یا

کسی دوسرے کے غلط اقدام سے ہم اس کرب سے آشنا ہو جاتے ہیں...... اذیت ناک لمحوں سے شناسائی کتنی جان لیوا ہے اس کا ادراک ہمیں بہت بعد میں ہوتا ہے...... اور کبھی یک لخت...... لمحوں کے بیت جانے سے پہلے ہم بے جان ہو جاتے ہیں...... کچھ ایسا حال اس وقت گلشن کا بھی تھا۔

''مم...... میں چائے گرم کر کے لے آتی ہوں......''

عمران ٹھنڈی ٹھار چائے پینے لگا تو ایک دم ہی گلشن بولی تو عمران کپ اس کی طرف بڑھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

گلشن نے اس کی طرف دیکھا اور منوں بھاری قدموں کے ساتھ باہر کی جانب بڑھنے لگی۔ عمران نے آئینے میں جھانکتے اس کے بے جان قدموں کو اٹھتے دیکھا تو یک دم پلٹا تھا۔

''گلشن...... کیا ہوا...... ؟ خیریت؟'' عمران اس کی طرف بڑھتا ہوا اس کے بیزار اور متزلزل انداز کو دیکھا۔

''ہا...... ہاں' میں ٹھیک ہوں......'' اس کے لہجے سے جھانکتا تذبذب بہت واضح تھا جو عمران کی نظروں سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکا۔

''بتاؤ گلشن کیا ہوا؟'' عمران کے متفکرانہ انداز پر گلشن نے ڈبڈباتی نظروں سے اس کو دیکھا...... اور دیکھتی ہی چلی گئی...... کیا تھا اس کی نظروں میں؟ عمران نظریں چرانے لگا۔

''عمران......'' ٹھنڈی چائے کے کپ کو ہاتھ میں پکڑے وہ عجیب سی شش و پنج کا شکار ہو رہی تھی۔ عمران الگ متحیر نظروں سے اس کو دیکھنے لگا تھا۔ چند پل ایسے ہی گزر گئے۔

''عمران آپ یہاں بیٹھیں......'' گلشن کپ کو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کو بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور خود ایسی چال چلتی، پیر گھسیٹتی وارڈ روب کی طرف بڑھی۔ عمران نے بیٹھے، بیٹھے پلٹ کر اس کو دیکھا تھا۔

''آئی ایم سوری عمران میں وعدہ کر کے بھی آپ سے ملنے نہ آ سکی...... پلیز معاف کر دینا۔'' یک لخت ہی عمران کے موبائل پر میسج کی ٹون نے اس کو چونکا دیا...... گلشن نے بھی پلٹ کر اس کو دیکھا...... عمران نظریں گلشن پر جمائے اپنے پاکٹ سے موبائل نکالنے لگا...... اس کے ماتھے کی سلوٹوں میں یکا یک اضافہ ہوا تھا...... اب اس کی نظریں گلشن کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر تھیں...... دوسرے پل وہ اٹھ کھڑا ہوا...... عجیب سے تاثرات لیے وہ گلشن کی طرف بڑھا تھا۔

''آپ کے موبائل پر ایک اور میسج آئے گا......''

دھیمی آواز نے جیسے عمران کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔

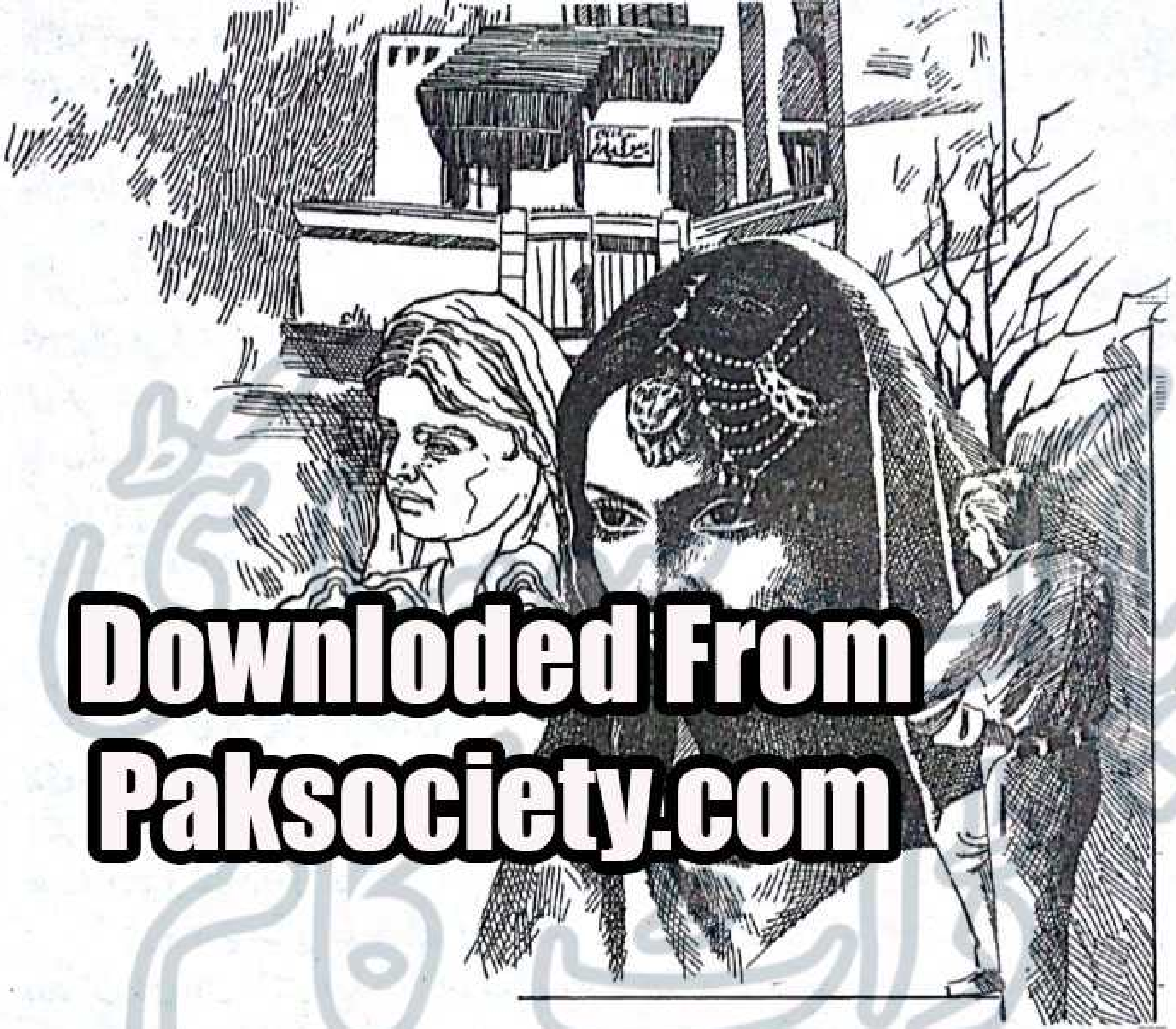
''میں آئی تھی عمران، میں آئی تھی لیکن ہمت نہ ہوئی سامنے آنے کی......'' موبائل کی اسکرین پر آویزاں ان لفظوں نے سارے بھرم مٹی میں ملا دیے تھے۔

عمران کی زبان تالو سے چپک چکی تھی...... گلشن کے ہاتھ میں موبائل...... عمران کی طرف اس کے سامنے آئے میسج...... ساری حقیقت عیاں ہو رہی تھی اور...... اب کچھ کہنے کے لیے تو گلشن کے پاس بھی نہیں تھا...... خاموشی سے موبائل عمران کے حوالے کیا اور خود منوں بھاری قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ لیکن یہ قدم صرف کمرے سے نہیں کہیں اور سے بھی اکھڑ چکے تھے۔

☆☆☆

انجانے میں ہی ہم ڈھیر سارے خسارے اپنے نصیب میں خود ہی لکھوا لیتے ہیں۔ جب بہت کچھ بن مانگے ملنے لگتا ہے تب ہم راہ سے بھٹکنے لگتے ہیں...... سیدھی راہ پر چلتے، چلتے اچانک ایک ایسا موڑ مڑ جاتے ہیں جو سراسر غلط ہوتا ہے خار دار راہ گزر کے علاوہ کوئی سہانا منظر وہاں نہیں ہوتا...... اپنے ہی خوابوں کو تار، تار کر کے ہم انگاروں پر چلنے لگتے ہیں...... اور پھر گمراہی اور فقط شرمندگی کے سوا کوئی گلاب اس رستے پر نہیں کھلتا۔





ہائے بے بسی

فرح طاہر قریشی

''ملیحہ! بیٹی تم خوش تو ہوناں......؟'' سطوت آرا نے اسٹیج پر نظریں جھکائے دلہن بنی ملیحہ کے برابر میں بیٹھتے ہوئے دھیمی آواز میں سوال کیا تھا۔

آج ملیحہ کا ولیمہ تھا اس کے میکے والے سب اس تقریب میں آئے ہوئے تھے۔

''جی امی، میں خوش ہوں......'' ملیحہ نے نظریں جھکائے، جھکائے جواب دیا۔ ایک ہی دن تو.... شہر یار کے ساتھ گزارا تھا، ابھی وہ کچھ بھی نہیں جان پائی تھی پھر بھی ماں کو تسلی دے رہی تھی۔

''امی آپ یہاں کیا کر رہی ہیں وہاں پھپو،

چچیاں سب آپ کا پوچھ رہی ہیں۔'' ملیحہ سے چھوٹی نبیلہ نے اسٹیج پر آکر سطوت آراسے کہا۔

''ہاں جاتی ہوں ان کے پاس بھی، میں ذرا ملیحہ کا حال احوال پتا کرنے یہاں آگئی تھی۔ اس کے پاس۔''

''کیا امی، آپی کا آج پہلا دن ہی گزرا ہے ان لوگوں کے ساتھ...... پہلا دن کیسا گزرتا ہے، یہ آپ بھی جانتی ہیں تو آپی کو کیا پتا ابھی کچھ؟ آپ بھی ناں امی بس...... دیکھیں آپی آج دلہن بنی کل سے بھی زیادہ پیاری لگ رہی ہیں۔ آپ ان سے اچھی، اچھی باتیں کریں کیا پریشانیوں کی باتیں کرنے لگی ہیں آپ۔'' نبیلہ نے ملیحہ کا دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔ سطوت آرا ہنس پڑیں اور میٹھی نظروں سے ملیحہ کو دیکھنے لگیں۔

''دیکھ رہی ہو ملیحہ...... یہ تمہاری گڑیا نبیلہ کتنی بڑی، بڑی باتیں کررہی ہے۔ ایک دم سمجھ داری والی باتیں...... ایک دن ہی ہوا ہے تمہیں اس سے الگ ہوئے اور یہ کتنی سمجھ دار ہوگئی ہے۔''

''ہاں تو اور کیا، یہ آپی نے ہی مجھے بچی بنایا ہوا تھا ورنہ میں بڑی ہوں دیکھیں ذرا......'' نبیلہ نے سیدھے کھڑے ہوکر ہنستے ہوئے کہا۔

ماشاء اللہ......'' ملیحہ نے خاموش لبوں سے بہن کو دیکھ کر نظروں میں کہا۔

''اچھا امی باتیں ہوتی رہیں گی، ابھی آپ چلیں وہاں سب آپ کو بلارہے ہیں۔'' نبیلہ کو ایک دم اپنے آنے کی وجہ یاد آئی تو ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج سے اتار لائی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے سحرش، اتنی پریشان، گم صم سی کیوں بیٹھی ہو؟''

''کچھ نہیں اماں بس بابا کی طبیعت کا سوچ رہی تھی۔ بابا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ وہ ایسی حالت میں کام پر بھی نہیں جاسکتے پھر گھر کا خرچہ کیسے چلے گا اماں......؟'' سحرش نے اپنی پریشانی کی وجہ ماں سے کہی۔

''ہاں بیٹی پریشان تو میں بھی ہوں...... ایک طرف تمہارے بابا کی حالت...... تو دوسری طرف گھر کا خرچہ...... کیسے ہوگا سب؟'' بانو بیگم نے کہا۔

''اور اماں گڈو کی اسکول کی فیس دو مہینے کی ہوگئی ہے۔ کل اس کی ڈائری پہ نوٹ بھیجا تھا اسکول والوں نے کہ اگر اس ماہ بھی ہم نے اس کی فیس جمع نہ کرائی تو وہ گڈو کا نام خارج کردیں گے۔'' سحرش نے پریشانی سے ماں کو بتایا۔

''بیٹی میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ گڈو کو اسکول سے اٹھالو، مت بھیجو اسکول...... تم نہیں مانیں اب کہاں سے دیں فیس، وہ بھی انگریزی اسکول کی...... میں اب بھی کہتی ہوں انگریزی اسکول سے ہٹا کر کسی گورنمنٹ اسکول میں ڈال دو اسے...... آخر تم نے بھی تو گورنمنٹ سے ہی پڑھا ہے۔''

''نہیں اماں، میں نے گورنمنٹ سے پڑھ لیا جب تک آپ لوگوں کو صحیح پتا بھی نہیں تھا لیکن میں اب گڈو اور نیلم کو اچھے اسکولوں میں ہی پڑھاؤں گی۔ آگے کا اللہ مالک ہے اماں، بس آپ بابا سے بات کرلیں۔ وہ مجھے نوکری کرنے کی اجازت دے دیں، میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو گھر کا خرچہ اٹھاسکتی ہوں ناں...... بارہ جماعتیں پڑھی ہیں میں نے...... اگر گڈو کے ہی اسکول میں پڑھالوں تو وہ اتنا تو دے ہی دیں گے کہ میں دونوں کی اسکول کی فیسیں وقت پر دے پاؤں گی۔''

''لیکن تمہارے بابا نہیں مانیں گے سحرش......'' بانو بیگم نے انکار میں سر ہلایا تھا۔

''اماں آپ بات تو کریں بابا سے، اب ہم اور پیسے کہاں سے لائیں۔ بابا کی حالت سب نے دیکھی ہے لیکن کوئی ہماری مدد کرنے کو تیار نہیں...... پھپو، تایا، چچا سب نے آنکھیں پھیرلیں...... آپ ہی بتائیں پھر کہاں سے پیسہ لائیں ہم......؟'' سحرش نے بڑی بے بسی سے ماں سے کہا۔

''اچھا تم پریشان مت ہو، میں کچھ کرتی ہوں۔''
بانو بیگم نے تسلی دی۔

''آپ کیا کریں گی اماں..... زیادہ سے زیادہ اور کڑھائی، سلائی کا کام شروع کردیں گی لیکن اماں ان کاموں کے آئے پیسے بابا کی دوائیوں میں، گھر کے خرچے میں ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ باقی کام پھر ادھورے پڑے رہ جاتے ہیں۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

''اماں..... اماں میں کچھ کرنا چاہتی ہوں آپ بس بابا سے بات کریں انہیں کسی طرح راضی کرلیں کہ وہ مجھے نوکری کرنے کی اجازت دے دیں..... پلیز اماں.....'' سحرش نے ماں کی منت کی تھی۔

''اچھا، اچھا تم پریشان مت ہو، میں جاتی ہوں تمہارے بابا کے پاس بلکہ ایسا کرو تم بھی آجاؤ میرے ساتھ سامنے ہی بات کرلینا اپنے بابا سے۔''

دونوں ماں، بیٹی انور صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

☆☆☆

''شہر یار ہفتہ ہوگیا تمہاری دلہن کو آئے، شادی کی تھکن بھی اتر گئی ہے۔ کیا کہتے ہو اب ملیحہ سے میٹھا پکوا کر کام شروع کروادیں؟'' عالیہ بیگم نے سروتے سے چھالیا کتر کر منہ میں رکھتے ہوئے پاس بیٹھے بیٹے سے پوچھا تھا۔

''ہاں امی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، آپ کی بہو ہے جو آپ کا دل کرے وہ کروائیں۔'' شہر یار نے لاابالی پن سے کہہ کر ماں کو فری ہینڈ دے دیا تھا۔

''جیتا رہ میرے بچے.....'' عالیہ بیگم نے خوش ہو کر دعا دی ساتھ ہی بہو کو آواز دی۔

''ملیحہ.....!''

''جی امی، آپ نے بلایا.....؟'' ملیحہ فوراً ہی حاضر ہوئی تھی۔

''کیا کررہی تھیں کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی؟'' عالیہ بیگم نے سوال کیا۔

''بس، کچھ نہیں امی، یونہی فارغ بیٹھی تھی۔''

''پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے امی کہنا چھوڑ دو، مجھے پہلے کی طرح چچی ہی کہا کرو، امی تمہاری وہی ہے جو تمہاری ماں ہے سمجھیں.....؟'' عالیہ بیگم نے ملیحہ کو ٹوکا تھا۔

''لیکن امی..... میں تو.....'' ملیحہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ عالیہ بیگم پھر بول پڑیں۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں..... بس میں نے کہہ دیا تم آئندہ مجھے امی نہیں کہو گی..... تو بحث فضول ہے..... ہاں جس کام کے لیے تمہیں بلایا تھا وہ تو درمیان میں ہی رہ گیا۔ تم بیٹھو یہاں مجھے بات کرنی ہے تم سے۔''

''جی چچی کہیں.....؟'' منتظر سی ملیحہ انہی کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی، تمہاری شادی کو ایک ہفتہ ہوگیا ہے تھکن تو اتر ہی گئی ہے شادی کی..... دعوتوں کا سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا، تم ایسا کرو آج میٹھے کی رسم بھی پوری کردو پھر کل سے گھر کے کام کاج میں تم بھی حصہ لیا کرنا۔''

''جی چچی مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، میں میٹھا پکا دیتی ہوں، آپ بتائیں میں میٹھے میں کیا بناؤں؟''

''میٹھے میں تم ایسا کرو.....'' عالیہ بیگم ابھی اپنی بات مکمل بھی نہیں کرپائی تھیں کہ شہناز، ملیحہ کی جیٹھانی جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی نے تیزی سے کہا۔

''ملیحہ بی بی تمہیں اعتراض ہو یا نہیں ہو لیکن مجھے اعتراض ہے، خالہ اس سے کام کاج بعد میں کرانا پہلے تم نے جو کہا تھا وہ پورا کرو..... ان کی شادی کو ایک ہفتہ ہوگیا ہے تم نے مجھے بس تین دن کا کہا تھا، میں اتنے دن چپ رہی لیکن تم نے تو کچھ کہا ہی نہیں تو مجھے خود ہی بولنا پڑا۔''

''شہناز نیچی آواز میں بات کرو..... تمہارا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔'' عالیہ بیگم نے بڑی بہو کو ٹوکا۔

''نہیں خالہ، میں اب چپ نہیں رہوں گی اگر میں چپ رہی تو میرا حصہ میرے ہاتھ سے نکل کر ملیحہ کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ یہ مجھے کسی صورت قبول نہیں۔'' شہناز اسی انداز میں ہاتھ نچا کر بولی تھی۔

''شہناز بھابی کیوں اتنا غصہ کررہی ہو...... ابا آجائیں تو پھر مل کر بات کریں گے۔'' کب سے خاموش بیٹھے شہریار نے بھاوج کو خاموش کرانے کی کوشش کی تھی...... ملیحہ خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی، بالکل گپ چپ......

''شہریار میرا بولنا غلط تو نہیں ہے تم خود بھی جانتے ہو، خالو اور خالہ نے کیا کہا تھا۔ تم بھول رہے ہو تو میں ہی بتا دیتی ہوں...... خالہ نے مجھ سے میرا کمرا خالی کرا کہ مجھے اسٹور روم میں شفٹ کیا تھا تاکہ میرا کمرا تمہیں دے سکیں...... میں نہیں مانی تھی لیکن انہوں نے کہا تھا کہ مجھے میرا کمرا واپس مل ہی جائے گا یعنی شادی کے تین، چار دن بعد مجھے میرا کمرا مل جانا چاہیے تھا تو اب تو شادی کو ہفتہ ہو گیا ہے، کسی نے کچھ نہیں کہا تو مجھے خود مطالبہ کرنا پڑا...... ذرا سے اسٹور روم میں میرا گزارہ نہیں ہو رہا، اس میں تم اپنا انتظام کرو...... اور مجھے میرا کمرا واپس کرو......''

''لیکن بھابی میں کہاں انتظام کروں اپنا......؟ ملیحہ کا سامان اتنا ہے، میں اگر اسٹور روم میں شفٹ ہوتا ہوں تو یہ سامان اس میں کہاں آئے گا؟ ہم کیسے وہاں رہیں گے؟'' شہریار نے سوال کیا تھا۔

''یہ تم سوچو تم کیسے رہو گے، یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔'' شہناز نے سر جھٹکا۔

''اور یہ سامان کا تم کیسے سنا رہے ہو کہ ملیحہ کا سامان اتنا ہے تو میرا سامان بھی کم نہیں تھا، ہر چیز لائی تھی میں جہیز میں...... وہ الگ بات ہے کہ اب اس میں سے کچھ باقی نہیں رہا۔ آتے ہی تو تم لوگوں نے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے توڑ ڈالے تھے، ٹرالی توڑ دی...... اتنے مہنگے ڈنر سیٹ توڑ ڈالے...... اونہہ اور اب سامان کا مجھے سنا رہے ہو......'' وہ تنک کر بولیں۔

''ایسا نہیں ہے بھابی، میں تو بس بتا رہا ہوں آپ کو......''

''بس رہنے دو میاں...... بس آج کے آج تم میرا کمرا مجھے واپس کرو۔'' شہناز نے حتمی انداز میں اپنی بات کہی۔

''بڑی بہو تم زیادہ شور مت ڈالو...... بہت چلالی تم نے، اب جاؤ تم کام کرو اپنا، تمہارا کمرا تمہیں مل جائے گا۔'' عالیہ بیگم نے حکمیہ کہا تھا۔

''جی ہاں بہتر یہی ہوگا کہ مجھے میرا کمرا واپس مل جائے۔'' شہناز نے منہ بنا کر کہا اور کچن کی طرف چل پڑی...... ملیحہ حیرت زدہ سی وہاں بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

''سحرش بیٹا ہم نے تمہیں نوکری کی اجازت تو دے دی ہے لیکن بیٹی یہ خیال رکھنا گھر سے باہر ہر قسم کے لوگ منتظر ملتے ہیں۔'' بانو بیگم نے تیار ہوتی بیٹی کو سمجھایا تھا۔

''اماں آپ پریشان مت ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوتا بس بابا اور آپ کی دعا چاہیے...... پھر میں ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔''

''ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹی......'' بانو بیگم نے آیت الکرسی پڑھ کر سحرش پر پھونکی تھی۔

''شکریہ امی......! بس آپ پریشان مت ہوں، میں جا رہی ہوں، دعا کریں کام بن جائے میرا......'' سحرش نے اپنے ڈاکومنٹس کی فائل اٹھائی اور ماں کو سلام کرتی گھر سے نکل گئی۔

☆☆☆

داد الٰہی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں...... بڑا بیٹا افتخار اور چھوٹا انور تھا پھر نفیسہ اور عشرت تھی۔ چاروں بچوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ بیٹیاں دونوں ایک ہی گھر میں بیاہی تھیں...... اور اب بیٹوں کے بچوں کی بھی آپس میں شادیاں طے پا رہی تھیں...... جبھی ملیحہ، افتخار کی بیٹی اور شہریار انور کا بیٹا دونوں کا آپس میں رشتہ ہوا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے ملیحہ اس طرح چپ کیوں ہو بیٹی؟'' آج ملیحہ اپنے میکے آئی تھی، خاموش تو وہ ویسے بھی رہتی تھی لیکن آج تو بہت زیادہ خاموش تھی۔ جبھی

سطوت آرا نے اس سے پوچھا تھا۔
شادی کے بعد کے حالات سے پریشان ملیحہ ماں کی توجہ پا کر ان کے گلے لگ کر رو دی۔
''ملیحہ ...... ملیحہ میری جان بتاؤ تو صحیح ہوا کیا ہے؟'' سطوت آرا نے روتی ہوئی بیٹی کے بال سنوارتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تھا۔
تب ملیحہ نے تمام باتیں ماں کو بتائیں......
''امی اب فیصلہ یہ ہوا ہے کہ میں اور شہریار الگ کرایے کے گھر میں شفٹ ہو جائیں...... امی کرایے کے گھر پر رہنے میں مجھے کوئی قباحت نہیں ہے لیکن... شہریار کوئی خاص کام نہیں کرتے ہیں تو ہم کرایے کے پیسے کہاں سے دیں گے، الگ کھانے پینے کا خرچہ کیسے پورا کریں گے اور پھر کرایے کے گھر میں بجلی کا بل، گیس کا بل سب کیسے ہوگا امی......؟'' ملیحہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کافی حد تک فکرمند ہے۔
''اوہ...... مجھے پتا تھا، یہ سب تو ہونا ہی تھا...... یہی ڈر تھا مجھے تبھی تو میں نے صاف انکار کر دیا تھا اس رشتے سے...... لیکن تمہارے باپ...... وہ ہی بھائی کی محبت میں مجبور ہو گئے اور آج بیٹی کی زندگی برباد کرنے کو چھوڑ دی۔'' وہ سخت مضطرب ہوئیں۔
''تم رونا بند کرو جان، ہمت رکھو اللہ نے مشکلات پیدا کی ہے تو وہ ہی ان کے لیے کوئی راستہ بھی سُجھائے گا۔ دیکھو تمہارے بابا سے کہتی ہوں، پراپرٹی ڈیلنگ کا کام تو کرتے ہیں، وہ ہی کوئی گھر بھی دلا دیں گے کسی طرح تمہیں...... پھر شہریار کے کاروبار کا بھی سوچتے ہیں...... تم بس پریشان مت ہو، چار دن شادی کو ہوئے ہیں اور حالت دیکھو اپنی......'' سطوت آرا نے تسلی دی۔
''جی امی، آپ ابو سے ضرور بات کریں۔'' ملیحہ تشکر آمیز انداز میں بولی تھی۔

☆☆☆

''کیا بنا سحرش، تم نوکری کے لیے گڈو کے اسکول گئی تھیں......؟'' سحرش واپس گھر آئی تو بانو بیگم نے امید بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھ کر پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں امی......'' سحرش نے چادر اتار کر کھونٹی پر لٹکائی اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ کر کہا۔
''امی نوکری دینے کے لیے وہ تیار ہو گئے تھے۔ میں نے تنخواہ کا پوچھا تو کہتے ہیں ہم بارہ کلاس پڑھی ہوئی ٹیچر کو پندرہ سو دیتے ہیں...... میں نے ان سے کہا زیادہ نہیں تو پچیس سو تو دیں...... لیکن وہ نہیں مانے تو میں واپس آ گئی۔''
''پندرہ سو......؟'' اللہ کی پناہ فیس یہ بچوں سے اتنی لیتے ہیں اور استانیوں کو تنخواہ اتنی سی دیتے ہیں......'' بانو بیگم نے حیرت بھرے لہجے میں افسوس کیا تھا۔
''اب کیا کریں گے بیٹی؟''
''اسکول میں نہیں ہوئی تو کیا ہوا امی...... وہاں اسکول میں، میں نے اخبار پڑھا تھا اس میں فوری اسٹاف کی ضرورت کے اشتہار سے دو تین آفس کے نمبر میں نے نوٹ کر لیے تھے...... کل وہاں جاؤں گی فون پر ایڈریس سمجھ کر۔''
''چلو ٹھیک ہے کر لینا، ابھی تم بیٹھو میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔'' بانو بیگم کھانا لینے کے لیے چل دیں...... وہ باپ کی طبیعت پوچھنے ان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

آج ملیحہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوئی تھی جو افتخار صاحب نے بیٹی کے نام کرا کر گفٹ کر دیا تھا...... ملیحہ نے شہریار کے ساتھ مل کر سارے گھر کو اپنے طریقے سے سجا سنوار لیا تھا...... سارا سامان گھر میں سیٹ ہو چکا تھا۔ تبھی آج نئے گھر کی خوشی میں [illegible] نے گھر میں میلاد شریف کا اہتمام کیا تھا جس میں پورے خاندان کو مدعو کیا تھا...... میلاد کے اختتام پر دور پرے کے تمام مہمان جا چکے تھے اب ملیحہ کے میکے اور سسرال والے موجود تھے...... تمام افراد ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جب ملیحہ کی ساس عالیہ بیگم نے کہا۔
''سطوت آرا یہ بہت اچھا کیا تم لوگوں نے اپنی

بیٹی کے سکون کے لیے اسے الگ گھر لے دیا...... اچھا ہے اب یہ یہاں اپنی خوشی، اپنی مرضی کے مطابق رہ سکے گی......'' سطوت آرا اس خوشی کے موقع پر عالیہ بیگم سے الجھنا نہیں چاہتی تھیں تبھی ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا...... عالیہ بیگم پھر سے گویا ہوئیں۔

''بس اب شہریار کے کاروبار کا مسئلہ رہ گیا...... میری مانو تو اب ملیحہ اپنے زیور بیچ دے پھر ان پیسوں سے شہریار کو کوئی کاروبار کرا دے۔''

''نہیں ہرگز نہیں...... ملیحہ ایسا کچھ نہیں کرے گی...... ابھی اس کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں، ٹھیک طرح سے اس نے ان زیورات کو پہنا تک نہیں ہے اور آپ بیچنے کی بات کرتی ہیں؛ ایسا تو ہم ہونے نہیں دیں گے...... ابھی پوری زندگی پڑی ہے ملیحہ کی...... آگے کس کو خبر کیسے حالات ہوتے ہیں اور کچھ نہ ہو لیکن کم از کم زیور تو ملیحہ کے پاس ہونے چاہئیں......'' سطوت آرا نے تیز لہجے میں عالیہ بیگم کی بات کا جواب دیا۔

''ارے بی بی اتنا بھاؤ کیوں دکھا رہی ہو...... میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تمہاری بیٹی کی بھلائی کی بات ہی کی ہے...... اب اس کا الگ گھر بار ہے...... اس کے ہزاروں الگ خرچے ہوں گے...... شہریار کام کوئی نہیں کرتا تو کیسے پورا کرے گا ملیحہ کا۔'' عالیہ بیگم نے ہاتھ نچا کر جواب دیا تھا۔

''یہ ساری ذمے داری ہماری نہیں ہے عالیہ بہن...... شہریار آپ کا بیٹا پہلے ہے ہمارا داماد بعد میں...... آپ لوگوں نے شادی کرنے سے پہلے کیوں نہیں اس کے کاروبار کا سوچا اور اب شادی کے بعد گھر ہم نے لے دیا تو کیا کاروبار بھی ہم ہی کرائیں؟'' سطوت آرا نے انہی کے انداز میں کہا۔

''تو ہم نے بھی کوئی......'' عالیہ بیگم مزید کچھ کہتیں جبھی درمیان میں ملیحہ نے اپنی کہی۔

''امی، چچی آپ لوگ خاموش ہو جائیں...... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، ابھی تو پہلا دن ہی ہے الگ ہوئے ابھی آپ لوگ جھگڑا مت کریں پلیز......''

''اونہہ......'' سطوت آرا نے ہنکارا بھرا تھا...... عالیہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

''مے آئی کم ان سر......؟''

''یس کم آن مس......''

''میں سحرش احمد...... آپ کا اخبار میں ایڈ دیکھا تو اس لیے اپلائی کرنے آ گئی۔''

''اوکے، یو سٹ ڈاؤن پلیز......''

سحرش خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی...... آج وہ آفس میں اپلائی کرنے آئی تھی جس کا ایڈ اس نے کل اخبار میں پڑھا تھا۔

''ڈاکومنٹس دکھائیں......'' سامنے کرسی پر بیٹھے شخص نے سحرش سے اس کی تعلیمی اسناد طلب کی تھیں۔

''آپ کو پتا ہے ہم نے آفس کے کس کام کے لیے ایڈ دیا تھا؟'' اس شخص نے ڈاکومنٹس دیکھتے ہوئے سحرش سے سوال کیا۔

''نو سر وہاں ایسا کچھ نہیں لکھا تھا۔ جس سے پتا چلتا کہ آپ کو کس کام کے لیے ورکر کی ضرورت ہے۔'' سحرش نے نگاہیں ٹیبل پر جمائے جواب لوٹایا تھا۔

''اوکے، آفس میں ایک پرسنل سیکریٹری کی ضرورت ہے، آپ کو لگتا ہے آپ یہ جاب کر پائیں گی؟'' اس شخص نے ڈاکومنٹس ٹیبل پر رکھ کر سحرش کی طرف سرکاتے ہوئے سوال کیا۔

''پرسنل سیکریٹری......؟ ایز آ پرسنل سیکریٹری مجھے کیا کرنا ہوگا سر؟'' سحرش نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''ایز آ پرسنل سیکریٹری آپ کو پورے آفس ٹائم میں، میرے ساتھ رہنا ہوگا، میری ضرورتوں کا خیال رکھنا ہوگا، آفس کے اندر یا باہر سب جگہ میرے ساتھ جانا ہوگا...... اور اس کام کے لیے میں آپ کو جب مرضی طلب کر سکتا ہوں، آپ کو فوراً خود کو میرے لیے تیار رکھنا ہوگا۔''

''سوری سر، میں آپ کی زر خرید بن کر یہ نوکری نہیں کر سکتی...... بے شک مجھے نوکری کی ضرورت ہے لیکن مجھے ایسی نوکری نہیں چاہیے جہاں میں اور میری عزت نفس کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ نہ جانے مجھ جیسی کتنی ضرورت مند لڑکیاں اپنی ضرورت کے تحت ایسی جگہوں پر آتی ہوں گی اور آپ جیسے لوگ ان کو اپنا غلام بنا کر عیش کرتے ہوں گے...... سوری...... میں یہ جاب نہیں کر سکتی......'' سحرش نے اسے کھری، کھری سناتے ہوئے اپنے ڈاکومنٹس اٹھائے اور کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

''یا اللہ بارہ بج گئے شہر یار ابھی تک واپس نہیں آئے، جانتے بھی ہیں نئی جگہ ہے، میں کسی کو بھی نہیں جانتی ہوں، پتا نہیں کیسے لوگ ہوں گے یہاں کے...... کچھ احساس ہی نہیں اتنی دیر لگا دی ابھی تک گھر نہیں لوٹے...... یا اللہ خیر کرنا میرے مالک......'' وہ اکیلی گھر میں اِدھر سے اُدھر چکر لگاتی دعا مانگ رہی تھی۔ بارہ سے رات ڈیڑھ کا ٹائم ہوا تو ملیحہ تھک کر کاریڈور میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی...... وہ شدید پریشان تھی۔ شادی کو چار مہینے ہو چکے تھے لیکن اتنے عرصے میں شہر یار کبھی اتنی دیر سے واپس نہیں آیا تھا۔ پونے گیارہ بجے تک واپس آ جاتا تھا لیکن آج نہ جانے وہ کدھر رہ گیا تھا۔

تبھی دو بجے ڈور بیل ہوئی تو ملیحہ بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچی جھک کر آئی ہول سے باہر جھانکا، سامنے شہر یار کھڑا نظر آیا تو فوراً گیٹ وا کر دیا......

شہر یار جو دروازے پر ہاتھ لگائے سہارا لیے کھڑا تھا ایک دم پورا گیٹ کھلنے کی وجہ سے لڑکھڑایا اس سے پہلے کہ وہ گرتا ملیحہ نے فوراً اسے تھام کر سہارا دیا۔

''شہر یار کیا ہوا ہے آپ کو...... ایسی حالت کیوں ہے، سب ٹھیک تو ہے ناں آپ اتنی دیر تک باہر کہاں تھے؟''

''کیسی عورت ہو، تھکا ہارا گھر آیا ہوں نظر نہیں آ رہا کیا...... ایک دم اتنے سوال کر ڈالے۔'' ملیحہ کو

شہر یار کو سہارا دیے اندر لا رہی تھی تب اس کے بولنے کے دوران عجیب سی بو ملیحہ کی ناک سے ٹکرائی وہ فوراً پیچھے ہٹ کر شہر یار کو غور سے دیکھنے لگی۔ تب اسے سمجھ آیا شہر یار کی ایسی حالت کیوں ہے۔

''شہر یار آپ نے نشہ کیا ہوا ہے، آپ نے شراب پی......'' ملیحہ کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی اس نے بے یقینی سے شہر یار سے سوال کیا۔

''ہاں تو کیا ہوا، مرد کی شان ہے یہ......'' شہر یار نے فخر سے اپنی بات کہی۔

''کیا......؟'' ملیحہ خود چکرا کر گرنے کو تھی اسے لگا آسمان گھوم رہا ہے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے کھسک رہی ہے...... شہر یار خود ہی کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''میں تو اکثر کرتا ہوں تمہیں نہیں پتا کیا؟''

ملیحہ اسے ساتھ لیے بیڈ روم میں لائی اور بیڈ پر لٹا کر خود وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔

''اے اللہ یہ سب بھی ہونا تھا۔ مالک مجھ ناچیز سے ایسی کیا خطا ہوگئی جو شہر یار جیسا انسان میری قسمت میں لکھا......'' ملیحہ گھٹنوں پر سر ٹکائے رو رہی تھی۔

شہر یار نشے کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔

دن اسی عالم میں گزر رہے تھے اب ملیحہ نے اپنے گھر میں ہی ایک کمرے میں بیوٹی پارلر کھول لیا تھا...... اس نے شادی سے پہلے باقاعدہ کورس کیا تھا۔

اس محلے میں کوئی پارلر نہیں تھا تبھی پارلر اب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ پارلر کی آمدنی سے ملیحہ گھر کا خرچہ چلا رہی تھی۔ شہر یار دن بھر باہر رہتا، دل چاہتا تو باپ کی دکان پہ بیٹھ جاتا ورنہ نہ جانے کہاں گھومتا پھرتا...... ملیحہ سب دیکھ کر خاموش تھی...... کبھی خرچے کے پیسے شہر یار سے طلب نہیں کیے پر کسی کو کچھ نہیں بتایا خود خاموشی سے سب سہہ رہی تھی۔

☆☆☆

''سحرش......'' بانو بیگم نے بیٹی کو پکارا۔

''جی امی کہیں......''

''تمہارے ابو کی تمام دوائیاں ختم ہوگئی ہیں بیٹی...... گھر میں اتنے پیسے بھی نہیں ہے کہ میں ان کی دوائیاں لا سکوں اور دوائیاں نہ ملیں تو ان کی حالت اور خراب ہو جائے گی۔''

''امی آپ فکر مت کریں، کل میں نوکری کے لیے ہاں کر دوں گی اس کمپنی کو اپنی پروڈکٹس کی سیل کے لیے سیل گرلز کی ضرورت ہے، بے شک سیل گرل کا کام تھوڑا مشکل ہے لیکن اماں اب میں اور نوکری کی تلاش میں ٹائم ضائع نہیں کرنا چاہتی...... آپ کو پتا ہے اس کمپنی کی یہ سہولت مجھے اچھی لگی کہ میں دن بھر میں جتنی پروڈکٹس سیل کروں گی وہ کمیشن مجھے اسی دن دے دیا کریں گے...... اس طرح پیسوں کا مسئلہ حل ہو جایا کرے گا۔ بس آپ پریشان مت ہوں۔''

سحرش نے ماں کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام کر تسلی دی تو بانو بیگم اسے دعائیں دینے لگیں۔

☆☆☆

اس روز اس کے پارلر میں دو نقاب پوش خواتین آئیں...... جو ماں بیٹی تھیں۔ بیٹی کو فیشل کروانا تھا اور ماں ساتھ کے لیے آئی تھی۔

''آپ یہ برقع اتار دیں تاکہ میں آرام سے فیشل کر سکوں۔'' ملیحہ نے لڑکی سے کہہ کر اس کی ماں کی طرف دیکھا جو منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

''آنٹی آپ اِدھر کرسی پر بیٹھ جائیں، فیشل میں کچھ ٹائم لگے گا......'' ملیحہ نے ان سے کہا۔ یکایک خاتون نے آگے بڑھ کر ملیحہ پہ پھونک ماری...... کرسی پر بیٹھی لڑکی کرسی سے اٹھ کر ماں کے پاس گئی تھی...... ملیحہ غائب دماغی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ جا کر اپنے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیور اٹھا کر لاؤ اور ہمیں دو......'' خاتون نے ملیحہ کو حکم دیا۔

ملیحہ گویا کسی کے زیر اثر خاموشی سے گئی اور تمام زیور اور نقدی ان کو لا تھمائی...... دونوں خواتین نے تمام چیزیں اپنے بیگ میں رکھیں اور پارلر سے نکل گئیں...... جیسے ہی وہ پارلر سے نکلیں ملیحہ جیسے جھٹکے سے ہوش میں آگئی۔ اسے خود سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو گیا...... وہ بھاگ کر لاکر کے پاس گئی تمام لاکر خالی پڑا تھا...... ملیحہ نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے تمام زیور تمام پیسے ان خواتین کو پکڑا دیے تھے...... ملیحہ کے حواس کھو رہے تھے اس نے فوراً فون کر کے اپنی ماں اور ساس کو خبر دی، سب ہی کچھ دیر میں وہاں موجود تھے۔

''یہ کیا ہو گیا ملیحہ کیسے ہوا یہ سب......؟'' سطوت آرا زیورات کے خالی ڈبے دیکھ کر اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''اماں مجھے خود نہیں پتا یہ سب کیا ہو گیا...... میں، میں بس ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خاتون کچھ پڑھ رہی تھیں، میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا تب انہوں نے میرے پاس آ کر مجھ پر پڑھ کر کچھ پھونکا اور مجھے زیور اور نقدی لانے کو کہا...... میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنی چیزیں لا کر انہیں دیں...... امی

میں لٹ گئی۔ کچھ بھی نہیں رہا امی......'' ملیحہ اب بری طرح رو رہی تھی۔

''کاش کہ شہر یار سنجیدگی سے کوئی نوکری کر رہا ہوتا تو ملیحہ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا......'' سب اپنی، اپنی بولی بول رہے تھے۔

''اوہ لگتا ہے انہوں نے پڑھائی کر کے ملیحہ کی نظر بند کی، اسے اپنے تابع کر کے اس سے اس کی تمام چیزیں لے کر فرار ہو گئیں......'' عالیہ بیگم گویا ہوئی تھیں۔

سب افراد اظہارِ افسوس کر رہے تھے...... پورے محلے میں یہ خبر پھیل چکی تھی۔

ملیحہ بخار کی حالت میں اس صدمے کو برداشت نہ کر پائی اور اپنے حواس کھو بیٹھی...... اسے اکیلا گھر لینے کی اتنی بڑی سزا ملے گی یہ کسی نے نہیں سوچا تھا۔

☆☆☆

آج سحرش کا بیوٹی پروڈکٹس کی کمپنی میں نوکری کا پہلا دن تھا۔ کمپنی والوں نے ایک بیگ میں کچھ پروڈکٹس دے کر سحرش کو سیل کرنے کے دیا......سحرش کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی دونوں نے اپنے بیگ اٹھائے اور کمپنی کی بلڈنگ سے باہر نکل گئیں......گیٹ سے نکل کر دونوں نے سامنے نظر آتی گلی میں جا کر پروڈکٹس سیل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس گلی میں داخل ہو گئیں......گلی میں موجود گھروں میں جا کر اپنی پروڈکٹس کی تعریفیں بیان کیں کچھ نے ان سے سامان لیا کچھ نے لینے سے انکار کر دیا۔

گلی میں چلتے ہوئے ایک پارلر کا بورڈ نظر آیا تو دونوں نے پارلر میں جانے کا فیصلہ کیا اور پارلر میں داخل ہو گئیں۔

پارلر میں کافی خواتین پہلے سے موجود تھیں، اتنا رش دیکھ کر سحرش اور فرناز تھوڑا جھجک کر وہیں رک گئیں۔

''جی کیسے آنا ہوا آپ لوگوں کا......؟'' تبھی انہی کی ہم عمر لڑکی نے ان سے پوچھا۔

''ہم یہ اپنی کمپنی کی کچھ پروڈکٹس سیل کر رہے ہیں، پارلر نظر آیا تو یہاں سیل کرنے آ گئے۔'' سحرش نے بیگ زمین پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

یہ پارلر ملیحہ کا ہی تھا جہاں آج کے واقعے کی وجہ سے ان کا خاندان اور محلے والے جمع تھے۔

''کون ہیں یہ لڑکیاں نبیلہ......؟'' سطوت آرا نے سحرش اور فرناز سے بات کرتی نبیلہ کے پاس آ کر سوال کیا۔

''امی یہ دونوں اپنی کمپنی کی پروڈکٹس سیل کرنے آئی ہیں۔'' نبیلہ نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ سطوت آرا، نبیلہ کا جواب سن کر شدید غصے میں آ کر چلائی تھیں۔

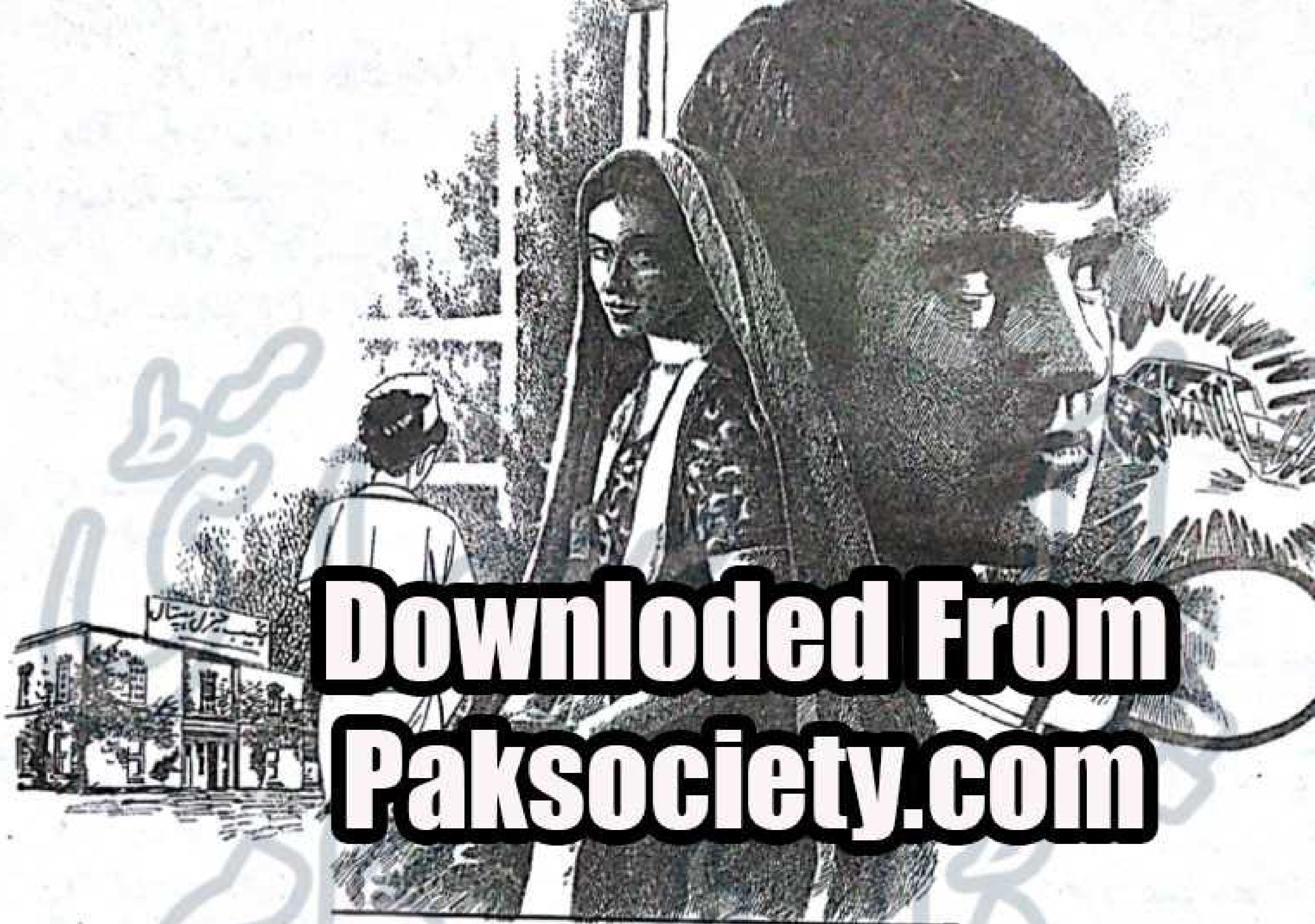
''دفع ہو جاؤ تم لوگ......؟ معصوم بن کر بھیس بدل کر آ جاتے ہو دوسروں کو لوٹنے کے لیے......اب کیا لوٹو گی...... یہاں تو تمہارے ہی جیسی دو پہلے ہی میری بیٹی کا سب کچھ لوٹ کر لے گئی ہیں...... یہاں اب لوٹنے کو کچھ نہیں ہے...... جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے......''

سطوت آرا صدمے کے زیرِ اثر شدید غصے میں تھیں۔ تبھی دونوں کو دھکے مار کر پارلر سے باہر نکال دیا۔

سحرش اور فرناز پارلر کے باہر کھڑی حیرت سے سب سن...اور دیکھ رہی تھیں تبھی ایک عورت ان کے پاس آئی اور ملیحہ کے ساتھ ہوا حادثہ ان دونوں کو بتانے لگی۔

سحرش اور فرناز حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں کھڑی سب سن رہی تھیں۔ کسی کے کیے کی سزا اُن کو مل رہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھیں جنھوں نے ملیحہ کو لوٹا وہ کون تھیں......وہ ملیحہ کے دکھ کو محسوس کر رہی تھیں...... اُن بھیس بدل کر لوٹتی عورتوں کی وجہ سے وہ بھی مجرم ٹھہرائی گئی تھیں......دونوں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ پائیں۔ بتا ہی نہیں پائیں کہ وہ کس حد تک ضرورت مند ہیں، ایک کا باپ گھر میں دوائیوں کا منتظر ہے تو دوسری کے گھر میں کمانے والا مرد کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ ملیحہ کے ساتھ ہوئے ظلم کے لیے افسوس کر سکتی تھیں لیکن کسی کے کیے کی سزا خود کو ملنے کی وجہ سے اپنے پر ہوتے ظلم پر کچھ بھی نہیں کہہ پا رہی تھیں......شاید یہی بے بسی ہوتی ہے۔



ناولٹ

مکافات

ناہید سلطانہ اختر

نجیب جنرل اسپتال شہر کی ایک مشہور شاہراہ پر لبِ سڑک ایستادہ ایک سہ منزلہ عمارت کی پیشانی پر یہ تین الفاظ ہر آتے جاتے کو اپنی طرف متوجہ رکھتے۔ رات کو یہ الفاظ جگمگا اٹھتے اور سپیدۂ سحر پھیلنے تک جگمگاتے ہی رہتے۔

کبھی یہ عمارت صرف گراؤنڈ فلور پر ہوا کرتی تھی مگر اب اس کے تین فلورز تھے۔ کبھی یہ بیگم محسود علی خان کی ملکیت ہوا کرتی تھی اب ڈاکٹر نجیب اس کے مالک



تھے۔ بیگم محمود علی خان کا ڈاکٹر نجیب سے نہ تو کوئی رشتہ ناتا تھا نہ انہوں نے اپنی یہ ملکیت ڈاکٹر نجیب کو فروخت کی تھی۔ کبھی، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو چیز آپ کی نہیں ہوتی آپ کی بن جاتی ہے۔ مالک کی دین...... اس کی نظرِ کرم...... اور کبھی، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جو چیز آپ کی ہوتی ہے آپ سے چھن جاتی ہے۔ اوپر والا ہی جانے کب، کسے کیا دینا ہے اور کب، کس سے اپنی کوئی نعمت واپس لینی ہے۔ اس ملنے اور چھننے میں مالک کی رضا اپنی جگہ مگر کچھ دوش تو بندے کا بھی ہوتا ہوگا۔

ڈاکٹر نجیب کی زندگی کا سفر نہایت غربت میں شروع ہوا تھا۔ باپ ریلوے اسٹیشن پر قلی تھا۔ ماں ریلوے کوارٹروں میں گھر، گھر جا کر چھوٹے موٹے کام کرتی تھی جس کے عوض اسے ان گھروں سے باسی کھانا، پرانے کپڑے اور تھوڑے، بہت پیسے مل جاتے۔ تین بچے تھے ایک بیٹا نجیب اور اس سے چھوٹی دو بہنیں...... اسٹیشن کے نزدیک ایک سرکاری اسکول تھا جس میں تینوں بہن، بھائی پڑھنے جایا کرتے تھے۔ پرائمری سیکشن میں لڑکے، لڑکیاں اکٹھے پڑھتے، چھٹی جماعت میں لڑکیاں اور لڑکے علیحدہ ہو جاتے۔ وسیع و عریض احاطے میں اسکول کے تین فریق تھے۔ پرائمری، گرلز سیکنڈری اور بوائز سیکنڈری۔ ماں کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے تینوں بچے لکھ پڑھ جائیں۔ وہ نہ تو بیٹے کو باپ کی طرح مسافروں کا اسباب ڈھوتے دیکھنا چاہتی تھی، نہ بیٹیوں کو اپنی طرح گھر، گھر کام کرتے...... تینوں بچوں کو پڑھائی کی لگن تھی۔ رات کو جب آس پاس گھروں میں بچے پڑ کر سو جاتے، تینوں لالٹین کی روشنی میں بیٹھے پڑھتے رہتے، کبھی جب لالٹین کی لو تیل کی کمی سے مدھم پڑ جاتی نجیب اپنا بستہ اٹھا کر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم یا ویٹنگ روم میں جا بیٹھتا اور رات بھر پڑھتا رہتا۔ اسے ڈاکٹر بننے کی لگن تھی۔ اس کی ماں نے اس کے دل میں بچپن سے یہ بات ڈال رکھی تھی کہ اسے ریلوے اسپتال کے ڈاکٹر بابو کی طرح ڈاکٹر بننا ہے۔

میٹرک میں نجیب نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایف ایس سی میں دن رات ایک کر کے اکیانوے فی صد نمبر حاصل کیے۔ یوں میڈیکل کالج میں اسے میرٹ پر داخلہ مل گیا۔ اس کے ڈاکٹر بننے تک ایک بہن کی شادی ہو چکی تھی دوسری ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ ہاؤس جاب کے بعد ڈاکٹر نجیب کو ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں سرکاری ملازمت ملنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کہ آج...... ملازمت کے آغاز ہی میں ڈاکٹر نجیب کو ڈاکٹرز کالونی میں سرکاری رہائش گاہ بھی مل گئی۔ اہلِ خانہ اس رہائش گاہ میں شفٹ ہو گئے۔ باپ نے قلی کا کام ترک کر دیا تھا۔ ماں بھی عرصہ ہوا محنت مزدوری کرنا چھوڑ چکی تھی۔

سرکاری ملازمت کے ساتھ ڈاکٹر نجیب نے جلد ہی شہر کی ایک گنجان غریب بستی میں اپنا ذاتی کلینک بھی شروع کر دیا...... مقصد پیسہ کمانا نہیں، غریبوں اور ناداروں کی خدمت تھی۔ ڈاکٹر نجیب کو اپنا اور اپنے خاندان کا برا وقت بھولا نہیں تھا۔ موسم سرما میں وہ اور اس کی بہنیں گرم کپڑوں کے بنا ٹھٹرتے ہوئے اسکول جایا کرتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ جب اس کی ماں کے پاس کبھی، کبھی ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے باپ کو سر پر اوپر تلے تین، تین ٹرنک اٹھائے ایک ہاتھ سے ان ٹرنکوں کو سنبھالے اور دوسرے ہاتھ کی بغل میں سامان دبکائے دیکھتا تو اس کا دل ڈرنے لگتا تھا کہ کہیں کسی روز اس کا باپ سامان کے بوجھ تلے بیٹھ ہی نہ جائے۔ گئے دنوں کے دکھ ڈاکٹر نجیب کو دوسروں کے دکھ سمجھنے میں مدد دیتے۔ میڈیکل کالج میں اپنے دورِ طالب علمی ہی سے وہ غریبوں کا انتہائی ہمدرد رہا تھا۔ شاید یہی ادا تھی کہ خدا کو اتنی بھا گئی تھی کہ ڈاکٹر نجیب کے ہاتھ میں اس نے ایسی شفا سمو دی تھی کہ سرکاری اسپتال میں اس کے شعبے میں آنے والے ہر مریض کی یہ کوشش ہوتی کہ ڈاکٹر نجیب ہی اس کی نبض پر ہاتھ رکھے۔ پرائیویٹ کلینک میں تو مریضوں کا وہ اژدھام

ہوتا کہ خدا کی پناہ......

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ بطور معالج ڈاکٹر نجیب کی مہارت اور شہرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ماں بہت خوش تھی باپ مغرور کہ بیٹا وہاں جا پہنچا تھا جہاں ان کا وہم وگمان بھی نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری بہن بھی اپنے گھر بار کی کردی گئی تھی۔ اب ڈاکٹر نجیب کی شادی کا معاملہ درپیش تھا۔ والدین نے شریکِ حیات کا انتخاب بیٹے پر چھوڑا۔

ندرت اسی سرکاری اسپتال میں نرس تھی جہاں ڈاکٹر نجیب ملازمت کر رہے تھے۔ ندرت بہت خوب صورت تھی۔ اس کا تعلق ایک نچلے متوسط گھرانے سے تھا۔ ڈاکٹر نجیب اسے پسند کرتے تھے مگر اس پسند کا اظہار ندرت سے کرتے ڈرتے تھے کہ وہ ماہِ تاباں تھی اور ڈاکٹر نجیب اس کے قطعاً برعکس...... دونوں میں زمین آسمان کا تضاد تھا۔ ڈاکٹر نجیب کا قد چھوٹا، جسامت بے ڈول، رنگت نہایت سیاہ تھی۔ جبکہ ندرت سروقامت، دبلی پتلی اور بے حد گوری چٹی تھی۔ ایک دو نہیں متعدد ڈاکٹرز تھے جو اس پر مرتے تھے لیکن وہ جتنی خوب صورت تھی اس سے کہیں زیادہ باکردار...... اپنے کام سے کام رکھتی...... وقت پر آتی وقت پر جاتی۔ اپنے پیشہ ورانہ فرائض ذمے داری اور دیانت داری سے سر انجام دیتی۔ اسپتال میں کام کرنے والے کسی شخص کو بلا ضرورت بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ مریضوں کا پورا خیال رکھتی مگر کسی کو حد سے آگے نہ بڑھنے دیتی۔ اس کا کبھی کوئی اسکینڈل دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا تھا۔

''سسٹر ندرت میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر نجیب نے بہت محتاط لہجے میں اس سے بات کی تھی۔

''جی...... پوچھیے......''

''آ...... آپ...... کہیں انگیجڈ تو نہیں؟''

''جی نہیں......''

''کیا میں اپنے گھر والوں کو آپ کے گھر بھیج سکتا ہوں؟'' وہ کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے کہا۔

''آپ ڈاکٹر ہیں اور اس اسپتال میں آپ کی اچھی بھلی شہرت اور عزت ہے...... میں بھی آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' اس کے چپ ہو جانے پر ڈاکٹر نجیب نے کہا۔

''میں...... میں ایک نرس ہوں...... بہت معمولی گھرانا ہے میرا...... آپ تو اپنے گھر والوں کو میرے گھر بھیج کر اور ہمارا لونگ اسٹینڈرڈ دیکھ کر پیچھے ہٹ جائیں گے، میرا مذاق بنے گا۔''

''یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟''

''لوگ سمجھیں گے میں نے آپ کو پھانسنے کی کوشش کی مگر آپ پھنسے نہیں، میرا مذاق اڑایا جائے گا...... بھپتیاں کسی جائیں گی کہ نرس ہو کر ڈاکٹر کے خواب......''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''ایسا ہی ہوگا ڈاکٹر صاحب...... لالو کھیت میں ندی کے کنارے ہمارا دو کمروں کا مکان اتنا تنگ و تاریک ہے کہ آپ کے گھر والے وہاں زیادہ دیر بیٹھنا بھی پسند نہیں کریں گے۔''

''تم انہیں آنے کا موقع تو دو اپنے گھر......'' ڈاکٹر نجیب آپ سے تم پر آگئے۔

''فائدہ......؟''

''نقصان بھی کچھ نہیں۔''

''آپ کو نہیں مگر مجھے ہے...... میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خواب نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''مگر میں تو دیکھتا ہوں اور تعبیر بھی اپنی مرضی کی پاتا ہوں۔''

''میں آپ کی قسمت پر رشک ہی کر سکتی ہوں۔''

''تمہارے پاس دو کمروں کا مکان تو ہے، ہمارے پاس کبھی یہ بھی نہیں تھا۔ میرے والد اسٹیشن پر قلی تھے۔ والدہ گھروں میں کام کرتی تھیں۔ ہماری لالٹین میں اکثر مٹی کا تیل بھی نہیں ہوتا تھا۔

میں ریلوے پلیٹ فارم یا ویٹنگ روم میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔'' ندرت آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے ڈاکٹر نجیب کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں۔'' اس نے ڈاکٹر نجیب کے چپ ہو جانے پر کچھ دیر بعد کہا۔

''نہیں...... یہ حقیقت ہے...... لیکن جیسا کہ میں نے تم سے کہا، میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خواب دیکھتا ہوں اور تعبیر بھی اپنی مرضی کی پاتا ہوں...... میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں، میں نے ان کی اس خواہش کو اپنے دل میں بسایا۔ سفر مشکل تھا مگر کٹ ہی گیا۔ میں نے بھی اپنی والدہ کو ان کے خواب کی تعبیر دی۔ اب میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے مجھے اس کی تعبیر بھی اپنی مرضی کی ملے گی۔''

ندرت خاموش رہی۔

''کیا کہتی ہو؟'' ڈاکٹر نجیب نے اس سے پوچھا۔

''مجھے آپ کی یہ بات اچھی لگی ہے۔'' وہ بولی۔

''کون سی......؟''

''کہ آپ نے خود کو کسی پردے میں چھپانے کی کوشش نہیں کی...... لوگ جو نہیں ہوتے وہ نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''فائدہ کچھ نہیں...... حقیقت بالآخر کھل ہی جاتی ہے۔''

''یہ کون سوچتا ہے۔''

''کیا کہتی ہو...... بھیج دوں؟''

''کسے؟'' وہ بے ساختہ چونکی۔

''اپنے گھر والوں کو مسز ندرت۔''

''ایک شرط پر......'' وہ خلافِ عادت مسکرائی۔

''کیا......؟'' وہ چونکا۔

''آپ مجھے مسز نہیں کہیں گے۔''

''اوہ......'' وہ جھینپ کر مسکرایا۔

☆☆☆

ندرت کے گھر والوں کی طرف سے انکار کا اگر کوئی سبب ہو سکتا تھا تو وہ صرف یہ کہ ندرت اور ڈاکٹر نجیب کا ظاہراً کوئی جوڑ نہیں تھا۔ ندرت سرو قامت، خوب صورت اور دلکش تھی جبکہ ڈاکٹر نجیب پستہ قامت، بے ڈول اور حبشیوں کی طرح سیاہ فام......

''باقی تو سب ٹھیک ہے مگر...... بہر حال دیکھ لو...... بیٹی یہ نہ کہے کہ میرا جوڑ نہیں دیکھا۔'' ندرت کے باپ نے اس کی ماں سے کہا۔

''ہاں۔'' ماں نے شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''جو آدمی آنکھ ہی کو نہ بھائے اسے دل کیسے قبول کرے گا بھلا...... مگر رشتہ اچھا ہے...... ندرت کی قسمت تیز ہے جو گھر بیٹھے ایسا اچھا رشتہ آ گیا۔ کنبہ بھی مختصر ہے، دو بہنیں، اکلوتا بھائی...... بہنیں دونوں اپنے اپنے گھر کی...... ماں، باپ بوڑھے بھلا کتنے دن کے۔''

''ندرت سے پوچھ لو...... گزارہ اسی کو کرنا ہے۔'' باپ نے رائے دی۔

ندرت جس نے گھر والوں پر یوں ظاہر کر رکھا تھا جیسے ڈاکٹر نجیب کا رشتہ آنے میں اس کا کوئی بیچ ہی نہیں تھا۔ اپنی رضا معلوم کیے جانے پر بولی۔

''شکل صورت میں کیا رکھا ہے۔ سارے انسان اللہ کے بنائے ہوئے ہیں...... کوئی خوب صورت آدمی ہو مگر جاہل اور نکما ہو تو......''

گھر والوں کو جواب مل گیا تھا۔

''تم شادی کے بعد جاب نہیں کرو گی۔'' ڈاکٹر نجیب نے ندرت سے کہا۔ ندرت کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ تو دل سے چاہتی تھی کہ کبھی دن کبھی رات کی ڈیوٹیوں سے نجات ملے۔

ندرت کی ''ساتھیاں'' اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر اور وہ بھی وہ جس کی مریضوں، جونیئرز اور اپنے برابر کے ساتھیوں میں ہی نہیں سینئرز میں بھی عزت تھی۔

شادی سے قبل ہی ندرت نے ملازمت چھوڑ دی۔

شادی ہو گئی۔ ابتدائی دنوں کے چاؤ چونچلوں کے بعد ندرت نے گھر سنبھال لیا۔ ساس، سسر، شوہر، نندیں سب خوش تھے۔ ندرت کے آنے سے گھر

میں اجالا سا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نجیب بیوی کے سامنے بچھا بچھا جاتا۔ اپنوں پرایوں سب میں ڈاکٹر نجیب کی بیوی کی خوب صورتی کی دھوم مچی ہوئی تھی...... دونوں اکٹھے باہر نکلتے تو لوگ انہیں چونک کر دیکھنے لگتے۔ ڈاکٹر نجیب کے ایک دوست نے دونوں کی دعوت کی تو ان کے نوعمر بچوں نے جنہیں والدین نے اظہارِ رائے کی پوری آزادی دے رکھی تھی، کھانے کی میز پر بہت بے باکی سے کہا۔

''انکل افریقا کے لگتے ہیں اور آنٹی انگریز......''

''ہاں بھئی ایسا ہی ہے۔'' ڈاکٹر نجیب نے مسکراتے ہوئے کہا مگر ندرت کو بچوں کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر ناگواری تھی۔

شوہر ڈاکٹر نجیب جیسا چاہنے والا ہو تو ندرت کیا، کوئی بھی سمجھدار بیوی ان بچوں کی بات پر اسی طرح ناگواری محسوس کرتی۔ ڈاکٹر نجیب سے اس کی شادی ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس قلیل عرصے میں اس نے اسے اتنی محبت، اتنی عزت دی تھی کہ وہ دل و جان سے اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ وہ اس کا اتنا خیال رکھتا کہ اسے یوں لگتا جیسے ماں، باپ کا گھر چھوڑ کر وہ کسی جنت میں آبسی تھی۔ پرائیویٹ کلینک میں ڈاکٹر نجیب کی پریکٹس کافی اچھی چل رہی تھی۔ سرکاری اسپتال کی نوکری سے ملنے والی تنخواہ بھی اچھی تھی۔ ندرت جس شے کی طرف نظر اٹھا دیتی اس کا خریدنا ڈاکٹر نجیب کے لیے لازم ہوتا۔

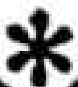
ندرت کے گھر والے خوش تھے کہ اُن کی بیٹی کو صحیح قدردان مل گیا تھا۔ اور ڈاکٹر نجیب کے والدین مطمئن کہ ان کے بیٹے کو ایسی شریکِ حیات ملی تھی جو عام عورتوں کی طرح ناشکری اور بے فیض نہ تھی۔ وہ شوہر کا نہ صرف خیال رکھتی بلکہ اس کا احترام بھی کرتی...... ساس، سسر کو عزت دیتی، نندیں گھر آتیں تو ان کی آؤ بھگت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے باقی سسرالی رشتے داروں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا

نیا سال

مبارک ہو!

اپنے ساتھ یادوں کی سوغات لیے
اشکوں کی برسات لیے
اور الوہی جذبوں سے معمور
دعاؤں کے ڈھیر سارے پھول لیے
پھر نیا سال آیا
اور ایسے سمے میں
آنکھوں کے بیش بہا خزانے لٹاتی
میری آنکھیں
تمہارے لیے
دعاؤں کے پھول چن رہی ہیں
نیلے امبر کو چھوتی میری نگاہیں
تمہارے لیے خوشیوں کی دعائیں
مانگ رہی ہیں
اور کہہ رہی ہیں میری مسرت بھری
یہ آنکھیں
اے دوست تمہیں
''نیا سال مبارک ہو''

مرسلہ: صائمہ مشتاق، سرگودھا



تھا۔ مائیں اور ساسیں اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو اس کی مثالیں دیتیں۔ وہ واقعی بہت سمجھدار تھی۔ اتنی سمجھدار کہ شادی کے بعد کچھ دنوں تک تو وہ نو بیاہی دلہنوں کی طرح بنتی سنورتی رہی لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ نجیب کے ساتھ باہر جانے پر لوگ ان دونوں کے درمیان ظاہری تضاد کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہی ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو اس نے بننا سنورنا بتدریج کم کر دیا تھا۔ گھر سے باہر جاتے ہوئے وہ شوخ رنگ کپڑے پہننے سے گریز کرتی۔ میک اپ بہت ہوا تو آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک...... سادگی اختیار کر کے وہ اپنے اور نجیب کے درمیان ظاہری شخصیت کے تضاد کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتی۔ جہاں تک دل کے اندر کی بات تھی وہ نجیب سے انتہائی محبت کرنے لگی تھی۔ صورت شکل سے کیا ہوتا ہے آدمی کا من اجلا ہونا چاہیے اور اس اعتبار سے وہ لاکھوں میں ایک تھا۔ مرد کی شخصیت شاندار ہو مگر وہ عورت کا خیال نہ رکھے، اسے آرام نہ دے، اس کی ضرورتیں پوری نہ کرے۔ اسے عزت سے محروم رکھے۔ اپنے پاؤں کی جوتی سمجھے تو اس کے ظاہری حسن کو لے کر چاٹنا ہے کیا...... عورت، مرد سے تحفظ، آرام، محبت اور عزت کی طلبگار ہوتی ہے اور یہ سب کچھ ڈاکٹر نجیب نے اسے بے بہا، بے حساب دیا تھا سو اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کے لیے اس دنیا کا حسین ترین اور محبوب ترین شخص کون ہے تو وہ آنکھ بند کر کے نجیب کا نام لیتی۔

☆☆☆

آٹھ سال کے عرصے میں تین بچوں کی وقفے، وقفے سے پیدائش نے ڈاکٹر نجیب اور ندرت کے باہمی رشتے کو مزید جلا دی...... مدحت سب سے بڑی تھی۔ اس سے تین سال چھوٹی عفت اور پھر اریب...... ڈاکٹر نجیب کو تینوں سے بے حد پیار تھا۔ والدین اللہ کو پیارے ہو چکے تھے گھر میں اب وہ دونوں میاں، بیوی تھے اور تین بچے...... گھر میں خدا کے فضل سے ہر طرح کی فراغت تھی۔ ڈاکٹر نجیب کی سرکاری نوکری کے ساتھ پرائیویٹ پریکٹس بھی جاری تھی۔ وقت گزارنے کے ساتھ، ساتھ ڈاکٹر نجیب کی صفتِ مسیحائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ لمبی چوڑی غیر ملکی ڈگریوں کی فہرست آویزاں نہ تھی مگر خدا جسے چاہے دستِ شفا عطا فرما دے۔ اسپتال میں ڈاکٹر نجیب کے شعبے میں آنے والے ہر مریض کی یہی خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر نجیب اپنا دستِ شفا اس کی نبض پر رکھے۔ ڈاکٹر نجیب کی پرائیویٹ کلینک پر مریضوں کا اتنا اژدھام ہوتا جیسے مرید اپنے پیر کی قدم بوسی کو پہنچے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر نجیب کے بارے میں کہا جاتا کہ وہ جس کی نبض پر ہاتھ دھر دے اس کی شفا یقینی......

سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر نجیب کے اوقات کار کے دوران دہشت گردی کی شکار ایک ادھیڑ عمر خاتون بیگم محسود علی خان، ڈاکٹر نجیب کے وارڈ میں لائی گئی۔ خاتون بے ہوش تھی۔ اس کے ہمراہ آنے والے ڈرائیور نے جو خود بھی زخمی حالت میں تھا بتایا کہ وہ خاتون کو شاپنگ کے لیے ان کی کار میں لے جا رہا تھا کہ راستے میں تین نامعلوم افراد نے گاڑی روکی اور اسے اور اس کی مالکن کو جو عقبی نشست پر تھی گن پوائنٹ پر لے لیا۔

ان میں سے ایک نے خاتون سے اس کا بیگ اور قیمتی جیولری ہتھیانے کی کوشش کی تو خاتون نے مزاحمت کی، دہشت گردوں نے فائر کھول دیا۔ خاتون پر بھی اور اگلی نشست پر بیٹھے ڈرائیور کی ٹانگ میں بھی گولی مار دی تا کہ وہ خاتون کا دفاع نہ کر سکے۔ خاتون شدید زخمی تھی۔ راہ گیروں نے دہشت گردوں کے فرار کے بعد خاتون اور اس کے ڈرائیور کو اسپتال پہنچایا تھا۔

خاتون تقریباً ڈیڑھ ماہ اسپتال میں زیرِ علاج رہی اور اس دوران ڈاکٹر نجیب نے اس کے علاج معالجے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ نہ صرف ان زخموں کا علاج جو دہشت گرد اس معمر خاتون کو لگا

گئے تھے بلکہ اس خوف کا علاج بھی جو دہشت گردوں کے اس حملے کے نتیجے میں اس خاتون کے دل میں اثر کر گیا تھا۔

صحت یابی کے بعد بیگم محمود علی خان نے ڈاکٹر نجیب کو مع اہلِ خانہ اپنے گھر مدعو کیا۔ بیگم محمود علی ایک متمول خاتون تھیں۔ شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ عزیز، رشتے دار سب خوشحال اور اپنی، اپنی دنیا میں مگن، شہر کی ایک معروف اور مصروف شاہراہ پر لبِ سڑک واقع ایک خوب صورت کوٹھی میں بیگم محمود تنہا رہتی تھیں۔ گھر کے کام کاج کے لیے انہوں نے ایک ملازم جوڑا کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رکھا ہوا تھا۔ عورت گھریلو کام کاج کرتی۔ مرد باہر کے کام نمٹاتا، مالی گیری، چوکیداری، ڈرائیوری سب اس کے ذمے تھا۔ دونوں کے چار بچے تھے۔ بیگم محمود میاں، بیوی کو ان کی خدمات کے عوض ماہانہ تنخواہ دیتیں اور چاروں بچوں کے تعلیمی اور دیگر اخراجات میں فراخدلی سے مدد کرتیں...... محمود علی خان اس کوٹھی کے علاوہ ایک شاپنگ مال بھی چھوڑ کر مرے تھے جیسے محمود علی خان کا ایک سیکنڈ کزن اور ان کے بیٹے چلاتے تھے۔ اس مال سے بیگم محمود علی کو ہر ماہ خطیر رقم مل جاتی جس سے وہ فراغت کی زندگی گزار رہی تھیں۔

بیگم محمود علی خان کے مدعو کرنے پر ندرت اور بچوں سے ملاقات کے بعد ڈاکٹر نجیب سے بیگم محمود کا تعلق صرف معالج اور مریض کا نہ رہا بلکہ بیگم محمود نے انہیں اپنے ''فیملی فرینڈز'' کا درجہ دے دیا۔ گہرے مراسم کی استواری میں بیگم محمود نے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ وہ ڈاکٹر نجیب اور فیملی کو بہ اصرار جلدی، جلدی اپنے ہاں بلاتیں۔ خود بھی ڈاکٹر نجیب کے گھر آتیں مگر اپنی عمر اور جوڑوں کے درد کو زیادہ نہ آنے کا جواز بتاتیں......

''آپ لوگ جوان ہو، ایکٹو ہو میں زیادہ کہیں نہیں آ، جا سکتی...... جب بلایا کروں تو آنے میں تکلف نہ کیا کرو...... یہ سمجھا کرو کہ ماں نے بلایا ہے۔'' بیگم محمود علی کے ایک مرتبہ یہ کہنے کے بعد نجیب نے ان کے بلانے پر تکلف سے کام لینا چھوڑ دیا تھا بلکہ کبھی، کبھی بن بلائے بھی وہ بیوی بچوں کو لے کر ان سے ملنے پہنچ جاتا۔

بیگم محمود علی سے نجیب اور اہلِ خانہ کا یہ تعلق آٹھ برس سے زائد برقرار رہا۔ پھر بیگم محمود علی اچانک بہت بیمار پڑ گئیں۔ بلڈ کینسر تشخیص ہوا۔ نجیب ان کے علاج معالجے میں معاون رہا مگر بیگم صاحبہ شفایاب نہ ہو سکیں۔ اپنی علالت کے آخری دنوں میں انہوں نے اپنی شاندار کوٹھی عام لوگوں کے علاج معالجے کے لیے ایک اسپتال قائم کرنے کو ڈاکٹر نجیب کے نام کر دی۔ اس کا انکشاف ان کی موت کے بعد وصیت نامہ کھلنے پر ہوا۔ ان کا بقیہ ترکہ شرعی وارثان کو ملنا تھا۔ اپنی ایک تہائی جائداد کی بابت وہ وصیت کرنے کی مجاز تھیں اور کوٹھی کی مالیت ان کے ترکے کا تقریباً ایک تہائی ہی بنتی تھی۔

گو وارثان کو بیگم محمود کی وصیت آسانی سے ہضم نہیں ہوئی مگر وصیت میں کوئی قانونی سقم نہ ہونے کے باعث انہیں قبول کرنا ہی پڑا۔

ڈاکٹر نجیب نے بیگم محمود سے ملنے والی کوٹھی میں ایک اسپتال قائم کر دیا جہاں ایک عام آدمی بھی معمولی فیس پر علاج معالجے کی سہولت حاصل کر سکتا تھا۔ اسپتال چلانا کل وقتی ذمے داری تھی، ڈاکٹر نجیب نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور... پرائیویٹ کلینک میں اپنی پریکٹس ختم کر کے بیگم محمود علی خان مرحومہ کی کوٹھی میں قائم اسپتال کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ اسپتال میں ان کے علاوہ بھی ایک فی میل اور دو میل ڈاکٹرز ملازم رکھے گئے۔ دیگر اسٹاف ان کے علاوہ تھا۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ ڈاکٹر نجیب اور ندرت کے درمیان ہم آہنگی میں مثالی اضافہ ہوا تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں ان کی باہمی محبت کی مثالیں دی

جاتیں۔ ڈاکٹر نجیب اپنے تینوں بچوں کے لیے بھی سراپا محبت تھے۔ تینوں بچوں کو انہوں نے انتہائی لاڈ سے پالا تھا۔ کبھی ان کی کوئی فرمائش رد نہیں کی تھی۔ جب سے بچے بڑے ہوئے تھے۔ سال میں کم از کم ایک مرتبہ وہ انہیں ساتھ لے کر اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک تفریح کے لیے ضرور لے جاتے...... ندرت کی سابقہ سہیلیاں اور خاندان والے اس کی قسمت پر رشک کرتے...... بچوں سے ڈاکٹر نجیب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ گھر میں بیوی بچوں کے لیے علیحٰدہ گاڑی اور ڈرائیور ہونے کے باوجود وہ صبح بچوں کو خود اُن کے اسکول، کالج چھوڑتے اور واپسی پر خود ہی پک کرتے۔

مدحت کالج میں پہنچ چکی تھی۔ عفت او لیول کر رہی تھی اریب آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ عفت اور اریب کی چھٹی ڈیڑھ بجے ہوتی۔ مدحت دو بجے کے لگ بھگ کالج سے فارغ ہوتی۔ ڈاکٹر نجیب ڈیڑھ بجنے سے پہلے ہی عفت اور اریب کے اسکول کی پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی لا کر کھڑی کر دیتے۔ دونوں بچے جب چھٹی کے بعد پارکنگ لاٹ کی طرف آتے تو ڈاکٹر نجیب انہیں آتا دیکھ کر گاڑی سے اتر آتے۔ ان کے قریب آنے پر انہیں ہگ (گلے لگاتا) کرتے۔ ان کے بیگ سنبھالتے، عفت پچھلی نشست پر بیٹھتی اریب آگے۔ انہیں لے کر ڈاکٹر نجیب، مدحت کو لینے کے لیے اس کے کالج روانہ ہو جاتے۔ راستے بھر دونوں بچے انہیں اسکول میں گزرے وقت کا احوال سنانے لگتے۔

''پاپا آج ہماری اسپورٹس ٹیچر نے ریسز کروائیں۔'' اریب بتاتا۔

''پاپا میں نے کلاس میں اسپیچ کی۔'' عفت کہتی۔

''پاپا......! آئس کریم۔'' اریب فرمائش داغتا اور ڈاکٹر نجیب کی گاڑی یوں رک جاتی جیسے اریب کی فرمائش گاڑی کا ریموٹ کنٹرول تھی۔

بچوں کی فرمائشیں ڈاکٹر نجیب کو اچھی لگتیں۔ تعطیلات گزارنے کے لیے مقام کا انتخاب وہ ہمیشہ بیوی بچوں کی مرضی سے کرتے۔

''پاپا اس مرتبہ ملائشیا۔'' مدحت کہتی۔

''نہیں انگلینڈ۔'' عفت ٹھنکتی۔

''اس بار سنگاپور نہ چلیں۔'' ندرت کہتی۔

بالآخر کسی ایک مقام پر سب کا اتفاق رائے ہو جاتا۔ تعطیلات گزارنے کے لیے بیوی بچوں کو بیرون ملک لے جانا اب ایسا ہی تھا جیسے پنڈی یا اسلام آباد میں رہنے والے مری گھوم آنے کی بات کرتے ہیں۔ خدا نے ڈاکٹر نجیب کو بہت نواز دیا تھا۔

فضائی سفر کے دوران اگر ندرت یا بچوں میں سے کوئی یہ کہہ دیتا کہ جہاں وہ جا رہے تھے وہاں کے بجائے فلاں جگہ جانا چاہیے تھا تو ڈاکٹر نجیب کا بس نہ چلتا کہ کاک پٹ میں جا کر پائلٹ کو جہاز کا رخ اس مقام کی طرف موڑنے پر مجبور کر دیں۔ جس کی فرمائش کی جا رہی ہوتی۔

ندرت اور اس کے بچے واقعی خوش قسمت تھے کہ خدا نے انہیں ڈاکٹر نجیب جیسا شوہر اور باپ دیا تھا۔

☆☆☆

لیکن اس خوش قسمتی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔

بیگم محمود علی خان مرحومہ کی کوٹھی میں قائم نجیب جنرل اسپتال میں ملازم ایک نرس نور جہاں نے ڈاکٹر نجیب کو اپنے دام میں پھانس لیا۔ وہی ڈاکٹر نجیب جو اپنی باوفا شریکِ حیات ندرت کا منہ دیکھ کر گھر سے نکلتے تھے اور گھر واپسی پر سب سے پہلے اسی کو دیکھنے کے متمنی ہوتے تھے، اس سے کترائے، کترائے سے رہنے لگے۔ بچوں کے اسکول کی پارکنگ لاٹ میں سب سے پہلے آ کر کھڑی ہونے والی ڈاکٹر نجیب کی کار اب اکثر دیر سے آنے لگی۔ عفت اور اریب پارکنگ لاٹ سے متصل شیڈ میں بیٹھے ہر آنے جانے والی گاڑی کو تکتے رہتے۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کی اور شیڈ تلے بچوں کی تعداد کم سے کم ہوتی چلی جاتی۔ کبھی، کبھی تو ڈاکٹر نجیب کو آنے میں اتنی دیر ہو جاتی کہ شیڈ تلے بس وہی دونوں بیٹھے رہ جاتے۔ ڈیوٹی ٹیچر ناک بھوں

چڑھانے لگتی۔ مین گیٹ پر تعینات چوکیدار دور سے آوازیں لگاتا۔

''کیا بات ہے بچوں آپ کے ابو دیر سے کیوں آنے لگے ہیں؟''

اس سوال کا جواب تو انہیں ان کے بار، بار پوچھنے کے باوجود باپ سے بھی نہیں مل سکا تھا۔ انتظار کرتے وہ روہانسے ہو جاتے۔ ڈاکٹر نجیب آتے تو نہ پہلے کی طرح انہیں ہگ کرتے نہ ان کے بیگ سنبھالتے، اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے وہ بچوں سے کہتے۔

''بیٹھو بھئی جلدی بیٹھو...... مدحت کو بھی لینا ہے ابھی۔''

''پاپا... آپ دیر سے کیوں آتے ہیں'' اریب منہ بنا کر کہتا۔

''صرف تمہی کو نہیں لینا ہوتا اور بھی کام ہوتے ہیں مجھے۔'' ڈاکٹر نجیب ناگواری سے کہتے۔

''پہلے بھی تو کام ہوتے تھے آپ کو...... پہلے تو آپ جلدی آجاتے تھے۔'' عفت پھولے، پھولے لہجے میں کہتی۔

ڈاکٹر نجیب کے پاس اس اعتراض کے جواب میں خاموشی ہوتی۔

مدحت الگ اپنے کالج میں صبر آزما انتظار سے زچ ہوئی بیٹھی ہوتی۔ وہ اپنا بیگ سیٹ پر پھینک کر منہ پھلائے گاڑی میں بیٹھتی۔

''اتنی دیر کیوں ہو جاتی ہے آپ لوگوں کو۔'' گھر پہنچتے تو ندرت فکر مند ملتی۔ ڈاکٹر نجیب آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کرتے۔

''پہلے بھی یہی شہر تھا، یہی سڑکیں، یہی ٹریفک...... پہلے تو آپ کو اتنی دیر کبھی نہیں ہوتی تھی۔'' ندرت رساں لہجے میں کہتی۔

''جاؤ جا کر ان بینکوں سے پوچھو جنہوں نے ایک، ایک گھرانے کو چار، چار گاڑیاں سود پر دے دی ہیں، جسے دیکھو گاڑی نکالتا ہے اور سڑک پر چلا آتا ہے...... پھر تو یہی ہوگا ناں...... میں تو خود اتنا بیزار ہو جاتا ہوں ان لوگوں کی وجہ سے مجھے اسپتال کے دس کام چھوڑ کر اٹھنا پڑتا ہے۔ سوچتا ہوں انہیں ڈرائیور ہی پک اینڈ ڈراپ کر دیا کرے تو اچھا۔''

''نہیں پاپا نہیں۔'' بچے ایک آواز ہو جاتے۔

''ڈرائیور کے ساتھ نہیں۔'' باپ کی بڑی گاڑی میں آنا جانا انہیں ڈرائیور کے ساتھ چھوٹی گاڑی میں آنے جانے سے زیادہ اچھا لگتا۔

''تو پھر برداشت کرو...... دیر تو ہوگی۔''

چھٹی والے دن بیوی، بچوں کے ساتھ کہیں باہر آنے جانے کے معمول سے بھی ڈاکٹر نجیب کو اب دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چھٹی والے دن وہ اسپتال کے کام نمٹانے کے لیے گھر سے نکل جاتے۔ نور جہاں ... ڈیوٹی پر ہوتی۔ آیا ڈاکٹر نجیب کے لیے چائے بناتی مگر ان کے کمرے میں چائے نور جہاں خود لے کر جاتی۔ اپنے گھر سے وہ ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ پکا کر بھی لاتی۔ جسے ڈاکٹر نجیب بڑے شوق سے تناول کرتے۔

اسپتال میں ڈاکٹر نجیب اور نور جہاں کی روز افزوں قربت پر چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نجیب کے لیے اسپتال کے ملازمین کی نگاہوں میں اب وہ پہلا سا احترام نہیں رہا تھا۔ نور جہاں کی بے حیائی دیدنی تھی۔ وہ خوب بن سنور کر ڈیوٹی پر آتی۔ رات کو اسپتال سے واپسی پر ڈاکٹر نجیب اسے ایک طے کردہ مخصوص مقام سے اپنی گاڑی میں بٹھاتے اور اس کے گھر تک چھوڑتے۔ راستے میں کسی ایسی جگہ رک کر جہاں کسی شناسا کے مل جانے کا امکان نہ ہوتا، دونوں باہر کھاتے پیتے بھی تھے۔

نور جہاں ایک طلاق یافتہ جوان عورت تھی..... طلاق کے بعد وہ اپنے والدین کے گھر میں رہ رہی تھی۔ اس سے چھوٹی دو کنواری بہنیں اور ایک بھائی بھی اس گھر میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر نجیب سے نور جہاں کے تعلقات اس کے گھر والوں سے پوشیدہ نہیں تھے بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اس کے والدین اور بہن بھائی اس معاملے

میں تو اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نجیب ان کے گھر آتے تو سب کے سب خدّام ادب بن کر ان کی پیشوائی کو اٹھ جاتے۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ان کی ایسے مدح سرائی کی جاتی جیسے وہ بادشاہ سلامت ہوں اور باقی سب خوشامدی درباری...... ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب کہتے ان سب کا منہ نہ سوکھتا...... نور جہاں اور ڈاکٹر نجیب کو جان بوجھ کر تخلیہ فراہم کیا جاتا اور نور جہاں اپنی عیارانہ اداؤں سے انہیں یوں لبھاتی کہ ڈاکٹر نجیب بھول جاتے کہ ان کے گھر میں ایک ایسی وفا شعار عورت ان کی واپسی کی منتظر بیٹھی تھی جس نے شوخ رنگ ملبوسات پہننا اور بننا سنورنا محض اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ اپنے پستہ قامت، بے ڈول اور کریہہ الصورت شوہر کے مقابلے میں حور نہ دکھائی دے۔ اب یہ اور بات تھی کہ اس کی اس احتیاط کے باوجود بھی وہ پہلوئے لنگور میں حور ہی دکھائی دیتی تھی۔

گھر واپسی پر جب ندرت جو اُن کے انتظار میں خود بھی بھوکی بیٹھی ہوتی تھی۔ کھانا میز پر لگواتی تو وہ تھکن کا بہانہ کر کے آنکھیں موند کر بستر پر پڑ جاتے، آنکھیں کھول کر بیوی سے نظریں ملا بھی کیسے سکتے تھے۔

''بیچارے تھک جاتے ہیں۔'' ندرت کو ڈاکٹر نجیب پر ترس آنے لگتا۔

لیکن آخر کب تک...... بات ایک دن کھل ہی گئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نجیب کسی کانفرنس میں شرکت کا کہہ کر اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ ندرت کو ایک انجانے نمبر سے فون کال موصول ہوئی۔ فون کال کرنے والے مرد نے بتایا۔ ڈاکٹر نجیب کسی کانفرنس میں نہیں بلکہ اپنے اسپتال کی ایک نرس کو ساتھ لے کر دادِ عیش دینے بیرونِ شہر گئے تھے۔ ندرت کے ہاتھ پیروں سے جان جاتی رہی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ اپنے شوہر پر تو اسے خود اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اعتماد تھا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' ندرت کے دل نے کہا۔

لیکن پھر اسی دل میں وہم آنے لگے۔

ڈاکٹر نجیب کے معمولات میں تبدیلی ایک فلم کی طرح اس کے ذہن کے پردے پر چلنے لگی۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔

ڈاکٹر نجیب کے اسلام آباد قیام کے دوران ندرت نے ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ اس میں اسے خود اپنی توہین محسوس ہوتی تھی۔ اس جیسی خوب صورت، باوفا اور باحیا بیوی کو چھوڑ کر کسی غیر عورت کے ساتھ اس کے شوہر کا گلچھرے اڑانے نکل جانا اس کی اپنی ذات کی توہین نہیں تو پھر کیا تھی۔

''آپ اسلام آباد کس کے ساتھ گئے تھے؟'' ڈاکٹر نجیب کی واپسی پر اس نے پوچھا۔

''دو تین ڈاکٹرز تھے۔'' ڈاکٹر نجیب نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''میری طرف دیکھیے......!'' وہ ان کے رو برو آ کھڑی ہوئی۔

''ہاں...... کیا بات ہے؟'' وہ اسے دیکھنے لگے مگر ان کی نظریں زیادہ دیر اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکیں اور جھک گئیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، میں آپ سے کیا کہوں......'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ڈاکٹر نجیب نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''مجھے کسی نے فون کیا تھا۔''

''کس نے؟'' وہ بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''کوئی مرد تھا...... شاید آپ کے اسپتال ہی کا کوئی آدمی ہو...... وہ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کسی کانفرنس میں نہیں...... اسپتال کی کسی نرس کے ساتھ اسلام آباد گئے ہیں۔''

''اچھا ہوا تمہیں پتا چل گیا۔'' وہ گمبیر لہجے میں بولے۔

ندرت کو یوں لگا جیسے اس کے قدموں تلے سے

زمین نکل گئی تھی اور آسمان پھٹ کر سر پر آگرا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتی وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔''

ندرت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں پھاڑے سکتے کے عالم میں وہ ڈاکٹر نجیب کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اس کے منہ سے فلک شگاف آہ نکلی۔ یہ آہ ایسی دردناک تھی کہ تینوں بچے گھبرا کر اپنے، اپنے مقام سے وہاں آکھڑے ہوئے جہاں ڈاکٹر نجیب ایک مجرم کی طرح منہ چھپائے کھڑے تھے اور ندرت دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپے بلک، بلک کر رو رہی تھی۔ تینوں بچوں کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''کیا ہوا؟''

مدحت ماں کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا پاپا؟ ماما رو کیوں رہی ہیں؟'' عفت نے باپ سے پوچھا۔ اریب بھی ماں کو کبھی باپ کو دیکھ رہا تھا۔

''بتائیں ناں، ماما کیوں رو رہی ہیں؟'' عفت نے دوبارہ اور نہایت بے تابی سے پوچھا۔ ڈاکٹر نجیب نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور منظر سے نکل گئے۔

☆☆☆

حیات کا منظر یکسر بدل گیا۔

ڈاکٹر نجیب نے ندرت کو طلاق دے دی۔ یہ ان کی دوسری بیوی کا مطالبہ تھا۔ ندرت کو ڈاکٹر نجیب کا گھر چھوڑنا پڑا۔ تینوں بچے اس کے ساتھ تھے۔ چھوٹا سا یہ بے خانماں قافلہ ندرت کے ماں، باپ کے گھر آٹھہرا...... تینوں بچے دم بخود تھے۔ آناً فاناً زندگی کتنی بدل گئی تھی۔

''تم لوگوں کو خرچا ملتا رہے گا۔'' ڈاکٹر نجیب نے مدحت کو فون کر کے کہا۔

''تھینک یو پاپا......'' مدحت نے نہایت تلخی سے کہا۔ ''ہم آپ کے بھجوائے ہوئے خرچے کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔''

اس بے خانماں قافلے میں مدحت نے سب سے پہلے ہمت پکڑی۔

''آپ پریشان نہ ہوں ماما...... میں جاب کرلوں گی۔'' اس نے ماں کو تسلی دی۔

''نہیں بیٹا...... تم اپنی تعلیم مکمل کرو...... تمہیں ابھی کیا جاب ملے گی۔'' ندرت نے کہا۔ ''جاب میں کروں گی...... تم نہیں۔''

''نہیں...... آپ جاب نہیں کریں گی۔'' مدحت یک لخت بلک، بلک کر رونے لگی۔

''اوکے...... اوکے۔'' مدحت کے بلک، بلک کر رونے سے ندرت کا دل کٹنے لگا۔

''میں کالج اس لیے بھی نہیں جانا چاہتی کہ اپنی فرینڈز کو کیا بتاؤں گی۔'' مدحت نے کہا۔

''بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' ندرت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جب میں خود کالج آؤں، جاؤں گی تو میری فرینڈز پوچھیں گی تو سہی کہ تمہارے پاپا تمہیں پک اینڈ ڈراپ کیوں نہیں کرتے۔''

''کوئی بھی بہانہ کر دینا۔''

''نہیں ماما...... میں اب کالج نہیں جاؤں گی۔''

''پڑھائی ادھوری چھوڑ دو گی؟''

''پرائیویٹ پڑھوں گی...... اور جاب کروں گی۔''

''نامکمل تعلیم کے ساتھ تمہیں جاب کیا ملے گی میری جان۔''

''کچھ بھی...... کچھ بھی کرلوں گی ماما۔''

زندگی میں اس یک لخت تبدیلی سے عفت تینوں بچوں میں سے سب سے زیادہ متاثر تھی۔ ندرت نے اسے اور اریب کو اسکول آنے جانے کے لیے وین کا بندوبست کیا تو پہلے ہی دن گھر واپس آکر عفت نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے اور صاف اعلان کر دیا کہ وہ وین میں اسکول نہیں جائے گی۔

''اسکول نہیں جاؤ گی تو پڑھو گی کیسے؟'' ندرت نے سمجھایا۔

''مجھے نہیں پڑھنا۔''

''کیوں؟''

''بس......''

ندرت کا خیال تھا وقت کے ساتھ عفت بھی اس صدمے سے نکل آئے گی اور مدحت کی طرح ہمت پکڑ لے گی مگر عفت نہایت کمزور ثابت ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمت پکڑنے کے بجائے وہ گم صم رہنے لگی۔ لوگوں کا سامنا کرنے سے گھبراتی، رات کو بستر پر اکیلی نہ سوتی۔ اس کی خواہش ہوتی کہ ماں کے سینے میں منہ دبکا کر سوئے۔ جب کسی باعث ماں کو اس کے پاس سے اٹھنا پڑتا تو وہ دونوں ٹانگیں سمیٹ کر پیٹ سے لگا لیتی اور اپنے بازوؤں کو ٹانگوں کے گرد کس کر باندھ لیتی۔ نیند میں بار، بار ڈرتی رہتی۔ تاریکی سے خوف زدہ ہوجاتی گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتی...... گھر ٹوٹنے کے اس پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اس نے کتابوں سے یکسر منہ موڑ لیا تھا۔ پڑھنے کو کہا جاتا تو رونے بیٹھ جاتی...... یہ وہ لڑکی تھی جو اپنے اسکول میں ہمیشہ ''ٹاپر'' رہی تھی۔

عفت نے اسکول جانا چھوڑا تو ندرت نے اریب کو بھی گھر کے نزدیک ہی ایک ایسے اسکول میں داخل کرادیا۔ جہاں کے مصارف بھی پچھلے اسکول کی طرح زیادہ نہ تھے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ عفت اور اریب کی سابقہ اسکول میں تعلیم ندرت نے اپنے بہن بھائیوں کے مالی تعاون پر جاری رکھنے کا ارادہ کیا تھا ورنہ وہ اتنا خرچ کہاں سے اٹھا سکتی تھی۔ اور پھر اسے یہ امید بھی تھی کہ مدحت کو سمجھا بجھا کر وہ خود کسی اسپتال میں ملازمت کرلے گی۔ آخر ایک سند یافتہ نرس تو تھی ناں وہ......

لیکن عفت کی نفسیاتی کیفیت کے پیشِ نظر اسے اب اپنا ملازمت کرنا بھی دشوار لگتا تھا۔ وہ تو روز بروز گم صم ہوتی چلی جارہی تھی۔ کبھی، کبھی تو ندرت کو ڈر سا لگنے لگتا کہ کہیں وہ چپ رہ، رہ کر بالکل ہی گم نہ ہو جائے۔ اکثر نفسیاتی امراض کی ابتدا یونہی تو ہوا کرتی ہے...... کوئی سانحہ...... کوئی حادثہ، کوئی ناپسندیدہ اور ناگہانی صورتِ حال...... عفت کو اس وقت اس کی ہمہ وقت موجودگی کی اشد ضرورت تھی۔ تنگدستی سہی جا سکتی تھی مگر عفت کو نفسیاتی خلجان میں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اسے اس وقت مضبوط جذباتی سہارے کی ضرورت تھی اور یہ سہارا اسے اس کی ماں کے مہربان ہاتھ ہی فراہم کر سکتے تھے۔

☆☆☆

مدحت نے ایک ایڈور ٹائزنگ ایجنسی میں ریسپشنسٹ کی جاب کرلی تھی اب وہ پہلے کی طرح لاابالی اور آرام پسند نہیں رہی تھی۔ ٹاپ اور ٹائٹس پہننے اور دوپٹے سے، بے نیاز رہنے والی مدحت اب شلوار قمیص اور کُرتا، پاجامہ پہننے لگی تھی گھر سے باہر نکلتے وقت اس کے سر پر اسکارف اور شانوں پر دوپٹا ہوتا، اس نے جان لیا تھا، زندگی سدا سکھ ہی نہیں دیتی دکھ بھی دیتی ہے۔ ماں، باپ کی علیحدگی اور ایک ہنستے بستے گھر کا اجڑنا اس کی زندگی کا ایسا حادثہ تھا جس نے اسے برسوں آگے لے جا کھڑا کیا تھا۔ اب وہ بڑوں کی طرح سوچتی تھی، انہی کی طرح رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی بات بے بات ہنسنے کی عادت داستانِ پارینہ بن گئی تھی۔ اب تو اس کے چہرے پر ہمہ وقت گمبھیر سی سنجیدگی دکھائی دیتی۔ البتہ بہن کو مورل سپورٹ دینے کی خاطر وہ اس سے ضرور ہنسی مذاق کرنے کی کوشش کرتی۔ بھائی کا مورال ہائی رکھنے کو وہ ہر جتن کرتی...... ندرت کے لیے اس کڑے وقت میں یہ بڑی بیٹی بہت بڑا جذباتی سہارا بن گئی تھی۔ اپنی پہلی تنخواہ جب اس نے ماں کے ہاتھ میں دی تو ندرت کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

''اوہ ماما......'' مدحت نے ماں کا سر اپنے سینے سے یوں لگا لیا جیسے وہ ماں تھی اور ندرت بیٹی۔

''کبھی سوچا بھی نہیں تھا... میں نے کہ یوں ہو گا۔'' ندرت کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''کم آن ماما...... جب وہ وقت نہیں رہا تو یہ بھی نہیں رہے گا۔'' مدحت نے ماں کو دلاسہ دیا۔
ندرت اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟'' مدحت مسکرائی۔
''دیکھ رہی ہوں کہ برے وقت نے میرے بچوں کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔'' ندرت نے دل گرفتگی سے کہا۔
''اچھا ہی بنا دیا ہے ناں...... مضبوط اور پریکٹیکل......'' مدحت نے ماں کا دل رکھنے کی کوشش کی۔
''دوسروں کے گھر اجاڑنے والی عورتیں یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اس ایک مرد کے ساتھ کتنے رشتے اور ان رشتوں کی کتنی خوشیاں بندھی ہوں گی...... کیا بگاڑا تھا ہم نے اس عورت کا جو اس نے مجھ سے میرا شوہر اور تم تینوں سے تمہارا باپ چھین لیا۔''
''بھول جائیں ماما کہ آپ کا کوئی شوہر اور ہمارا کوئی باپ تھا۔'' مدحت نے اپنا بازو ماں کے شانے پر دراز کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔
''بہت کوشش کرتی ہوں میری جان مگر...... نہ میں تمہارے باپ کو بھلا سکتی ہوں نہ اپنے گھر کو......''
''انشاء اللہ ہم اس سے بھی اچھا گھر بنائیں گے۔'' مدحت بولی۔
''اس شخص کو کہاں سے لائیں گے بیٹا جو ہماری زندگیوں کا مرکز و محور تھا۔ تمہیں پتا ہے صبح جب میں نیند سے جاگتی تھی تو میری خواہش ہوتی کہ میں سب سے پہلے تمہارے پاپا کا چہرہ دیکھوں۔''
''آج ایک بات بتائیں...... بتائیں گی ناں......؟'' مدحت نے اپنی بانہیں ماں کے گلے میں حمائل کر دیں۔
''اگر بتانے والی ہوئی۔'' ندرت کے لہجے میں مشروط کیفیت تھی۔
''آپ کو تو بہت اچھے، اچھے رشتے مل سکتے تھے۔ آپ نے پاپا جیسے کالے کلوٹے آدمی سے شادی کیوں کی؟''
''کیونکہ وہ بہت اچھے تھے...... مجھے پرپوز کرتے وقت انہوں نے اپنی اصل حیثیت مجھ سے نہیں چھپائی...... صاف بتا دیا کہ وہ انتہائی غربت سے اٹھ کر اپنی محنت سے اس مقام تک پہنچے ہیں۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ وہ غریبوں اور ناداروں کے ہمدرد تھے۔ بہت سی خوبیاں تھیں ان میں۔ انہوں نے شادی کے بعد میرا اتنا خیال رکھا کہ مجھے وہ اس دنیا کے سب سے خوب صورت انسان دکھنے لگے تھے...... وہ بہت اچھے تھے بیٹا اور شاید ہمیشہ اچھے ہی رہتے اگر شیطان نے انہیں اپنے جال میں نہ پھانس لیا ہوتا...... میں قرآن مجید کی تفسیر میں پڑھ رہی تھی کہ شیطان اپنی جس کامیابی پر سب سے زیادہ نہال ہوتا ہے وہ ہے میاں، بیوی میں جدائی ڈالنا۔''
''شیطان نہیں شیطانی کہیے ماما۔''
''شیطان روپ بدل، بدل کر آتا ہے میری جان۔''
''بھول جائیں ماما......''
''کیسے......؟''
''پاپا کو۔''
''یہ دکھ تو ساری حیات ساتھ چلے گا بیٹا......'' ندرت کی آنکھوں میں جل تھل مچ گئی۔
''ہمیں پاپا کو یہ دکھانا ہے کہ ہم ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور خوش بھی۔''
''ہماری زندگی سے کسی شخص کے نکل جانے سے سفر تو نہیں رکتا میری جان...... سارے کام چلتے ہیں...... سورج بھی اسی طرح نکلتا ہے، چاند بھی ویسے ہی روشنی بکھیرتا ہے...... ہم کھاتے پیتے بھی ہیں...... ہنستے بولتے بھی ہیں...... بس دل پہلے کی طرح نہیں رہتا۔''
''دل بھی ویسے ہی دھڑکتا ہے ماما جی۔''
''مگر دل کی ہر دھڑکن درد میں ڈوبی ہوتی ہے میری جان......'' ندرت کی آواز بھرا گئی۔ ''گھر ٹوٹنے اور طلاق کے نہ جانے کتنے قصے سنے اور پڑھے تھے۔ لیکن جب اپنے اوپر بیتی تو معلوم ہوا کہ ایک

عورت کے لیے اس سے بڑا تو دوسرا کوئی صدمہ ہی نہیں کہ اس کا گھر ٹوٹ جائے...... شوہر اس کا نہ رہے کسی اور کا ہوجائے...... تمہارے پاپا نے اس عورت سے شادی کرلی تھی گوارا...... مگر اس کے کہنے پر مجھے تو نہ چھوڑتے...... میں ساری عمر اُن کے نام پر ہی بیٹھ کر گزار دیتی۔“

ندرت سسک سسک کر رونے لگی۔

”آپ دیکھیے گا وہ بھی خوش نہیں رہے گی...... اس کا گھر بھی ٹوٹے گا۔“ مدحت کے لہجے میں تلخی تھی۔

☆☆☆

عفت کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگا مگر بالآخر وہ نارمل ہوگئی۔ اسے بھی اریب کی طرح گھر کے نزدیک واقع ایک اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ اولیول کے بجائے اب اسے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ مدحت بھی ملازمت کے ساتھ پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھی۔

ندرت کو ڈاکٹر نجیب کی بے مہری پر حیرت ہوتی۔ عورت سے مرد کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے اولاد سے تو نہیں...... کیسا باپ تھا وہ جسے بچوں کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی بھی توفیق نہ ہوتی تھی۔ ایسا کوئی دور دراز فاصلہ بھی نہیں تھا۔ ایک ہی شہر تھا، شہر کے راستے بھی شناسا سا، ایسی بھی کیا بے مروتی کہ انسان اپنی اولاد ہی سے لاتعلق ہوجائے۔ مانا کہ شروع میں مدحت کا رویہ ان کے ساتھ درشت رہا تھا مگر اس کے دل کو چوٹ لگی تھی۔ درشت ہونا فطری تھا، گھاؤ لگانے والے کو تو پوچھنا لازم تھا۔

ندرت کو اس عورت کی سفاکی پر بھی ملال ہوتا...... وہ خود بھی تو ڈاکٹر نجیب سے شادی کرنے سے قبل اپنے پہلے شوہر سے طلاق یافتہ تھی۔ کیا اسے اس دکھ کا احساس نہیں تھا جو اس نے دوسری عورت کو دیا تھا۔ شوہر تو چھینا ہی گھر بھی اجڑوادیا اور بچوں کو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم کردیا۔

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ندرت کو اپنا گھر اجڑنے کا غم اندر ہی اندر کھوکھلا کیے دیتا۔ رات کو سوتے میں آنکھ کھل جاتی تو دھیان اپنے اجڑے گھر کی طرف ہی جاتا۔ ندرت کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ آس پاس سوئے بچوں کے چہروں پر نظر پڑتی تو آنکھیں بھر آتیں۔ کس ناز و نعم میں پلے بچے

تھے جو سختیاں جھیل رہے تھے۔ مدحت صبح کی نکلی شام کو تھکی ماندی گھر واپس لوٹتی مگر ماں کو حوصلہ دینے کی خاطر مسکراتی ہوئی۔ عفت جو باپ کی گاڑی سے محرومی کے بعد اسکول وین میں سفر کرنے سے پہلے ہی دن ہراساں ہو کر گھر لوٹی تھی اور اسکول جانے سے انکار کر دیا تھا اب پیدل ہی اسکول آتی جاتی۔

اریب بیچارہ تو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تفسیر بن گیا تھا۔ ندرت کو اس پر سب سے زیادہ ترس آتا۔ لاکھوں ماہانہ آمدن والے باپ کا بیٹا پیٹھ پر بھاری بستہ لادے جوتے گھسیٹتا اسکول آتا جاتا...... باہر کے سارے کام اسی پر تھے۔ کبھی سودا سلف لینے بھاگا جا رہا ہے تو کبھی کاپی، کتاب خریدنے، کبھی ماں کے لیے درد کی گولی تو بہنوں میں سے کسی کے لیے اس کی ضرورت کی کوئی شے۔

بچوں کی چھوٹی، چھوٹی محرومیوں پر ندرت کا دل چپکے، چپکے خون کے آنسو روئے جاتا۔

بہت کڑا وقت تھا۔ مگر ڈاکٹر نجیب کو کیا پروا...... وہ تو اپنی دوسری بیوی اور اس کے بطن سے جنم لینے والے دو جڑواں بیٹوں میں مگن تھے۔

☆☆☆

وقت کڑا ہو یا سہل گزر ہی جاتا ہے۔ ندرت نے بھی بچوں کے ساتھ برا وقت گزار لیا تھا۔

مدحت نے ایم فل کیا تھا۔ اور اب وہ ایک نیوز چینل سے وابستہ تھی۔ اسی چینل میں کام کرنے والے ایک انجینئر سے اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ ایک بیٹا تھا جس کی سب سے بہترین دوست اس کی بوڑھی مگر گریس فل نانی تھی۔

عفت بینکار تھی۔ اس کی شادی اپنے ماموں کے بیٹے سے ہوئی تھی جو ایک ملٹی نیشنل ادارے میں ملازم تھا۔ عفت کے دو بچے تھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی......

مدحت کبھی کبھی مذاق میں اس سے کہتی۔ ”تم مجھے سپر سیڈ کر گئی ہو۔“

”بھئی آپ بھی دو بچے کر لیں ناں......“ عفت مسکرا کر کہتی۔

”سوچوں گی۔“

اریب ابوظہبی میں تھا۔ اس نے مکینیکل میں انجینئرنگ ڈپلوما کے بعد ایک آئل ریفائنری سے وابستگی اختیار کی اور موقع ملنے پر ابوظہبی چلا گیا۔ اس کی شادی ندرت نے اپنی ہی ایک سہیلی کی بیٹی سے کی تھی۔ ابوظہبی میں اریب کی ملازمت چونکہ آئل فیلڈ پر تھی اس لیے بہو، ندرت کے ساتھ ہی رہتی۔ اریب کو ملازمت میں جلدی، جلدی چھٹی ملنے اور گھر جانے کی سہولت حاصل تھی لہٰذا وہ جتنا وقت وطن سے دور آئل فیلڈ پر گزارتا اتنا ہی وقت وطن میں اپنی فیملی کے ساتھ بھی گزارتا۔

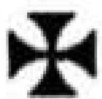
کڑا وقت گزر گیا تھا مگر اپنے نشان ندرت کے دل پر چھوڑ کر...... ڈاکٹر نجیب نے بچوں سے اپنا تعلق برسوں بعد استوار کرنے کی کوشش کی تھی مگر وقت بدل چکا تھا۔ کبھی انہیں بچوں کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی توفیق نہیں تھی اب بچوں کو ان کی طرف دیکھنے کی حاجت رہی تھی نہ فرصت......

☆☆☆

کچھ عرصہ پہلے ایک کار ایکسیڈنٹ میں ڈاکٹر نجیب کی دوسری بیوی سے ان کے دونوں بیٹے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے...... ندرت کو کسی شناسا نے بتایا۔ ڈاکٹر نجیب کی بیوی کا دماغی توازن جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر نجیب بھی بہ مشکل خود کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

ندرت کو اپنا گھر اجاڑنے والی عورت کی گود اجڑنے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی ملال ہوا۔

خدا ہر کس و ناکس کو مکافاتِ عمل سے بچائے۔



مجھے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ خواب ایک خودرُو پودے کی طرح ہوتے ہیں جہاں نہ اگنا ہو وہیں اگ جاتے ہیں بنا چاہے بنا مانگے وہ روشنی بھر دیتے ہیں آنکھوں میں کہ آس پاس کے سب منظر دھندلاتے جاتے ہیں۔ نوچ کر پھینکنا بھی چاہیں ان خوابوں کو تو ان کی جڑیں ہماری آنکھوں سے ہوتی ہوئی دل، جسم اور روح تک اتر چکی ہوتی ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج تک آنکھیں بند

مرہم سے آگ لگ جائے

سیارا جپوت



کیے بیٹھی ہوں' وہ کہتا ہے میرے ساتھ رہو، میری دنیا دیکھو مگر میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کی بات کا اور میری خاموشی کو وہ کبھی بے وفائی کہتا ہے کبھی خود غرضی اور کبھی انا...... مگر میں اسے کبھی سمجھا ہی نہیں پائی کہ اسفند رضا خان تم نے میری زبان تک چھین لی ہے مجھ سے۔ میں مہر النسا آفندی جسے اپنے جذبوں کی سچائی پر یقینِ کامل تھا آج بے بس ہوں، ہار گئی ہوں اسفند رضا خان تمہارے سامنے۔ کہیں پڑھا تھا کبھی کہ محبت، اعتبار کا رشتہ ہے مگر مجھے لگتا ہے...... محبت کو ضرورت ہے اعتبار کی نہ وفا کی......

کوئی وفا کرے، جفا کرے، عذاب دے یا خواب دے محبت تو بس بھاگتی رہتی ہے محبوب کے پیچھے دیوانہ وار، مجھے یاد ہے جب اس نے کہا تھا کہ سوچ لو اچھی طرح...... تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو یا نہیں تب اس کا یہ وار مجھے یہ سمجھا گیا کہ میں ہمیشہ یک طرفہ محبت میں ہی معجزہ ڈھونڈتی رہی۔

اس جملے کے بعد کہ سوچ لو، بس ''سوچ لو'' کی ہی بازگشت تھی میرے ہر طرف اور میں یہی سوچتی رہی کہ اسفند رضا خان کیا اب سوچنے کا وقت باقی ہے؟ زندگی کے بارہ سال تمہارے نام پر روتے' بلکتے، تڑپتے ہوئے کاٹنے کے بعد اب میرے پاس سوچنے کی گنجائش ہے۔

جس سے محبت ہوتی ہے اسے ہم کسی اور کا ہوتا دیکھ نہیں سکتے اور یہ بات اسفند کبھی سمجھ نہ سکا۔

''کسی اور کے ساتھ وقتی رہنے سے میں کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔ میں صرف تمہارا ہوں مہر النسا کیوں پریشان ہو۔ ہونے دو جو ہوتا ہے، کر لینے دو تقدیر کو اپنے فیصلے۔'' اور میں شاکڈ ہوجایا کرتی تھی اس کی باتوں سے، اس کی اس نام نہاد محبت سے...... شاید محبت غلط نام دیا تھا میں نے اس کے جذبوں کو، محبت کی شدت اور نوعیت بدل بھی جائے مگر محبت میں محبت ختم نہیں ہوتی۔

''بتاؤ مہر النسا تمہیں مجھ پر اعتبار ہے ناں؟'' یہ ایک ایسا سوال ہوتا تھا جسے اسفند رضا خان بہت تاک کر داغ دیا کرتا تھا اور میں جلدی سے ہاں میں جواب دیا کرتی کہ کہیں میرا دماغ میرے دل کے فیصلے پر حاوی نہ ہو جائے یا شاید میں خود بھی نکلنا نہیں چاہتی تھی اس سحر سے مگر کب تک...؟

سامنے والے کے ہاتھ میں ایسی دودھاری تلوار تھی کہ ہر ضرب کاری تھی، ہر بار میری محبت ڈھال بنی اور وہ محبت کی ڈھال بھی اسفند نے ہی بنائی تھی پھر اس نے وہ ڈھال مجھ سے چھین بھی لی۔ میرے مسیحا نے زہر دیا مجھے خود اپنے ہاتھوں سے اور میں پی گئی۔

''مجھے جانے دو اسفند...... اپنی دنیا سے دور، میں تمہیں کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی، آنکھ سے اوجھل رہوں گی تو سنبھال جاؤں شاید......''

''تم مجھ سے دور ہو کے جی سکتی ہو؟ مر جاؤ گی تم میرے بنا، میں مقروض ہوں تمہاری محبت کا......''

مرے یہ سود رے والا حساب تھا اس کا......

''اگر تمہیں پتا ہے اسفند کہ میں مر جاؤں گی تمہارے بنا تو پھر کیوں کر رہے ہو ایسا...... کیوں کر رہے ہو یہ شادی...... پلیز رحم کرو مجھ پر، کیا تم میری جگہ دے سکتے ہو کسی اور کو......؟''

کتنا عجیب لگتا ہے ناں جب ہم اس انسان سے رحم مانگیں جس نے جینا سکھایا ہو، محبت سکھائی ہو، دل کو دھڑکنا سکھایا ہو۔

میں ہمیشہ کہتی رہی کہ خواب راس نہیں ہیں میری آنکھوں کو...... پر وہ اسفند تھا، اسفند رضا خان جسے فاتح کہلانے کا جنون تھا جسے حاکمیت کا شوق تھا۔ اپنی پوروں سے میری بند پلکوں کو نیم وا کیا اور خواب بھر دیے میری آنکھوں میں، وہ خودرو پودا جسے آبیاری کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر پھر بھی اسفند نے اپنے پیار سے آباد رکھا۔

میں نہ اسفند کے آفس سے استعفیٰ دے سکی نہ اسے شادی سے روک سکی کہ مفتوح لوگوں کے بس میں ہوتا ہی کیا ہے۔ پہلے پہل تو وہ مرہم رکھنے کے لیے

ہی یہ کر رہا تھا مگر...... ایسے مرہم کا کیا فائدہ جس سے زخم گہرا ہو جائے۔

آج سے ایک سال پہلے جب اسفند نے اپنی منگنی کی خبر مجھے سنائی تب میں اپنے اور اس کے درمیان کے اس نادیدہ فاصلے کو ڈھونڈنے لگی جس نے اسے منگنی تک پہنچا دیا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا مگر فاصلہ تھا ہی کب؟ اس کے کھانے، پینے، سونے جاگنے ڈریسنگ کرنے تک کی روٹین میرے حافظے میں مقید ہے۔ آج تک پھر وہ کون سا پل تھا اور کتنا طویل تھا کہ جس میں اسفند تم نے کسی اور کو اپنانے کا کسی اور کو میری جگہ دینے کا، میرے خواب کسی اور کی آنکھوں میں بھر دینے کا فیصلہ کیا؟

''کیوں اسفند کیوں؟ تمہیں کیا حق ہے کسی اور کو میری جاگیر سونپ دینے کا؟''

''میں تمہارا ہوں مہر، صرف تمہارا کوئی اور اگر میرے گھر زبردستی آجائے تو کیا وہ مالک بن جائے گا میرے دل کا؟ میرے دل میں صرف تم ہو۔'' اس کا بدلتا لہجہ جانے کیا داستان سنا رہا تھا۔

''میں نے تمہارے پاس آنے سے پہلے خدا سے مدد طلب کی کہ مجھے وہ اتنی ہمت دے تاکہ میں تم پر اپنا آپ واضح کر سکوں۔ اور خدا نے تو دیکھو میری مدد بھی کر دی۔'' وہ بالکل نارمل تھا۔

''میں اس سے شادی نہیں کروں گا مہر...... صرف گھر والوں کے دباؤ میں ہوں کسی طرح منا لوں گا انہیں بس تم میرا ساتھ دو، مجھ سے رابطے ختم نہ کرو، پلیز تم ساتھ ہو تو میں دنیا تسخیر کر سکتا ہوں۔''

مگر نہ ہی اسفند کسی کہانی کا ہیرو تھا نہ ہی میں اتنا ظرف رکھتی تھی کہ اسفند کو اس کی ہونے والی بیوی کے ناز نخرے اٹھاتے دیکھ سکتی۔

میرے ساتھ رہنے پہ دنیا تسخیر کرنے والا آج اپنی دنیا میں مگن اور مطمئن ہے، اسے مطمئن دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی مجھے...... محبت میں نارسائی کا جو دکھ مجھے رات دن کاٹ رہا تھا اس کی ہلکی سی کسک بھی اسفند کی آنکھوں میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

''اسفند آہیں عرش تک جاتی ہیں، تمہیں ڈر نہیں لگتا؟'' اندر کی عورت سے بحث کرتے کرتے تھک کر میں نے صرف ایک بار کہا۔

''اگر تمہاری آہ میں اتنی شدت ہے مہر تو ان جذبوں کو دعاؤں میں بدل دو ناں......''

میں ایک بار پھر لاجواب ہو گئی تھی اس کے سامنے، واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ دل سے نکلی دعا عرش تک کیوں نہیں جا رہی، کیا میری محبت میں کوئی کھوٹ ہے؟ نہیں قطعی نہیں......

ہم انسان اگر رب کی رضا میں راضی ہو جائیں تو ہم یوں محبتوں کا احتساب ہی نہ کریں، میں اس محبت کا احتساب کرنے بیٹھ گئی جس میں، میں تیرہ سال سے جل رہی تھی۔

کہتے ہیں ناں...... جس سے محبت ہو اسے کچھ کہنا نہیں پڑتا، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر میں یہ محبت کے سارے فلسفے سارے قصے جھٹلا کے کسی بھی طرح اس تک اپنی محبت پہنچانا چاہتی تھی۔

مگر وہ اسفند تھا، اسفند رضا خان جس نے... مہرالنسا آفندی کو کبھی بولنے نہیں دیا، وہ بس آنکھوں سے محبت لٹاتا اور میں ڈھیر ہو جاتی ہمیشہ اس کی مان کر اس کی جان لیوا محبت جو ہر طرح کی زیادتی پر اتر آئی تھی اور میں اس کے آگے سرنڈر کر دیتی۔ اور ہر بار وہ ایک نئی آزمائش لے کر میرے سامنے آجاتا۔

''سوچ رہا ہوں منہ دکھائی میں گفٹ کیا دوں اپنے عمر بھر کے ساتھی کو۔'' یہ بات کہہ کر اسفند نے مجھے یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو تمہیں چوٹ تو نہیں لگی مہر......؟

پھر میں اسے کیا بتاتی کہ جب کوئی عورت بظاہر مضبوط ہونے کا دعویٰ کرنے لگے تو سمجھ جاؤ کہ وہ بری طرح ٹوٹنے والی ہے۔

اور اس رات میں ایک پل نہ سو سکی، نیند تو ویسے بھی نصیب میں نہیں تھی مگر اس رات جتنا غبار تھا دل

میں سب اپنے پروردگار کے سامنے نکال دیا۔

پھر اس رات جیسے مجھے راستہ مل گیا، کہیں پڑھا ہوا ایک جملہ جس پر میں سختی سے کاربند رہنا چاہتی تھی ”......اپنی محبت کو آزاد چھوڑ دو اگر وہ تمہارا ہے تو کبھی پرواز نہیں کر سکے گا۔“

☆☆☆

اور یوں زندگی ایک داغ بن گئی پھر وقت کے ساتھ زخم بھرے نہیں ابھرتے چلے گئے۔ ”تم کچھ زاد راہ ہی ساتھ کر دیتے اسفند... واپسی کا سفر اتنا مشکل ہوگا یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ میں نے اسفند سے چھپنے کے لیے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا اور اسے بنا بتائے ٹرین میں سوار ہوگئی۔

آج مجھے کائنات کی ہر شے اپنی بربادی کی سازش میں شامل لگ رہی تھی یہاں تک کہ میں خود جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھا کرتی تھی، میں نے بھی خود کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں کبھی آنکھ بند نہیں کرسکی مگر اسفند تو اسفند تھا بند اور کھلی آنکھوں میں زبردستی گھس آنے والا، مجھے اپنے آس پاس دکھائی دیتا تھا، ہنستا، بولتا، چلتا، پھرتا، لڑتا جھگڑتا، ہر بات منواتا، ہم گھنٹوں باتیں کرتے......ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہی منظر تھے جو اسفند کے ساتھ سفر طے کرتے وقت ایک سرخوشی کا عالم ہوا کرتا تھا۔ چھوٹی، چھوٹی ہزار خوشیاں اور یادیں تھیں، وہ اب ہمراہ تھیں مگر وہ نہیں تھا جس نے سانس لینی سکھائی تھی۔

”مہر تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔“

”تم اس آواز کو سلامت دینا۔“

”اپنی سانس بھلا میں خود کیسے روک سکتا ہوں۔“ میں کبھی سمجھ نہیں سکی اس کے معنی خیز جملے......اسفند کے اس خود غرضانہ فیصلے نے مجھ سے مانگا بھی تو کیا...... تو کیا اس نے اپنی اصل محبت پانے کے لیے میرا استعمال کیا تھا، یہ ایسا زخم تھا جس پر خود اسفند بھی ساری زندگی مرہم لگاتا رہتا تو بھی نہ بھرتا جوجگہ وہ پلوشہ کو مسز اسفند رضا خان بنا کے دے چکا تھا وہ آسمانوں پہ شاید درج تھا اور آسمانوں کے فیصلے کوئی بدل نہیں سکتا مگر تب میں اپنے مالک کی رضا پہ حیران تھی اگر پہلے ہی راضی ہو جاتی اپنے رب کی رضا میں تو یہ نارسائی کا دکھ ساتھ نہ ہوتا آج اور کاش کہ وہ بھی کبھی کہتا...... ”مجھے نیند نہیں آتی مہر، میں ویران ہو، میں ڈھونڈتا ہوں تمہیں۔“ مگر وہ کہہ نہ سکا بلکہ وہ شاید ایک نئی محبت ' نئے ہمسفر کا نیا لطف حاصل کر چکا تھا۔

یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ میں نے اسفند کی نظروں سے اس کی دنیا سے دور جانے کا فیصلہ کرلیا، کتنا کچھ کرواتی ہے ناں محبت؟ میں جو محبت دیکھنا چاہتی تھی اسے پانے کے لیے مجھے اسفند سے دور ہونا پڑا، میں تمہیں اور پلوشہ کو ساتھ دیکھ کر بھی تو لہولہان تھی مگر تم یہ بھی سمجھ نہ سکے۔ میں گاؤں واپس آکے دُہرے عذاب سے گزر رہی تھی، نہ تمہیں دیکھ سکتی ہوں نہ سن سکتی ہوں مگر ایک سلسلہ عذاب کا چل نکلا ہے میں ٹوٹنے لگی ہوں اس گاؤں سے بھی تو اسفند کی یادیں جڑی تھیں۔

اس روز بارش ہو رہی تھی زوروں کی جب کال کر کے اسفند نے کہا کہ ”میں آرہا ہوں مہر یہ بارش تمہارے ساتھ انجوائے کروں گا“ اور ہم محبت گزیدہ لوگ تو بند آنکھوں سے ہی پیروی کیا کرتے ہیں محبوب کی باتوں کی......میں واحد لڑکی نہیں ہوں اسفند کی وجاہت کے سامنے اوندھے منہ گرنے والی، میں اس مسحور زدہ اکثریت کا حصہ تھی جو کچھ نہیں کرسکی اپنے دفاع میں۔

اونچا قد کاٹھ، تیکھے نقوش، صاف رنگت، روشن پیشانی، جیل سے پیچھے کیے گئے سیاہ بال، عمدہ نفیس ٹوپیس، سوٹ بلاشبہ وہ بلا کا ہینڈسم تھا۔ آج تک میں خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی رہی خود کو اور شاید آج بھی اندر چھپی بیٹھی اسفند کی ”مہر“ خود پر نازاں ہے کہ دھوکے میں ہی سہی ملی تو سہی اسفند کی محبت...... مجھے وہ

کوئی آسمانوں سے اترا دیوتا ہی لگا وہ دیوتا جس نے صرف درد اور زخم دیے تب بھی میں اسے مسیحا ہی مانتی رہی کہ میرے ہر درد کا مداوا صرف اسفند ہی کرسکتا ہے تو وہ ہی مسیحا ہوا ناں......اب مسیحا کب رحم کرتا ہے یہ دیکھنے میں آگئی ہوں اپنے گھر واپس کہ اگر وہ محبت پوجنے کے لائق ہے تو میرے دل کی عبادت گاہ میں ضرور آئے گا واپس آئے گا مگر یہ انتظار شاید اس کی واپسی تک میری جان لے لے گا۔

''میں نے جب ، جب یاد کیا تب ، تب تم بِنا بلائے ہی چلے آئے کیسے جان لیتے ہو؟''

''میں تمہارے اندر ہی تو رہتا ہوں مہر، کان لگائے بیٹھا رہتا ہوں کہ کب تم آواز دو' میں حاضر ہوجاؤں۔'' میرے تصور میں اس کی آواز ابھرتی۔

''میں بھی خدا سے یہی دعا مانگتی آئی ہوں کہ اگر ہم ایک نہ بھی ہوسکے تو بھی یہ رابطہ، یہ محبت کبھی ختم نہ ہو کہ محبت وہ منہ زور آندھی ہے جو خود بنالیتی ہے سارے رابطے، سارے سلسلے، سارے وسیلے......''اور میں نے ٹھیک ہی کہا اگر محبت ہوتی اسفند کو مجھ سے تو وہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا ناں مجھ تک آنے کا۔

اگر مجھ تک نہیں آسکے تم تو کم سے کم اس راستے پر ہی کھڑے رہتے جو مجھ تک آتا تھا؟ مگر تم نے وہ پگڈنڈی وہ راستہ ہی بدل لیا۔

اپنے جملہ حقوق کسی اور کے نام کردیے؟ ہم ایک دریا کے دو کنارے بھی تو بن سکتے تھے؟

☆☆☆

انسان ہمیشہ وہ ہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ اسفند سب پر یکساں مہربان ہے، میں اس کے انداز کو اپنے لیے محبت سمجھتی رہی، میں وقت کے ایک تیز دھارے میں بہہ کر دور ہوچکی تھی اس سے۔

☆☆☆

میں اسفند رضا خان اس زعم میں تھا کہ کسی بھی لڑکی کو چٹکیوں میں پگھلا سکتا تھا مشرقیت اور پارسائی کا

یہ بچے

میری رہائش آرمی کالونی میں تھی۔ قریب ہی بڑی ہمشیرہ اور ماموں زاد بھائی بھی رہتے تھے۔ سو یہ سوچ کر ہی کرایے پر یہ جگہ حاصل کی تھی کہ ایک تو محفوظ علاقہ دوسرے اڑوس پڑوس نیک اور دیندار لوگ تھے۔ رمضان کے مہینے میں افطاری کا بلاوا تقریباً روز ہی آتا۔ اگر نہ جاتی تو بھانجا خود لینے آجاتا، خالہ ...چلیں سب آپ کا انتظار کررہے ہیں، ان کے بچے بھی مجھے روز دیکھنے کے عادی تھے۔ ایک روز افطاری سے ذرا پہلے چلی گئی کہ کچھ ہاتھ ہی بٹالوں گی کام میں...... باہر ہمشیرہ کا پوتا سائیکل چلا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''ابھی کھانا پک رہا ہے۔'' میں ہنسے بغیر نہ رہ سکی اور اندر جاکر اس کی بات سنائی سب خوب ہنسے...... کچھ روز بعد ہماری خالہ زاد بہن کا انتقال ہوا تو تین روز تک وہاں جانا پڑا۔ گھر میں ہمارے بارے میں کسی نے پوچھا کہ آج خالہ نظر نہیں آرہیں تو جواب آیا کہ ''آج وہ کہیں اور گئی ہوئی ہیں۔'' کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا تھا یہ سن کر......اب میں یہ قصہ اسے سناتی ہوں تو خوب ہنستا ہے، ماشاء اللہ اب وہ آٹھویں کلاس میں ہے۔

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

لباس اوڑھے کسی بھی دوشیزہ کے دل میں سونامی برپا کرسکتا تھا۔

مہر النسا کو پروپوز کرنے سے پہلے میں جانتا تک نہیں تھا جسے میں صرف جیتنا چاہتا ہوں وہ میری زندگی بن جائے گی۔ مجھے تو تب بھی پتا نہیں چلا جب میں نے اسے کسی انعام کی طرح جیت کر ایک طرف رکھ دیا اور اِک نیا کھیل کھیلنے چل پڑا۔ ہاں میری شادی بھی تو صرف ایک کھیل ہی تھی جو میں نے خود اپنے ساتھ کھیلا...... مجھے لگا کہ ایک سیدھی سادی لڑکی اپنے ماں، باپ کی مرضی سے لا کر سرخرو ہوجاؤں گا دنیا اور خدا کی نظر میں کہ میں اپنے والدین کا فرماں بردار ہوں مگر مہر النسا آفندی میری روح میں بس چکی تھی۔ میرے دن رات کو وہی ترتیب دے رہی تھی۔ میرے اندر باہر کے موسم بدل چکی تھی وہ بلکہ مجھے جینا سکھا چکی تھی وہ...... میں نے اپنے دل اپنی روح کے سارے معاملات اسی کو سونپ رکھے تھے پر آج اس سجے سجائے گھر کے اس عالیشان حجلۂ عروسی کے درودیوار مجھ پر آن گرے تو میں نے جانا کہ میں تو دراصل اسے کھو چکا ہوں میں۔ سمجھتا رہا کہ میں مرد ہوں، سنبھل جاؤں گا...... مگر مہر النسا؟ وہ واقعی سچی محبت کر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

میں نے زندگی سے بس یہ ہی سیکھا ہے کہ محبت، خوشی اور توجہ کے لیے ترسے ہوئے لوگ جان بوجھ کر دھوکا کھاتے ہیں شاید محبت کے دھوکے میں بھی انہیں تسکین ہوتی ہے جن سے کچھ پل وہ جی لیتے ہیں، میں نے بھی اس زندگی سے تھک کر آنکھیں بند کرلیں اور آج وہ سب باتیں سامنے نظر آرہی ہیں جو اسفند کی موجودگی میں نظر نہیں آتی تھیں۔

جب وہ آیا میری زندگی میں تب اپنے نام کی عینک پہنا دی تھی اس نے مجھے سب کچھ ویسا ہی دکھائی دیتا رہا جو اسفند دکھاتا رہا۔

مجھے یاد ہے تب بھی بہت سی باتوں پر میں خاموش لبوں اور خشک آنکھوں سے روئی، دل چیخ، چیخ کر کے اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں بہت تکلیف میں ہوں...... مگر اسفند مقابل سے ایسے قوتِ گویائی چھین لیا کرتا تھا گویا اس کی زبان ہی نہ ہو......

کاش آج وہ سامنے آجائے تب میں رو، رو کے اسے بتاؤں کہ کتنی تکلیف ہوئی تھی جب اس نے اپنی منگیتر کا بتایا تھا۔

اب کئی سال ہوگئے اس کی آواز سنے مگر آس اب بھی باقی ہے کہ کبھی وہ آئے اور یہ کہے کہ مجھے بھی تمہاری طرح درد ہورہا ہے، مہر النسا میں بھی نارسائی اور ہجر کا دکھ اٹھا رہا ہوں۔ میرے اندر کی بہت حقیقت پسند لڑکی آج بھی آئینہ لیے میرے سامنے کھڑی چیخ، چیخ کر کہہ رہی ہے کہ محبت میں جانے والوں کی واپسی تو ممکن ہے مگر جہاں محبت ہی نہ ہو وہاں انتظار کیسا......؟ میں یہ حقیقت سن تو سکتی ہوں مگر قبول ہرگز نہیں کرسکتی۔

میں آج بھی آنکھیں بند کیے اسی دنیا میں ہوں جو اسفند نے دکھائی تھی۔ مجھے اس بات کا تو سکون ہے کہ میرے جذبے سچے تھے۔ عشقِ حقیقی میں نیت صاف ہونی چاہیے تو عشقِ مجازی میں بھی نیک نیتی کا دخل ہوتا ہے۔ اگر جذبوں میں، نیتوں میں سچائی ہو تو رائگاں ایک آنسو بھی نہیں جاتا......

میرا ہجر، میرے رت جگے، میرے دکھ، میرا صبر کچھ رائگاں نہیں جائے گا اس لیے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسفند کی اس قدر کھلم کھلا بے وفائی کے باوجود میری محبت آج بھی اسے بس ایک نظر دیکھنے کو بے چین ہے...... مجھے یقین ہے کہ آج بھی وہ ایک بار آکر مجھے ضرور پکارے گا اور میں سب گلے شکوے بھول کے اس کے قدموں میں بیٹھ جاؤں گی کہ اس نے وعدہ کیا تھا۔

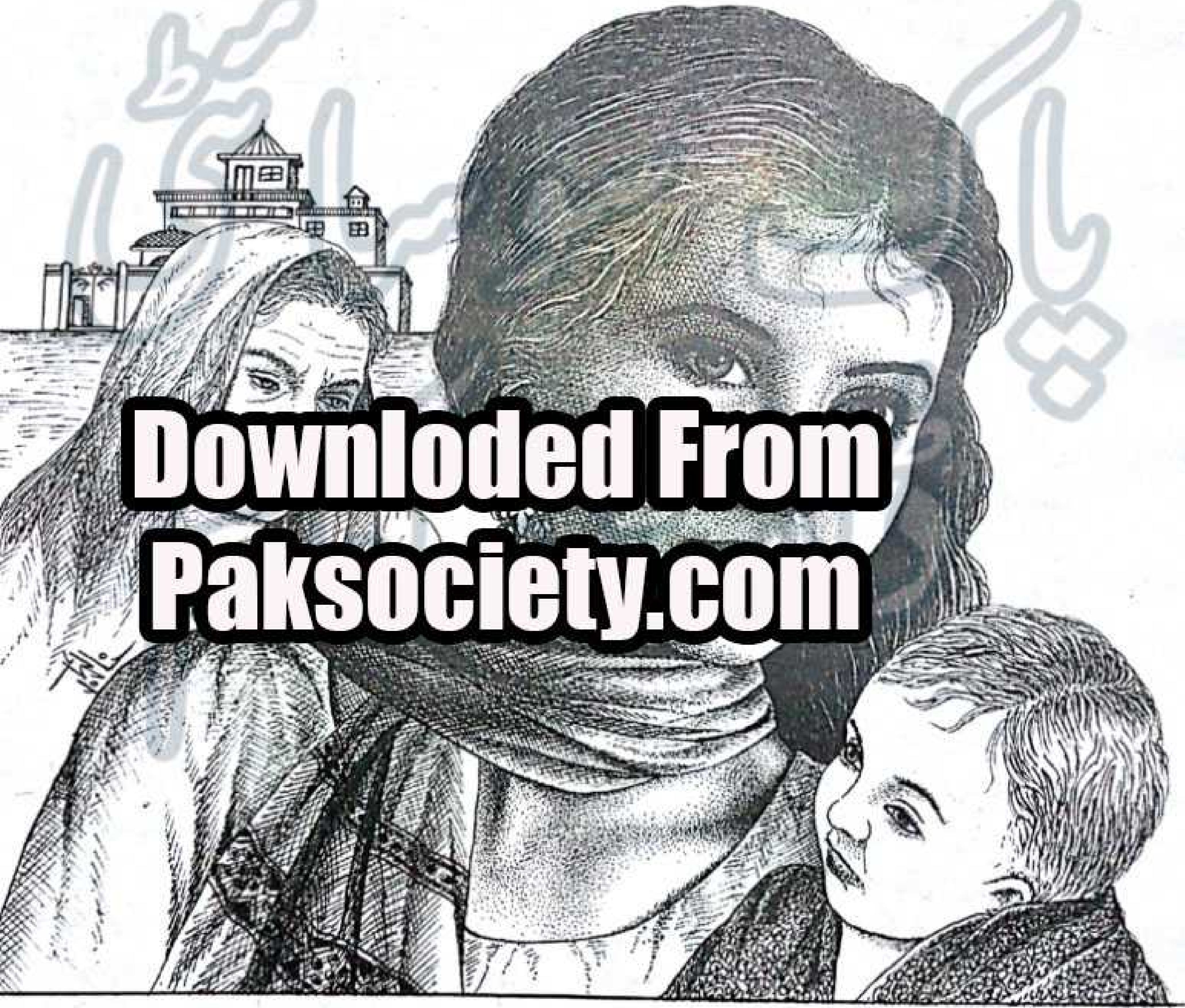
''مہرو میرا انتظار کرنا، میں ضرور آؤں گا۔''

بے شک وہ آئے گا تو ضرور لیکن میری لحد سجانے......



ایک وعدہ ایک پیغام

فرحین اظفر



ثانیہ تیسری بار امید سے تھی۔

ہونٹ لٹکا کر اور منہ حد درجے بسور کر اس نے سب سے پہلے یہ خبر اپنے میاں کے بعد اپنی ماں جائی کے سامنے بریک کی۔ ردِعمل انتہائی توقع کے مطابق تھا۔ وہ بری طرح بل کھا کر رہ گئی۔

"کیوں...... میں پوچھتی ہوں کیوں ثانیہ، اب کیا ضرورت پیش آگئی تم کو یہ سب کھڑاک پھیلانے کی۔" بس نہیں چلتا تھا کہ سر ہی پیٹ لے۔

"میں نے کون سا جان بوجھ کے......" وہ پہلے ہی روہانسی ہو رہی تھی۔

’’اچھا یہ جان بوجھ کے نہیں تو پھر......‘‘

اس شدید ٹینشن میں بھی وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکی اور حلق سے بے اختیار قہقہہ ابل پڑا۔

بات پر غور کرنے کے بعد رانیہ بھی کچھ جھینپ سی گئی۔مگر اگلے پل......

’’تمہیں دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ تمہیں کوئی پریشانی ہے۔‘‘ اس نے سر سے پیر تک طنزیہ نظروں سے ثانیہ کو گھورا......ثانیہ کے مسکراتے لب فوراً ہی سکڑ کر لٹکی ہوئی پوزیشن میں واپس آگئے۔

’’رانی......!‘‘امی کی تنبیہی آواز پر دونوں باادب، باملاحظہ سی ہو گئیں۔

’’کیوں بیچاری کی جان کھا رہی ہو...... پہلے ہی اس کا آدھا خون تو جل ہی چکا۔‘‘فضا میں قورمے کے سالن کی بھنی ہوئی خوشبو پھیل رہی تھی۔ثانیہ بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ابکائی لیتی ہوئی واش روم کی سمت بھاگی۔

’’جی اور باقی کا کریں گی اس کی ساس...... وہ خون خشک نہیں کریں گی بلکہ خون پی جائیں گی۔‘‘وہ تاسف سے دھیمی آواز میں بول کر واش روم کی طرف گھورنے لگی۔ جہاں سے ثانیہ کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔امی ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔

☆☆☆

کوئی ایک مسئلہ ہوتا تو ٹھیک تھا مگر...... یہاں تو مسئلے ہی مسئلے تھے۔

سب سے پہلے تو اس کے شوہر دانیال کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ تیسرے بچے کے اخراجات بحسن وخوبی برداشت کر سکتا...... بہت ہی محدود وسائل و آمدنی کے ساتھ۔لامحدود مسائل اور روز افزوں ترقی کرتی مہنگائی میں تنخواہ کب ہاتھ میں آتی اور کب پُھر ہو جاتی...... پتا ہی نہیں چلتا تھا۔اس کے لیے گھر کے تمام اخراجات پورے کرتے ہوئے ثانیہ کی دواؤں اور خوراک کا خیال رکھنا ایک بے حد مشکل مرحلہ ہوتا...... اوپر سے دوران زچگی ثانیہ کی حالت بھی بہت خراب رہتی...... بلڈ پریشر کے نخرے نہیں ملتے تھے...... چکر آئے دن کے مہمان بن جاتے......اور الٹیاں الگ بے حال کیے رکھتیں......اور ان سب کے ساتھ، ساتھ کبھی کبھی سر درد کی شکایت بھی جاری رہتی۔آئے دن ڈاکٹروں کے چکر لگتے......آدھی تنخواہ دواؤں پر اٹھ جاتی......پھر بھی ثانیہ پورے نو مہینے حال سے بے حال رہتی......

اور دواؤں کا پورا کرتے، کرتے دانیال کی جیب اتنی ہلکی پڑ جاتی کہ پھل اور دودھ جیسی ضروری چیزیں بہت سوچ سمجھ کر لائی جاتیں......اور اس کے ساتھ، ساتھ دونوں بچے بھی ترس جاتے۔

لیکن ان سب سے الگ سب سے بڑا اور لاینحل مسئلہ اس کی ساس تھیں...... جن کے بارے میں اس کا اور رانیہ کا خیال تھا کہ ان کا خمیر کریلے کی بیل کی جڑ سے اٹھایا گیا ہے۔

مزاج میں اس قدر تلخی اور کڑواہٹ اور گفتگو اس قدر طنزیہ کہ ثانیہ قسم کھا کر کہتی تھی۔اتنی بداخلاق اور...بدمزاج خاتون اس نے اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھی تھی...... اور نہ آئندہ دیکھنے والی تھی...... اور اللہ دکھائے بھی نہیں......دانیال ان کا اکلوتا بیٹا تھا......کوئی بہن نہ بھائی...... وہ خود بڑے چاؤ سے ثانیہ کو بہو بنا کر لے کر گئی تھیں...... مگر چند دن گزرنے کے بعد ہی جیسے انہوں نے خود پر کسی مہربان پری کا سا جو خول چڑھا رکھا تھا وہ اتار پھینکا۔

’’دنیا کی ہر ساس بہو میں تو، تو میں، میں ہوتی ہے، پھر بھی ہر خوشی غمی کے موقع پر تمام ساسیں اور بہویں اپنی آپس کی رنجشیں بھلا کر ایک ہو جاتی ہیں۔مگر یہ پتا نہیں کیسی ماں ہیں...... اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے ہی دو میٹھے بول، بول لیں...... یا کم سے کم پوتے، پوتیوں کو پیار تو کریں......وہ تو ان کا اپنا خون ہیں۔‘‘ وہ بولتے، بولتے روہانسی ہو گئی۔

’’اے ہئے......تو کیا تمہارے بچوں کو بھی بالکل پیار نہیں کرتیں؟‘‘امی کو تعجب ہوا۔

’’نہیں، کرتی تو ہیں مگر صرف دانی کے سامنے دو لمحے کے لیے......بس۔‘‘اس نے منہ بنایا۔

''بات یہ ہے بیٹا کہ وہ احساسِ عدم تحفظ کا شکار ہیں، ایک ہی ان کا بیٹا ہے، انہیں ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا ہوگا کہ کہیں تم اُن سے اُن کی اولاد کو چھین نہ لو....'' امی نے اپنی سمجھ کے مطابق ایک ''ماں'' کی نفسیات بیان کی۔

''لیکن امی...... ایک بیٹے کے نزدیک اس کی ماں بہت اہمیت رکھتی ہے، خصوصاً بیوہ ماں اور پھر بیٹا بھی اکلوتا...... انہیں کیوں ڈر لگتا ہے۔ میں ان کے بیٹے کو ان سے چھینوں تو نہیں گی ناں...... میں تو انہیں بڑھاپے میں آرام دینا چاہتی ہوں۔ ان کی خدمت کرنا چاہتی ہوں.....'' وہ آنکھوں میں الجھن بھر کے معصومیت سے بولی۔

''ہوسکتا ہے ان کے سسرال والوں کا رویہ جوانی میں اور بیوگی کے بعد ان کے ساتھ بہت خراب رہا ہو.....اس لیے وہ اتنی سخت مزاج ہوگئی ہوں۔''

''سخت مزاجی اور بات ہے اور کسی کی تضحیک یا تذلیل کے لیے حد سے گزر جانا اور بات......اور اگر وہ اپنے بیٹے کے دور ہو جانے سے ڈرتی ہیں تو وہ یہ خیال کیوں نہیں کرتیں کہ ان کے منہ سے میری برائیاں سن سن کر دانی بھی ان سے بد دل ہو سکتے ہیں۔'' وہ کسی طور پر مطمئن ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

''صبر کرو اب تم......بس اور کیا کہوں بیٹا......گھر کی بزرگ ہیں وہ...... زیادہ سے زیادہ کتنے دن جی لیں گی......بزرگوں کے دم سے ہی گھر میں برکت ہوتی ہے۔''

امی نے ایک اچھی ماں کی طرح اسے ہمیشہ والی صبر کی نصیحت کی اور وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ ثانیہ کو بے اختیار ان کی زبان سے نکلے کوسنے یاد آگئے۔

یہ سچ تھا کہ ثانیہ کی ساس دنیا کی سخت ترین ساسوں میں شمار ہوتی تھیں۔ عام دنوں میں بھی وہ طرح، طرح کے پھیلاوے پھیلا کر ثانیہ کا کام بڑھاتی رہتی تھیں۔ اور ایسی حالت میں تو انہیں جانے کون، کون سے اور خاص طور پر اوپری منزل سے جڑے بھولے بسرے کام یاد آنے لگتے۔

بھاری، بھاری وزنی سامان اٹھوانا...... بار بار پورے گھر اور کونوں کھدروں خصوصاً چھت کی صفائیاں، دھلائیاں، راتوں کو دیر تک جگا کر ٹانگیں دبوانا...... مالشیں کروانا......ان کے معمول کا حصہ بن جاتے۔

عام دنوں میں وہ اپنے کپڑوں، بستر اور الماری کو ثانیہ کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں......اور یوں اسے دور بھگا دیتیں جیسے اسے کوئی چھوت کی بیماری ہو...... مگر اس کی زچگی کا پتا چلتے ہی ان کے پیروں اور کمر میں سوئے ہوئے درد جاگ اٹھتے۔ برسوں پرانے پتے اور گردے کی پتھری کے آپریشن والے ٹانکے دکھنے لگتے...... اور وہ ثانیہ کو کولہو کے بیل کی طرح کام میں جوت کر خود بستر سے لگ جاتیں۔

پہلی دونوں بار میں بھی ڈاکٹر نے کام کی زیادتی کے باعث آخری دنوں میں اسے بیڈ ریسٹ بتایا اور یہ بیڈ ریسٹ اس کے بجائے اس کی ساس نے انجوائے کیا۔

اب بھی ثانیہ کو نہ اپنی طبیعت کی فکر تھی نہ خرچوں کی......صرف اور صرف اس ساسو ماں کا خیال بھوت کی طرح حواسوں پر سوار تھا۔

دانیال رات میں اسے گھر واپس لے جانے آئے تو اس کی شکل شدید فکر کے مارے عجیب سی ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا......کیا طبیعت خراب ہے......؟'' دانی نے کئی بار اسے دیکھ کر پوچھا۔

بس نفی میں سر ہلا کر رہ گئی...... دانیال سے کیا کہتی......ان ہی سے ان کی ماں کی برائی کرنا اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا اور فائدہ بھی کیا تھا...... دانیال خود ہر بات سے واقف تھے......اور ماں کی زبان کے آگے بے بس بھی...... ذرا جو کبھی اُن کے فضیحتے کے جواب میں آرام سے کوئی صفائی یا وضاحت دینے کی کوشش بھی کرتے تو اماں کی توپوں کا رخ خود انہی کی طرف مڑ جاتا......اور وہ ان کے ایسے لتے لیتیں کہ انہیں کان ہی دبانے پڑ جاتے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ہر وقت ہی انگارے چباتی ہوں......کبھی، کبھی مسکراتی بھی تھیں...... اور ثانیہ کبھی

کوئی نیا جوڑا اوڑھ پہن کرانہیں دکھاتی تو دھیرے سے مسکرا کر ماشاءاللہ بھی کہہ دیتیں...... ناشتا، کھانا، چائے خاموشی سے کیڑے نکالے بغیر کھالینا بھی ان کے مزاج کی بہتری کی طرف اشارہ کرتا...... محلے والیوں سے بھی اچھی علیک سلیک تھی۔

مگر بات یہی تھی کہ جب زخم لگانے پر آتیں تو زبان سے ہی روح تک میں شگاف ڈال دیتیں۔ کبھی بے حد ٹھنڈے لہجے میں اتنی آگ لگاتی ہوئی بات کرتیں کہ ثانیہ تڑپ کررہ جاتی مگر کہہ نہ پاتی۔

کبھی اسے لگتا اس کی ساس فطرتاً ہی خراب ہیں...... اچھی بننا بھی چاہتی ہیں تو زیادہ دیر تک نہیں بن پاتیں...... وہ خراب تھیں یا نہیں...... مگر وہ خود فطرتاً بہت نرم تھی۔ حساس دل رکھنے والی اور ہر ایک کا خیال کرنے والی۔

ان کی خدمت میں اپنی طرف سے اس نے کوئی کوتاہی نہیں چھوڑی تھی۔ دانیال کے سامنے اور نہ ہی پیٹھ پیچھے انہیں کبھی جواب دیا۔ شاید...... یہی وجہ تھی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کا رویہ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

''جلدی گھر کو نہیں لوٹا جاتا تم لوگوں سے۔''

ابھی صرف رات کے دس ہی بجے تھے...... مگر وہ عشا کے بعد سو جانے کی عادی...... نیند میں سے اٹھ کر دروازہ کھولنے آئیں تو ظاہر ہے خاموشی گناہ جیسی تھی۔

''یہ مہارانی تو چلو اپنے اوپر ٹوٹنے والے ظلم وستم کی داستانیں سنانے جاتی ہے تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا ہوگا...... پر تجھے تو ہوش کرنا چاہیے۔''

انہوں نے ہمیشہ کی طرح ایک بے تکی مگر سلگتی ہوئی بات کی۔ ثانیہ خون کے گھونٹ پیتی سوتی ہوئی بچی کو سنبھالتی کمرے میں چلی گئی۔ تھکن اتنی تھی کہ جی تو چاہتا تھا کہ فوراً بستر پر پڑ جائے مگر وائے ری قسمت...... ابھی وہ اپنی بیٹی کو لٹا کر کمر بھی سیدھی نہیں کر پائی تھی کہ اماں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس کے انگڑائی کے لیے اٹھے ہوئے بازو فضا میں ہی معلق ہو کر رہ گئے۔

''گھوم پھر آئیں مہارانی...... اور بھاڑ جھونکنے کے لیے یاد آگئی ماں......''

وہ کمرے کے سامنے سے گزر کر کچن کی طرف جارہی تھیں...... دھیرے سے دروازہ کھول کر دانیال اندر داخل ہوئے۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کہ ذرا چائے دے دیں، سر میں درد سا ہو رہا ہے۔'' وہ شرمندہ سے تھے۔

ثانیہ کا جی چاہا اپنا سر پیٹ ڈالے۔

''کیا ضرورت تھی آپ کو ان سے کہنے کی۔'' مارے بے بسی کے اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

''میں نے سوچا تم تھکی ہوئی ہو تو......'' شاید انہیں خود بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ اماں سے کہہ کرانہوں نے غلطی کردی ہے۔

ثانیہ بڑبڑ کرتی باہر کی طرف لپکی...... اماں کچن میں ماتھے پر بل ڈالے ابھی تک برتن ہی پٹخ رہی تھیں۔ کیتلی دھلی دھلائی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ مطلب کہ ان کا چائے بنانے کا کوئی موڈ نہیں تھا...... اور انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ثانیہ خود ہی چائے بنانے آجائے گی۔

''ارے اماں......! آپ رہنے دیں...... میں بنارہی ہوں چائے......'' اس نے جیسے بھرے ہوئے بارود کو تیلی دکھائی۔

''اے بی بی بس رہنے دو، اس بڑھاپے میں گرم بستر سے نکلوا کر جھونک دیا ساس کو چولھے میں...... اور اب چلی ہیں میاں کی تابعدار بننے...... میں پوچھتی ہوں اتنی دیر سے کمرے میں گھسی تم کیا دروازے سے کان لگا کر کھڑی تھیں کہ کب اماں باورچی خانے میں آئیں اور کب تم یہ ڈراما کرنے نکلو۔''

''نہیں اماں...... خدا نہ کرے کوئی آپ کو چولھے میں کیوں جھونکے۔''

''ہاں شاباش......'' انہوں نے زور، زور سے سر ہلایا اور چائے کی کیتلی کو ہاتھ مار کر اٹھا کر سنک میں پٹخ دیا۔

''اتنی باتوں میں صرف ساس کا چولھے میں جھونکنا ہی یاد رہا...... اور ایک بات تو بتاؤ......'' وہ کیتلی وہیں پٹخ کر پلٹیں...... ثانیہ سر جھکائے آنسو ضبط کر رہی تھی۔

''تمہارے اماں باوا کو اتنا بھی خیال نہیں کہ داماد کو ایک کپ چائے کا ہی پوچھ لیتے۔'' ثانیہ اپنے ماں، باپ پر بات آتے دیکھ کر تڑپ ہی تو گئی۔

''انہوں نے وہاں کہا ہی نہیں تو......''

''اے لو تو یہ کوئی کہنے کی بات تھی...... سچ ہے بھئی...... ایسے بے ڈھنگے لوگ تو دیکھے نہ سنے......'' وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

مقصد پورا ہو چکا تھا...... چائے ثانیہ کو ہی بنانی تھی۔

وہ جلتی کڑھتی چائے کا کپ لے کر کمرے میں آئی تو دانیال خراٹے لے رہے تھے...... اس کا دل چاہا کہ کپ سامنے دیوار پر دے مارے۔

☆☆☆

زندگی ایک دم سے مشکل تر لگنے لگی تھی۔

اماں کا رویہ...... پیسے کی کمی، بچوں پر عدم توجہی اور وقت بے وقت بگڑ جانے والی طبیعت...... صبح سے شام تک کولہو کی طرح جتے رہنے کے بعد بھی کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی جو اماں کا موڈ خراب کر دیتی اور ان کی زبان بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتی...... جب وہ زیادہ جلال میں آتیں...... تو کچن میں رکھی چیزیں پھینکنے لگ جاتیں...... شور شرابے سے دو سالہ رمشہ سہم جاتی۔ وہ اسے بانہوں میں بھر کے پناہ لینے کے لیے بیڈ روم میں چھپ جاتی۔

کبھی مزاج برہم ہوتا تو کھانا کھاتے میں .... دسترخوان سے اٹھ جاتیں...... وہ اور دانیال بلاتے رہ جاتے...... اور وہ جھک، جھک کرتی اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں...... اور کبھی یہاں تک ہوتا کہ اس کا بڑھایا ہوا چائے کا کپ ہاتھ کے جھٹکے سے زمین بوس ہو جاتا...... اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

گھر چھوٹا تھا...... وہ اکیلی کمرے میں اور کبھی دانیال کے سامنے گھٹ، گھٹ کر سسکتی...... کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی آواز اماں تک جائے اور کوئی نیا فضیحتہ کھڑا ہو......

امی کے یہاں بھی مرضی سے جانے کی اجازت نہ تھی...... اسے گھنٹوں اجازت لینے کے خوشامد کرنی پڑتی۔ فون پر بھی امی سے خیر خیریت کے سوا کوئی بات نہیں ہو پاتی۔

ایک بار جب دل بہت جلا ہوا تھا وہ فون لے کر پھپولے پھوڑنے چھت پر چلی گئی...... ذرا دیر بعد اماں نے آ کر جس طرح شک بھری نظروں سے اسے اور پھر آس پاس کی چھتوں کو دیکھا وہ کانپ کر رہ گئی۔

''پہلے تو، تو کبھی اکیلی چھت پر نہیں آئی فون سننے......'' کٹیلے لہجے میں بولتی، وہ دور کہیں کسی چھت پر پتنگ اڑاتے نوعمر لڑکوں کو دیکھ رہی تھیں...... ان کا لہجہ ان کا انداز...... الامان......

وہ اندر تک کٹ کر رہ گئی...... اور پھر کبھی فون کرنے یا سننے چھت کی طرف نہیں گئی۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بھی دونوں بچوں کو ساتھ لے کر جانا پڑتا...... چاہے بائیک پر جانے کے لیے جتنی بھی دشواری اٹھانی پڑے...... کیونکہ اماں کا خیال تھا کہ وہ دونوں میاں، بیوی اکیلے جا کر سیر سپاٹے کرتے ہیں اور بچوں کو ان کے سر پر چھوڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے چند گھنٹوں کے لیے بھی کبھی بچوں کی ذمے داری نہیں اٹھائی تھی۔

ثانیہ سوچتی تو حیران ہی ہوتی...... دنیا کی ساسوں کو اگر بیر ہوتا ہے تو صرف بہو سے...... ورنہ پوتے، پوتیوں کو کون سی دادی نہیں چومتی چاٹتی...... اپنی چھاتی سے لگا کر پروں میں سمیٹ کر رکھتی ہیں...... مگر یہاں تو سارا حساب ہی الٹا تھا۔

☆☆☆

سردی نے شدت پکڑی تو چھ سالہ ارحم کو نزلہ زکام نے جکڑ لیا...... سرخ آنکھیں پانی سے بھری رہتیں...... اور کھانسی الگ...... اوپر سے اس کی اپنی

نازک حالت...... جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔ وہ جیسے دنیا زمانے سے بیزار ہو چلی تھیں۔

''سنیں مجھے امی کے یہاں چھوڑ دیں...... کتنے دن ہو گئے...... گئے ہوئے، رات میں لے آئیے گا۔'' اپنے دکھتے ہوئے سر کو دبا کر وہ دانیال سے بولی۔

''ہم......م...... اماں سے پوچھ لو۔'' اس کا حلق کڑوا ہو گیا۔

''اونہہ...... وہ تو منع ہی کریں گی۔'' دانیال آفس کے لیے نکل رہا تھا۔

''تو پھر کیا کرو گی...... جاؤ، پوچھنا تو ہے ناں...... جانا ہے تو فوراً ریڈی ہو جاؤ۔''

چار و ناچار وہ اٹھی...... اماں کو ابھی چائے دے کر آئی تھی۔ وہ کمرے میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ یکا یک اس کے دماغ میں جانے کیا آیا کہ اس نے امی کے یہاں دعوت کا کہہ دیا۔

''خیر تو ہے یہ اچانک بیٹھے بیٹھائے دعوت کی کیا سوجھ گئی۔''

دو چار باتیں مار کر منہ بنا کر بہ مشکل اجازت مل ہی گئی...... مگر شاداں و فرحاں چند گھنٹوں کی گلو خلاصی لینے والی ثانیہ کو علم نہیں تھا کہ چند گھنٹوں کے ذہنی سکون کے بعد اس کی جان کیسے پھنسنے والی ہے۔

امی کے یہاں کافی سکون سے وقت گزرا، چاہتی تو وہ یہ تھی کہ رانیہ بھی آجاتی مگر وہ اس دن شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ کئی لمحے تو ثانیہ نے اس کی فرصت اور آرام و آزادی پر رشک کرتے ہوئے گزارے...... اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ رہتی بھی سسرال سے الگ تھی...... مگر اس کی ساس، نندیں سب بہت اچھی طبیعت کی تھیں...... تھوڑی بہت چپقلش تو ہر گھر میں ہوتی ہے...... مگر مجموعی طور پر وہ سسرال کے معاملے میں اتنی ماٹھی نہیں تھی جتنی ثانیہ خود کو سمجھتی تھی۔

چند گھنٹے آرام کر لینے سے کون سا اس کی طبیعت بھلی چنگی ہو جانی تھی۔ مگر یہ ہوا کہ تھوڑا سا وقت سکون سے گزرا تو اس کے سر کا درد ختم ہو گیا۔ مزاج میں بہتری آگئی۔

عشا کی اذان کے تھوڑی دیر بعد وہ لوگ گھر پہنچے تو اماں صبح کی بھوکی بیٹھی تھیں۔ ثانیہ کو یقین تو نہیں تھا مگر...... جب وہ بول رہی تھیں تو یقین کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''لاؤ اب جلدی سے نکال کر دو......''

''کیا......؟'' وہ ایک دم سے ہونق ہو گئی۔

''کھانا اور کیا......!'' اماں کی بے نیازی دیدنی تھی۔

''کھانا......؟ لیکن میں تو کھانا نہیں لائی۔''

اس کے ذہن میں دور، دور تک وہ جھوٹ موجود نہیں تھا جو بول کر وہ صبح میکے جانے کے لیے نکلی تھی۔

''لو...... تو اب میں کیا کھاؤں گی...... تمہاری اماں نے تمہاری دعوت کی تھی یا مذاق......؟''

''اوہ......'' یاد آتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''وہ...... بب...... بریانی تھی تو بہت مزے کی لیکن...... ختم ہو گئی وہیں۔''

''اے لو...... ایسا للکا بلکا کھانا بنانے کی کیا ضرورت تھی کہ ایک بندے کی لیے ایک رکابی بھی نہ نکل سکے۔''

ثانیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''اور اتنا خیال نہیں تمہارے ماں، باپ کو...... میں ایک بیچاری بڈھی اکیلی جان اگر بلا نہیں سکتے تھے تو پکا کر بھیج تو سکتے تھے...... کم سے کم...... مگر نہیں بھئی، آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے یہاں تو۔'' اماں نے اسٹارٹ لے لیا اور اس کے سر کے درد نے بھی......

''اماں میں ابھی آپ کے لیے کھانا پکا دیتی ہوں۔'' چکراتے سر کو بہ مشکل تھام کر اس کے لبوں سے نکلا۔

''اے رہنے دو بی بی...... میرے سر پر دونوالوں کا احسان دھرنے کی ضرورت نہیں...... میں کرلوں گی خود ہی کچھ۔''

ثانیہ کو معلوم تھا کہ اب اگر وہ اپنے تن کے سری

پائے بھی پکا کر رکھ دے گی تو بھی ان کی ناک کو لگے گا نہیں...... اور نہ تو وہ خود کھانا پکانے کی زحمت کریں گی، نہ اس کے ہاتھ کا بنا ہوا کھائیں گی۔

عجیب مشکل میں پھنسی تھی اس کی جان...... جبھی باہر دروازے پر کھٹکا ہوا اس نے باہر نکل کر دیکھا تو دانیال کے ہاتھ میں کھانے کے پیکٹ تھے۔

شاید وہ اماں کا واویلا سن کر باہر سے کچھ لے آئے تھے۔

اس نے شکر گزار نظروں سے دانیال کو دیکھ کر اپنے کمرے کی راہ لی۔

☆☆☆

یہ اور اس جیسے کتنے ہی تلخ واقعات صفحۂ زیست پر رقم کرتا وقت کا قلم تیزی سے محوِ سفر رہا اور اس کی ڈلیوری کے دن بالکل نزدیک آگئے۔ اس کے چلنے پھرنے اور کام کرنے میں واضح سستی آگئی تھی۔ آخری ہفتے میں امی نے دونوں بچوں کو اپنے پاس بلوالیا تھا تاکہ کام کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے...... حالانکہ اماں بذاتِ خود کسی اضافی بوجھ کی طرح ہی بن گئی تھیں۔

اس وقت بھی وہ دو گھڑی کے لیے کمرے سیدھی کرنے لیٹی تھی کہ کچن میں کھٹ پٹ ہونے لگی۔ کچھ دیر تک تو وہ یونہی لیٹی رہی...... پھر ایک دم خیال آیا۔ اماں نے پانی گرم کرنے کے لیے کہا تھا۔

اماں کے کام میں تاخیر کا مطلب ان کے قہر کو آواز دینا تھا...... وہ حتی المقدور کوشش کر کے تیزی سے باہر نکلی تو اماں اپنے کمزور جسم کے ساتھ گرم پانی کا دیگچا اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ چکی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا۔

وہ چھت پر بنے غسل خانے میں نہا کر باہر نکلتیں اور دھوپ میں بیٹھ جاتی تھیں۔ گوکہ وہ نیچے سے نہا کر بھی اوپر جاسکتی تھیں...... مگر وہی پریشان کرنے والی عادتیں...... ثانیہ انہیں جاتا دیکھ کر ہول سی گئی...... اماں کوئی بہت بھاری بھرکم جثے والی عورت نہ تھیں...... منحنی سے وجود پر گرم کھولتے پانی سے بھرا دیگچا لے کر سیڑھیاں چڑھتی اماں کی حالت اب گریں کہ جب گریں جیسی ہی تھی۔

''اماں...... اماں...... رکیں میں آتی ہوں...... میں لے جاتی ہوں آپ مت......'' اپنی حالت کو نظر انداز کر کے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر درمیانی چبوترے تک پہنچی...... جہاں اماں دیگچا زمین پر رکھ کر اپنی کمرے پکڑے کھڑی تھیں۔

''اے رہنے دو...... تم سے کہیں تو بے غیرت ہو جائیں پر تمہاری نیندیں پوری نہ ہوں...... ایسے ہو چکے کام ہمارے...... خود کرلیں گے ہم۔'' اسے آتا دیکھ کر وہ تیزی سے دیگچا اٹھانے جھکیں...... جس میں سے تھوڑا سا پانی چھلک کر سیڑھیوں پر بہہ گیا تھا۔

دعا

دعا کے بارے میں میرا اپنا تجربہ، مشاہدہ اور یقینِ کامل ہے کہ خلوصِ دل سے نکلی ہوئی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ قبولیت انسان کی مرضی کے مطابق ہو یا اللہ کی رضا کے مطابق......

جو خوش قسمت اور صابر اور شاکر لوگ اپنی خواہشات اور مرضی کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع رکھتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہوتی ہیں اگر ان کی دعا اُن کی خواہش کے مطابق پوری ہو جائے تو وہ اس نعمت پر سجدۂ شکر بجالاتے ہیں اور اگر ان کی خواہش کے مطابق پوری نہ ہو تو وہ اسے بھی اللہ کی رضا کے مطابق قبولیت ہی سمجھتے ہیں اور اس کے سامنے بصد خوشی سرِ تسلیم خم کرتے ہیں کیونکہ ہماری بہتری کس میں ہے یہ صرف خدا جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دعا ضرور پوری ہوتی ہے چاہے دنیا میں ہو یا آخرت میں ذخیرہ ہو بس ہمیں صابر اور شاکر ہونا چاہیے۔

رفعت مبین رفی، یو ایس اے

''اماں آپ کی کمر رہ جائے گی..... رہنے دیں میں اٹھاتی ہوں۔'' اس نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں روکنا چاہا۔

''ہنو بھی کہاں سے آگئیں۔''

انہوں نے اس کا ہاتھ اس بری طرح جھٹکا کہ وہ ذرا سا لڑکھڑا سی گئی۔ سیڑھیوں پر پانی تھا..... اس کا پیر پھسل گیا..... اور وہ سنبھل نہ سکی۔

☆☆☆

''ہیلو..... کون..... کون بات کر رہا ہے دانیال بھائی۔'' وہ آواز نہیں پہچان سکا مگر فون جس نے بھی کیا تھا وہ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ دانیال خود بھی پریشان سا ہو گیا۔

''جی جی میں دانیال ہی ہوں، بتایئے آپ کون؟''

''میں فرح بات کر رہی ہوں، آپ کے گھر کے سامنے والے گھر میں۔''

دانیال کو لمحے سے بھی کم وقت لگا تھا انہیں پہچاننے میں..... جبکہ دوسری طرف وہ انتہائی تیزی اور عجلت میں بول رہی تھی۔

''ثانیہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے..... اس کی حالت بہت خراب ہے، میں نے ایمبولینس بلوائی ہے آپ فوراً گھر آئیں پلیز اس کی جان کو شدید خطرہ ہے۔'' دانیال کو اپنے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ فرح نے بات کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ پھر بھی تمام راستہ اس کے الفاظ دانیال کے کانوں میں ایسے گونج رہے تھے جیسے اب بھی وہ فون پر کہہ رہی ہو۔

''ثانیہ سیڑھیوں سے..... جان کو شدید خطرہ.....''

اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرح بائیک اڑاتا ہوا گھر تک پہنچا۔ گھر پر صرف اماں تھیں..... جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھتی ہوئی۔

''اسے ایمبولینس میں لے گئے ہیں، فرح گئی ہے ساتھ۔'' انہوں نے دانیال کی شکل دیکھتے ہی جلدی سے اسپتال کا نام اور تفصیل بتائی۔ وہ ان ہی قدموں اسے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

فرح بھابی کاریڈور میں ہی مل گئیں۔

''ڈاکٹرز فوراً آپریشن کا کہہ رہے ہیں، آپ کا ہی انتظار تھا۔''

وہ ان کے ساتھ تیز، تیز قدم اٹھاتا ثانیہ کے پاس آیا۔

ثانیہ کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر دانیال کو دیکھا..... اور پھر آنکھیں میچ کر زور، زور سے رونے لگی۔

''دانی..... دانی تمہاری ماں نے میری جان لینے کی کوشش کی..... انہوں نے مجھے سیڑھیوں سے دھکا دیا..... میرے خدا.....''

کرب و اذیت سے اس کی حالت غیر تھی..... اور دانیال اس کی بات سن کر سکتے میں رہ گیا۔ اسے ثانیہ کو تسلی کے دو لفظ تک کہنا یاد نہ رہے۔

ڈاکٹرز دانیال کے دستخط لے کر تیزی سے ثانیہ کو اوٹی میں لے جا رہے تھے۔

اور دانیال کے کانوں میں اس کی آواز آ رہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی اور اماں کو مسلسل بددعائیں دے رہی تھی۔

اس کی آواز پورے فلور پر گونج رہی تھی..... اور دانیال کا یہ حال تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں زندہ دفن ہو جائے..... آتے جاتے لوگ جو یہ اندازہ کر لیتے کہ وہ کون ہے اور اس کا ثانیہ سے کیا رشتہ ہے، وہ اس پر ایک ملامتی نگاہ ڈالنا فرض خیال کرتے۔

فرح بھابی الگ شرمندہ سی تھیں حالانکہ بیچاری کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے دانیال بھائی..... لیکن آپ کی والدہ کی تلخ کلامی سے تو سب ہی واقف ہیں..... میں جب سے ثانیہ کے پاس آئی ہوں اس کے منہ سے ایک بھی خیر کا کلمہ نہیں نکلا..... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، نہ وہ بدتمیز ہے نہ جھگڑالو..... لیکن اس وقت اس کی جو حالت ہے اس کی ذمے دار آپ کی

والدہ ہی ہیں...... آئی ایم سوری مگر...... آپ کو انہیں بہت پہلے ہی سمجھانا چاہیے تھا۔ جب ساتھ مل کر رہنا ہے تو دن رات ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنانے سے کیا فائدہ...... مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ اس طرح بھی کر سکتی ہیں یہ تو...... یہ تو سیدھا، سیدھا کسی کی جان لینے کے مترادف ہے۔''

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں...... دانیال سن نہیں پا رہا تھا۔ اسے تو بس وہ سنائی دیا جو کچھ دیر پہلے ثانیہ چیخ، چیخ کر کہہ رہی تھی۔

''خدا کرے وہ بھی ایسے ہی تڑپیں، انہیں بھی ایسی ہی اذیت سے گزرنا پڑے، ہائے میرے اللہ...... میں کیوں آگئی اس جلاد عورت کے پاس...... جس نے مجھے، میرے بچے کو مارنے کی کوشش کی۔'' اور بھی جانے وہ کیسی، کیسی دہائیاں دے رہی تھی۔

وہ یقیناً اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ خود پر گزرنے والی موت وزیست کی اذیت ناک کشمکش نے اس کے ہوش وحواس سلب کر لیے تھے لیکن...... لیکن یہ نوبت آئی ہی کیوں......؟

☆☆☆

تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ اس نے فون کر کے ثانیہ کی امی اور بہن کو اسپتال پہنچنے کا کہا تھا...... ان کے آنے سے پہلے ہی خدا نے بیٹے کی خوشخبری سنائی۔

فرح بھابی نے وہیں سجدۂ شکر ادا کیا کہ بیٹا اور ماں دونوں کی حالت خطرے سے باہر تھی...... اور دانیال خود ٹھیک طرح سے خوش بھی نہیں ہو پایا...... کیونکہ ثانیہ نے اس سے ملنا تو دور، اس کی شکل تک دیکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنی امی اور رانیہ سے ملتے ہی خود پر بیتنے والی زیادتی اس حالت میں بھی ان سے بیان کر دی تھی۔

رانیہ نے سارا ادب لحاظ بالائے طاق رکھ کر اسے بے نقط باتیں سنائیں، وہ ایک مجرمانہ خاموشی لیے سنتا رہا...... البتہ امی کی آنکھوں میں صرف ایک دکھ بھرا شکوہ تھا۔ وہ بولیں تو صرف اتنا کہ......

''خود بیٹی کی ماں نہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں بیٹا کہ دوسرے کی اولاد کو اولاد ہی نہیں سمجھا جائے۔''

دانیال کا سر مزید جھک گیا۔ اسے معافی کے الفاظ بہت بے قیمت لگے اور تلافی کا راستہ ندارد......

''چلیں فرح بھابی میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔'' بہت دیر باہر انتظار کرنے کے بعد جب ثانیہ سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ تھکے، تھکے لہجے میں بولتا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

گھر پر ایک عجیب سی ویرانی اور سناٹا طاری تھا...... فرح بھابی اس کے ساتھ ہی اندر آئیں...... اسے اندر آتا دیکھ کر اماں تیزی سے اپنے کمرے سے نکلیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟'' وہ بہت...... فکرمندی سے پوچھ رہی تھیں۔ دانیال کو ان کی یہ تشویش محض ایک دھوکا ہی لگی۔ اس نے ان کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ بے ساختہ نظریں چرا گئیں۔

''آپ کیوں پوچھ رہی ہیں اس کی طبیعت...... آپ کے لیے کوئی خوش خبری نہیں ہے۔ وہ زندہ بچ گئی ہے اور میرا بیٹا بھی۔''

''یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا......'' اس کی بات نے فرح بھابی کے ساتھ اماں کو بھی دنگ کر دیا تھا۔ وہ ہکلا سی گئیں۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں میں...... آپ کی کوشش ناکام ہو گئی...... اور اماں...... ایک بات بتائیں سچ، سچ...... میں آپ کا سگا بیٹا ہوں ناں...... کسی سے مانگ کر تو نہیں پالا آپ نے......؟'' باہر لاؤنج میں دروازے کے پاس کھڑی فرح بھابی کو لگا غصے اور دکھ سے دانیال کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

''کیسی باتیں کر رہا ہے تو...... کیا ہو گیا...... ہوا کیا ہے؟''

''بری لگ رہی ہیں میری باتیں...... لیکن یہ ان بددعاؤں سے بہت اچھی ہیں جو ثانیہ اس وقت آپ کو دے رہی تھی...... جب خدا ایک ماں کی ہر دعا قبول کرتا

ہے۔ جب ہر عورت کے لبوں پر صرف دعائیں ہوتی ہیں...... اس وقت اماں...... اس وقت وہ آپ کو... بددعا دے رہی تھی...... کیوں اماں...... کیوں کیا آپ نے ایسا...... کیا ملا آپ کو ایسا کر کے......'' بولتے، بولتے اس کی آواز رندھ سی گئی۔

''میں...... میرا یقین کرو میں......'' ہر وقت فراٹے بھرتی اماں کی زبان آج بیٹے کو بولتا دیکھ کر لڑکھڑا رہی تھی۔

''ہاں اماں میرا بھی دل نہیں مانتا کہ آپ ایسا کر سکتی ہیں مگر میں یقین کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں...... کیونکہ آپ نے کبھی محبت کے دو بول اس سے نہیں بولے...... اور وہ جو آپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولتی تھی...... وہ چیخ رہی تھی کہ جو آپ نے اس کے ساتھ کیا...... خدا وہی آپ کے ساتھ کرے...... اب میں کیسے مان لوں آپ کی بات، بتائیں مجھے۔''

وہ بولتے، بولتے ایک دم بھڑک اٹھا۔ فرح کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ رکے یا وہیں سے پلٹ جائے۔

''اماں......! اماں کس قدر شرمندگی اٹھائی ہے میں نے آج اسپتال میں...... سب کے سامنے میں کیسے برداشت کر گیا سب کچھ...... میں کیا بتاؤں آپ کو، کیا کہوں میں آپ سے۔'' اس نے چلاتے ہوئے سر دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

''دانی...... دانی میرے بیٹے میں......''

''مت کہیں مجھے اپنا بیٹا...... میں نہیں ہوں آپ کی اولاد...... اگر میں آپ کی اولاد ہوتا تو آپ یقیناً میرے بچے کے بارے میں سوچتیں...... بیوی کا نہ سہی...... میری اولاد کا تو خیال کرتیں...... نہیں ہوں میں آپ کا بیٹا......'' زور، زور سے بولتے ہوئے وہ باہر نکلا...... اور گھر سے باہر نکلتا چلا گیا۔

''دانی رکو...... رکو میری بات سنو......''

اماں نے پیچھے سے روکنا چاہا لیکن اس نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں...... وہ لمحے بھر میں بائیک پر بیٹھ کر دور ہوتا چلا گیا...... اماں نے جو فرح کو وہاں کھڑے دیکھا تو چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں وہیں کھڑی رہیں۔

''خالہ ابھی وہ بہت غصے میں ہیں...... جب غصہ ٹھنڈا ہو گا تو آپ ہی کے پاس آئیں گے۔ پھر آپ انہیں بتا دیجیے گا کہ......''

فرح بھابی بہت ٹھہر ٹھہر کر دھیرے سے بول رہی تھیں...... مگر اُن کی بات پوری نہیں ہو سکی...... اماں نے شاید ان کی ادھوری بات بھی ٹھیک سے نہیں سنی...... وہ کھڑے قد سے زمین پر بے جان سی ہو کر آ گری تھیں۔

☆☆☆

ثانیہ کی ناراضی کا دورانیہ طویل ہو گیا تھا...... دانیال فوراً اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ثانیہ کی امی بھی داماد کی حامی تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر تو بنائے رکھنا تھا۔ اسے توڑنا تو نہیں تھا ناں......

انہوں نے بہ مشکل پیار سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے اسے ناراضی ختم کر کے دانیال سے ملنے کے لیے راضی کیا...... دانیال نے پہلے دن کے بعد سے اپنے بیٹے کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

اور ثانیہ کے دل میں غصہ تلے دبکی بیٹھی شوہر کی محبت بھی تر و تازہ ہو کر پھر سے اپنے پر پھیلائے کھڑی تھی۔ جبھی دانیال نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا اس کے آنسو پلکوں سے جھر جھر بہنے لگے۔

اس کی ساس مزاج کی کتنی بھی کڑوی سہی مگر دانیال ایک محبت کرنے والا شوہر تھا۔ اس نے اپنی ذات سے کبھی ثانیہ کو دانستہ کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ نہ کبھی بے جا روک ٹوک کی۔ نہ بے تکا غصہ دکھایا۔ نہ کوئی ایسی ضد باندھی جو ثانیہ کو جھنجلاتی یا دانی کی طرف سے اس کا دل میلا کرتی...... اپنی ماں اور بیوی کو ساتھ رکھنا اس کی مجبوری یوں تھی کہ وہ اپنی بیوہ ماں کی اکلوتی اولاد تھا...... وہ کبھی مر کے بھی اپنی جنت کو دنیا زمانے کی ٹھوکروں کی نذر کر کے اپنے اور ثانیہ کے لیے جہنم کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔

''کیسی ہو......؟'' ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام دوسرے ہاتھ سے اس کے بکھرے، بکھرے وجود کو

سہلاتے، سمیٹتے اسے خود سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کرے...... ثانیہ کے آنسو تھم کے نہیں دے رہے تھے۔

آنسوؤں کی دھند کے پار سے اپنے محبوب شوہر کا ندامت سے بھرپور وجود دیکھنا ثانیہ جیسی محبت کرنے والی وفاشعار بیوی کے لیے بہت کٹھن تھا۔

"مجھے...... مجھے معاف کردیں۔" وہ بہت دقت سے بول سکی تھی۔ گلے میں اٹکتے آنسوؤں نے اس کے الفاظ کا راستہ روک رکھا تھا۔

"تم کس بات کی معافی مانگ رہی ہو، معافی تو مجھے مانگنی چاہیے...... جو زیادتی اور ظلم جانے انجانے میں اماں کے ہاتھوں اور زبان نے تمہارے اوپر روا رکھے انہوں نے ان سب کے لیے تم ان کی جگہ مجھے معاف کردو، میں......" دانیال نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں دانیال پلیز......"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ثانی...... تم نہیں جانتیں...... اماں کی حالت بہت خراب ہے...... جس دن ہمارا بیٹا اس دنیا میں آیا، اس دن ان کے اوپر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔"

ثانیہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... دانیال نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ ان سے کتنی فضول کی بکواس کرکے گھر سے نکلا تھا۔

اور اگر اس دن فرح بھابی اپنے گھر جاچکی ہوتیں تو جانے کیا ہوتا......

"او، میرے خدا...... یہ کیا ہوگیا...... میں نے یہ سب نہیں چاہا تھا۔" ثانیہ اب بری طرح سے رو رہی تھی۔ دانیال نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ جانتا تھا بعض اوقات غصے، دکھ اور تکلیف میں انسان کے منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جنہیں بعد میں ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو سوائے ندامت اور شرمندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ثانیہ کا پچھتاوا اپنی جگہ...... مگر اس وقت وہ خود بھی ایسے ہی فیز سے گزر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اماں کی اس حالت کا ذمے دار ثانیہ سے زیادہ وہ خود ہے۔

☆☆☆

دو مہینے کا عرصہ دو دن کی طرح پلک جھپکتے گزرا تھا۔

ثانیہ دس دن امی کے گھر گزار کر گھر واپس آگئی تھی۔ اور جس دن سے گھر واپس آئی تھی۔ اسی دن سے اماں کی خدمت میں لگی تھی۔ گو کہ فالج کا اٹیک بہت معمولی تھا مگر بڑھاپے میں اس بیماری نے ان کی کمزوری کو ایک دم سے اس درجہ بڑھادیا تھا کہ اب وہ بالکل بستر کی ہو کے رہ گئی تھیں۔

ثانیہ اپنی طبیعت کی کمزوری کو بھلا کر اُن کے لیے پرہیزی کھانا پکاتی، ان کی ٹانگوں کی مالش کرتی، ہاتھ پیر اور سر دباتی، مستقل بچوں کو شور نہ کرنے کی تاکید کرتی رہتی۔ اور بالخصوص انہیں سہارا دے کر واش روم لے کر جاتی، کپڑے بدلواتی۔

اس دن کے بعد سے اماں کے لبوں پر جو خاموشی کی مہر لگی تھی تو اب تک نہ ٹوٹی تھی۔ ثانیہ کا البتہ اپنا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ وہ روزمرہ معمول کی کتنی ہی باتیں...... سرسری لہجے میں ان سے کرڈالتی۔ اماں چپ چاپ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھے جاتیں...... اور دیکھتے دیکھتے جب آنکھوں کی دھندلاہٹ بڑھ جاتی تو چہرہ دوسری طرف موڑ لیتیں۔

☆☆☆

وہ ایک بہت عام سا دن تھا۔ جب اماں کو واش روم سے واپس کمرے کی سمت لاتے ہوئے اس کا ہاتھ ذرا سا ہٹا تو بیڈ کے پاس اماں لڑکھڑا سی گئیں۔ ثانیہ نے بروقت تمام انہیں سنبھالا۔ وہ بری طرح سے گرتے، گرتے بچی تھیں۔ جبھی جب ثانیہ نے انہیں لٹا کر اپنا ہاتھ پیچھے کرنا چاہا تو انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے، چھوڑتے دوبارہ سے تھام لیا...... اور دھیرے، دھیرے سسکنے لگیں۔

ثانیہ جو اپنی کمر میں اٹھتی درد کی لہروں سے شل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک دم تھم سی گئی۔ بلاشبہ اس نے اماں کی صحت یابی کے دنوں میں بہت بار سوچا تھا کہ کبھی نہ کبھی

اماں کو اپنے خراب رویّے اور ترش روئی کا احساس ضرور ہوگا۔ اور جب وہ اس کا اظہار اس سے کریں گی تو وہ خوب باتیں جتا، جتا کر انہیں شرمندہ کرے گی...... مگر اب جب یہ وقت آیا تھا تو وہ انہیں اس حال میں دیکھ کر سر سے پیر تک عرقِ ندامت میں غرق ہو چکی تھی۔

سمجھ نہیں آتا تھا کہ کس طرح انہیں خاموش کروائے...... ان سے کہے کہ انہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں...... اس کے دل میں ان کے خلاف کوئی شکوہ، کوئی بغض، عناد اور کوئی برائی نہیں......

مگر وہ...... وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی...... بس دھیرے سے ان کے ہاتھوں پر سر ٹکا کر خود بھی رو دی۔

آفس سے تھکے ہارے واپس لوٹے دانیال نے گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے اماں کے کمرے کا رخ کیا مگر وہاں جو منظر اس نے دیکھا اس کے قدم کمرے کی دہلیز پر ہی جم گئے۔ چند لمحے ان دونوں کو خاموشی سے دیکھنے کے بعد وہ واپس پلٹ گیا مگر اپنی ماں اور بیوی کے برعکس اس کی آنکھوں میں نمی نہیں بلکہ لبوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

''آج شام کو اماں کے کمرے میں کیا سین ہو رہا تھا؟'' رات میں بچوں کے سونے کے بعد وہ دانیال کے لیے چائے لے کر آئی تو دانیال نہ چاہتے ہوئے بھی اسے چھیڑ بیٹھا۔

''ارے کچھ نہیں بس...... وہ ذرا جذباتی ہو گئیں اور...... میں...... مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوا۔'' ثانیہ دھیرے سے ہنس دی۔

''ایک بات بتاؤں تمہیں......'' دانیال نے ایک دم سنجیدگی سے اسے دیکھا...... ثانیہ نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

''میں جب بھی پریگننسی میں تمہاری بری حالت اور اماں کی وجہ سے تمہیں پریشان ہوئے دیکھتا تھا تو سوچتا تھا کہ شاید ہمارا فیصلہ غلط تھا۔ ہمیں اللہ نے اپنی نعمت اور رحمت دونوں سے نواز دیا تھا تو ہمیں مزید بچوں کی خواہش نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

"تو خواہش تو صرف آپ کی تھی، میں تو ایویں میں پھنس گئی تھی۔" ثانیہ دھیرے سے ہنس کے بولی تھی۔ مگر دانیال ہنوز سنجیدہ تھا۔

"تمہیں یاد ہوگا ایک بار مجھے کمپنی کی طرف سے کینیڈا جانے کا چانس مل رہا تھا مگر میں صرف تمہارے اور اماں کے اکیلے پن کے خیال سے جا نہیں سکا تھا۔"

"ہوں....." ثانیہ نے وہ دن یاد کرتے ہوئے سر ہلایا۔

وہ دن بھلا وہ کیسے بھلا سکتی تھی۔ جب صرف گھر کے اکلوتے مرد ہونے کی وجہ سے دانیال کا وہ سنہری موقع ضائع ہوگیا تھا۔ ثانیہ اور دانیال دونوں ہی دلگرفتہ ہوگئے تھے۔ اس وقت بھی ثانیہ کو نئے سرے سے افسوس ہوا۔

"میں نے تب فیصلہ کیا تھا کہ میرے بچے اکلوتے نہیں ہوں گے۔ بیٹا یا بیٹی دینا خدا کے ہاتھ میں ہے مگر میرے لڑکے ہوں یا لڑکیاں کم سے کم تین بچے تو ضرور ہوں گے۔ تاکہ بڑے ہو کر آگے چل کر وہ ایک دوسرے کا سہارا بن سکیں..... گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں یہ بات پکی ہوتی گئی۔ اللہ نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا..... بیٹا بھی، بیٹی بھی اور ساتھ میں ذہنی اور جسمانی طور پر مکمل صحت مند بھی..... مگر جب اس پریگنینسی میں جب تمہاری حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی تو میرے دل میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ شاید تیسرے بچے کا فیصلہ کر کے میں نے غلطی کر دی۔ ہر بار جب اماں کی وجہ سے تمہارا دل دکھتا..... یا ڈاکٹر کے پاس جانے میں تاخیر ہوتی، میں تمہاری دوائیں نہ لے پاتا..... یا تیزی سے مہینے کے ابتدائی دنوں میں ہی ختم ہوتی تنخواہ کو مایوسی سے دیکھتا تو خیال آتا کہ شاید..... شاید..... دو بچے ہی کافی تھے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا..... ثانیہ دم سادھے سن رہی تھی..... دانیال کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ابھی مزید بولے گا۔

"پھر ایک دن..... ایک دن اچانک..... اور اک کا ایک لمحہ مجھ پر سے اپنے بھاری قدم رکھتا ہوا یوں گزرا کہ میرے سب خیال اس کے نیچے دب کر اپنی موت آپ مر گئے..... وہ لمحہ جانتی ہو کون سا لمحہ تھا۔"

وہ اب سنجیدگی سے ثانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔ پھر اس نے ثانیہ کے جواب دینے کا انتظار نہیں کیا۔

"وہ، وہ لمحہ تھا جب تم اماں کو چیخ، چیخ کر... بددعائیں دے رہی تھیں۔" دانیال کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

پھر بھی ثانیہ نے اس کی بات میں شرارے سے پھوٹتے ہوئے محسوس کیے اور ان کی تپش سے اس کا وجود پسینہ، پسینہ ہوگیا۔

دانیال نے اس پر سے نظریں ہٹالیں۔ ثانیہ کے اندر بات کرنے کی ہمت نہیں بچی تھی اور دانیال شاید اس وقت کچھ سننا چاہتا بھی نہیں تھا۔

"تب مجھ پر انکشاف ہوا..... ایک ایسا انکشاف جس کے کئی پہلو تھے..... سب سے پہلا روزِ روشن کی طرح عیاں پہلو ناشکری کا تھا۔ اللہ مجھے ایک بار پھر مالا مال کرنے جا رہا تھا اور میں کتنا ناشکرا تھا کہ مسلسل کئی مہینے یہی سوچتا رہا کہ میں نے عین وقت پر اپنا دامن سمیٹ کیوں نہ لیا..... اُف....." اس نے جیسے اپنی بات کہہ کر خود ہی اس کی اذیت محسوس کی۔

"اس دن مجھے خیال آیا کہ میں نے کتنا صحیح فیصلہ کیا..... اگر میرا بیٹا اکلوتا ہوتا تو شاید بڑھاپے میں وہ بھی ہم سے اتنا ہی پریشان ہو جاتا جتنا کہ میں اماں کی ضدی اور ترش طبیعت کی وجہ سے ہو جاتا تھا۔ میں نے کبھی اماں کی باتوں کے جواب میں انہیں جواب نہیں دیا ان کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی لیکن کیا پتا ہمارا بیٹا اتنا فرمانبردار ہوتا یا نہیں..... تیسری بات جو مجھ پر واضح ہوئی وہ یہ کہ چاہے ماں، باپ ہوں چاہے اولاد..... غلط بات کوئی بھی انسان کر سکتا ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ برداشت کرتے، کرتے ایک دن صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹے اور سب کو شرمسار کر جائے..... غلط بات پر نرم روی سے احتیاط اور

ادب کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ٹوکنا ضرور چاہیے...... کسی بھی چیز کی زیادتی اچھی نہیں...... اور توازن بہت ضروری ہے۔ رشتوں کے درمیان، رویوں کے درمیان......''

ثانیہ پُرسوچ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے کہیں ڈوب کر بول رہا تھا۔

''مجھ پر یہ پہلو واضح ہوا کہ اماں کی کڑوی کسیلی برداشت کرنا میرا فرض ہے۔ کیونکہ انہوں نے مجھے پالا پوسا، اپنی خواہشات کو مار کر میری پرورش کی لیکن تمہارا فرض نہیں کہ تم ان سے سخت سست سنتی رہو...... کبھی وجہ اور کبھی بغیر کسی وجہ کے...... اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت سے ہی سہی...... مجھے ان کو سمجھانا چاہیے تھا۔ وہ برا تو مناتیں لیکن مجھے ان کے رویے کی طرف توجہ دلانی چاہیے تھی۔ مجھے ان کو اعتماد دینا چاہیے تھا کہ میں ان کا بیٹا تھا ہوں اور ہمیشہ ان کا بیٹا ہی رہوں گا۔ انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نے انہیں بالکل ہی ان کے حال پر چھوڑ دیا...... اور ...... کتنا غلط کیا میں نے...... وہ مجھ سے ناراض ہو جاتیں تو میں انہیں منا سکتا تھا لیکن ان کے برا ماننے کے خیال سے میں چپ رہا...... اور تم نے دیکھو انہیں منا لیا...... انہیں اپنا بنا لیا...... میں سوچتا...... ہی رہ گیا اور تم کر گزریں...... ثانیہ...... تم...... بہت اچھی ہو......''

وہ جیسے تھک کر خاموش ہوا تھا...... یوں جیسے کہنے کو پتا نہیں کیا...... کچھ باقی تھا...... جسے اس نے ایک جملے میں سمیٹا تھا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔''

ثانیہ نے رسان سے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''آپ بھی بہت اچھے ہیں دانیال...... بلکہ دنیا کے سارے مردوں سے اچھے...... اور اماں بھی بہت اچھی ہیں، دنیا کی ساری ماؤں سے زیادہ اچھی......''

دانیال چند لمحے مسکرا کر اسے دیکھتا رہا۔

''مجھ سے ایک وعدہ کرو ثانی...... بلکہ ہم مل کر ایک عہد کرتے ہیں...... ہم کبھی اپنے بچوں سے اتنی سختی سے پیش نہیں آئیں گے۔ اپنے داماد اور بہوؤں کو اپنے خاندان میں ایک خوب صورت اضافہ سمجھ کر خوش دلی سے قبول کریں گے۔ انہیں اتنا اسپیس اتنی گنجائش دیں گے کہ وہ آسانی سے ہم لوگوں میں ایڈجسٹ کر سکیں...... ہم...... ہم فرشتے نہیں، نہ بن سکتے ہیں مگر ہم ایک بہترین انسان بننے کی کوشش ضرور کریں گے...... اور اپنے بچوں کی پرورش، ان کی تربیت اس انداز میں کریں گے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا سمجھیں۔'' دانیال نے بہت بڑی، بڑی باتیں بہت آسانی سے کہہ دی تھیں۔

''وعدہ...... پکا وعدہ......'' ثانیہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

''اور ایک بات اور......'' اس نے اٹھتی ہوئی ثانیہ کو ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو اپنے بیٹوں کو الگ گھر میں جانے کی اجازت دیں گے۔''

''ہیں......؟'' ثانیہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''اور اگر وہ الگ نہ جانا چاہیں تو......؟''

''تو بھی میں ان سے کہوں گا کہ اپنے بیوی، بچوں سمیت بوریا بستر سمیٹو اور اپنا ٹھکانا کہیں اور کرو۔''

''لیکن...... کیوں دانیال......؟ کس لیے؟'' اسے یہ منطق سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''تاکہ جب تم اپنی ایک بہو کے ساتھ لڑو یا اسے اس کے میکے جانے سے روکو...... اور وہ اپنی مرضی کر کے چلی جائے تو میں تمہاری حمایت میں، ان سے ناراض ہو کر دوسرے بیٹے کے گھر جا سکوں۔''

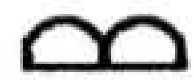
''دانیال......'' ثانیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''اور پتا ہے جب میرا بیٹا مجھے منانے کے لیے آئے گا تو میں کہوں گا۔ تو تو ہے ہی جورو کا غلام......''

''ارے اللہ دانیال......!'' اب کے ثانیہ کی ہنسی میں چیخ نما آواز شامل تھی۔

''اور تم بھی وہ گولڈن چانس مس مت کرنا...... پان کلے میں دبا کر پوچھنا۔ بیگم نے اجازت دے دی بیٹا۔''

اس نے پوپلا منہ بنایا...... اور ثانیہ نے پاس پڑا تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔



اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

ڈرِ ثمن بلال

وہ کمالِ ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار ...یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصّع ہو، زیرِ نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر

قسط:6




Downloaded From
Paksociety.com
Reading
Section

مناب کے گھر پہنچتے ہی...... ایشال اور عنایہ...... نور بیگم کے ساتھ ''کاشانہ عمر'' دوڑی چلی آئی تھیں۔ ان تینوں کزنز میں پیار بھی بہت تھا۔ ان تینوں کو اکثر لوگ بہنیں ہی سمجھتے تھے۔
ساجدہ بیگم کی خوشی بھی دیدنی تھی...... وہ پھولے نہیں سما رہی تھیں...... اور خلافِ معمول آج ڈاکٹر عمر بھی شام کو دوبارہ اسپتال نہیں گئے تھے...... ایشال اور عنایہ جب گھر کے اندر داخل ہوئیں تو ڈاکٹر عمر لابی میں ٹہلتے ہوئے سیل فون پر کسی سے نہایت خوشگوار موڈ میں خوش گپیوں میں مصروف دکھائی دیے۔
ایشال نے انہیں بہت عرصے بعد یوں مسکراتے ہوئے دیکھا۔
''عینی تمہیں یاد ہے آخری بار عمر بھائی کتنا عرصہ پہلے مسکرائے تھے؟'' اس نے عنایہ سے سرگوشی کی۔
''بکواس نہیں کرو...... سن لیں گے عمر بھائی۔'' عنایہ نے اسے ٹوکا۔
''ہاں یاد آیا...... آخری بار میں نے انہیں مناب کی انگیجمنٹ پر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔'' اسے یاد آ گیا تھا۔
''اسٹاپ اٹ ایشو......'' عنایہ نے اسے گھورا تو وہ خاموش ہوگئی۔
کاشانہ عمر میں ان کے لیے پُرتکلف چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رضیہ ان سب کو چائے سرو کر رہی تھی...... نور بیگم اور ساجدہ اکھٹے بیٹھی تھیں۔ جبکہ مناب کے دائیں، بائیں ایشال اور عنایہ بیٹھی تھیں اور خوشگوار موڈ میں ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔
مناب لندن میں گزرے لمحات اور پھر فاریہ کے ساتھ گزارا ہوا اچھا وقت ان سے شیئر کر رہی تھی...... اچانک مناب کو جیسے کچھ یاد آیا تھا اور وہ بات کرتے ہوئے ہنس پڑی۔
''کیا ہوا، تم فاریہ کے بارے میں بتاتے ہوئی ہنسی کیوں؟'' عنایہ کو تجسس ہوا۔
''پتا ہے اقصم نے فاریہ کا نک نیم ''چیکو'' رکھا ہوا ہے۔''
''کیوں......؟'' وہ دونوں حیران ہوئیں۔
''موصوف کو لگتا ہے فاریہ اسے دیکھتے ہی اسے امپریس کرنے کی کوشش کرتی ہے۔'' مناب نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔
''اونہیں...... بڑا آیا پرنس چارمنگ...... اپنے بارے میں اقصم کو ہمیشہ سے بڑی خوش فہمی رہتی ہے کہ موصوف پہ لڑکیاں بڑی فدا ہوتی ہیں۔'' ایشال کی دلچسپ رائے پر سبھی مسکرا دیے۔
''خوش فہمی نہیں ہے ایشو...... یہ حقیقت ہے میرے بھتیجے تو شہزادے ہیں......'' ساجدہ بیگم کے انداز میں زارون اور اقصم کے لیے پیار اور تفاخر تھا۔
''اور پھر پھپو اپنی بھتیجیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' ایشال کو اپنی فکر لاحق ہوئی۔
''میری بھتیجیاں تو پرستان کی پریوں جیسی خوب صورت ہیں...... ماشاءاللہ۔''
ان کی تعریف پر عنایہ نے ایشال کو دیکھا۔
''ہوگئیں تم پھپو کی بٹرنگ (مسکا پالش) سے خوش......؟''
''ارے بھئی یہ بٹرنگ نہیں ہے۔'' ساجدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے چائے کی خالی پیالی ٹیبل پر رکھی۔ ''یہ سچ ہے۔''
''دیکھا...... میری پھپو کتنی اچھی، کتنی نائس ہیں۔'' ایشال نے خوشی سے اظہار کیا۔
''کون nice ہے؟ کس کی تعریف ہو رہی ہے؟'' ڈاکٹر عمر بڑے خوشگوار موڈ میں لونگ روم

میں داخل ہوئے انہوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ جس کی آستینیں فولڈ کرتے ہوئے وہ قریبی صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

''ایکچوئیلی ایشو آپ کی بہت تعریف کر رہی تھی عمر بھائی......'' عنایہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ مناب مسکرادی جبکہ ایشال نے عنایہ کو گھور کر دیکھا۔

''میں جانتا ہوں ایشال میری کیا تعریفیں کرتی ہے۔ پچھلے دنوں فون پر علینہ سے جو میری تعریفیں ہو رہی تھیں...... وہ سن چکا ہوں میں......'' بات کرتے ہوئے وہ صرف چند لمحوں کے لیے مسکرائے تھے۔ ایشال سر جھکا گئی تھی...... جبکہ عنایہ اور مناب مسکرانے لگی تھیں۔

''تم ایشال کو چھوڑو...... اپنی سناؤ، شادی کیوں نہیں کرتے؟ آج میں تم سے دوٹوک بات کرنے آئی ہوں۔'' نور بیگم نے خفگی سے ڈاکٹر عمر کو دیکھا۔

''نانو آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے آپ میرے لیے لڑکی ڈھونڈ چکی ہیں...... اور میں ٹال مٹول کر رہا ہوں۔'' وہ مسکرائے۔

''تم شادی کے لیے ہامی تو بھرو...... لڑکیاں بہت ہیں۔'' نور بیگم نے انہیں تسلی دی۔

''بس اماں یہ مذاق کر رہا ہے...... ایسے ہی مجھے بھی ٹال دیتا ہے...... میں تو تھک گئی ہوں اسے شادی کے لیے مناتے، مناتے......'' ساجدہ بیگم مایوس ہوئیں۔

''عمر میرے بچے اب بس کرو...... تم سے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں طے ہو رہی ہیں اور تم ہو کہ شادی کا نام تک نہیں لیتے......؟ میرے بچے میں اپنی زندگی میں تمہارا ہنستا بستا ہوا آباد ہوتا گھر دیکھنا چاہتی ہوں...... اسے میری آخری خواہش سمجھ کر ہی پورا کردو......'' نور بیگم آبدیدہ ہوئیں۔

''نانو کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہم پر سلامت رکھے...... آپ پلیز آئندہ ایسی بات مت کیجیے گا۔'' ڈاکٹر عمر نے ضعیف سی نور بیگم کو دیکھا جو چھڑی ہاتھ میں پکڑے صوفے پر بیٹھی امید بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''تو پھر وعدہ کرو مجھ سے...... تم اسی سال شادی کرو گے۔'' نور بیگم بھی آج ڈاکٹر عمر سے وعدہ لے کر ہی جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

''نانو آج آپ کو ہو کیا گیا ہے......؟ لگتا ہے مما اور چھٹکی...... (مناب) نے آپ کا اچھا خاصا برین واش کیا ہے۔''

''تم جو مرضی کہہ لو...... میں کچھ نہیں جانتی، مجھ سے عہد کرو کہ تم اسی سال شادی کرو گے......'' نور بیگم کے بچوں جیسے انداز پہ ڈاکٹر عمر ہنس دیے۔

''اب آیا ناں اونٹ پہاڑ تلے...... ہماری مانی ہوتی تو آج اس طرح وعدہ نہ کرنا پڑتا......'' مناب نے انہیں زچ کیا۔

''چھٹکی تم سے تو میں نمٹ لوں گا...... آتے ہی میرے خلاف اعلانِ جنگ کروادیا۔'' ڈاکٹر عمر کا موڈ خلاف توقع بہت خوشگوار تھا۔ ایشال نے کن انکھیوں سے ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''عمر بھائی دادو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں...... آپ بس جلدی سے اب شادی کرلیں...... ہم سے اب اور انتظار نہیں ہوتا......'' عنایہ نے بھی اپنی رائے دی۔

''چلو جی تمہاری کسر باقی تھی عینی......! ویسے میں تو سمجھتا تھا کہ تمہیں اپنی شادی کے علاوہ دنیا کی کسی چیز

میں دلچسپی ہی نہیں۔'' ڈاکٹر عمر نے اسے چھیڑا۔
''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔'' عنایہ مسکرائی۔
''ویسے عینی، عمر بھائی جو کہہ رہے ہیں وہ غلط تو نہیں.....'' مناب کے شریر انداز پر عنایہ نے مصنوعی غصے سے مناب کے کندھے پر دھپ رسید کی۔
''وعدہ تو بیچ میں ادھورا ہی رہ گیا اماں.....'' ساجدہ نے مسکرا کر نور بیگم کو یاد دلایا۔
''ہاں بھئی عمر جلدی سے بتاؤ؟''
''اوکے نانو.....کرلوں گا اسی سال شادی.....کوئی اور حکم.....؟''
''جیتے رہو خوش رہو، اللہ میرے بچے کو ہمیشہ آباد رکھے.....'' نور بیگم نے خوشی سے دعا دی۔
''پھپوجی مبارک ہو..... مان گئے ہیں عمر بھائی.....'' عنایہ، ساجدہ بیگم سے مخاطب ہوئی۔
''خیر مبارک.....'' سب کے چہرے اس وعدے پر خوشی سے دمک اٹھے تھے۔ صرف ایشال تھی جو صرف مسکرانے پر اکتفا کر رہی تھی جو کچھ بول نہیں رہی تھی نہ جانے کیوں.....؟ تھوڑی دیر کے بعد مناب اٹھ کر اپنے روم میں چلی گئی تھی اور پھر سب کے لیے گفٹس لے کر لونگ روم میں آئی۔
''نانو یہ آپ کے لیے ہے.....'' مناب نے لیمپ وول کی خوب صورت جرسی نور بیگم کی طرف بڑھائی۔
''ارے میری جان اس کی کیا ضرورت تھی؟'' نور بیگم نے جرسی پکڑتے ہوئے کہا۔
''نانو.....ضرورت تھی ناں..... ایسے مت کہیں۔'' پھر اس نے ایشال اور عنایہ کے گفٹس ان کو تھمائے..... ان دونوں کے لیے خوب صورت برانڈڈ بیگز تھے.....مختلف برانڈ کی نیرو جینز..... کچھ ٹاپ اور سوئٹرز وغیرہ تھے جو عنایہ اور ایشو کو بہت پسند آئے تھے۔
''اتنے سارے گفٹس بانٹے جا رہے ہیں، میرا گفٹ کہاں ہے بھئی.....؟'' ڈاکٹر عمر نے خوشگوار موڈ میں مطالبہ کیا۔
''بھیا لائی ہوں آپ کا گفٹ بھی..... یہ لیں کیا یاد کریں گے۔'' مناب نے ڈاکٹر عمر کا فیورٹ پرفیوم ان کی طرف بڑھایا۔
''واؤ دیٹس گریٹ، یہ میرا فیورٹ پرفیوم ہے۔'' ڈاکٹر عمر پرفیوم ہاتھ میں لیے بہت خوش ہوئے۔
''اب گفٹ کے بدلے میں، میری فرمائش بھی سن لیں..... اسی سال آپ اس گھر میں میری بھابی لا رہے ہیں اور وعدہ کریں کہ آج آپ نے جو وعدہ کیا ہے وہ آپ پورا کریں گے۔''
''یار یہ کیا آج تم لوگوں نے بھابی.....اور شادی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بھابی کسی شاپنگ مال سے تھوڑی ملتی ہے اور ویسے بھی کون لڑکی کرے گی مجھ بورنگ شخص سے شادی؟'' ڈاکٹر عمر تو جیسے آج چھٹی کر کے پھنس گئے تھے.....اب وہ زچ ہو رہے تھے۔
''کیوں بھئی کیا کمی ہے میرے بیٹے میں؟ تم ہامی بھرو..... میں لائن لگا دوں لڑکیوں کی۔'' ساجدہ بیگم کی بات پر ڈاکٹر عمر مسکرا دیے۔
''مائیں اپنے بچوں کے معاملے میں کتنی ایموشنل ہوتی ہیں۔''
''ہاں تو کیوں نہ ہوں مما ایموشنل.....؟ میرے بھیا میں آخر کس چیز کی کمی ہے؟'' مناب نے پُرجوش انداز میں اظہار کیا۔
''ڈونٹ وری عمر بھائی، لڑکیوں کی ہم لائن تو لگا دیں گے مگر مجھے بس ایک ہی چیز کا خدشہ ہے۔'' عنایہ نے

مسکراہٹ چھپائی۔
''کیسا خدشہ......؟'' ڈاکٹر عمر حیران ہوئے۔
''کہیں آپ کی ایج کا ایشو نہ بن جائے......'' عنایہ کے چھیڑنے پر ڈاکٹر عمر کھسیا کر ہنس دیے۔
''مجھے لگتا ہے آج میں نے اسپتال سے چھٹی کر کے غلطی کر دی ہے۔''
''ارے تم دونوں کیوں تنگ کر رہی ہو میرے بچے کو...... اب ایسی زیادہ عمر بھی نہیں ہوئی میرے بچے کی۔'' نور بیگم نے مداخلت کی۔
''نا نو آپ کے یہ بچے چار سال کے بعد چالیس سال کے ہو جائیں گے۔ اگر یہ اسی طرح چپ سادھ کر بیٹھے رہے تو عنقریب ان کے لیے لڑکیوں کا کال پڑ جائے گا۔'' عنایہ ہنوز ڈاکٹر عمر کو چھیڑ رہی تھی۔
''تم میری فکر مت کرو...... اور اپنے مجنوں کا انتظار کرو...... اگلے مہینے آ رہا ہے وہ...... ابھی آپ ان لیلیٰ، مجنوں کی شادی کو ڈسکس کریں...... اور مجھے ان چکروں میں نہ ہی الجھائیں تو بہتر ہے۔'' ڈاکٹر عمر اٹھ کھڑے ہوئے۔
''لو جی یہ پھر جان چھڑا رہا ہے۔'' نور بیگم حیران ہوئیں۔
''نا نو اب بھیا جو مرضی کہہ لیں...... اب ہم ان کی جان چھوڑنے والے نہیں۔'' مناب، عنایہ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ نور بیگم اور ساجدہ مسکرا دیں۔
''عمر بیٹا کہاں جا رہے ہو......؟'' عمر کو اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر ساجدہ بیگم نے پوچھا۔
''مما آپ کی بیٹیاں جو میرے پیچھے پڑ گئی ہیں...... اب جان تو چھڑانی ہے ناں ان جنگلی بلیوں سے......''
ڈاکٹر عمر خلافِ توقع آج نہایت خوشگوار موڈ میں تھے۔
''کہیں باہر مت نکل جانا...... میں کھانا لگواتی ہوں......'' ساجدہ بیگم مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ہی نور بیگم بھی عشا کی غرض سے اٹھ گئیں۔
''یار ایشو کیا بات ہے تم بڑی چپ، چپ سی ہو......؟'' مناب نے اپنے قریب خاموش بیٹھی ایشال کو دیکھا...... جو کافی دیر سے سب کی باتیں سن رہی تھی مگر چپ تھی...... بول کچھ نہیں رہی تھی۔
''بس ایسے ہی...... آپ سب کی نوک جھوک سن رہی تھی۔'' ایشال مسکرائی۔
''تمہیں تو پتا ہے...... ایشو کی ویسے بھی عمر بھائی کی موجودگی میں بولتی بند ہو جاتی ہے۔'' عنایہ نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا تو تینوں ہنس دیں مگر ایشال کی ہنسی پھیکی تھی۔

☆☆☆

گلو کی نوکری لگتے ہی جیسے گھر کے تمام مسائل حل ہو گئے تھے...... اس بار مالک مکان کو پہلی بار مہینے کی پندرہ، بیس تاریخ کے بجائے یکم کو ہی کرایہ ادا کر دیا گیا تھا۔
دودھ والے سے بھی اس بار شاکر حسین کو بے عزتی نہیں سہنی پڑی تھی کیونکہ پچھلا بل...... اور موجودہ بل سیما بیگم نے اکٹھے ہی ادا کر دیا تھا۔ اس بار بجلی کا بل دیکھ کر پہلی بار سیما بیگم کا بی پی ہائی نہیں ہوا تھا کیونکہ سیما بیگم کے پاس روپے موجود تھے۔ اور ایسا بھی پہلی بار ہی ہوا تھا کہ گھر میں مہینے بھر کا اکٹھا راشن لایا گیا تھا۔ جو سبزی فروش انہیں ادھار سبزی دینے سے صاف انکار کرتے ہوئے اپنی ریڑھی آگے بڑھا کر گزر جاتا تھا...... وہ اب روز دروازے پر دستک دے کر خود اُن سے سبزی خرید لینے کا مطالبہ کرتا۔
اس چھوٹے سے گھر میں تو جیسے ہر سو خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئی تھیں۔ سیما بیگم بہت خوش تھیں انہیں تو ایسا

لگتا جیسے وہ ایک جہنم بھری زندگی سے نکل کر جنت میں آ گئی تھیں۔
گلو کی شاندار نوکری نے سیما بیگم کی محرومیوں کو کسی حد تک دور کر دیا تھا...... گھر میں خوشحالی کیا آئی سب جھگڑے ہی ختم ہو گئے۔ بس ایک شاکر حسین تھے جو گلو کی کمائی کا ایک نوالہ تک نہیں توڑتے۔ اب سیما بیگم کو زارا اور اس کی تینوں بچیاں بوجھ نہیں لگتی تھیں۔
محلے کی جو عورتیں ان کے گھر کی غربت کی وجہ سے کبھی جھانک کر بھی نہیں دیکھتی تھیں۔ اب وہی بہانے، بہانے سے سیما بیگم کے پاس چکر لگایا کرتیں اب تو گھر میں ups بھی لگ گیا تھا۔ سارہ جو ہمیشہ خود سے لاتعلق سی رہتی تھی اب ہمہ وقت خود پر توجہ دیتی تھی اور ہر ہفتے محلے کے پارلر کا چکر ضرور لگاتی۔ اسجد کی محبت نے اس کی بے رنگ زندگی میں خوب صورت رنگ بھر دیے تھے...... وہ اب ہر دوسرے تیسرے دن اسجد سے باہر ملنے لگی تھی۔
اسجد کی محبت کا خمار...... اس کے اندر کے ڈر و خوف اور خدشات کو روز بروز ختم کر رہا تھا...... وہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھی۔ اور وہ اعتماد کیوں نہ کرتی...... وہ اس کا عاشق تھا...... اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا...... اسے آنے والے دنوں کے ایسے سپنے دکھاتا کہ اسے اسجد کے ساتھ پر فخر ہونے لگتا...... وہ جو ہمیشہ سے پڑھا کو لڑکی رہی تھی...... اب وہی سارہ تھی جس کا پڑھائی میں دل نہ لگتا تھا۔
اس کے اندھے عشق نے اسے اتنا نڈر بنا دیا تھا کہ وہ بڑی آسانی سے جھوٹ بولتی ہوئی گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کالج سے گھنٹوں غائب رہتی۔ اسجد کے ساتھ ٹائم گزارتی اور چھٹی کے وقت واپس آ جاتی۔
دوسری طرف خضر گھر آتا تو سیما بیگم کو اس کی آمد ایک آنکھ نہ بھاتی انہیں اپنی خوب صورت بیٹی کے لیے ایک معمولی تنخواہ لینے والا چار بہنوں کا اکلوتا بھائی کسی صورت مناسب نہ لگتا......
اب بھی سیما بیگم چارپائی پر بیٹھی اپنے سامنے ٹوکری میں انار رکھے...... انار کے دانے نکال رہی تھیں...... زارا کی تینوں بچیاں صحن میں کھیل رہی تھیں۔
زویا اپنی کسی کولیگ ٹیچر کے گھر گئی تھی...... سارہ پنجرے میں طوطوں کو باجرہ ڈال رہی تھی اور زارا رات کے کھانے میں چکن پلاؤ بنانے کے لیے چاول صاف کر رہی تھی جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، سارہ نے دروازہ کھولا تو خضر اپنی پھٹیچر موٹر سائیکل کے ساتھ داخل ہوا...... اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں دو درجن کیلے موجود تھے۔
''السلام علیکم...... کیسی ہیں مامی......؟''
''وعلیکم السلام...... شکر ہے خوش و خرم ہیں...... بس اللہ حاسدوں کے شر سے بچائے۔'' سیما بیگم نے منہ بنایا...... مگر خضر ان کا رویہ نظر انداز کرتا ہوا پاس رکھی چیئر پر آ بیٹھ گیا۔
''ماموں نظر نہیں آ رہے۔ کہیں گئے ہوئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں بازار تک گئے ہیں، میرا دل چاہ رہا تھا چھوٹے پائے کھانے کو...... وہ لینے گئے ہیں۔ تم سناؤ...... کوئی تنخواہ بڑھی تمہاری یا پچھلے پانچ سال سے اسی پندرہ ہزار پر گزارہ کر رہے ہو؟''
''ج...... جی مامی...... اب تو اٹھارہ ہزار ہو چکی ہے میری تنخواہ......'' خضر گڑبڑا گیا۔ کچھ عرصے سے سیما بیگم کے انداز و اطوار پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ شاید یہ روپے پیسے کا غرور تھا۔
''صرف اٹھارہ ہزار......؟ تین اور بہنیں بیاہنی ہیں تم نے...... پھر اپنی شادی کیسے کرو گے......؟ میری مانو تو کسی دوسرے ملک نکل جاؤ...... ورنہ میری زویا جیسی حسین لڑکی تو تمہاری بیوی بن کر میری طرح ترس، ترس کر

روز جیتے جی مرا کرے گی۔''

''نن نہیں مامی...... آپ ایسا مت سوچیں۔ اللہ اس کے نصیب اگر مجھ سے جوڑے گا تو اس کے نصیب کا رزق بھی تو دے گا ناں مجھے۔''

''بس خضر میاں...... تم بھی شاکر صاحب کے بھانجے ہو آخر خون کا کچھ تو اثر ہوگا ناں...... تمہارے ماموں بھی ہمیشہ اسی طرح کتابی باتیں ہی کرتے رہے...... میری تو ساری جوانی محرومیوں میں گزر گئی۔ اب پچھلی عمر میں گلو کی نوکری لگنے سے سکھ نصیب ہوا ہے...... میں تمہیں کھل کر بتا دوں...... اپنا مستقبل بناؤ...... ورنہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ پندرہ بیس ہزار جیسی معمولی تنخواہ لینے والے ملازم کے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ بھئی جس پہ ذمے داریوں کا اتنا بوجھ ہو وہ میری بیٹی کو خوش کیسے رکھے گا؟ میں ایک اور سیما بیگم کو جنم نہیں لینے دوں گی سمجھے تم؟'' خضر کے ساتھ، ساتھ سارہ اور رزارا بھی سیما بیگم کی گفتگو سن کر حیران رہ گئی تھیں۔

''مامی یہ...... یہ کس طرح کی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ زویا میری بچپن کی منگیتر ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں...... جب زویا مجھ سے کسی بھی قسم کی ڈیمانڈ نہیں کرتی تو پھر یہ...... یہ باتیں بے معنی ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' خضر ورطۂ حیرت میں تھا...... اور اسی حیرانی کے عالم میں ان کی باتوں کے جواب دے رہا تھا۔

''زویا تو ناسمجھ ہے...... پاگل ہے وہ...... زمانے کی سمجھ بوجھ کیا جانے...... اور ویسے بھی خضر میاں...... یہ پیار و محبت صرف افسانوی باتیں ہیں...... عشق، پیٹ کا دوزخ نہیں بھرتا...... تن کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا...... خواہشات کا گلا نہیں گھونٹ سکتا...... جیب خالی ہو تو عشق جھاڑنے کو بھی دل نہیں کرتا...... آج کا دور پیسے کا دور ہے...... محبت کو کون پوچھتا ہے...... رشتے دار تک پیسے والوں کے رشتے دار بننے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور غریب بہن بھائی سے تو کوئی صرف سلام لے کر راضی نہیں ہوتا...... تم محبت کی بات کرتے ہو؟'' انہوں نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ ''بہرحال اگر اپنے مستقبل کو بہتر بنا سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے تو کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔'' سیما بیگم نے اس کی سماعتوں پر بم گرایا تھا۔

خضر اسی طرح حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا ان کی آخری بات پر ہڑبڑا کر اٹھا۔ وہاں رکنے کا اب کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ وہ سیما بیگم کی باتوں سے ازحد پریشان ہو گیا تھا۔

''اور ہاں ذرا سنو خضر، یہ کیلے واپس لیتے جاؤ...... ہم نے یہ سستا فروٹ کھانا چھوڑ دیا ہے۔ میرا گلو ہمیں مہنگے سے مہنگا فروٹ کھلاتا ہے...... یہ کیلے تم گھر لے جانا...... نگہت کو ویسے بھی کیلے بہت پسند ہیں۔'' سیما بیگم نے نہایت رعونت سے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔

خضر مارے شرمندگی کے شاپر اٹھا کر باہر نکل گیا۔

''اماں یہ کس طرح کی باتیں کر رہی تھیں آپ خضر بھائی سے؟'' سارہ کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''آپ کو ان کے ساتھ اس طرح کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ زویا آپی انہیں پسند کرتی ہیں اور آپ ان کا رشتہ توڑنے کے درپے ہیں؟'' سارہ کو ماں کی باتوں پر غصے کے ساتھ، ساتھ افسوس بھی ہو رہا تھا۔

''ارے بس کرو بھاڑ میں جائے یہ اور اس کی محبت...... جا...... کچن سے نمک کا ڈبا لے کر آ...... میں ان پر چھڑک دوں پھر سب کھا لینا۔'' سیما بیگم نے انار کے دانے نکال لیے تھے...... اب وہ اٹھ کر ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

☆☆☆

موسم بدل گیا تھا برسات کے شروع ہوتے ہی گرمی کا زور بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ رات پچھلے پہر ہونے والی تیز بارش نے ایک خوب صورت صبح کا آغاز بن کر رات کے تاریک دروازے پر دستک دی تھی۔
نہ جانے یہ جگہ کی تبدیلی کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی...... ایشال کی آنکھ صبح چھ بجے ہی کھل گئی تھی۔ حالانکہ سنڈے والے دن وہ بھرپور نیند لے کر ہی اٹھا کرتی تھی مناب اور عنایہ بیڈ پر گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ دونوں مناب کی آمد کی وجہ سے پھپو کے گھر ہی رک گئی تھیں' وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے ساجدہ بیگم کے کمرے کا دھیرے سے دروازہ کھولا تو ساجدہ بیگم جائے نماز پر بیٹھی کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔
رات دیر تک جاگنے اور صبح جلدی اٹھ جانے کی وجہ سے ایشال کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ چائے کی شدید طلب اسے کچن میں لے آئی تھی...... فیضو ابھی تک کچن میں نہیں آیا تھا۔ اس نے کیٹل میں پانی ڈال کر چولھے پر رکھا اور کیبنٹ کھول کھول کر ٹی بیگز ڈھونڈنے لگی۔
''ٹی بیگز تیسرے کیبنٹ میں رکھے ہیں۔'' عقب سے ڈاکٹر عمر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
''یہ اتنی صبح اٹھتے ہیں؟'' ایشال نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا۔
وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھے' انہوں نے ٹخنوں سے اوپر شلوار کے پائنچے چڑھا رکھے تھے ان کے سر پر نماز کی ٹوپی تھی۔
''گڈ مارننگ......'' ایشال نے دھیرے سے کہا۔
''ویری گڈ مارننگ......'' ڈاکٹر عمر جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔
''تم چائے بنا رہی ہو؟''
''جی...... اس نے مختصر جواب دے کر ٹی بیگز کا ڈبا نکالا۔
"Really !you will make the tea?"
ڈاکٹر عمر کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔
"I dont know but trying to make it" ایشال نے خفگی سے جواب دیا تھا۔ جسے سن کر ڈاکٹر عمر کے لبوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔
''او ہو...... پھر تو یہ آج صبح کی بڑی خبر ہے۔''
ایشال نے ایک نظر ان کی پشت پر ڈالی جو پانی کی بوتل فریج میں سے نکال کر گلاس میں انڈیل رہے تھے۔ اس نے غصے سے انہیں دیکھتے ہوئے ابلتا ہوا پانی مگ میں ڈالا۔ ڈاکٹر عمر کی موجودگی اور پھر ان کے تمسخر اڑاتے ہوئے انداز پر اسے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ عجلت میں گرم پانی مگ میں ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ پر گر گیا تھا۔ ایک چیخ کے ساتھ دوسرے ہاتھ میں پکڑی کیٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری...... وہ زندگی میں پہلی بار چائے بنانے لگی تھی اور ہاتھ جلا بیٹھی تھی۔ اس اچانک افتاد پر ڈاکٹر عمر گھبرا کر اس کی طرف لپکے وہ اپنا ہاتھ پکڑے رو رہی تھی۔
''اسٹوپڈ ہو تم...... جو کام تمہیں سرے سے آتا ہی نہیں وہ کام تم کرتی ہی کیوں ہو؟'' ڈاکٹر عمر ٹیبل پر رکھی ٹھنڈے پانی کی بوتل عجلت میں اٹھا کر لائے اور ایشال کا بازو پکڑ کر اسے کچن کے سنک کی طرف لے آئے اور اس کے ہاتھ پر ٹھنڈا پانی ڈالا جس سے ایشال کو تھوڑا سکون ملا پھر دوڑ کر ٹھنڈے پانی کی دوسری بوتل فریج سے نکال کر لائے اور اسے ایشال کے ہاتھ پر ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے۔
''جلن کچھ کم ہوئی؟'' ایشال روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔

''کم آن ایشو..... تم رونا تو بند کرو..... میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھتا ہوں.....شاید اس میں کوئی مرہم مل جائے۔'' ڈاکٹر عمر اب اس کا بازو پکڑے ڈائننگ چیئر کی طرف آئے.....چیئر گھسیٹ کر انہوں نے ایشال کو بٹھایا اور خود کچن سے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کچن میں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک ٹیوب تھی.....وہ ایشال کے قریب دوسری چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گئے تھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر ٹیوب سے دوا نکال کر لیپ کرتے ہوئے اسے ڈانٹنے لگے۔

''بائے داوے تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟ کیا تم ساری زندگی اسی طرح الٹے سیدھے کام ہی کرتی رہو گی؟'' وہ اس کے رو برو بیٹھے تھے اس کے قریب اور اس کے بالکل سامنے.....ایشال نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ سر جھکائے، اس کا ہاتھ پکڑے..... اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر دوا لگا رہے تھے ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ایشال کا جی چاہا کہ وہ ان سے کہے.....

''میری پرابلم صرف اور صرف آپ ہیں، آپ کی موجودگی میں ہی مجھ سے سارے کام الٹے سیدھے ہوتے ہیں.....'' مگر وہ خاموش رہی..... آج اسے عمر کی ڈانٹ بری نہیں لگی تھی..... جانے یہ دوا کا اثر تھا یا کچھ.....اور.....ایشال کو درد کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''اب کیا فیل کر رہی ہو.....؟ جلن کچھ کم ہوئی؟'' ان کے لہجے میں فکر تھی۔

''جی اب بہتر فیل کر رہی ہوں۔''

''او کے تم مما کے روم میں جا کر آرام کرو۔

آدھے گھنٹے کے بعد یہ ٹیوب ایک بار پھر ہاتھ پر لگا لینا.....اور صبح کسی اسکن اسپیشلسٹ کو چیک کروا لینا انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر عمر نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی اور اپنی بنائی ہوئی چائے کا مگ ہاتھ میں لیے کچن سے باہر نکل گئے۔

ایشال وہیں ڈائننگ چیئر پر بیٹھی..... دوسرے ہاتھ سے مگ اٹھا کر چائے پینے لگی جو ڈاکٹر عمر نے اس کے لیے بنائی تھی۔

چائے پینے کے بعد جب وہ ساجدہ بیگم کے کمرے میں گئی تو وہ جائے نماز تہہ کر رہی تھیں ایشال کے ہاتھ پر لگی ہوئی ٹیوب دیکھ کر وہ پریشانی کے عالم میں اس کی طرف آئیں۔

''ایشو میری بچی..... میری جان یہ..... یہ کیا ہوا ہے تمہارے ہاتھ پر؟'' وہ ازحد پریشان ہوئیں۔

ایشال بیڈ پر بیٹھ گئی..... اس دوران ڈاکٹر عمر ٹراؤزر شرٹ پہنے ان کے کمرے میں داخل ہوئے تھے وہ شاید جوگنگ کے لیے باہر جا رہے تھے۔

''آپ کی بھتیجی کو شوق چڑھا تھا..... اپنے لیے چائے بنانے کا بس اپنا ہاتھ جلا بیٹھیں۔'' ڈاکٹر عمر نے بتایا۔

''او گاڈ..... میری جان یہ کیا کر لیا تم نے؟ تمہیں چائے پینی تھی تو مجھے کہہ دیا ہوتا.....؟ میں اپنی بیٹی کو بنا دیتی۔'' وہ ازحد پریشان ہو گئی تھیں..... ان کی محبت پر ایشال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے.....ساجدہ بیگم ایسی ہی تھیں..... محبت سے گندھی ہوئی..... انہوں نے اپنے دونوں بچوں اور ان دونوں بہنوں میں کبھی کوئی فرق نہیں رکھا تھا.....اب وہ ایشال کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے ازحد پریشان ہو رہی تھیں۔

''پھپو آپ فکر مت کریں..... عمر بھائی نے دوا لگائی ہے، اب بہتر محسوس کر رہی ہوں میں۔'' ایشال نے

انہیں تسلی دی۔
بچپن سے ہی نور منزل میں نوکروں کی فوج نے دونوں بہنوں کو کچن سے ہمیشہ دور ہی رکھا تھا...... انہیں جو کھانا ہوتا جو چاہیے ہوتا وہ اپنے روم میں موجود انٹر کام سے بٹلر کو ہدایت کرتیں وہ چیز اُن کے کمرے میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ گھر کا کسی بھی طرح کا چھوٹا موٹا کام کرنے کی ان دونوں بہنوں کو عادت ہی نہیں تھی...... اور نہ ہی وہ دونوں بہنیں گھریلو امور میں دلچسپی لیتی تھیں جبکہ عمر اور مناب اپنے چھوٹے موٹے کام خود ہی کرلیا کرتے تھے گوکہ ساجدہ بیگم کے گھر میں بھی ملازم ضرور تھے مگر ساجدہ بیگم شروع سے ہی کھانا خود بنایا کرتی تھیں۔ اگلے دو دن وہ اسپتال نہیں گئی تھی۔ شہر کے مشہور اسکن اسپیشلسٹ سے اس کے ہاتھ کا ٹریٹمنٹ ہورہا تھا...... اب وہ تقریباً ٹھیک تھی۔
مناب کے آنے کی خوشی میں عنایہ نے مناب، ایشال اور علینہ کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا...... وہ چاروں نہایت خوشگوار موڈ میں باتیں کرتی ہوئی اپنے لیے مخصوص کرائی گئی ٹیبل پر آگئی تھیں۔ اس مشہور پوائنٹ پر زیادہ تر ان کی طرح برگر فیملیز کے لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ علینہ اور عنایہ نے جینز کے اوپر سلیولیس ٹاپ پہن رکھے تھے...... مناب نے جدید تراش کا پلازو اور گھٹنوں تک آتا لوز سا کُرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کندھوں پر دوپٹا بھی لے رکھا تھا۔ جبکہ ایشال نے بھی ٹائٹس کے ساتھ لانگ شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے گلے میں بھی دوپٹا نظر آرہا تھا۔
''ایشو میں پچھلے کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کپڑوں کے معاملے میں تمہاری چوائس کافی بدل گئی ہے...... یہ دوپٹا وغیرہ گلے میں ڈالنا کب سے شروع کیا تم نے؟'' مناب نے اپنی حیرت کا اظہار کیا...... تو علینہ اور عنایہ ہنسنے لگیں۔
''جب سے اس نے عمر بھائی کا اسپتال جوائن کیا ہے تب سے۔'' علینہ کی بات پر مناب حیران ہوئی۔
''میں سمجھاتی ہوں...... دراصل ایک دن محترمہ ایشو نیرو جینز کے ساتھ ہاف سلیولیس ٹاپ پہن کر اسپتال چلی گئی تھیں اور پھر پندرہ منٹ کے بعد ہی واپس گھر آگئیں۔ کیونکہ عمر بھائی نے انہیں کھری، کھری سنا کر چینج کرنے کے لیے گھر بھیج دیا تھا۔'' عنایہ نے مسکراتے ہوئے مناب کو اطلاع دی تو وہ دھیرے سے مسکرادی مگر بولی کچھ نہیں...... مناب جانتی تھی ایشال اور عنایہ کی بہت آزاد ماحول میں پرورش ہوئی تھی کسی بھی معاملے میں کبھی ان پر کوئی روک ٹوک نہیں کی گئی تھی...... بے شک مناب اور ڈاکٹر عمر خود بھی اس کلاس اور ماحول کا حصہ تھے مگر انہوں نے اپنی زندگی کے کچھ اصول وضوابط بنا رکھے تھے عنایہ اور ایشال نے کبھی دوپٹا نہیں لیا تھا مگر مناب لیتی تھی...... زارون اور اقصم نے بھی نماز نہیں پڑھی تھی مگر عمر باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔
''ہاں تو قصور بھی تو میرا ہی تھا...... مجھے ایسا ڈریس پہن کر اسپتال جانا نہیں چاہیے تھا۔'' ایشال نے تسلیم کیا۔
''اچھا اس دن تو بڑے غصے میں گھر آئی تھیں۔'' عنایہ کو حیرت ہوئی۔
''کچھ چیزوں کے مطلب انسان کو کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوتے ہیں۔'' ایشال نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''لوجی...... مناب مبارک ہو...... تمہاری سوچوں کا اثر ایشو پر بھی ہونے لگا ہے۔'' علینہ کی بات پر مناب نے صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ اسی دوران جو پیزا ان چاروں نے آرڈر کیا تھا وہ آگیا تھا۔ جب وہ وہاں سے نکلیں تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ پارکنگ میں ایشال نے ارسل کو اپنے دوستوں کے ساتھ اسی ریسٹورنٹ

میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ارسل کی بھی اس پر نظر پڑی تھی مگر ارسل کو دیکھتے ہی ایشال کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ شہر کا پوش ایریا تھا۔ ایک وسیع اور عالیشان بنگلے سے ایک قیمتی گاڑی نکلی تو دور کھڑے دو موٹر سائیکل سواروں نے عجلت میں اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے اپنے اور اس گاڑی کے درمیان فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

گاڑی ایک عورت ڈرائیو کر رہی تھی اور وہ اکیلی ہی تھی۔

''ارقم اس بڑھی آنٹی کے ٹھاٹھ تو دیکھ ذرا...... چالیس لاکھ کی تو اس کی گاڑی ہوگی، مان گئے بھئی...... پیسہ اور خوشحالی انسان کو ہمیشہ جوان رکھتا ہے، ہمارے طبقے کی مائیں اس عمر میں غربت، تنگ دستی اور پریشانیوں سے ہماری دادی نظر آتی ہیں۔'' کہنے والے نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''بس استاد اس ملک میں زندگی صرف پیسے والوں کی ہے، وہ پیسوں سے ہم جیسے لوگوں کی مجبوریاں بھی خرید لیتے ہیں اور خوشیاں بھی۔'' بائیک چلانے والے لڑکے نے اپنے پیچھے بیٹھے لڑکے سے اظہار کیا۔

''ہاں یہ تو سچ ہے...... اچھا چھوڑ ان باتوں کو...... اب جلدی فاصلہ کم کر اور بائیک تیز چلا...... یہ نہ ہو کہ یہ مچھلی جال میں پھنسنے کے بجائے ہاتھ سے نکل جائے۔'' اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہ گاڑی کا راستہ روک چکے تھے۔ بائیک پہ پیچھے بیٹھا نوجوان پھرتی سے نیچے اترا تھا اور پھر اس نے کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا عورت کی کمبختی آئی ہوئی تھی جو اس نے شیشہ نیچے کر دیا تھا۔

''جلدی سے اپنا پرس اور موبائل میرے حوالے کرو......'' وہ عورت نہایت خوفزدہ تھی... اس نے حواس باختہ انداز میں انگریزی میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنا پرس اور موبائل کانپتے ہاتھوں سے پستول تانے نوجوان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''جلدی سے یہ انگوٹھیاں اتارو۔'' اس لڑکے کی نظر اس عورت کی انگوٹھیوں پر بھی پڑی۔

''یہ...... یہ میں تم کو نہیں دے سکتی...... پلیز یہ مت لو۔'' اس عورت نے التجا کی۔

''اے جلدی کر بڑھیا...... ورنہ تجھے تیری گاڑی سمیت ابھی اور اسی وقت یہاں سے اغوا کر لوں گا...... اور پھر تیرے گھر والوں کو ان انگوٹھیوں کے ساتھ تاوان کے طور پر دگنی رقم ادا کرنی پڑے گی ہمیں۔'' پستول تانے لڑکا دہاڑا تو اس کی دھمکی پہ اس عورت نے اپنے ہاتھوں سے دونوں ڈائمنڈ رنگز اتار دیں...... جنہیں جھپٹ کر وہ لڑکا عجلت میں بائیک پہ واپس بیٹھا تھا اور بائیک چلانے والے لڑکے نے بائیک بھگا لی تھی۔

''استاد اس آنٹی کے پاس اتنی قیمتی گاڑی تھی وہ بھی ہتھیا لیتے...... ہمارے چار مہینے آرام سے گزر جانے تھے۔''

بائیک چلاتے نوجوان نے اپنے پیچھے بیٹھے ساتھی سے کہا۔

''ارقم تو ابھی اس کام میں نیا، نیا آیا ہے تو نہیں سمجھے گا...... یہ جو امیر لوگوں کی اتنی مہنگی گاڑیاں ہوتی ہیں ناں...... ان کو سیکیورٹی سسٹم لگا ہوتا ہے...... اناڑی بندہ ان کی گاڑی چوری کرلے تو الٹا پکڑا جاتا ہے...... گاڑی چوری ہونے کی صورت میں یہ امیر لوگ سیکیورٹی والوں کو ایک کال کر دیں تو گاڑی راستے میں ہی جام ہو جاتی ہے۔ سیکیورٹی والوں کو یہ تک علم ہو جاتا ہے کہ گاڑی اس وقت کس علاقے میں کس جگہ پر کھڑی ہے...... اور پھر یہ لوگ...... اس علاقے کے تھانے میں فون کھڑکا کر پولیس والوں سے ریڈ کروا کر گاڑی بازیاب کروا لیتے ہیں۔''

''ارے واہ استاد...... اس کا مطلب ہے یہ امیر لوگ بھی اچھے خاصے استاد ہوتے ہیں۔'' بائیک چلاتا ارقم حیران ہوا۔

''میرے ساتھ رہے گا تو اس کام کی اونچ نیچ بھی سمجھ جائے گا...... پیسہ ہو تو کیا نہیں ہو سکتا ارقم آج کل پیسے کی ویلیو ہے انسان کی نہیں بہر حال چل پہلے اپنے ٹھکانے پہ چلتے ہیں پھر بندو خان سے کھانا کھاتے ہیں۔ آج بڑی مچھلی ہاتھ لگی ہے...... عیاشی تو بنتی ہے ناں بھئی......'' بائیک پہ پیچھے بیٹھے نوجوان نے ارقم کے کندھے پر دھپ رسید کی۔

☆☆☆

زارا کو نواں مہینہ لگ چکا تھا۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو وہ آرام کر رہی تھی...... اور زویا ناشتا بنا رہی تھی۔ سارہ کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی...... سیما بیگم پلنگ پر بیٹھی ہاتھوں میں ہزار، ہزار کے نوٹ پکڑے گنتی کرنے میں مصروف تھیں۔ رات ہی گلوان کو چالیس ہزار دے کر گیا تھا...... سیما بیگم کے سامنے کرسی پر بیٹھے شاکر حسین کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔

''ابا ناشتا کر لیں۔'' زویا نے ناشتا بنا کر باپ کے آگے رکھا۔

''اٹھا لو زویا...... ابھی میرا ایمان اتنا کمزور نہیں ہوا کہ میں گلو کی حرام کی کمائی سے پیٹ کی آگ بجھاؤں...... دولت کو اللہ نے قناعت میں چھپا رکھا ہے مگر تمہاری ماں جیسے لوگ اسے عیش و عشرت میں تلاش کرتے ہیں...... اور اپنا سکون، اپنا ایمان بھی کھو بیٹھتے ہیں...... حتیٰ کہ دعا کی قبولیت کو بھی اللہ نے لقمۂ حلال میں چھپا رکھا ہے۔ مگر لوگ اسے حرام ذرائع میں تلاش کرتے ہیں اور پھر ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ زویا بیٹا میں بہت پریشان ہوں اور مجھے اپنی باتوں کے سچ ہونے سے ڈر لگتا ہے۔'' شاکر حسین کے لہجے میں دکھ اور پریشانیاں اور بے بسی پنہاں تھی۔

''ابا دو مہینے ہو گئے ہیں آپ باہر کا کھانا کھا رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بیمار پڑ جائیں گے۔'' زویا کو ان کی فکر ہوئی۔

''زویا بیٹا میری بھوک ویسے بھی مر چکی ہے اب تو زندگی کے چند دن رہ گئے ہیں۔''

''نہیں کھاتے تو نہ کھائیں...... ناشتا اٹھا لو زویا...... تمہارے باپ کو اچھی چیزیں کھانے کی عادت نہیں ہے۔ نہ اچھی زندگی گزاری، نہ اچھی زندگی کی خواہش کی انہوں نے......'' سیما بیگم کے لہجے میں تلخی تھی اور انداز میں بلا کی بے رخی......

زویا نے ناشتا اٹھا لیا اور واپس کچن میں رکھ آئی۔

''ابا مجھے اپنی دوائیوں کی پرچی دے دیجیے گا، میں واپسی پر لے آؤں گی۔'' زویا اسکول جانے لگی تو اس نے باپ سے دوا کی پرچی مانگی۔ جو انہوں نے چپ چاپ لا کر زویا کو تھما دی۔ آج زویا کی تنخواہ ملنی تھی۔ دو مہینے ہو گئے تھے شاکر حسین اپنے کھانے پینے کا تمام خرچ اپنی پنشن سے ہی پورا کر رہے تھے۔ ابھی ان کی پنشن آنے میں دو چار دن باقی تھے اور ان کی شوگر اور بلڈ پریشر کی دوا ختم ہو گئی تھی۔ اور آج تو ان کی طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وقفے، وقفے سے ان کا سر چکرا رہا تھا۔ سیما بیگم نے نوٹ گن کر پرس میں سنبھالے اور پرس اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

''کیسی ماں ہو تم؟ تمہارا بیٹا آئے دن تمہیں ہزاروں روپے تھما کر چلا جاتا ہے۔ کبھی اس سے یہ بھی پوچھا ہے کہ یہ پیسے وہ کس درخت سے اتارتا ہے؟ کہاں سے لاتا ہے اتنا روپیہ......؟ مگر تمہاری آنکھوں پر تو گلو نے

دولت کی جھوٹ اور فریب کی پٹی باندھ رکھی ہے مگر میرا ایمان ابھی مرا نہیں ہے، دولت کی لالچ نے میری آنکھوں کو بند نہیں کیا...... آسائشوں نے میرے دماغ کو ماؤف نہیں کیا...... میں آج ہی گلو کے سیٹھ سے ملنے جاؤں گا...... آج دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔'' شاکر حسین نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''محنت کرتا ہے میرا بیٹا...... کہیں سے چوری کر کے یا ڈاکا ڈال کر نہیں لاتا...... دن رات اس سیٹھ کے ہاں محنت کر کے یہ پیسہ کماتا ہے، آپ کو تو ویسے بھی ہمیں بھوکا مارنے کی عادت ہے۔ ساری زندگی مجھے اور میرے بچوں کو ایک ترستی ہوئی زندگی کے سوا آپ نے دیا ہی کیا ہے؟ اب میرا بیٹا کمانے لگا ہے، میری محرومیاں دور کر رہا ہے تو یہ آپ سے برداشت ہی نہیں ہو رہا......'' پیسے نے سیما بیگم کی آنکھیں بند اور زبان کھول دی تھی۔

''اماں بس کر دیں اب...... گلو کے لیے فکر مند ہونا ابا کا حق ہے، وہ ان کا بیٹا ہے، یہ جاننا ابا کا فرض ہے کہ آخر اتنی بڑی رقم وہ کیسے کماتا ہے کہاں سے لاتا ہے؟'' زویا نے خاموش بیٹھے باپ کی حمایت کی۔

''زویا تو، تو جب بھی بولے گی اپنے باپ کے حق میں ہی بولے گی تجھے تو ویسے بھی گلو سے خدا واسطے کا بیر ہے۔''

''خدا کے لیے اماں...... مت کیا کریں آپ اس طرح کی باتیں...... مجھے بھلا کیا بیر ہوگا گلو سے؟ گلو میرا چھوٹا بھائی ہے اور مجھے اس کی فکر کیوں نہ ہوگی؟'' زویا کو ماں کی بات پر افسوس ہوا تھا۔

''زویا رہنے دو، بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے...... اس کی عقل میں یہ باتیں نہیں آئیں گی...... جب میں اس دنیا میں نہ رہا تب تیری ماں کو میری باتیں یاد آئیں گی...... تب اس کو ان باتوں کے مطلب سمجھ میں آئیں گے...... آج کل تو اس کا دماغ ویسے بھی ساتویں آسمان پر رہتا ہے...... نگہت اور خضر تک کے ساتھ اس کا رویہ بدلا ہوا ہے۔'' شاکر حسین نے غصے سے بیوی کو دیکھا۔

''اچھا تو لگا دیں شکایتیں آپ کو آپ کی میسنی بہن نے میری......'' سیما بیگم نے تڑخ کر جواب دیا۔
''اس نے کوئی شکایت نہیں لگائی...... میں اندھا نہیں ہوں، خود دیکھ رہا ہوں تمہارے انداز و اطوار......''
''اماں آپ کو نگہت پھپو کے ساتھ اپنا رویہ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... اس دن بھی جب وہ مٹھائی لے کر آئیں تو آپ ان سے ایسی ہی عامیانہ باتیں کرنا شروع ہو گئی تھیں۔'' زویا نے اندر کے شکوے کو اظہار بنایا۔
''میری باتیں تو شروع سے ہی عامیانہ لگتی ہیں...... تم باپ، بیٹی نے تو ویسے بھی پی ایچ ڈی کر رکھی ہے...... فلسفہ پڑھ رکھا ہے......'' سیما بیگم غصے میں بولتی اٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔ زویا نے سر تھام لیا۔
''زویا بیٹا تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے...... تمہاری ماں تو الٹے دماغ کی عورت ہے اس کے سامنے سیدھی بات کرنا فضول ہے، پچیس سال سے میں اس کے ساتھ دماغ کھپا رہا ہوں...... یہ نہ بدلی اور نہ بدل سکتی ہے......'' شاکر حسین نے بے بسی سے کہا۔ اس دوران دوسرے کمرے سے سارہ بھی تیار ہو کر آگئی تھی۔
''زویا آپی مجھے ناشتا بنا دیں...... مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے اس گھر کے بکھیڑے تو زندگی بھر ختم ہونے والے نہیں...... کم از کم یہاں سے نکل کر ذہنی سکون تو ملے گا۔'' سارہ بھی صبح ہی صبح گھر میں شروع ہونے والے ڈرامے سے گھبرا کر زویا سے مخاطب ہوئی تو زویا چپ چاپ اٹھ کر کچن میں آگئی اور بہن کے لیے ناشتا بنانے لگی۔
زویا آج دل میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آج وہ ہر حال میں ابا کے ساتھ ڈیفنس میں گلو کے بتائے اس ایڈریس پر ضرور جائے گی جہاں گلو کے مطابق وہ کسی سیٹھ کا ڈرائیور تھا۔

☆☆☆

سارہ کالج آئی تو آدھے گھنٹے کے بعد اسجد کی کال آگئی...... سارہ کالج آتے ہی موبائل آن کر لیا کرتی تھی، فری پیریڈ میں وہیں موبائل چارج کر لیتی......
''لو جی آگیا تمہارے اسجد کا فون...... کم از کم ایک گھنٹا تو تم فارغ نہیں ہو گی......'' حنا اس کے ساتھ بیٹھی تھی اسجد کی کال آتی دیکھ کر وہ کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ہیلو...... صبح بخیر......'' حنا کے اٹھتے ہی سارہ نے کال پک کی۔
''صبح بخیر کیسی ہو میری جان...... بلکہ جانِ اسجد......'' سارہ مسکرا دی...... اسجد ایسے ہی پیار سے اس سے مخاطب ہوتا تھا۔
''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟''
اسجد نے ایک طویل سانس لی۔
''تمہارے بغیر اداس، پریشان...... اور افسردہ رہتا ہوں اور ویسے بھی ایک عاشق کو اپنی محبوبہ کی جدائی میں یہی چیزیں تو ملتی ہیں...... جو اس کی بھوک کو ختم کر دیتی ہیں، اس کی نیندیں چھین لیتی ہیں اور اس کا سکون لے اڑتی ہیں۔'' اس کے بے ساختہ اظہار پر سارہ کے لبوں پر دھیمی سی خوب صورت مسکراہٹ ٹھہر گئی۔
''آپ بالکل شاعروں والی باتیں کرتے ہیں...... اور ویسے بھی...... ابھی تین دن پہلے ہی تو ہم ملے تھے...... آپ اتنی جلدی میرے لیے اداس بھی ہو گئے......؟''
''ارے پگلی تمہیں کیا معلوم ایک مجنوں کے لیے اپنی لیلیٰ سے جدائی کے یہ تین دن تین صدیوں کے برابر ہوتے ہیں...... محبت میں دلِ ناداں پہ جدائی کا ایک، ایک لمحہ صدیوں کے برابر محسوس ہوتا ہے...... مگر تم کیا جانو

سارہ...... عشق تو میں نے کیا ہے تم سے...... تم نے تھوڑی کیا ہے، مجھ سے؟'' آخری جملہ اس نے سارہ کو چڑانے کے لیے بولا تھا۔

''اچھا تو یہ جو میں آپ سے فون پر اتنی لمبی، لمبی باتیں کرتی ہوں...... اپنے گھر والوں سے اور دنیا والوں سے چھپ، چھپ کر آپ سے باہر ملتی ہوں...... اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آپ سے اکیلے میں ملتی ہوں...... یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے بھلا......؟'' سارہ نے برا منایا تو دوسری طرف اسجد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''قسم سے میری جان تمہیں چھیڑنے اور چڑانے میں بہت مزہ آتا ہے جواباً تمہارا یہ جلا کٹا اندازِ محبت دیکھ کر...... میرا دل مجھ سے الٹی سیدھی فرمائشیں کرنے لگتا ہے۔'' اسجد نے جذباتی لہجے میں کہا...... تو وہ بلش ہوگئی۔

''اپنے دل کو سمجھائیں کہ یہ الٹی سیدھی فرمائشیں ابھی مت کرے۔'' شرم سے سارہ کا لہجہ دھیما ہوگیا تھا۔

''سمجھا، سمجھا کر تھک گیا ہوں میری جان...... مگر کیا کروں تمہاری طرح ضدی ہوگیا ہے میرا دل...... اب یہ آسانی سے میری بات نہیں مانتا......'' اس کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔

''اچھا......؟ تو میں نے آپ کی کون سی بات نہیں مانی......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''تم جانتی تو ہو...... اب انجان بن رہی ہو...... پرسوں میں تمہیں اپنے گھر لے کر جانا چاہتا تھا، اپنی ماں سے ملوانا چاہتا تھا مگر تم نے انکار کر دیا تھا۔'' اسجد نے شکوہ کیا۔

''اسجد اس سے ایک دن پہلے ہی تو ہم باہر ملے تھے...... میں روز، روز آپ سے نہیں مل سکتی...... زویا آپی مجھے آج کل مشکوک نظروں سے دیکھتی ہیں...... کالج سے ذرا دیر ہوجائے تو وہ سو، سو سوال کرتی ہیں مجھ سے...... بلکہ پچھلے دنوں تو وہ کہہ رہی تھیں مجھے تم حنا کے پارلر لے چلو۔'' سارہ اسے تفصیل بتاتے ہوئے خود بھی پریشان ہوئی۔

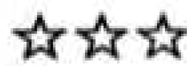
''میری جان اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے، تم حنا کو ساری بات بتا دو...... تاکہ زویا آپی جب بھی حنا سے ملیں تو کم از کم حنا جھوٹ تو ڈھنگ سے بول سکے۔'' اسجد نے اسے مشورہ دیا۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

''اوکے جانِ اسجد...... اب میں فون رکھ رہا ہوں...... دس بجے تیار رہنا، میں کالج کے گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔''

''مگر اسجد...... یہ...... یہ ممکن...... نہیں ہے، آج کل گیٹ پر کافی سختی ہوگئی ہے۔''

''کوئی اگر مگر نہیں...... میں آج تمہیں اپنی امی سے ملوا کر ہی رہوں گا۔'' اسجد نے حتمی فیصلہ سنایا اور فون بند کر دیا۔



زارون چوہدری کو ملائشیا گئے دو مہینے ہو چکے تھے...... وہاں فیکٹری لگانا اپنے بزنس کی ٹریڈ کو بیرون ملک آگے بڑھانے کا تجربہ نہایت کامیاب رہا تھا...... زارون چوہدری اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے داؤد ٹیکسٹائل کے ساتھ، ساتھ زارون ٹیکسٹائل کو بھی اپنی محنت اور قابلیت سے روز بروز ترقی کے سفر پر گامزن کر رہا تھا، اس کی شخصیت ہی کچھ ایسی سحر انگیز تھی...... جب سے اس نے داؤد چوہدری کا بزنس جوائن کیا تھا...... اس کی اندرون ملک یا بیرون ملک میں کسی بھی بزنس پارٹی سے کی جانے والی میٹنگ ناکام نہیں ہوئی تھی...... وہ مقابل کو بہت جلد قائل کر لینے کا ہنر جانتا تھا اس نے ہارورڈ سے ایم بی اے کیا تھا اور اپنے باپ کے بزنس کو کہاں سے

کہاں پہنچا دیا تھا۔ عنایہ کو اس کی آمد کا شدت سے انتظار تھا...... اس کی اطلاع کے مطابق تو زارون کو چار دن کے بعد ملائشیا سے واپس آنا تھا مگر وہ ماں، باپ کو اعتماد میں لے کر راز داری سے عنایہ کو سرپرائز دینے کے لیے آج ہی دوپہر تین بجے کی فلائٹ سے واپس آ رہا تھا۔

داؤد چوہدری نے آفس سے ہی ڈرائیور ائرپورٹ بھیج دیا تھا۔

علامہ اقبال انٹرنیشنل ائرپورٹ سے نکل کر زارون اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا...... راستے میں اس نے فلاور شاپ پر گاڑی رکوا کر عنایہ کے لیے ایک خوب صورت سی بڑے سائز کی فلاور باسکٹ تیار کروائی تھی۔

ڈرائیور نے فلاور باسکٹ گاڑی میں پیچھے بیٹھے زارون کے ساتھ خالی سیٹ پر رکھ دی تھی۔ زارون نے پچھلی سیٹ کی پشت پر سر ٹکا لیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے لب مسکرا رہے تھے۔

اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر عنایہ کا ردِعمل کیا اور کیسا ہونے والا تھا؟ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا...... شاید اسی لیے وہ تصور ہی تصور میں وہ منظر دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

زویا آج اسکول سے جلدی گھر آ گئی تھی۔ شاکر حسین نے محلے میں کریانے کی دکان والے صاحب سے چند گھنٹوں کے لیے موٹر سائیکل مانگ لی تھی۔ لہٰذا شاکر حسین اور زویا کو گھر سے نکلے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

ڈیفنس کے ایک، ایک بلاک میں انہوں نے گلو کے بتائے فرضی ایڈریس اور اس کے فرضی سیٹھ کے بارے میں پتا کیا تھا...... وہ باپ، بیٹی جس کوٹھی جس بنگلے کے سامنے رکتے وہاں کسی گھر کا گن مین...... کسی کا واچ مین...... اور کسی کا ملازم یا لان میں کام کرتا مالی یہی بتاتا کہ یہ ایڈریس غلط ہے اور یہاں کوئی غلام مرتضیٰ نامی سیٹھ نہیں رہتا...... وہ ایک فرضی پتا تھا جو گلو نے کسی سے لکھوا کر تسلی کے لیے شاکر حسین کو تھما دیا تھا۔ وہ ازحد مایوس ہوئے تھے...... ان کا شک درست ثابت ہوا تھا ان کا بیٹا گلو یقیناً غلط ہاتھوں میں کسی غلط جگہ پر ناجائز طریقے سے نوٹ کما رہا تھا۔ یہ احساس اتنا ہولناک تھا کہ شاکر حسین کو بڑھاپے میں ذلیل و خوار کر کے مارنے کے لیے کافی تھا...... آج صبح سے ہی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، گلو کے جھوٹ نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ ان کی شوگر غم سے لو ہو رہی تھی پورا جسم جیسے بے جان ہو رہا تھا اور دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ہمت جمع کر کے وہ موٹر سائیکل چلا رہے تھے...... زویا باپ کی ذہنی حالت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ جب ہی زویا ان کے پیچھے بائیک پر بیٹھی دھیرے سے بولی۔

''ابا پلیز آپ ٹینشن مت لیں...... یہ ضروری نہیں کہ جو ہم سوچ رہے ہوں وہ سچ بھی ہو...... کیا پتا سیٹھ کا ایڈریس دیتے ہوئے گلو سے کوئی غلطی ہو گئی ہو؟''

''مجھے جھوٹی تسلیاں مت دو زویا...... میں تمہارا ابا ہوں اور مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو...... گلو نے ہم سب سے جھوٹ بولا ہے...... مجھے پہلے ہی شک تھا مگر آج یقین ہو گیا ہے۔ گلو ضرور کسی غلط دھندے میں ملوث ہے۔'' ان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''ایک غلط عورت...... ناشکری عورت...... اللہ پر توکل نہ رکھنے والی عورت...... دولت کے لالچ میں اندھی ہو کر حلال و حرام کا فرق بھول جانے والی نے میری ساری زندگی عذاب بنائے رکھی، نہ جانے یہ میرے کس گناہ کی سزا تھی۔ جسے میں نے پچیس سال بھگتا...... اور اب...... اب بڑھاپے میں میرے اکلوتے بیٹے نے میرا منہ کالا کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔'' شاکر حسین آبدیدہ لہجے میں بول رہے تھے، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے...... ان کی باتیں زویا کو اندر سے چیر رہی تھیں...... ایک دو جگہ موٹر سائیکل لڑکھڑائی تھی مگر بروقت شاکر حسین سنبھل

جاتے...... انہیں چکر آرہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر زویا دل ہی دل میں خیروعافیت سے گھر پہنچنے کی دعائیں مانگ رہی تھی...... وہ ریزیڈینشل ایریا سے نکل کر مین روڈ کی طرف جا رہے تھے جب شاکر حسین کو شوگر لو ہونے کی وجہ سے ایسا شدید چکر آیا کہ ان سے موٹر سائیکل بے قابو ہو کر سامنے سے آتی گاڑی سے ٹکرا گئی...... جس کے نتیجے میں شاکر حسین اور زویا سڑک پر جا گرے تھے...... زویا کے گھٹنوں اور بازوؤں پر چوٹ آئی تھی جبکہ شاکر حسین کا سر سڑک پر لگنے کی وجہ سے ان کے دماغ پر کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئے تھے...... وہ ہیلمٹ بھی نہیں پہنے تھے۔

''ابا... ہوش میں آئیں ابا۔'' زویا اپنی تکلیف بھول کر ان کی طرف لپکی تھی اور چیختے ہوئے انہیں جھنجوڑنے لگی تھی مگر وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ ہو چکے تھے۔

اسی اثنا میں اس قیمتی گاڑی کا پاور ونڈو شیشہ نیچے ہوا تھا۔

''الو کے...... اندھے ہو گیا...... ؟ موٹر سائیکل کیا آنکھیں بند کر کے چلاتے ہو؟'' ڈرائیور نے بے ہوش پڑے شاکر حسین کو گالیاں دیں۔

''چھوڑو فیاض...... یہ غریب لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں...... یہ (گالی) چیپڑ ہوتے ہیں...... یہ لوگ جان بوجھ کر ہم جیسوں کی گاڑیوں سے ٹکراتے ہیں تا کہ ہم سے ہمدردی کے طور پر پیسے وصول کر سکیں۔'' وہ امیرزادہ جو کوئی بھی تھا نہایت غصے اور تنفر میں ان دونوں کو سخت سست سنا رہا تھا۔

زویا دوڑ کر گاڑی کے قریب آئی تھی۔

''سر پلیز...... پلیز میرے والد کو کسی قریبی اسپتال پہنچا دیں...... ہمیں کچھ نہیں چاہیے پلیز سر صرف میرے والد کو...... دیکھیں ان کی حالت سیریس ہے...... سر پلیز...... ہماری مدد کریں۔'' زویا روتی ہوئی اس مغرور شخص کے آگے ہاتھ جوڑ کر مدد کی درخواست کر رہی تھی۔

''ہیلپ...... ؟ مائی فٹ...... فیاض گاڑی آگے بڑھاؤ...... دیر ہو رہی ہے ہمیں۔'' اس شخص نے رعونت بھرے لہجے میں اپنے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کو کہا تو زویا گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑی اس شخص سے التجائیں کرنے لگی۔

''سر پلیز...... میرے والد کی حالت سیریس ہے، انہیں ہوش نہیں آ رہا خدا کے لیے...... میری مدد کریں...... پلیز...... میرے والد کو صرف کسی قریبی اسپتال پہنچا دیں۔'' زویا زاروقطار رو رہی تھی فریاد کر رہی تھی۔

''صاحب اسے تھوڑے سے پیسے دے دیں...... اور جان چھڑائیں۔'' ڈرائیور نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے اپنے جھنجلائے ہوئے مالک کو مشورہ دیا۔ انہوں نے والٹ نکالا...... پانچ، پانچ سو کے اور ہزار، ہزار کے کئی نوٹ نکال کر گاڑی کے شیشے سے تھوڑا ہاتھ باہر لے کر زویا کو دینے چاہے...... مگر زویا نے وہ پیسے نہیں پکڑے تھے۔ اس شخص نے وہ پیسے زویا کی جانب اچھال دیے تھے...... اور گاڑی کا پاور ونڈو شیشہ بند ہو گیا تھا۔

''فیاض بہت ہو گیا یہ تماشا...... گاڑی آگے بڑھاؤ ہمیں دیر ہو رہی ہے، یہ لڑکی بلاوجہ ہمارا ٹائم ویسٹ کر رہی ہے۔'' ڈرائیور نے سر ہلایا اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ زویا وہیں کھڑی رو رہی تھی۔ نوٹ سڑک پر بکھر چکے تھے، وہ شاندار گاڑی زویا کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی...... وہ دوڑ کر ایک بار پھر سڑک پر بے ہوش پڑے باپ کی طرف لپکی...... وہ چیخ چیخ کر انہیں جھنجوڑتے ہوئے آوازیں دے رہی تھی۔''

''ابا...... ابا ہوش میں آئیں۔'' آہستہ آہستہ اس کے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا...... کچھ لوگ

سڑک سے نوٹ اٹھانے میں مصروف تھے کسی نے شاکر حسین کے لبوں سے پانی کا گلاس لگایا تھا اور کسی نے فون کر کے ایمبولینس منگوالی تھی۔

ایمبولینس کے آتے ہی لوگ شاکر حسین کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں لے جانے لگے...... انہیں فوری طور پر آکسیجن لگادی گئی تھی۔

زویا اب ساکت و جامد...... ایمبولینس میں اپنے باپ کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں اور نظریں زخمی باپ پر جمی ہوئی تھیں...... وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے باپ کے بے جان وجود اور زرد چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اسجد اور سارہ ہمیشہ کسی کیفے میں...... کسی پارک یا کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں ملتے تھے مگر اس بار اسجد نے سارہ کو اپنی محبت کی قسمیں دے کر اسے اپنے گھر آنے کو کہا تھا...... شاید وہ سارہ کو اپنی ماں سے ملوانا چاہتا تھا۔ اسجد نے سارہ کو کالج سے پک کرلیا تھا...... پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایک درمیانے درجے کے رہائشی علاقے میں داخل ہو چکے تھے سارہ نے چہرے پر نقاب چڑھا رکھی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ ایک گھر کے سامنے رک گئے تھے۔ اسجد نے جیب سے چابی نکال کر گیٹ کا لاک کھولا...... سارہ نے حیرت سے اسجد کو دیکھا۔

''آپ کی امی گھر پر ہیں تو آپ ایسے لاک کیوں کھول رہے ہیں......؟ آپ سیدھی طرح ڈور بیل دے دیتے؟''

''میری جان...... میری معصوم سارہ اسجد...... امی کا جب سے بائی پاس ہوا ہے وہ بار، بار اٹھ کر دروازہ نہیں کھول سکتی ہیں...... اس لیے ابو نے اور میں نے الگ، الگ گیٹ کی چابی اپنے پاس رکھی ہوئی ہے...... امی کو گیٹ پر آنا نہیں پڑتا اور ہم دونوں آسانی سے چابی لگا کر اندر آجاتے ہیں......'' اسجد نے اسے تفصیل بتائی اور اسے اندر لے آیا۔

''آپ کے گھر میں کتنی خاموشی ہے ناں......؟'' گھر کے اندر خاموشی کا راج تھا...... سارہ کو حیرت ہوئی۔

''ہاں خاموشی تو ہے...... عنقریب اس خاموشی کو ہمارے بچے اپنی قلقاریوں سے توڑ دیں گے۔'' اسجد نے سارہ کو اپنے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی تو سارہ جھینپ گئی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ...... چھوڑیں مجھے، آپ کی امی نے دیکھ لیا تو کیا سوچیں گی وہ......؟'' سارہ نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔

''تمہیں ہمیشہ لوگوں کا ڈر ستاتا رہتا ہے کہ فلاں نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔'' اسجد نے مصنوعی خفگی سے سارہ کو دیکھا۔

''اچھا اب چھوڑیں ان باتوں کو...... اب اندر بھی چلیں......'' سارہ نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں بھئی چلو......'' اسجد نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے گھر کے اندر لے آیا...... گھر کے اندر بھی اسی طرح خاموشی کا راج تھا۔

''آپ کی امی کہاں ہیں اسجد......؟'' سارہ نے ٹی وی لاؤنج پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''میں دیکھتا ہوں...... امی اپنے کمرے میں ہوں گی۔'' اسجد ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سارہ صوفے پر بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی...... اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ عنقریب اسے اس گھر پر حکمرانی کرنا تھی...... اب وہ اٹھ کر دیواروں پر لگی فریمڈ فیملی تصویریں دیکھنے لگی تھی۔

''یار تم ابھی تک کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ میری جان۔'' وہ اسجد کی آواز پر چونک کر مڑی۔

''تمہاری امی......؟''

''میری جان ایک مسئلہ ہو گیا ہے......'' اسجد کچھ پریشان سا دکھائی دیا۔

''کیسا مسئلہ......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''امی گھر پر نہیں ہیں، میں نے چونکہ انہیں تمہاری آمد کا بتایا نہیں تھا دراصل میں تمہیں یہاں اچانک لا کر سرپرائز دینا چاہتا تھا امی کو......لیکن امی چھوٹی خالہ کی طرف گئی ہوئی ہیں...... میں نے ابھی انہیں فون کیا ہے......تو مجھے پتا چلا کہ امی تو ایک گھنٹا پہلے ہی گھر سے نکلی ہیں اب اتنی جلدی ان کی واپسی ممکن نہیں ہے۔'' وہ شرمندہ سے انداز میں سارہ کو تفصیل بتا رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں اسجد......آپ پریشان نہ ہوں...... میں پھر کبھی آ کر ان سے مل لوں گی۔'' سارہ نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''تم......تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئی ناں......؟'' اسجد نے محبت سے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

''نہیں اسجد میں بھلا آپ سے کیوں ناراض ہوں گی؟'' سارہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''تھینکس گاڈ، تم خفا نہیں ہوئی ہو مجھ سے۔'' اسجد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اسجد اب ہمیں چلنا چاہیے......آپ کی امی بھی گھر پر نہیں ہیں۔''

''ہاں چلتے ہیں میری جان...... پہلے اپنا یہ گھر تو دیکھ لو...... جہاں تمہیں میری دلہن بن کر آنا ہے۔'' اسجد نے محبت بھرے انداز میں فرمائش کی تو سارہ مسکراتے ہوئے سر ہلا گئی۔ پھر اسجد اس کا ہاتھ تھامے اسے گھر دکھانے لگا...... بلاشبہ اسجد کا گھر شاندار فرنیچر خوب صورت پردوں اور سلیقے کے ساتھ رکھی گئی چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ آخر میں وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک کمرے میں لے آیا۔

''یہ تمہارا اور میرا بیڈ روم ہے۔ ہماری محبت بھری زندگی کی آرام گاہ......''

اسجد نے محبت سے سارہ کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بتایا تو وہ بلش ہو گئی...... ڈبل بیڈ کی پچھلی دیوار پر اسجد کی ایک بڑے سائز کی ہنستی مسکراتی تصویر آویزاں تھی۔

''سارہ اس جگہ پہ ہم اپنی شادی کی تصویر لگائیں گے......اور اس دیوار پر ہم اپنے ہنی مون کی تصویر لگائیں گے اور یہاں پر......''

وہ سارہ کو اپنی بانہوں میں لیے دروازے کی طرف پلٹا...... ''یہاں پر اس دروازے پر ہم اپنے بچے کی پینا فلیکس تصویر لگائیں گے...... کیا خیال ہے تمہارا؟'' اسے اپنے کان کے قریب اسجد کی سرگوشی سنائی دی......سارہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا......شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔

''اسجد اب چلیں ناں...... ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' سارہ نے ٹاپک بدلا۔

''تمہیں ہمیشہ جانے کی جلدی ہوتی ہے بس آج تم میری مرضی سے واپس جاؤ گی۔'' اسجد نے فرمائش کی۔

''مگر اسجد پلیز ایسا......'' سارہ نے کچھ بولنا چاہا تو اسجد نے اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''سارہ میری جان......! کیا تم تھوڑا سا ٹائم میرے ساتھ میرے اس غریب خانے میں نہیں گزار سکتیں؟ جب تک ہماری شادی نہیں ہوتی......تب تک میں اس کمرے میں تمہارے ساتھ گزرے اس وقت کو یاد کر کے آنے والے دن گزارتا رہوں گا...... پلیز سارہ...... میری خاطر...... تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔'' اسجد کے لہجے میں

بے پناہ محبت تھی...... التجا تھی فریاد تھی...... فرمائش تھی ۔سارہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے اب اگر اس مہمان کو روک ہی لیا ہے تو اس کی خاطر مدارات بھی تو کرو......'' سارہ کی بات پر وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔اسجد نے بڑے سائز کی ٹرے (جس میں کئی لوازمات رکھے ہوئے تھے) سینٹرل ٹیبل پر رکھی اسجد نے جوس کا گلاس سارہ کی طرف بڑھایا......اور خود بھی گلاس لے کر سارہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''اسجد اس کا ٹیسٹ تھوڑا ڈیفرنٹ ہے۔'' سارہ جوس کا آدھا گلاس ہی پی سکی تھی۔

''میری جان یہ امپورٹڈ جوس ہے، اس کا ٹیسٹ ڈیفرنٹ ہوتا ہے ناں......تم پیو ناں...... رک کیوں گئیں؟'' اسجد نے وضاحت دی اور خود بھی مشروب پینے لگا۔

''سارہ یہ کٹلس اور چکن رول امی نے بنائے تھے......چکھو تو سہی......تم تو کچھ بھی نہیں کھا رہی ہو؟''

''جب میں آپ کے ساتھ ہوتی ہوں تو مجھے بالکل بھی بھوک نہیں لگتی، آپ کی محبت کے سوا کچھ اچھا نہیں لگتا مجھے۔'' سارہ نے خالی گلاس ٹرے میں رکھا۔اسجد بھی گلاس خالی کر چکا تھا۔

''سارہ کبھی، کبھی مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اس دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہوں جسے اپنی محبت کے بدلے میں اتنی محبت ملی ہے۔'' اسجد نے محبت سے چور لہجے میں اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ اس کے بے پناہ قریب تھا اتنا کہ اس کی سانسیں سارہ کو اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں......سارہ کی نظریں خود بخود شرم سے جھک گئیں۔

اسجد نے دھیرے سے اس کے سر سے چادر ہٹادی......اب اس کا ہاتھ سارہ کے بالوں میں گردش کر رہا تھا......پھر دھیرے سے اسجد نے اس کا کیچر بالوں سے اتار دیا......سارہ کے ریشمی سیاہ بال اس کی کمر پر بکھر گئے۔آہستہ آہستہ وہ بہکنے لگا۔

''اسجد......اب بہت دیر ہوگئی ہے......ہمیں چلنا چاہیے۔'' اگلے ہی لمحے سارہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسجد نے اسے کلائی سے پکڑ کر دوبارہ اپنے پاس بٹھالیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے میری جان؟ مجھے اور میری محبت کو اپنے حسن سے سیراب ہو لینے دو۔'' اسجد نے اس کی چادر ہٹانی چاہی۔

''اسجد یہ......یہ کیا کر رہے ہیں؟'' سارہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا تھا......اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''کم آن میری جان، تم خواہ مخواہ ڈر کیوں رہی ہو؟'' اسجد اس کے قریب تر تھا۔

''اسجد......یہ......کک......کیا......'' سارہ کی سانسیں اتھل پتھل ہوئیں۔

''ششش......اب اور کوئی بات نہیں......'' اسجد نے مخمور لہجے میں اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

سارہ نے آخری بار اس کا حصار توڑنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اسجد کی محبت نے بے بس کر دیا تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد سارہ کا سر نیند سے بوجھل ہونے لگا تھا۔

(...ری ہے)

مدیحہ ایک ہاتھ کی پشت سے آنکھیں ملتی اور دوسرے سے جمائی روکتی کمرے سے باہر آئی تو بڑے سے صاف ستھرے صحن میں آتی سردیوں کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اماں صفائی کر چکی ہیں...... اس نے شرمندگی سے پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ جہاں بچھے تخت پر گاؤتکیے سے ٹیک لگائے زاہدہ پھپو اپنی بہت پرانی ملنے والی کے ساتھ پُرسکون انداز میں بیٹھی تھیں اور مدیحہ کو یقین تھا کہ وہ

دونوں اس وقت اپنے ،اپنے جسم میں اٹھنے والے دردوں کا پُردرد حال ایک دوسرے سے بیان کر رہی ہوں گی اور اس صدمے سے نڈھال ہوئی جا رہی ہوں گی کہ ان کے گھر والوں کو ان کی تکلیف کا احساس کبھی نہیں ہوسکتا، اس کا انداز تو کوئی درد والا ہی کر سکتا ہے بھلا کسی اور کو کیا خبر کہ گھٹنوں میں اٹھنے والی ٹیس کیسے تڑپاتی ہے اور کمر میں آئے دن آنے والی چک کیسے راتوں کی نیند اڑا دیتی ہے۔

بُرا آپا

ثریا انجم



زاہدہ پھپو کی سہیلی کا آنا ہر دوسرے چوتھے روز معمول تھا لہٰذا مدیحہ انہیں دور ہی سے سلام کر کے صحن کے کونے میں لگے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی...... آج اس نے کالج کی چھٹی کی تھی، اس کا ارادہ تھا کہ دیر تک سوئے گی اور پھر فریش ہو کر ارم کے گھر جائے گی جس کو رنگت نکھارنے کا کوئی نیا نسخہ ہاتھ لگا تھا جس کے استعمال کے بعد وہ صرف ایک ہفتے میں گوری، گوری ہوگئی تھی۔ مدیحہ کو یقین تھا کہ ذرا سی کوشش سے وہ ارم سے یہ قیمتی راز اگلوانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

ویسے تو ٹی وی کے سارے ہی چینل اپنے مارننگ شوز میں ایک قومی فرض سمجھ کر روزانہ ہی تھوک کے حساب سے بال بڑھانے، رنگ گورا کرنے اور ناک نقشہ بدلنے کے طریقے سکھا رہے ہوتے ہیں...... مگر وہ سب سننے اور اسکرین پر دیکھنے کی حد تک تھے مگر ارم کی سنولاہٹ مائل گندمی رنگت کو سفیدی میں بدلتا دیکھنا ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ تھا جس نے پہلی بار مدیحہ کے دل میں بھی گورا ہونے کی خواہش کو اس طرح انگڑائی لے کر بیدار کیا جیسے قوم کا سویا ہوا ضمیر کسی منفی پروپیگنڈے پر ہڑبڑا کر جاگتا ہے اور پھر اسے واپس سلانے کے لیے حکومت کو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور مدیحہ کو بھی یہی خوف تھا کہ اگر اس کی نئی، نئی خواہش کی جگار کی بھنک بھی اماں کو مل گئی تو وہ بھی اپنی طاقتور زبان اور دو ہتھڑوں کی بارش کا استعمال کرنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہیں لگائیں گی۔ حالانکہ ان کی پیدائش بعد از تقسیم کی تھی مگر ان کے خیالات اسی دور میں چکراتے پھرتے تھے جب اولاد کو قدم اٹھانے سے پہلے ماں، باپ سے اجازت لینی ہوتی تھی کہ پہلے دایاں پاؤں اٹھائیں یا بایاں یوں تو مدیحہ کو ان کے خیالات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا مگر وہ اس وقت سے ڈرتی تھی جب اس کا بازو ان کی شکنجے جیسی گرفت میں ہوتا اور دوسرا ہاتھ ایسے دھڑا دھڑ اس کی کمر پر برستا کہ وہ کئی گھنٹوں کے لیے اس خیال میں غرق ہو جاتی کہ اگر سگی ماں ایسی ہوتی ہے تو سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہوگی اور یہی خیال اسے اپنے ابا، اماں کی طویل ازدواجی زندگی کے لیے دعا کرنے پر مجبور کر دیتا کیونکہ ابا سے کچھ بعید نہیں تھی کہ وہ اماں کے اِدھر اُدھر ہوتے ہی سر پر سہرا نہ سہی گلے میں ہار ڈالنے کو تیار ہو جاتے۔

بس ذرا صابن ہاتھوں پر رگڑ کر اس نے بہت نرمی سے وہی ہاتھ چہرے پر مل لیے، اس لیے نہیں کہ اشتہار والی حسینہ بڑی ادا سے کہتی ہے۔ ''بس ذرا سا......'' بلکہ اس لیے کہ اماں کی عقابی نگاہیں واش بیسن پر دھرے صابن کو ہر وقت اپنے حصار میں رکھتی تھیں۔

''پچاس روپے کی بٹی ہے، دو دن میں گھول کر ختم نہ کر دینا۔'' وہ جب بھی منہ دھونے لگتی اسے یہ ہدایت نامہ سننا پڑتا۔

واش بیسن کے اوپر... دیوار میں لگے آئینے میں اپنا چمکتا چہرہ دیکھ کر اسے دلی اطمینان ہوا کہ اس کی رنگت اب بھی ارم کے ٹوٹکوں سے گورے ہوتے رنگ سے بہتر تھی مگر تھوڑا اور گورا ہونے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

''اری مدو کب تک شیشے کے سامنے کھڑی رہے گی۔ بلقیس کب سے آئی بیٹھی ہے ذرا چائے ہی بنا دے۔'' زاہدہ پھپو کی نزلے سے متاثرہ آواز پر وہ چونک کر مڑی، وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا گھٹنا دباتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں سے چھلکتی محبت ہمیشہ کی طرح اسے موم کر گئی۔

''ابھی لائی پھپو......'' اس نے جھٹ سے تولیا الگنی پر ڈالا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں اماں پریشر ککر بھر کر دال چڑھا چکی تھیں اور اب آلو چھیل رہی تھیں۔ اسے اندر آتا دیکھ کر ان کی تیوری کے بل اور گہرے ہوگئے۔

''ہوگئی لاڈو کی سویر......'' انہوں نے حسبِ عادت طنزیہ لہجے میں اس کا خیر مقدم کیا۔

''اماں چاہے دیر سے ہو، سویر تو ہونی ہی ہے سو ہوگئی۔'' لاڈو کو بھی ڈھٹائی میں کمال حاصل تھا۔

''اچھا زیادہ بک، بک کرنے کی ضرورت نہیں

جلدی سے چائے بنا کر چولھا خالی کرو تو میں آلو کی قتلیاں بنالوں، اب بلقیس آپا آئی ہیں تو کھانا تو کھا کر ہی جائیں گی۔''

چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر مدیحہ نے بڑے پیار سے اماں کی طرف دیکھا جواب پورے انہماک سے آلوؤں کے چھلکے اتار رہی تھیں۔

''مگر اماں بلقیس پھپو کے لیے صرف دال اور آلو......''اس کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اماں نے چھری پٹخ کر سبزی کی ٹوکری دور کھسکا دی۔

''تو کیا اپنا کلیجا بھون کر اُن کے سامنے رکھ دوں......'' ان کی آواز میں غصے سے زیادہ بے بسی تھی مدیحہ نے شرمندگی کے گہرے احساس میں گھر کر سر جھکالیا...... مہینے کا آخر چل رہا تھا۔ ابا کی مختصری تنخواہ کب کی ختم ہو چکی ہوگی یہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔

''میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا تھا۔'' اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے چائے کی پتی کا ڈبا کھولا۔

''پتی ذرا دیکھ کر ڈالنا ابھی پورا مہینہ پڑا ہے۔''

اماں کے مہینے کے باقی رہ جانے والے چار دنوں کو پورا مہینہ کہنے پر بے ساختہ ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کو چھپا کر وہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھنے لگی اور اماں نے دوبارہ سبزی کی ٹوکری اپنے آگے کھسکالی۔

مدیحہ چائے کی ٹرے زاہدہ پھپو کے سامنے رکھ کر واپس پلٹنے لگی تھی کہ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مدیحہ میرا بچہ ذرا کندھے تو دبا دے، ساری رات نیند نہیں آئی کروٹ بدل، بدل کر کندھے ٹوٹ گئے۔'' مدیحہ نے بیچارگی سے اُن کی طرف دیکھا اور پھر ان کی پشت پر کھڑے ہو کر دھیرے، دھیرے ان کے کندھے دبانے لگی، اپنا ارم کے گھر جانے کا پروگرام اسے چوپٹ ہوتا نظر آرہا تھا کیونکہ دوپہر ہونے کو آئی تھی اور آصف بھائی یونیورسٹی سے کسی بھی وقت واپس آسکتے تھے ان کی موجودگی میں گھر سے نکلنا ناممکن تھا کیونکہ وہ اس کا محلے کے گھروں میں جانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اسی وجہ سے اس نے کالج کا ناغہ کیا تھا تا کہ ان کے واپس آنے سے پہلے ارم کے گھر کا چکر لگالے، اماں کسی کام سے اُدھر سے گزریں تو اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر لمحے بھر کو ٹھٹکیں پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔ ابا اور زاہدہ پھپو کے سامنے وہ ایسے ہی خاموش رہتی تھیں جیسے ان کے منہ میں زبان ہی نہیں ہو۔

اماں کی بیچارگی کے احساس میں کھو کر مدیحہ کے ہاتھ سست پڑنے لگے تو زاہدہ پھپو نے فوراً ہی ٹوک دیا۔

''اے بیٹا جوان جہان ہو، اتنی ذرا سی دیر میں تھک گئیں، ہمارا تو بڑھاپا ہے ورنہ تمہاری عمر میں تو سارا دن سانس لیے بغیر ایک کے بعد دوسرا کام نمٹاتے چلے جاتے تھے۔ مجال ہے کہ ذرا دیر کے لیے بھی ستانے کا نام لیتے ہوں۔ مگر اب تو مانو ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی۔'' مدیحہ نے ان کے سفید میدے جیسے ہاتھوں کی طرف دیکھا جن کی کھنچی ہوئی جلد پر دور، دور تک بڑھاپے کے آثار نہیں تھے، ایک ہاتھ ہی کیا ان کے خوب صورت چہرے کو دیکھ کر بھی یہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اماں کی ہم عمر ہیں، اماں تو اپنی عمر سے بھی کئی سال بڑی لگتی تھیں۔

''اسی لیے تو بڑے کہہ گئے ہیں کہ بڑھاپا برا آپا ہوتا ہے۔'' بلقیس پھپو نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ ٹرے میں رکھ دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں زاہدہ پھپو کو کچھ اشارہ کیا تو انہوں نے پلٹ کر بڑی محبت سے مدیحہ کی طرف دیکھا۔

''بس میرا بچہ اب تم جاؤ، تمہیں ارم کی طرف جانا تھا ناں......'' مدیحہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں اسے وہاں سے ہٹا کر کچھ خاص باتیں کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی بہانے اس کی جان تو چھوٹی، ابھی اتنا وقت تھا کہ وہ آصف بھائی کی واپسی سے پہلے چاہے تھوڑی دیر کو سہی ارم کے گھر کا چکر لگالے۔

☆☆☆

زاہدہ پھپو ابا کی اکلوتی بہن تھیں اور وہ ان کے

اکلوتے بھائی...... ان دونوں کا ایک دوسرے کے لیے اکلوتا ہونا ہی شاید تمام حالات اور واقعات کے ہونے کا سبب بن گیا تھا۔

سسرال میں ہونے والی معمولی رنجشوں کی شکایت زاہدہ پھپو، ابا کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرتیں تو اکلوتی اور لاڈلی بہن کی محبت کچھ اس طرح جوش مارتی کہ ابا لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے، ایسے میں اماں بڑی مشکل سے انہیں قابو کر پاتیں مگر آخر کب تک...... ایک روز ایسے ہی کسی واقعے کے بعد زاہدہ پھپو نے روتے ہوئے ابا کو فون کر ڈالا اور ابا نے حسب عادت آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً بہن کی دادرسی کو اس کی سسرال پہنچ گئے۔ وہاں جو ہوا سو ہوا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ ابا، زاہدہ پھپو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے اور پھپو کی سسرال کی دہلیز پار کرتے وقت بڑے دبنگ لہجے میں یہ بھی کہہ آئے کہ ''ابھی میں زندہ ہوں اور اپنی اکلوتی بہن کی دو روٹیاں مجھ پر بھاری نہیں...... اگر کسی کو اپنا گھر بسانا ہو تو میرے گھر آکر پہلے میری بہن سے معافی مانگے اور آئندہ اس پر ایسا ظلم نہ کرنے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ لے جائے...... ورنہ زاہدہ اس دہلیز پر قدم نہیں رکھے گی۔''

زاہدہ پھپو سعادت مندی سے سر جھکائے بھائی کے ساتھ آگئیں۔

نہ کوئی زاہدہ پھپو کو منانے آیا نہ ہی انہوں نے دوبارہ اس دہلیز پر قدم رکھا مگر جس گھر کو بسنا تھا وہ بس گیا، زاہدہ پھپو کے شوہر نے چند ماہ بعد ان کے نام رجسٹری بھیج دی اور خود دوسری شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا۔ ابا تو حق دق رہ گئے شاید انہیں اپنی بہن کی خوب صورتی پر بہت ناز تھا کہ بھلا ایسی حسین و جمیل بیوی کے بغیر مظفر کتنے دن رہ پائیں گے مگر بقول اماں کے ''چہرے کی خوب صورتی چار دن کی چاندنی کی طرح ہوتی ہے اس کے بعد تو عورت کی خدمت اور اچھا اخلاق ہی مرد کے دل میں عزت اور گھر میں جگہ بنا پاتے ہیں۔''

زاہدہ پھپو ہر آئے گئے کے سامنے آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑی دلسوزی سے کہتیں۔ ''ارے میں تو واپس چلی جاتی اور ساری زندگی سر جھکا کر مظفر حسین کی جوتیاں سیدھی کرتی مگر باپ جیسے بھائی کی بات کا مان بھی تو رکھنا تھا اور انہوں نے تو یہی کہا تھا کہ مظفر لینے آئے گا تو زاہدہ جائے گی تو بھلا میں ان کے کہے کے خلاف کیسے چلی جاتی۔'' وہ بے بسی سے ہاتھ ملتیں اور دیکھنے سننے والوں کے دل ہمدردی سے بھر جاتے۔

بہن کی قربانی نے ابا پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ جو پہلے ہی ان کی محبت کے آگے کسی اور کو اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوتے تھے اب تو ان کی زندگی کا مقصد ہی زاہدہ پھپو کے منہ سے نکلی بات پوری کرنا اور تیوری پر پڑی شکنیں دور کرنا رہ گیا، اپنے گھر کے معمولات اور اپنے بیوی بچوں کی حیثیت ان کے لیے ثانوی سے بھی کمتر درجے پر آگئی اور زاہدہ پھپو کسی ملکہ کی طرح ان کے گھر اور گھر کے مکینوں پر راج کرنے لگیں۔ اماں کچھ طبیعتاً خود بھی خاموش رہ کر سہنے والی اور صلح جو تھیں اور کچھ ابا کی بدمزاجی نے انہیں ایک مسلسل خوف میں مبتلا کر دیا تھا لہٰذا انہوں نے زاہدہ پھپو کی اپنے گھر میں برتری اور اپنی کم حیثیتی کو بڑی سہولت سے قبول کر لیا۔

آصف بھائی کو البتہ رتبوں کی یہ غیر منصفانہ تقسیم پسند نہیں تھی وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی کے بہانے گھر سے باہر رہ کر گزارتے، مدیحہ اپنی کم عمری اور سادگی کی وجہ سے بھی زاہدہ پھپو کے شہد ٹپکاتے جملوں سے متاثر ہو کر دوڑ، دوڑ کر ان کے کام کرتی اور کبھی اماں کو سارا، سارا دن گھریلو مسائل سے الجھتے دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتی۔

ابا کو تو بس ایک ہی فکر رہتی تھی کہ ان کی بہن زاہدہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے اور ان کی یہ فکر جہاں آصف بھائی کی چوڑی پیشانی پر پڑنے والی شکنوں میں اضافے کا باعث بنتی وہیں کبھی، کبھی مدیحہ کو بھی حیرت میں مبتلا کر دیتی کہ بھلا ابا، زاہدہ پھپو کے

لیے اس قدر فکر مند کیوں رہتے ہیں، انہیں اس گھر میں تکلیف ہی کیا تھی۔ وہ تو سارا دن مزے سے ایک جگہ بیٹھ کر سب گھر والوں پر حکم چلاتی تھیں۔

''بھابی کھانا بعد میں پک جائے گا، پہلے میرے نہانے کے لیے پانی گرم کر دیں۔''

''مدو کالج جانے سے پہلے میرے لیے ایک کپ چائے اور بنا دے۔''

''ارے آصف کہاں بھاگا جا رہا ہے، میری دوائیں کب سے ختم ہو چکی ہیں مگر کسی کو کوئی ہوش ہی نہیں، آج یاد سے لیتے آنا۔'' ان کا لہجہ اور الفاظ ایسے ہوتے جیسے وہ گھر والوں سے نہیں بلکہ نوکروں سے مخاطب ہوں مگر یہ لہجہ، یہ تیور ابا کی موجودگی میں کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیتے تھے، وہ بالکل خاموش ہو جاتی تھیں، ایسے میں نہ انہیں چائے کی طلب ستاتی تھی نہ ہی اپنی دوائیں یاد آتی تھیں۔ بس چہرے پر ایک سوگوار سا تاثر لیے کسی نامعلوم نکتے پر نظریں جمائے گم صم سی بیٹھی رہتیں اور ابا کے دل پر احساسِ جرم کا بوجھ سا بڑھتا جاتا...... بہن کی اجڑی ہوئی بے رنگ زندگی کے ذمے دار ہونے کی سزا وہ اپنے آپ کو اپنے بیوی، بچوں سے لاتعلق رہ کر دیتے کہ ان کے خیال میں یہی ان کی بہن کے دکھوں کا مداوا تھا۔

☆☆☆

گھٹا خوب گھر کر آئی تھی، سارا ماحول سرمئی رنگ میں رنگا ہوا تھا، کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش شروع ہونے کا امکان بہت واضح نظر آ رہا تھا۔

''خدیجہ تم بیسنی روٹی پکانے کی تیاری کر لو اور لہسن، مرچ کی چٹنی بھی بنا لینا، مدیحہ سے کہو وہ سل پر پیس لے گی مگر لہسن اور مرچیں اپنے حساب سے نکال کر دینا، میں نے نصیر سے کہہ دیا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔ اسے بیسنی روٹی بہت پسند ہے بھلا امریکا میں کہاں نصیب ہوتی ہوگی اور مل بھی جائے تو ایسا موسم کہاں ہوتا ہوگا۔'' ابا کے لہجے میں تحکم نہیں نرمی تھی اور چہرے پر ہمیشہ رہنے والی کرختگی کی جگہ ہلکی سی مسکراہٹ جس نے ان کے چہرے کے نقوش ہی بدل ڈالے تھے۔

نصیر احمد، ابا کے بچپن کے دوست تھے، دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ایک ہی اسکول سے تعلیم کا آغاز کیا تھا اور اس کے بعد ایک ہی کالج میں داخلہ بھی لیا تاکہ ہمیشہ ساتھ رہیں۔ بچپن کی دوستی تھی لہٰذا ایک دوسرے کے گھر بے تکلفی سے آنے جانے میں نوجوانی کے دور میں داخل ہونے کے بعد بھی کوئی کمی نہیں آئی نہ کسی نے کوئی اعتراض کیا۔

گریجویشن کرنے کے بعد گھریلو حالات سے مجبور ہو کر ابا نے تو تعلیم کو خیر باد کہہ کر نوکری کر لی مگر نصیر احمد نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا مگر دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا نہ ہی ایک دوسرے کے گھر آنے جانے میں کوئی رکاوٹ آئی مگر پھر یوں ہوا کہ نصیر احمد اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے اور پانچ سال کے بعد واپس بھی آئے تو چند ماہ ٹھہرنے کے بعد شادی کر کے مستقل طور پر امریکا جا بسے۔

ابا اپنی زندگی کے محدود دائرے سے کبھی باہر نہ آ سکے، بچپن میں جو دوست بنایا اس کے بعد اور لوگوں سے ملنا جلنا تو رہا مگر دوستی کا رشتہ نہ قائم ہو سکا۔ کم عمری سے ذمے داریوں کا بوجھ اٹھائے وہ زندگی کی رنگینیوں سے نا آشنا ہی رہے۔ گنے چنے رشتے بھی بدگمانی اور تلخیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ابا کے برعکس نصیر احمد نے زندگی کو بھرپور انداز میں جیا تھا یا یوں کہا جائے کہ زندگی نے انہیں جینے کے لیے ہر وہ سہولت مہیا کی تھی جو خوشی اور سکون کا باعث ہوتی ہے مگر اپنے شاندار طرزِ زندگی اور سمندروں پار کی دوری کے باوجود انہوں نے بھی بچپن کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا...... وہ جب بھی پاکستان آتے اور ایسا کئی، کئی سالوں کے وقفے کے بعد ہوتا تھا۔ ابا سے ملنے ضرور آتے حالانکہ اب کراچی جیسے بڑے شہر میں ان کی رہائش پرانے محلے سے میلوں کے فاصلے پر تھی مگر وہ اپنے قیام کے دوران وقت کی کمی کے باوجود

زیادہ سے زیادہ ابا کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب ابا کی شخصیت یکسر بدل جاتی تھی۔ ان کی ساری بدمزاجی نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی، لہجہ دھیما ہو جاتا، چہرے پر چھائی درشتگی نرم، نرم سے تاثر میں بدل جاتی اور وہ اس بدلے ہوئے روپ میں مدیحہ کو اس قدر اچھے لگتے کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ نصیر چچا کو کبھی امریکا واپس نہ جانے دے۔

☆☆☆

مدیحہ نے ثابت لال مرچیں دھو کر نیم گرم پانی میں بھگو دیں تاکہ پیسنے میں آسانی ہو اور خود لہسن چھیلنے بیٹھ گئی جو اماں نے مرچوں کی مقدار کے حساب سے نکال کر دیے تھے۔

''کوئی مجھے بلقیس کے گھر چھوڑنے جائے گا یا میں اکیلی ہی چلی جاؤں......'' زاہدہ پھپو کی آواز پر اس کے لہسن چھیلتے ہاتھ ساکت ہو گئے اور اس نے قدرے حیرت سے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا جو خاصے بگڑے تیوروں کے ساتھ بظاہر کسی خاص شخص سے مخاطب ہوئے بغیر سوال کر رہی تھیں۔ مدیحہ نے پلٹ کر اماں پر نظر ڈالی جن کے چہرے پر اگر لمحہ بھر کو کوئی تاثر ابھرا بھی تھا تو دوسرے ہی پل وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو چکی تھیں۔ ابا البتہ بہن کی آواز سنتے ہی کمرے سے نکل آئے تھے۔

''زاہدہ، آصف تو اپنے کسی کام سے کہیں گیا ہوا ہے اور میں اس وقت کہیں جا نہیں سکتا کیونکہ نصیر آنے ہی والا ہوگا۔'' انہوں نے خاصی لجاجت سے عذر پیش کیا۔

''تو پھر میں اکیلی ہی چلی جاتی ہوں۔'' زاہدہ پھپو کا لہجہ یکسر بدل گیا اور ان کے انداز سے بے بسی اور بیچارگی ٹپکنے لگی۔

''نہیں، نہیں اکیلے کیسے جاؤ گی۔'' ابا تو جیسے تڑپ گئے۔ ''مدیحہ چلو چھوڑو یہ سب کام ...... باقی تمہاری ماں کر لے گی تم جا کر جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں رکشا لے آتا ہوں تم اپنی پھپو کے ساتھ بلقیس آپا کے گھر چلی جاؤ۔'' اس مرتبہ بے بسی اور بیچارگی کے احساسات نے بغیر کسی کوشش کے مدیحہ کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

اس نے اماں کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا جن کی گردن مزید جھک چکی تھی اور اپنے کام میں انہماک کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اماں کی بے نیازی پر جھلا کر اس نے زاہدہ پھپو کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر اب گہرا اطمینان تھا اور وہ بڑے پُرسکون انداز میں چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی برآمدے کی طرف جا رہی تھیں۔

''اماں مجھے بلقیس پھپو کے گھر نہیں جانا، ایک تو ان کے آدھا درجن پوتے پوتیاں اس قدر شور مچاتے ہیں، دوسرے ان کی بہو کی ان چاہا مہمان ہونے کا احساس دلاتی نظریں مسلسل شرمندگی میں مبتلا رکھتی ہیں اور پھر آج تو نصیر چچا کو آنا ہے۔ کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں وہ...... ان کی وجہ سے ہمارا گھر بھی کتنا اچھا لگنے لگتا ہے، بس میں نے کہہ دیا میں نہیں جا رہی۔'' مدیحہ نے رحم طلب نظروں سے اماں کی طرف دیکھ کر کہا تو، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔

''مدیحہ بیکار کی ضد نہ کرو...... جب تمہارے ابا نے کہہ دیا تو تم کو جانا ہی ہوگا، جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ وہ رکشا لے کر آتے ہوں گے۔'' اماں نے سخت لہجے میں اپنی بات ختم کر کے رخ دوسری طرف پھیر لیا اور وہ ہتھیلی سے آنسو خشک کرتی کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

دسمبر کا مہینہ اور موسمِ سرما کی پہلی بارش ہر شخص کے ذہن اور احساسات پر الگ، الگ انداز میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ کوئی بھولی بسری یادوں میں کھو کر حسرت و یاس کی تصویر بن جاتا ہے تو کوئی خوش نصیب اپنی زندگی کے خوب صورت رنگ موسم کے رنگوں میں شامل کر کے ماحول کو کچھ اور رنگین بنا لیتا ہے۔ مدیحہ کے لیے بھی کچھ دیر پہلے تک امڈتی گھٹا اور ہلکی، ہلکی سردی کا احساس ایک جادوئی اثر لیے ہوئے تھا مگر اب تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھٹ، پھٹ کرتے رکشا سے چھلانگ لگا کر

واپس گھر کی طرف بھاگ نکلے جہاں اماں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مکھن لگی گرم، گرم بیسنی روٹیاں تھیں، نصیر چچا کی خوب صورت باتیں تھیں اور ابا کا بدلا ہوا مسکراتا چہرہ اور نرم، نرم سا لہجہ تھا۔ مگر نہ وہ رکشے سے چھلانگ لگا سکتی تھی اور نہ ہی گھر واپس جا سکتی تھی اسے تو اپنے آپ پر جبر کر کے بلقیس پھپو کے گھر جانا تھا جہاں وہی ہزاروں مرتبہ کی سنی ہوئی بے مقصد کہانیاں تھیں اور بلقیس پھپو کی بہو کی قہر برساتی نظریں......

سارا راستہ وہ منہ دوسری جانب کیے بیزاری سے برابر سے گزرتی گاڑیوں کی طرف دیکھتی رہی اور جب زاہدہ پھپو کے قدرے اونچی آواز میں ''اب اتر بھی جاؤ مدو'' کہنے پر چونکی تو بلقیس پھپو کا گھر آچکا تھا۔

بلقیس پھپو کی بہو کی چڑھی ہوئی تیوریوں کو نظر انداز کرتی وہ دونوں اندر کمرے میں آگئیں جو ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ کیونکہ بلقیس پھپو اپنا ہر کام خود کرتی تھیں اور ان کے گھر آکر بس یہی ایک بات مدیحہ کو اچھی لگتی تھی کہ وہ ذرا، ذرا سے کام کے لیے کسی کو آواز نہیں دیتی تھیں مگر آج اسے نہ بلقیس پھپو کا کمرا اچھا لگ رہا تھا نہ خود پر انحصار کرنے کی عادت......وہ خاموشی سے منہ پھلا کر ان کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

''کیا بات ہے آج مدیحہ بہت خاموش ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' بلقیس پھپو کو اس کے چہرے پر چھائی بیزاری کا احساس ہوا تو انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سوال کیا۔ مدیحہ نے بڑی مشکل سے آنکھوں میں آئی نمی کو حلق میں اتارا۔

''کچھ نہیں پھپو بس سر میں درد ہو رہا ہے۔'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''کوئی سر میں درد نہیں ہے بس مرضی کے خلاف میرے ساتھ آنا پڑا تو منہ بنا ہوا ہے۔'' زاہدہ پھپو نے اس قدر بدلے لہجے میں کہا کہ بلقیس پھپو اپنے سوال پر شرمندہ ہو گئیں۔

''اچھا کوئی بات نہیں، تم ایسا کرو، یہ کمبل لے کر

خصوصی دعا

اے ربِ کائنات
اس بے تاب نفس اور کمزور جسم پر
رحم فرما اس لیے کہ جو تیرے سورج
کی تپش کو برداشت نہیں کر سکتا
وہ تیری جہنم کی آگ کو
کیسے برداشت کرے گا!
جو تیرے بادل کی گرج سے کانپ اٹھتا ہے
وہ تیرے غضب کی آواز کو کیسے سن سکتا ہے
جسے تیری رحمت اور پیار کی عادت ہے
وہ تیری ناراضی کا سامنا کیسے کرے گا
یا الٰہی ہمارے حال پر رحم فرما اور کرم فرما
اور ہم سب کو معاف فرما اور ہم سب سے راضی ہو جا
مہرین ضیا بنگش، کراچی

لیٹ جاؤ، ابھی ناصرہ چائے لے کر آئے گی تو تم اس کے ساتھ سر درد کی گولی کھا لینا۔'' انہوں نے تہ کیا ہوا کمبل کھول کر مدیحہ کے پیروں پر ڈال دیا۔

''نہیں پھپو، میں چائے نہیں پیوں گی۔''

''اچھا تو پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤ۔'' ان کے نرمی سے کہنے پر مدیحہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں جن کو چھپانے کے لیے اس نے منہ دوسری طرف کر کے کمبل کو گردن تک کھینچ لیا۔

☆☆☆

''انہوں نے اپنی جھوٹی انا کی خاطر میرا دل اجاڑ دیا۔''

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا، شاید اس کی آنکھ لگ گئی تھی، کتنی دیر کے لیے اس کا اندازہ تو نہیں ہوا مگر وہ گہری نیند سے جاگی تھی کیونکہ کئی لمحوں تک وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ کہاں ہے پھر اسے اس جملے کا دھیان آیا.. جسے سن کر اس کی نیند ٹوٹی تھی۔

''ایک غیر مرد کو ہمیشہ اپنے گھر میں بے تکلفی سے بلاتے وقت ان کی غیرت کہاں سوئی رہتی تھی۔ اس وقت انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ گھر میں جوان بہن بھی ہے، اس وقت تو ان کے دل کو یہ اطمینان تھا کہ بچپن کا آنا جانا ہے مگر بچپن ہمیشہ نہیں رہتا، یہ بات وہ بھول گئے تھے۔''

زاہدہ پھپو کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں آرہی تھی اور اب وہ پوری طرح جاگ چکی تھی مگر کسی انجانے احساس نے اسے ساکت لیٹے رہنے پر مجبور کردیا تھا۔

''اور جب نصیر کے گھر والوں نے میرے لیے رشتہ بھیجا تو اچانک ہی ان کی سوئی ہوئی غیرت جاگ اٹھی اور وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر گئے کہ ان کی اکلوتی بہن کے لیے اس سے اچھا رشتہ ملنا مشکل ہے۔ انہیں تو بس یہی خوف کھائے جارہا تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ نصیر کا ہر وقت کا آنا جانا تھا تو ہو نہ ہو یہ شادی لڑکا، لڑکی کی پسند سے ہورہی ہے۔ بس اتنی سی بات پر انہوں نے نصیر کے گھر والوں کو یہ کہہ کر انکار کردیا کہ زاہدہ کی بات تو طے ہوچکی ہے اور اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے دیکھا نہ بھالا اور جھٹ پٹ مظفر جیسے مٹی کے مادھو سے میری شادی کر ڈالی اور ایسے مطمئن ہوکر بیٹھ گئے جیسے اپنے سر سے کوئی بڑا بوجھ اتار پھینکا ہو۔ مگر میں نے بھی اسی وقت سوچ لیا تھا کہ یہ شادی ہو تو رہی ہے مگر قائم نہیں رہے گی اور بھائی کو ساری زندگی اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے گا، وہ بھی اپنی زندگی میں کبھی پورے طور پر خوش نہیں رہ سکیں گے۔''

''زاہدہ تم کیوں گزری ہوئی باتوں کو دُہرا کر اپنا خون جلا رہی ہو۔'' بلقیس پھپو نے آہستہ سے ٹوکا۔

''کیونکہ نصیر ہر سال دو سال بعد میرے زخموں کو کھرچنے کے لیے آجاتا ہے اور بھائی کو دیکھو، ایسے اس کی خاطر مدارات کرتے ہیں جیسے ساری دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی انہیں عزیز نہ ہو۔ ایسے میں میرا دل چاہتا ہے کہ اس گھر کو آگ لگادوں جہاں میری خوشیوں کو ملیا میٹ کردیا گیا۔'' زاہدہ پھپو کے لہجے میں گھلا زہر مدیحہ کو اپنے سارے وجود میں سرایت ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ اس نے بے ساختہ ایک ہلکی سی.... جھرجھری لی تو بلقیس پھپو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے زاہدہ پھپو کا ہاتھ دبایا۔

''بس اب چپ ہوجاؤ کہیں مدیحہ نہ جاگ جائے۔''

''جاگتی ہے تو جاگ جائے اسے بھی تو پتا چلے کہ اس کے مظلومیت کا لبادہ اوڑھے باپ نے کس طرح میری زندگی برباد کی ہے، ورنہ میں بھی آج ڈربے نما گھر کے بجائے امریکا میں آرام کی زندگی گزار رہی ہوتی۔'' وہ انتہائی تنفر سے بولیں تو مدیحہ کی برداشت جواب دے گئی اور وہ تھوڑا سا کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔

☆☆☆

اس رات بادل خوب جم کر برسا اور جہاں سارا ماحول دُھل کر نکھر گیا وہیں مدیحہ کے دل میں ابا کے لیے جو شکایتیں تھیں ایسے ختم ہوگئیں جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔

کڑکتی بجلی کے خوف سے وہ اماں کے لحاف میں گھس گئی تھی۔

''اماں......'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

''ہوں......'' اماں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''اماں یہ پھپو ایسی کیوں ہیں؟'' اس نے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

''کیسی......؟'' اماں کی آواز نیند سے بوجھل ہورہی تھی۔

''اتنی بری......'' مدیحہ کے کہنے پر انہوں نے سرزنش کے طور پر اسے ہلکے سے تھپکا۔

''ایسے نہیں کہتے' وہ تم سے بڑی ہیں اور ان کا بڑھاپا ہے تو ذرا چڑچڑی ہوگئی ہیں۔''

''بڑھاپا نہیں برا آپا...... بہت ہی برا آپا......''

مدیحہ منہ ہی منہ میں کہتے ہوئے اماں کے اور قریب ہوکر لیٹ گئی۔

دلِ جوئی

قانتہ رابعہ

ناسازیِ طبیعت کی وجہ سے میں بہاول پور شادی میں نہ جا سکی تھی لیکن سلمان کی شادی کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ فائزہ، سلمان اور یہ تینوں چلے گئے۔ ابھی میرے اکلوتے بیٹے سلمان کی شادی کو صرف پندرہ بیس دن ہوئے تھے۔ عزیز و اقارب کے ہاں تقریبات میں وہ میرے ساتھ جائے یا خود اکیلی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہاں حلقۂ احباب سے باہر بھیجنا مشکل کام تھا۔ خیر وہ یعنی (فائزہ میری بہو) شادی کے بعد واپس

آ چکی تھی اور خوب جوش و خروش سے شادی کی تفصیلات بیان کر رہی تھی۔ دلہن کا عروسی لباس، جوتے...... میک اپ جیولری سے لے کر کھانے کا مینیو، باراتیوں کی تعداد، طور اطوار تک...... مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس نے سسرالی رشتے داروں کے دل میں اچھا تاثر ہی جمایا۔ اس کی گفتگو میں وقفہ آیا تو میں نے پوچھا۔

''شادی میں کس، کس نے میرے بارے میں پوچھا؟''

''مسز حنیف، سب ان کے اردگرد جمع تھیں بہت سنجیدہ باوقار سی آنٹی تھیں۔ اسمارٹ اور خوب صورت جب ان کو میرا پتا چلا تو آپ کو یاد کر رہی تھیں اور سلام کہہ رہی تھیں۔'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''تم حبیبہ کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو بہت موٹی اور کافی ہنسوڑ خاتون ہیں۔''

''نہیں بھئی، میں جن کی بات کر رہی ہوں وہ تو اسمارٹ اور سانولے رنگ کی ماڈرن سی خاتون ہیں۔'' فائزہ نے قطعیت سے کہا۔

''ماڈرن! ارے بھئی وہ تو بہاول پور کے مضافات میں مدرسہ چلاتی ہیں۔ کپڑے لتے، فیشن سے، میک اپ سے بے نیاز۔'' مجھے فائزہ کی بات ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

''پھر آپ کسی اور سے کنفرم کر لیجیے یہ والی آنٹی تو جامہ وار کے ریچ والی فراک پہنے ہوئے تھیں۔ مجھے تو لگتا ہے بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی تھیں۔ تازہ، تازہ فیشل سے چہرہ چمک رہا تھا۔'' فائزہ نے معلومات دیں۔

''اچھا خیر، میں رومانہ سے پوچھوں گی۔'' میں نے بات ختم کی۔

اس رات رومانہ کا فون آیا تو میں نے حبیبہ کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون سی والی حبیبہ تھی۔ میرا شادی سے پہلے جس حبیبہ سے تعلق رہا ہے وہ تو موٹی سی، سادہ، درویشانہ مزاج کی اور قدرے ہنسوڑ طبیعت کی مالک تھیں۔

''نہیں آپا، یہ وہی والی حبیبہ حنیف ہیں۔ ڈاکٹر حنیف کی مسز...... چینج تو ان میں واقعی آیا ہے۔ ڈیزائنر کے کپڑے پہنتی ہیں۔ مہینے میں ایک دو دفعہ پارلر بھی جاتی ہیں۔ جم بھی جوائن کیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک گیٹ ٹوگیدر میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے میں کافی عرصے کے بعد ملی تھی ان سے، میں خود بھی نہیں پہچان پائی تھی۔'' رومانہ نے وضاحت کی۔

رات کو اس کا سوچتے، سوچتے نیند آ گئی۔ دو چار دن مزید گزر رے۔ بہاول پور سے میری نند عاصمہ بھی آئیں تو ایسی ہی ملتی جلتی معلومات سے نوازا۔

''اب تو بہت کم قہقہہ لگاتی ہیں، شولڈر کٹ بال وغیرہ۔''

''ارے ان کے تو وہ...... کمر سے نیچے تک کے بال تھے۔ کیا کسی ناگن کی طرح بل کھاتی چٹیا ہوتی تھی موتیوں کے پھولوں سے گندھی۔ بال کیسے کٹوا سکتی ہیں وہ......!'' میری حیرت سے چیخ نکل گئی۔

''یہ تو نہیں مجھے علم مگر سنا ہے انہوں نے کسی بہت اچھی کالونی میں دو کنال کی کوٹھی خریدی ہے۔ اڑھائی تین کروڑ روپے کی۔ ہو سکتا ہے جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق کچھ سیٹ اپ بدلا ہو۔'' انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد کئی دفعہ میرے دل میں آیا کہ ان سے فون پر رابطہ کروں اور پوچھوں ایسی دین دار عورت پر کون سی بپتا آن پڑی مگر آج کل کرتے چار پانچ ماہ گزر گئے اور پھر مجھے اپنی نند کے سسرالی رشتے داروں میں فوتگی پر بہاول پور جانا پڑا۔ میکے جاتے ہوئے سب سے پہلے حبیبہ سے ملنے کا پروگرام طے تھا۔ آخر جو دس سال ہمارے پڑوس میں رہیں، دن رات کا ساتھ رہا ان سے ملنا تو لازم تھا۔ فون پر ملاقات کا وقت لیا اور رومانہ کے ساتھ ان کے نئے گھر روانہ ہو گئی۔

واہ...... کیا گھر تھا۔ جنت محل کہنا چاہیے۔ شاندار ماسٹر بیڈ روم لاؤنج، اسٹڈی روم، سوئمنگ پول، واک

کرنے کے لیے ٹریک۔ بچوں کے لیے چھوٹا سا زو (Zoo)...... ''واقعی ایسے گھر میں رہنے یا اس سوسائٹی میں موو کرنے کے لیے اپنے اندر تبدیلیاں تو لانا پڑتی ہیں۔'' میں نے سوچا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ مسز حبیبہ حنیف ہماری منتظر تھیں۔

پہلی تو کیا میں دسویں نظر میں بھی انہیں پہچان نہ پاتی اگر مجھے ان کے متعلق بریف نہ کر دیا گیا ہوتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں، بچوں کی تربیت، پڑھائی کے مسائل سے لے کر ملکی مسائل تک زیرِ بحث آئے۔ وہ واقعی بہت تبدیل ہو گئی تھیں۔ جب میرا ان سے تعلق تھا وہ بہت زندہ دل اور قہقہے ابلنے والی خاتون تھیں اب حسین سنجیدگی...... یا مسکراہٹ کی جھلک۔

''ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں، اب بھی رات کو کلینک کرتے ہیں یا بس دن میں ہی......؟'' میں نے پوچھا۔

ان کے چہرے کا وقار یک لخت ہی حزن میں بدل گیا۔ وہ سراپا الم کی تصویر بن گئیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

''مجھے نہیں علم۔''

''ک...... کیا...... مطلب؟'' میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''مجھے پچھلے سال بریسٹ کینسر ہو گیا تھا۔ میں نے کیمو کروائی۔ پوری ٹریٹمنٹ لی۔ اذیت کے طوفان سے ڈوب کے نکلی تو پتا چلا ڈاکٹر صاحب کا دل ایک مریضہ پر آ گیا ہے۔ میں کیا کر سکتی تھی' سر کے بال اتر چکے تھے۔ وزن کم ہونا شروع ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں زندگی کی طرف پلٹی۔ اپنی ڈریسنگ اور ایکٹی وٹیز پر نظر ڈالی۔ سوشل سرکل بدلا۔ زمانے کے نئے طور طریقے اپنائے۔ پھر بھی پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ کسی عرب ملک میں وہ پارلر چلا رہی ہے۔ ایک ماہ ڈاکٹر صاحب اس کے پاس ہوتے ہیں ایک ماہ پاکستان میں...... اور......''

حبیبہ کی خوب صورت آنکھوں سے چشمے ابل رہے تھے۔ اس کی اسمارٹنس، جدید ہیئر اسٹائل کی وجہ مجھے پتا چل گئی تھی۔

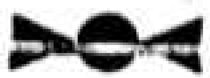
اس کی لگی بندھی روٹین کی زندگی میں شدت کی آزمائش نے اسے جس طرح ہلایا شاید دنیا کے کسی ریکٹر اسکیل پر نہ ناپا جا سکے۔ اس کے قل قل کرتے قہقہے، وقار، تمکنت اور حزن میں کیسے بدلے اس کا جواب بھی مجھے مل گیا کہ میں خود ایک عورت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ حبیبہ کے دائیں بریسٹ کا حصہ کندھوں تک ایک، ایک انچ زائد جگہ سے گوشت کاٹ، کاٹ کر رموو کر دیا گیا ہے۔ اسے شاید جسم کے اس حصے کے کٹنے کا اتنا دکھ نہ ہو جتنا بار بار کا غم اسے کاٹ ڈالتا ہوگا جب طرح، طرح کی عورتیں اس کے میاں کے بارے میں بیسیوں طرح کی باتیں کرتی ہوں گی۔

مجھے یہ سب خود سے ہی پتا تھا کہ میں بھی عورت ہوں۔

ہاں ایک سوال کا جواب نہ حبیبہ کے پاس تھا نہ میرے علم میں کہ کسی کی بیماری کے عرصے میں جب کوئی تیمار داری یا خبر گیری کے لیے جاتا ہے تو محبوبِ خدا کے فرمان کے مطابق ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ تیمار دار جنت کے میوؤں میں سے میوے کھاتا ہے کہ وہ مریض کی دل جوئی کرتا ہے۔ مریض اپنی حالتِ مرض میں لاچار اور... بے بس ہوتا ہے اس کو زندگی کی طرف لانے کا اجر ستر ہزار فرشتوں کی معیت...... پر اس کی بیماری میں دل جوئی کا یہ انداز کیسا تھا؟

کیا اسے کسی بھی طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

دکھ اس بات کا تھا کہ دوسری شادی تو کوئی ناجائز کام نہیں لیکن اس بیماری میں مبتلا عورت...... کہ جس کا نام ہی خون نچوڑ دیتا ہے...... اور وہ اپنی بیماری کے بجائے میاں کے لیے تن من دھن قربان کر دے۔ کیا یہ زندگی کے شب و روز کی ساتھی کی غمی خوشی میں ہم سفر (شوہر) کی دل جوئی ہے یا اس کی جانب سے اذیتوں کا کوہِ گراں! اس کا جواب کس کے پاس ہوگا......؟



منی ناول

دوسرا حصہ

دیار صبح کے اجالوں میں

نایاب جیلانی

ہادی اپنے بابا اور اماں کا بہت لاڈلا، فرمانبردار، انتہائی ہنسوڑ طبیعت کا مالک، چونچال سا، خوش اخلاق بیٹا تھا۔ وہ دو بھائیوں اور ایک بہن سے چھوٹا تھا جبکہ ایک بہن اس سے بھی چھوٹی تھی۔

بہت ہی خوب صورت، اونچا، لمبا، باوقار سا روشن آنکھوں والا ہادی لوگوں کے دلوں کو اپنی موہنی صورت اور اخلاق کی وجہ سے موہ لیتا تھا۔ فرمانبرداری میں بھی وہ اپنے بڑے دونوں



بھائیوں سے آگے تھا۔

والدین کو نہ کرنا اپنے لیے گناہِ کبیرہ سمجھتا تھا۔ اماں سے بڑھ کر بابا کا لاڈلا تھا۔ وہ جو کہتے مانتا..... جس طرح کہتے تھے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔

اس کی سعادت مندی کی لوگ مثالیں دیتے تھے۔ آج تک بابا نے ہی اس کے لیے تمام فیصلے کیے تھے، بچپن سے کھیل سے لے کر پڑھائی تک..... اور پھر زندگی کے اتنے اہم فیصلے کی باری آئی تب بھی ہادی نے سب کچھ بابا پہ ڈال کر فرمانبرداری کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا تھا حالانکہ اس سے بڑے دونوں بھائیوں نے اپنی من پسند لڑکیوں سے شادیاں کی تھیں۔ فدا نے اکلوتی پھوپی زاد کو دل میں بسایا تو اماں اسے بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ صائم نے اپنی پڑوسن کرنل اشفاق کی لاڈلی بیٹی عزہ کے لیے خواہش ظاہر کی تو بابا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

کرنل اشفاق ان کے پڑوسی تھے۔ عزہ اُن کی اکلوتی بیٹی تھی، بچپن سے یہ لوگ ایک ساتھ تھے۔ اکٹھے کھیلے کودے اور جوان ہوئے..... جب صائم نے عزہ کے لیے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا بابا بخوشی رشتہ لے کر اشفاق صاحب کے گھر چلے گئے۔ یوں صائم بیاہ کر برابر والے گھر چلا گیا..... کیونکہ کرنل صاحب نے شرط ہی یہی رکھی تھی کہ عزہ کی شادی اس لڑکے سے کریں گے جو گھر داماد بننے کے لیے تیار ہو..... اماں اور بابا نے یہاں پر بھی بیٹے کی خوشی کو ترجیح دی تھی۔ پھر کرنل صاحب کا گھر اتنا کون سا دور تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے بیچ میں دیوار کھڑی رہی۔ کرنل صاحب کی وفات کے بعد صائم نے بیچ کی دیوار گرا کر پھولوں کی باڑ سے پارٹیشن کروا دیا تھا۔

صائم کے بعد جب ہادی کی باری آئی تو بابا نے پہلی مرتبہ اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔

ہادی کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا..... جب وہ آفس سے تھکا ہارا گھر آیا تو بابا نے اسے سیدھا اپنے کمرے میں بلوالیا تھا۔ حالانکہ آفس سے آنے کے فوری بعد بابا کسی بھی بیٹے کو بڑے سے بڑے اور معمولی سی معمولی کام کے لیے بھی نہیں کہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے بیٹے دن بھر کی تھکن اتاریں، آرام کریں..... اپنی بیویوں کے ساتھ وقت گزاریں..... اس معاملے میں وہ خاصے روشن خیال تھے۔

ہادی بابا کا پیغام ملتے ہی بغیر کپڑے تبدیل کیے ان کے کمرے کی طرف آیا تو دستک دینے سے پہلے ہی اندر سے بابا کی آواز آتی سنائی دی تھی۔ وہ شاید اماں سے مخاطب تھے۔ اور اپنے کسی دوست شکیل کی بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔

''بہت ہی ہنس مکھ اور خوب صورت بچی ہے..... ہمارے ہادی کے ساتھ بہت سجے گی۔ ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔'' بابا کے لہجے میں واضح جوش اور خوشی محسوس ہو رہی تھی..... وہ بابا کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر دروازے پر دستک دے کر کے اندر آیا تو بابا اسے دیکھ کر بڑے سنجیدہ سے نظر آنے لگے تھے۔

ہادی ان کے قریب بیٹھا تو بابا نے بازو پھیلا کر اسے خود سے مزید قریب کر کے زور سے بھینچا..... وہ اس محبت بھرے مظاہرے پہ بھی بوکھلا سا گیا تھا۔

''بابا! خیر تو ہے؟ مجھ پر بڑا پیار آ رہا ہے آپ کو کہیں مجھے صائم کی طرح وداع کرنے کا تو نہیں سوچ رہے۔'' ہادی نے اپنے ازلی شرارتی انداز میں بابا کو چھیڑا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

''ہرگز نہیں..... میں اپنی پیاری سی بہو کو اس دفعہ وداع کر کے اپنے گھر لے آؤں گا۔''

''آہم..... یعنی مجھے گھوڑی چڑھوانے کے ارادے ہیں؟'' اس نے ایک کالر کھڑا کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گھوڑی کا تو رواج نہیں اب..... تمہیں پراڈو پہ بٹھا کر پنڈی لے جاؤں گا۔'' ان کا انداز بھی ہنوز ہادی جیسا تھا۔ ہلکا پھلکا اور شگفتہ..... ہادی ''پنڈی'' کے نام پر بے ساختہ چونک گیا تھا۔

''پنڈی.....؟''

''ہاں میری جان ...... تمہارے بڑے دو بھائیوں نے تو مجھے لڑکی پسند کرنے کی سعادت سے محروم رکھا...... اس دفعہ میں نے سوچا ہے تمہارے لیے خود لڑکی پسند کروں......'' کچھ دیر بعد انہوں نے تمہید باندھتے ہوئے اس بات کا اظہار کردیا جس کے لیے انہوں نے ہادی کو اپنے پاس بلوایا تھا۔

''پسند کرنی ہے......؟ یا کر چکے ہیں......؟'' ہادی نے سابقہ شرارتی لہجے میں پوچھا...... تب بابا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

''سمجھو، پسند کر چکا ہوں۔''

''اور مجھے صرف بتا رہے ہیں، ہے ناں......!'' ہادی نے ٹکڑا لگایا۔

''نہیں میری جان! تم سے اجازت لے رہا ہوں...... اگر تم دل سے حامی بھرو تو میں اپنے دوست کے سامنے جھولی پھیلاؤں......'' بابا نے مسکرا کر بڑی محبت سے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے ساختہ بولا۔

''آپ کے وہی دوست خلیل اور شکیل؟'' ہادی نے چونکتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ پھر بابا کے بولنے سے پہلے ہولے سے مسکرا کر کہنے لگا۔ ''آپ کا ہر فیصلہ مجھے قبول ہے بابا......! آپ میرے لیے برا تو نہیں سوچیں گے۔'' اس کی سعادت مندی نے اماں، اور بابا کو بے ساختہ خوش کردیا تھا۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر بھی بابا نے ہادی سے دوبارہ پوچھا۔

''تمہیں کوئی پسند تو نہیں بیٹا؟''

''اگر ہوتی بھی تو آپ کی پسند پہ قربان کردیتا...... آپ میرے بابا ہیں...... مجھے آپ کی پسند پہ پورا بھروسا ہے۔ آپ میرے لیے یقیناً کچھ پرفیکٹ ہی پسند کریں گے...... ویسے خیال رکھیے گا لڑکی کا خوب صورت ہونا شرط ہے۔'' وہ انہیں چھیڑتا ہوا شرارتی انداز میں کہہ گیا۔

''اور اگر خوب صورت نہ ہوئی تو......؟'' اماں نے ایسے ہی بے ارادہ پوچھ لیا تب ہادی نے اماں کی گردن میں بازو حمائل کرلیا۔

''تو پھر وہ آپ کی بہو ضرور ہوگی...... میری بیوی نہیں......'' اس کے لاڈ پہ اماں نے ڈپٹ کر کہا

''چل ہٹ...... میری بہو کوئی عام نہیں ہوگی۔ زری اور عزہ سے بڑھ کر لاؤں گی۔'' انہوں نے ہادی کے ماتھے کو چوم لیا تھا۔

''اپنی بات پر قائم رہیے گا اماں......'' ہادی کا انداز اب بھی شرارتی تھی۔

''تو بھی اپنی بات پر قائم رہنا......'' اماں نے بھی وعدہ لیا...... ہادی نے سر ہلا کر اقرار کیا تھا...... اور اس کے اقرار پر بابا اگلے ہی دن پنڈی روانہ ہوگئے تھے...... ان دنوں ہر کوئی جانتا تھا بابا پنڈی کس مقصد کے لیے گئے تھے۔

زری، کشف اور فلک کو بڑی بے چینی تھی اور عزہ بھی استنبول میں کم بے تاب نہیں تھی...... سب کو ہادی کے لیے بابا کا اکیلے ہی لڑکی دیکھنے جانا کچھ کچھ عجیب لگا تھا لیکن ظاہر ہے بابا کے سامنے کسی کو بولنے کی جرات نہیں تھی۔

پھر بابا جتنے پُرجوش، خوش اور ولولے کے ساتھ پنڈی گئے تھے واپسی پہ خوش ضرور تھے تاہم اتنے پُرجوش نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے ہادی کا رشتہ پکا کردینے کا اعلان کردیا تھا...... وہ واپسی پہ مٹھائی کے ٹوکرے لائے تھے جسے خاندان بھر میں تقسیم کرکے ہادی کی بات طے ہوجانے کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔

بابا خود گئے تھے لیکن کوئی تصویر نہیں لائے تھے۔ شاید انہیں خیال نہیں آیا تھا۔ یا پھر تصویر مانگنا معیوب سا لگا۔ سب ہی کو مایوسی ہوئی کیونکہ سب لوگ تصویر کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

عزہ جو ہنی مون انجوائے کرنے ترکی گئی تھی وہاں سے یار، بار فون کرتی۔

''اسما کی کوئی تصویر ہی دکھا دو۔'' اس کی دہائیوں پر ادھر سے مایوسی بھرا جواب ملتا۔

''بابا کو تصویر لانی یاد نہیں رہی...... ویسے ہمیں بابا

کی بات پر پکا یقین ہے۔ جب بابا نے کہہ دیا...... وہ بہت خوب صورت ہے تو ہمیں یقین آ گیا...... بابا غلط بیانی نہیں کرتے...... ''کشف نے اس دن اماں اور بابا کی باتیں سن لی تھیں جب وہ اسما کی تعریف کر رہے تھے، سو کشف نے پورے خاندان میں یہی بات نشر کر دی اور عزہ کو تو وہ اکثر چڑاتی۔

''ہادی کی بیوی تم دونوں سے زیادہ حسین ہوگی...... تم دونوں اس کے سامنے چڑیل لگوگی۔''

''دیکھ لیں گے اسما کے حسنِ جہاں سوز کی تجلیاں بھی......'' عزہ چڑ کر جواب دیتی...... تاہم اسما کی فوٹو دیکھنے کی حسرت پوری نہیں ہو سکی تھی۔

کچھ ان کے خاندان میں لڑکی یعنی ہونے والی بہو کے گھر خواتین کا جانا معیوب سمجھا جاتا تھا...... کوئی ایک آدھ مرد اور بس ایک آدھ عورت ہی جاتی تھی...... شگن کی رسم کرنے...... اسی لیے بس بابا اور ان کی پھپو اسما کو ارجنٹ انگوٹھی ڈال آئے تھے...... اماں کو گھٹنوں کی تکلیف تھی...... وہ اور ہادی دونوں ترکی چلے گئے تھے وہاں پہ صائم نے ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا تھا۔

ہادی کا رشتہ طے ہو جانے اور منگنی کے بعد اصل ٹوئسٹ تو تب آیا تھا جب بابا کے موبائل میں اسما کی ڈھیروں تصویریں آئیں...... ان تصویروں کو دیکھ کر کشف، زری، فلک اور حتیٰ کہ عزہ تک دم بخود رہ گئی تھی۔ اور دم بخود تو ہادی بھی رہ گیا تھا۔

کشف نے ساری تصویریں ہادی کو بھجوا دی تھیں۔ یوں سب لوگ ہی ہادی کی ہونے والی دلہن سے متعارف ہو گئے تھے...... صائم اور عزہ بھی...... ''متاثرین'' میں شامل ہوئے...... اور ہادی......؟ اس کے دل کی کیفیت کچھ سمجھ میں آنے والی ہی نہیں تھی...... وہ ایک نظر میں ہی اسما کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

ہر تصویر میں نمایاں نظر آنے والی انتہائی خوب صورت، نازک اندام سی دودھیا رنگت کی مالک اسما حواسوں پر بم گراتی تھی...... اس کا ایک، ایک نقش ہادی کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔

وہ تصویر سے نکل کر مجسم ہادی کے سامنے آ کھڑی ہوتی اور ہادی کو اپنا دل سنبھالنا مشکل ہو جاتا...... اوپر سے صائم کے تبصرے......

''والدین کی بات تابعداری سے مان لینے کے اتنے فائدے ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہی جنت کی حوریں دستیاب ہو جاتی ہیں...... کاش میں نے بھی جلد بازی سے کام نہ لیا ہوتا...... اور آج ایک چڑیل میری زندگی میں نہ ہوتی...... بلکہ جنت کی حور ہوتی......'' صائم کی بکواس پہ عزہ تپ اٹھتی۔

''منہ دھو رکھو...... تمہیں ہر صورت میں چڑیل ہی ملنی ہے...... جنت میں بھی دوزخ میں بھی۔'' ان دونوں کی تکرار سے یکسر بے نیاز ہادی، اسما کی خوب صورت اداؤں میں کھو سا جاتا...... اسما اس کے لیے اپنی تصویروں میں ہی لازم ملزوم ہو گئی تھی۔

لیکن اس دوران ایک عجیب سی بات ہو گئی...... دن میں اٹھارہ، اٹھارہ مرتبہ منگنی کی تصویریں دیکھنے والی عزہ نے ایک بڑا احساس پوائنٹ اٹھایا تھا۔

وہ ایک ایسی تصویر پر الجھ گئی تھی جس میں ایک سادہ سی معصوم صورت لڑکی کچھ گھبرائی کچھ بوکھلائی صوفے سے اٹھ رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں پھپو بیٹھی تھیں...... یوں لگ رہا تھا وہ ان کے قریب سے اٹھی ہے۔ اس لڑکی کے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی تھی...... بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی...... جو یقیناً بابا لے گئے تھے۔ یہ انگوٹھی کشف نے اسکائپ پر انہیں بھی دکھائی تھی...... پھر یہ انگوٹھی اس لڑکی کے ہاتھ میں کیوں تھی؟ وہ عام سی لڑکی جو کہیں سے بھی منگنی کی دلہن نہیں لگ رہی تھی...... بلکہ وہ کہیں سے بھی ہادی کے ہم پلہ نہیں تھی...... اور نہ ہی وہ ہادی کی منگیتر لگ رہی تھی...... اس کی تصویر بھی ایک تھی...... باقی ساری تصویریں اس پری وش کی تھیں...... جسے جانِ محفل کہا جاتا تو غلط نہیں تھا۔

عزہ نے اپنی کشمکش کا اظہار ہادی اور صائم سے بھی کر دیا تھا...... اور ان دونوں نے اس تصویر کو عام

انداز میں دیکھا اور بس...... کسی نے بھی عزہ کی بات کا نوٹس نہیں لیا...... کیونکہ اس کے بعد اسما کی اور بھی تصویریں انہیں ملتی گئی تھیں۔ جب اچانک ہی اسما اور ہادی کا آپس میں رابطہ ہوگیا تھا...... ہادی، عزہ اور صائم کو لمحے، لمحے کی خبر دیتا پھر وہ کیسے نہ بتاتا کہ ایک سہانی صبح اسما نے ازخود ہادی سے کانٹیکٹ کیا تھا۔ ہادی کے لہجے میں اسما سے بات کرنے کی سرشاری اور خماری کا واضح مدھ بہتا تھا...... اسے اسما کے ازخود رابطہ کرنے پر ذرا بھی ناگواری محسوس نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے اس بات پر غصہ کر کے غلط انداز میں سوچ کر اپنے بیک ورڈ ہونے کا ثبوت دیا لیکن جب عزہ کو اسما کے اس اقدام کی خبر ہوئی تو اسے اندر ہی اندر بہت برا لگا۔

اسما کی بے باکی یا آزاد خیالی پہ وہ کچھ حیران رہ گئی تھی کیونکہ منگنی کے بعد ان کے خاندان میں لڑکے، لڑکی کا میل جول، بات چیت محض کزن ہونے کے ناتے تو ہو سکتی تھی مگر اس طرح اجنبیوں میں......

بہر حال یہ عزہ کے ذاتی خیالات تھے اور اب یہ دور خاصا ایڈوانس تھا پھر بابا کی طرف سے بھی کوئی پابندی نہیں تھی، وہ تو ہادی کو اتنی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ ہادی اپنے ہونے والی سسرال جا کے ان سے ملے اور اسی بہانے اسما سے مل بھی لے...... دیکھ تو وہ چکا ہی تھا...... تصویروں کی حد تک...... بات بھی کر چکا تھا...... فون کی حد تک ایک ملاقات بھی ہو جاتی تو بہتر تھا۔

ہادی اور اسما کا بڑھتا ہوا التفات اور رابطہ بھی، کبھی عزہ کو عجیب لگتا۔ اسے اسما کوئی باوقار یا سلجھی لڑکی کے بجائے قدرے چھچھوری اور سطحی سی عام لڑکی لگتی لیکن جب ہادی نے اسما سے کانفرنس پہ بات کروائی تو عزہ کو بھی اس کے برجستہ، میٹھے ٹھنڈے شہد سے لہجے اور مدھر سریلی آواز کا گرویدہ ہونا پڑا تھا۔

اگر ہادی، اسما کا دیوانہ ہوا تھا تو بالکل ٹھیک دیوانہ ہوا تھا۔ کیونکہ اسما کو اپنی لوچ دار مٹھاس بھری آواز سے سننے والے پہ سحر طاری کرنا اور اسے اپنی طرف کھینچنا بخوبی آتا تھا۔ اسی لیے ہادی عبدل زئی بھی

اسما کی محبت اور آواز و حسن کے سحر میں ہمیشہ کے لیے جکڑ گیا تھا۔

☆☆☆

بھیگتی ہوئی خوب صورت رات چیونٹی کی طرح پھسلتی جارہی تھی۔

ایک دلنشین احساس تلے مہکتا وہ دل میں اٹھتے گداز اور انوکھے جذبوں سے سرشار اپنی خواب گاہ کی طرف جارہا تھا۔ جہاں پہ اس کے خوابوں کی شہزادی جلوہ افروز تھی...... اس کے بابا کی پسند اور ہادی کی اولین چاہت...... اس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا تھا...... جب بابا نے اسما سے اس کا رشتہ پکا کیا تھا تب بھی خیالوں میں اتنی جلدی تبدیلی نہیں آئی تھی...... اسما کی تصویریں دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے اور روبرو دیکھنے کے بعد وہ اس کے دل پر تسلط جما کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ دھیرے، دھیرے اس کے اندر نہیں اتری تھی...... وہ ایک دم آئی اور چھا گئی...... پہلی نگاہ میں ہی دیوانہ بنا گئی تھی۔ اور اب ہادی اپنے کورے جذبے کے شفاف پانیوں پر تیرتا ہوا اسما سے ملنے اور ہمیشہ کے لیے اسے اپنا بنانے اپنی خواب گاہ کی طرف جارہا تھا۔

اس سے ملنے، فون پر بات کرنے اور روبرو دیکھ لینے کے باوجود اس وقت اسما کا سامنا کرنے کے احساس سے اس کا دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔

جب اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور دھیرے، دھیرے فاتحانہ انداز میں چلتا ایک سرور آگیں نشے میں معمور اپنے کمرے میں داخل ہوا تو پہلا دھچکا اس کا منتظر تھا۔

اسما کمرے میں موجود تھی لیکن سوئی ہوئی۔ چادر کے نیچے اس کا زرتار لباس جھانک رہا تھا۔ نیند میں بھی لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود ہولے، ہولے کانپ رہا ہے...... وہ یہاں کے موسموں کی عادی نہیں تھی اسی لیے شاید اسے سردی لگ رہی تھی۔ کچھ سوچ کر ہادی نے الماری کھول کر اندر سے کمبل نکالا اور بیڈ کی پائنتی پر رکھ دیا۔

اس کا دھیان اسما کی طرف تھا...... وہ سو کیوں گئی تھی؟ کیا وہ ہادی سے ناراض تھی؟ وہ دیر سے آیا تھا؟ اسے انتظار کرنا پڑا...... آخر وہ اتنا لمبا سفر کر کے آئی تھی...... اور ہادی نے اسے اتنا انتظار کروایا۔

ہادی کو بے طرح سے صائم اور عزہ پر غصہ آیا...... ان کی وجہ سے وہ اتنا خوار ہو کر لیٹ ہوا تھا۔

فی الحال وہ اسما کو جگانا چاہتا تھا، اس کے لیے وہ کیا کرتا؟ ان دونوں کے درمیان فون پر تو خاصی بے تکلفی تھی لیکن یوں اسے سوتے میں جگانا غیر مناسب تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے کمبل کھولا اور اسما پر پھیلا دیا...... گو کہ اس نے بڑے احتیاط سے کمبل ڈالا تھا پھر بھی وہ کسمسائی اور اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کی پشت ہادی کی طرف تھی...... اور ہادی پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔ جیسے ہی وہ گھوم کر اسما کی طرف آیا وہ غیر محسوس انداز میں سرک کر دوسری طرف رخ بدل گئی تھی۔ یوں کہ ہادی کی اب بھی اسما کو دیکھنے کی کوشش بیکار گئی تھی۔

اسما کی ایک مرتبہ پھر ہادی کی طرف پشت تھی۔ نہ بھی ہوتی تب بھی اسما کا لمبا گھونگٹ اس کی ٹھوڑی تک سجدہ ریز تھا...... گھونگٹ ان کے ہاں کا رواج تھا...... جو لڑکی میکے سے نکال کر لاتی تو سسرال میں آکر الٹا جاتا تھا جب ساس وغیرہ کو دکھایا جاتا...... پھر بعد میں گھونگٹ دوبارہ نکال لیا جاتا تھا جسے دولھا نے کھولنا ہوتا تھا اور اس وقت اسما کا چہرہ گھونگٹ میں چھپا تھا...... وہ اتنا لمبا گھونگٹ نکالے ان ایزی ہو کر سو رہی تھی۔ ہادی کو بے پناہ تاسف نے آن گھیرا تھا۔

وہ اسما کے کچھ قریب فاصلہ مٹاتے ہوئے آیا تو وہ سمٹ کر محتاط سی ہو گئی...... اس کو محتاط ہوتا دیکھ کر ہادی کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

کیا وہ اس سے شرما رہی تھی؟ حالانکہ اسما اپنی بولڈنیس کی وجہ سے اتنی شرمیلی ہرگز نہیں لگتی تھی۔ لیکن یہ والی سچویشن شاید ہر لڑکی کے لیے ایک سی ہوتی

ہے..... کیا آزاد خیال، پُراعتماد اور کیا دبو.......

وہ چپکے سے مسکرایا اور اسما کے قریب بیٹھ گیا......

گو کہ اب بھی وہ سامنے نہیں تھا..... لیکن نیم رخ سے اسما کو دیکھ سکتا تھا۔ اسما اس کا بیٹھنا محسوس کر چکی تھی...... ہادی کے لیے نئی نویلی دلہن کو مخاطب کرنا کارِ محال تھا۔ کچھ دیر تک چپ سادھے سوچنے کے بعد ہادی نے گلا کھنکھارا..... گو کہ وہ بڑا پُراعتماد تھا لیکن اسما کا رویہ اس کے اعتماد کو ڈانواں ڈول کر رہا تھا..... آخر ایسی بھی کیا ناراضی......؟

''امی!'' ہادی کے طرزِ تخاطب پہ ہی اسما کو اس شدت سے کرنٹ لگا تھا..... وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر جیسے ہتھوڑا برسا تھا..... ہادی نے اسے کس نام سے پکارا تھا؟ امی..... ؟ اسما کو لگا تھا جیسے اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی...... یہ نِک نیم یا شارٹ نیم اسما کا تھا ہی نہیں..... پھر ہادی نے اسے یہ نام کیوں دیا؟

''امی...... ! میں سمجھتا ہوں تم ناراض ہو...... تمہیں انتظار کی کوفت اٹھانا پڑی..... اس کے لیے معذرت کرتا ہوں..... ایکچوئلی! عزہ اور صائم کی فلائٹ لیٹ ہوگئی تھی۔'' وہ آگے بھی اپنے لیٹ آنے کی تفصیل بتا رہا تھا..... لیکن اسما کا ذہن امی سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا..... ہادی نے کس بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا تھا..... جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں..... ہادی نے اسے امی کیوں کہا؟ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔

''اب اس بات پر ناراضی ختم..... جلدی سے یہ ٹینٹ ہٹاؤ..... گھونگٹ اٹھاؤ..... اور اپنی منہ دکھائی لو......'' وہ بڑے شرارتی لب و لہجے میں مخاطب ہوا تھا..... پھر اس نے کمال بے تکلفی سے اسما کا ہاتھ پکڑ لیا..... اس کا حنائی ہاتھ نہایت کومل تھا..... جسے ہادی نے اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا تھا..... اس کے ہاتھ میں منگنی والی انگوٹھی بھی موجود تھی..... نرم و ملائم کومل ہاتھ مہندی سے پور پور سجے تھے۔ لیکن ان ہاتھوں میں کچھ تو تھا جو اسے کچھ مختلف لگا تھا..... گو کہ اسما کے نرم، نرم ہاتھ اس کے دل کی دھڑکن کو بڑھا رہے تھے لیکن پھر بھی ایک عجیب احساس نے اسے قدرے..... بے کل کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت دودھیا اور پتلے نہیں تھے..... گدرائے سے نرم ملائم اور نفیس تھے۔ جبکہ انگلیاں بھی مخروطی نہیں تھیں پھر بھی ہادی نے اس احساس کو جھٹکنا چاہا..... سلونے سے ہاتھ کی انگلی میں اس نے بیش قیمت انگوٹھی پہنا دی تھی۔ گو کہ یہ کام تھوڑا زبردستی کیا تھا لیکن بخیر و خوبی نمٹ گیا..... اسما نے اس دوران کتنی ہی مرتبہ اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا تھا لیکن ہادی نے اس کی کوشش ناکام بنادی تھی۔

''لگتا ہے امی! میری جدائی میں تمہیں گردن توڑ بخار ہوا تھا..... تمہاری رنگت سنولا گئی ہے..... خیر غم نہ کرو..... میرے ساتھ رہو گی تو گورا کر دوں گا.....'' ہادی کی شرارت پہ اسما کا دل اندر تک چڑ گیا تھا..... اس کا دل چاہا وہ گھونگٹ الٹ کر اس کمرے تو کیا اس گھر سے نکل کر کہیں دور بھاگ جائے۔ جہاں پر کوئی آواز اس کا پیچھا نہ کرے..... کوئی یہ نہ کہے دلہن کیوں بدل گئی؟ کوئی یہ نہ کہے تم کون ہو؟ اور کہاں سے ٹپک پڑی؟

''ویسے تمہارا منہ تو دیکھا بھالا تھا..... منہ دکھائی تو ایویں ہی وصول کر بیٹھی ہو..... لاؤ واپس کرو.....'' ہادی اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔ اس کی شرارت سمجھے بغیر اسما نے واقعی ہاتھ آگے کر دیا..... جس کا مطلب تھا۔ ''اتارلو انگوٹھی۔''

''کم آن یار..... ! تم تو مذاق بھی نہیں سمجھ رہیں..... ایسی بھی کیا ناراضی..... ذرا میری پناہوں میں آؤ تو بتاؤں.....؟ کتنا بے قرار کیے رکھا ہے تم نے مجھے.....'' ہادی نے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا اور اپنے بازوؤں کی زنجیر بنائی تو اسما کا حلق سوکھ گیا..... سانس گھٹ گئی..... دل بند ہو گیا۔

وہ اسے کون سمجھ رہا تھا.....؟ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا؟



نور العین ساجدہ سے ملاقات

مجھے کتابیں پڑھنے کا جنون ہے لیکن میرا اصلی عشق صرف اردو ادب ہی ہے باقی سب کو میں صرف اپنا کتابوں کا نشہ پورا کرنے کے لیے پڑھتی ہوں اور اس معاملے میں آتش جی کی مکمل ہم خیال ہوں۔

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

اور کیا بتاؤں اپنے بارے میں...... روحانیت اور خوب صورتی مجھے بہت متاثر کرتی ہے چاہے وہ کسی انسانی پیکر سے جھلکتی ہو یا کسی دلکش نظارے میں جھلکتی ہو یا پھر کہیں جذبات میں ٹھہرے ہوئے سی حسین پل کی سوغات ہو۔ اسی لیے کبھی کبھی جب دل میں بہت ہڑک اٹھے تو شاعری پر بھی ہاتھ صاف کر لیتی ہوں، یہ اور بات کہ باقی شاعروں کی فلاح و بہبود کی خاطر (کہ وہ میری قیود و بند و وزن سے آزاد شاعری دیکھ کر کہیں اپنی شاعری سے تائب ہی نہ ہو جائیں) منظرِ عام پر نہیں لاتی۔ دنیاوی گزر بسر کے لیے میں نے کمپیوٹر کا فیلڈ چنا ہوا ہے، ایک انٹرنیشنل کمپنی میں جاب کرتی ہوں۔ شادی شدہ ہوں مگر ابھی قدموں تلے جنت نہیں آئی ہے۔ ہمارے خاندان کو پاکستان چھوڑے اتنے سال ہو چکے کہ ٹھیک سے اپنے گھر اور گلیوں کا نقشہ بھی اب یاد نہیں مگر پاکستان کی محبت دل سے کسی صورت نہیں نکلتی۔ اسی اپنائیت اور اردو ادب سے محبت کی تلاش میں نیٹ پر مارے، مارے پھرتے کچھ سال پہلے ون اردو فورم نامی ایک گوہرِ مقصود ہاتھ لگا۔ oneurdu.com
یہ وہ بنیادی اساس اور اکائی ہے جس پر میرے لکھنے کی عمارت کھڑی ہوئی۔ وہیں ہنسی مذاق میں ایک دن دوسروں کے

اسما کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا...... اس کا سر چکرانے لگا۔

''میں امی...... نہیں ہوں......'' بالآخر اسما کو زبان کھولنا پڑی تھی۔ سوکھے حلق کو بہ مشکل تر کرتی وہ بھربھری آواز میں بڑی دشواری سے بولی تھی۔ یوں کہ ہادی لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔ جیسے اس کی آواز پر چونکا ہو...... کتنی بدلی، بدلی سی آواز تھی...... پھر وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

''امی جان! تم تو آواز سے لے کر ہاتھوں تک پوری کی پوری بدل کر میرے پاس آئی ہو...... کون سا سیاہ برش پھیرا ہے تم پہ؟ آخر ہوا کیا ہے؟'' وہ اب بھی شرارتی انداز میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

اسما کے ضبط کا یارا نہ رہا...... اس کی برداشت کا ہر ٹانکا اُدھڑ گیا تھا...... اس کا فگار ہوا دل پھٹ پڑا تھا۔ جس وقت سے وہ اس گھر میں آئی تھی مسلسل ایسی باتیں سن رہی تھی۔

یہ اسما تو نہیں......
دلہن بدل گئی......
بابا کسے اٹھا لائے......
یہ کون ہے؟

اب وہ مزید کچھ بھی سہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ جتنا اس کی عزتِ نفس کا جنازہ نکلنا تھا نکل چکا تھا۔ جتنی اس کی توہین ہونا تھی ہو چکی تھی۔ جتنا اسے بے عزت کیا جانا تھا، کیا جا چکا تھا...... اس کی انا، خودداری، عزتِ نفس کو کرچی، کرچی کر دیا گیا تھا۔

کیا وہ بھاگ کر آئی تھی؟ کیا اغوا ہو کر آئی تھی؟ اسے...... تو بڑی عزت و احترام کے ساتھ لایا گیا تھا۔ پھر یہاں آ کر ایسا کیوں ہوا؟ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ ان لوگوں کے ساتھ گڑبڑ ہوئی یہ جان بوجھ کر اسے ٹیز کر رہے تھے؟ اسما سوچ، سوچ کر تھک چکی تھی...... اب آر یا پار ہونے کا فیصلہ کرنا تھا۔

کب تک وہ خود کو چھپائے اندر ہی اندر سلگتی اور گھلتی رہتی...... آخر اسے کس بات کا خوف تھا؟ ٹھکرائے جانے کا؟ دھتکارے جانے کا......؟ تو یہ

افسانوں پر تبصرے کرتے، کرتے سب نے خود افسانے لکھنے کی ٹھان لی اور پھر تین مقابلوں میں میری کوئی نہ کوئی پوزیشن رہی۔ بس وہیں سے حوصلہ ملا تو اردو پوائنٹ اور اسکائی اردو پر لکھنا شروع کیا۔ ان کا بہت شکریہ کہ انہوں نے خوشی سے ایک نو آموز، نا تجربہ کار لکھاری کو ادب کی دنیا میں جگہ بنانے میں بہت مدد دی۔ وہیں سے کافی زیادہ مثبت فیڈ بیک ملا تو ہمت کچھ اور بڑھی اور اخبارات سمیت پاکیزہ میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور ان سب مدیروں کی صورت قسمت نے میرا خوب ساتھ دیا۔ میرے افسانوں کی خاص بات کہ میں فکشن نہیں لکھتی بلکہ کوئی بھی دل و دماغ کو جھنجوڑنے والا سچا واقعہ لے کر ایک مثبت پیغام کی صورت آپ سب تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ اسی طرح میں اپنے افسانوں میں زندگی کی چھوٹی، چھوٹی بنیادی حقیقتیں سمجھوتے کبھی بہت مجبور و مظلوم عورت اور کبھی چٹانی عزم رکھنے والی بہادر عورت جو طوفانوں کا رخ موڑ سکتی ہے اور ہر گھر میں موجود بنیادی تلخیاں سامنے لانا چاہتی ہوں۔ اپنی سمجھ کے مطابق ان کا کوئی حل پیش کرنا چاہتی ہوں اور اس وقت میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے جب کوئی مجھے ای میل لکھتا ہے کہ میرے فلاں افسانے کی وجہ سے ان کے ذہن میں لگی کوئی بہت بڑی گرہ کھل گئی اور زندگی بہت مثبت سمت میں بدل گئی ہے۔ انجم انصار آپا بہت شفیق اور سوئٹ ہیں اور اتنے مشہور رسالے کی مدیرہ اور خود اتنی بڑی مصنفہ ہونے کے باوجود بہت ڈاؤن ٹو ارتھ اور پیار کرنے والی ہیں۔ انہوں نے بہت کھلے دل کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا اور اس کے نتیجے میں آج یہ سطور آپ تک پہنچ رہی ہیں اور اس طرح افسانے بھی پہنچتے رہیں گے انشاءاللہ......

آخر میں دعا ہے کہ آپ سب کا پیار اسی طرح مجھے ملتا رہے اور ہمارا ساتھ یونہی ہمیشہ بنا رہے۔ میرا پیغام صرف یہ ہے کہ عزت دیجیے اور عزت لیجیے...... آخر میں دعا ہے کہ آپ سب بہت، بہت خوش اور زندگی کے ہر خوب صورت مقصد میں کامیاب رہیں، آمین۔

نور العین ساحرہ، امریکا

کام ہادی کی بہنیں کر چکی تھیں...... کچھ نہ کچھ بھاوجیں بھی کر چکی تھیں...... اب تو ہادی کی باری تھی۔

''امی! تم گھونگٹ کے پار کون سا مسئلہ سلجھا رہی ہو یار! عالمی مسائل سلجھانا تمہارے بس کا روگ نہیں...... مجھ غریب کی فریاد پہ توجہ دو...... مت ویٹو پاور بنو...... میرے ساتھ غریب ممالک جیسا سلوک مت کرو...... امی! زندہ بھی ہو یا گزر چکیں؟ میں کل ولیمے کی جگہ تمہارے قل کے انتظامات نہ کرواتا پھروں......؟ دیکھو، آج کی رات مرنے سے پرہیز کرو...... میں بیوہ ہونے سے ڈرتا ہوں۔'' ہادی کی مسخریاں اپنے عروج پر تھیں...... اور اسما ایک پل صراط پر کھڑی تھی جو تلوار سے زیادہ تیز تھی اور بال سے زیادہ باریک......

''میں امی نہیں ہوں...... میں اسما ہوں...... اسما خلیل......'' اسما نے آنکھیں میچ کر اپنے بھرائے لہجے پر قابو پا کر کہا۔

ہادی جو اس کی آواز کے پیچ و خم میں الجھ رہا تھا ایک مرتبہ پر مسکرا دیا۔

''میں نے کب کہا ہے؟ تم کوئی اور ہو...... تم اسما ہو...... میری اسما......''

''آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں؟'' اسما نے اپنے غیر متوازن لب و لہجے پر کنٹرول کر لیا تھا...... اب وہ کچھ پُر اعتماد تھی اور اپنے مضطرب ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے سے پرہیز کر رہی تھی۔

''میں تمہیں اپنی بیوی سمجھ رہا ہوں......'' ہادی کا جواب بڑا برجستہ تھا...... اسما کے اندر دور تک تلخی بکھر گئی تھی۔

''جب آپ کو پتا چلا میں ''امی......'' نہیں ہوں تب بھی مجھے اپنی بیوی سمجھیں گے......؟'' اس کے سوال پر ہادی اب کی دفعہ بری طرح سے ٹھٹک گیا...... اس کی آواز امی کی آواز نہیں تھی۔ اس کا لہجہ امی کا لہجہ نہیں تھا...... اُس کی آواز میں کھنک تھی، ترنگ تھی، لوچ سا تھا...... اس کی آواز میں سادگی تھی۔ نرماہٹ اور ٹھہراؤ تھا...... جبکہ اُس کا لہجہ تیز، آواز بھی تیز تھی......

اس کا لہجہ مدھم اور آواز بھی مدھم تھی۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو......؟'' اب... ہادی کا لہجہ بدل گیا تھا...... اس کی تمام تر شوخی، چونچالی اور تازگی پر گرد پڑ گئی تھی۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا...... اس کا دل بری طرح سے اپ سیٹ ہوا۔

''آپ کی باتیں سن کر یہ سوال مجھے کرنا چاہیے...... یہ ہماری پہلی ملاقات ہے...... اور مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ مجھ سے پہلے بھی مل چکے ہیں...... آپ کی باتیں یہی بتا رہی ہیں......'' اسما کے الفاظ اسے بھک سے اڑا گئے تھے۔ ہادی ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں...... میں تم سے تمہارے ہی گھر میں مل چکا ہوں......'' ہادی کا لہجہ بلا کا سنجیدہ اور جتاتا ہوا تھا...... تب اسما نے خود بخود بڑے صبر اور ضبط کے ساتھ گھونگٹ الٹ دیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ہادی پہلے تو بری طرح سے ٹھٹکا تھا پھر اس کو بلا کا دھچکا لگا...... پھر اسے جیسے کرنٹ لگا اور وہ اپنی جگہ سے اس قدر تیزی کے ساتھ اٹھا تھا جیسے اسما کے وجود سے شعلے نکل کر اسے اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھے...... یا اسما کے وجود سے کانٹے نکل کر ہادی کے وجود میں کھبنا چاہتے تھے۔

اسما کے ہونٹوں پر ایک اذیت ناک خاموشی پھیل رہی تھی۔

وہ اسما کے گھر اسما سے مل چکا تھا؟ کتنی بڑی تعجب میں ڈالنے والی بات تھی۔ وہ اسما کے گھر اسما سے نہیں ملا تھا۔ اگر وہ اسما سے مل چکا ہوتا تو آج یہ والی صورتِ حال کہیں سے بھی بہت سے لوگوں کو شاک میں مبتلا نہیں کرتی اور نہ ہی ان دو مرکزی لوگوں کی زندگیوں کو انگاروں سے بھرتی۔

''تم کون ہو......؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ہادی جیسے چیخ پڑا تھا۔ اس کے سامنے زرتار لباس میں اس کی محبوبہ نہیں بیٹھی تھی۔ یہ کوئی اور ہی تھی...... یہ آخر کون تھی؟ وہ جیسے ضبط و تحمل کو ایک طرف رکھ کے چلا اٹھا۔

''میں خود چل کر یہاں نہیں آئی...... مجھے آپ کے بابا اور آپ خود نکاح کے بعد لائے ہیں...... میں اسما خلیل ہوں...... میں اسما شکیل نہیں ہوں...... میں آپ کی بیوی ہوں۔'' اسما نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھیگی پُرنم آواز میں کہا تھا۔

اپنی عزتِ نفس کا گلا گھونٹ کر اتنے منت بھرے انداز میں کسی کو بھی یقین دلانا کتنا مشکل ہوتا ہے...... اور وہ کسی جب آپ کا شوہر ہو...... اور آپ کے وجود کو تسلیم ہی نہ کرے تو پھر ایسی سچویشن میں کیا کرنا چاہیے۔

''تم میری بیوی نہیں ہو...... سنا تم نے...... تم اتنی کوجی، کم شکل...... میری بیوی کیسے ہو سکتی ہو؟ میرے ساتھ اتنا بڑا فراڈ ہوا ہے...... تم یہاں کیسے آ گئیں میں تمہیں جاننا بھی نہیں......'' وہ غم و غصے کی انتہا پر ساری تہذیب اور شائستگی کو بھلا کر چلا رہا تھا۔ مارے غصے اور اشتعال کے اس نے کمرے کی آرائشی چیزوں پہ زہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اندر آگ بھر گئی تھی۔ اس کا دماغ الٹ رہا تھا۔ ہادی کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اسے کوڑے مارنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ کیسا بھیانک مذاق تھا؟ یہ کس نے اتنا شرمناک کھیل کھیلا تھا؟ کس نے اسے بے وقوف بنایا تھا...... کون اس کے جذبوں اور احساسات کی دھجیاں اڑا گیا تھا؟ دلہن کی خوب صورتی یا کم صورتی ایک طرف تھی...... یہاں پہ تو پورے کا پورا وجود ہی بدلا ہوا تھا۔

پورا ایک سال وہ کس حسین تصور کے ساتھ محوِ کلام رہا تھا؟ وہ کس کو سپنوں میں بسائے ہوئے تھا...... وہ کون تھی جو اس کے پاک، ان چھوئے، کورے جذبوں، محبت، اعتبار، مردانہ خودی، انا اور دل جیسی متاع کو لوٹ کر لے گئی تھی۔ یہ کس نے اس کی مردانگی پہ شب خون مارا تھا۔

وہ تو پورے قد سے ذلیل و خوار ہو گیا تھا...... شرمسار ہو گیا تھا۔

آخر یہ ڈراما کس نے کیا تھا......؟ کیا سامنے کھڑی اس خون آشام بلا نے؟ یا بابا کو دھوکا دیا گیا؟ ہادی کا سر دہکی، دہکی بکھر رہا تھا...... اس کی شریانوں میں بھوا ابل رہا تھا۔

''جاؤ...... دفع ہو جاؤ...... اپنی صورت گم کرو...... مجھے ایک پل کے لیے بھی دکھائی مت دو......'' اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا...... وہ زخمی شیر کی طرح دہاڑتا رہا...... غراتا رہا...... پھنکارتا رہا۔

اسما آنکھیں میچے بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ، کرب، اذیت اور اپنے مٹی، مٹی ہو جانے کا احساس لکھا کرلا رہا تھا...... اس کے آنسو ٹوٹ، ٹوٹ کر گر رہے تھے اور وہ کسی شکستہ عمارت کی طرح ڈھے چکی تھی۔

ہادی نے اسے زمین پر گرتے دیکھا تو ایک زہر آلود، شعلے اگلتی نگاہ ڈالی اور تن فن کرتا باہر نکل گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کرسٹل کے کارنر کو ٹھوکر سے اڑایا تھا۔ اوپر رکھے بہت سے ڈیکوریشن پیس اڑتے ہوئے دیوار سے ٹکراتے رہے اور زمین پہ چکنا چور ہو کر گرتے رہے...... جیسے اسما زمین پر کرچی کرچی ہو کر بکھر چکی تھی۔

☆☆☆

وہ سہاگ کی سیج سے اٹھ کر سیدھا اماں اور بابا کے کمرے میں آیا تھا...... جس شدت کے ساتھ اس نے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا...... اماں اور بابا گھبرا کر اٹھ بیٹھے تھے۔ یہ غیر معمولی دستک کسی نارمل صورت حال کو ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہادی کو کھڑے پایا۔

ہادی کی شکل دیکھ کر دونوں میاں بیوی دھک سے رہ گئے تھے...... یہ کچھ دیر پہلے والا شگوفے بکھیرتا، چٹکلے چھوڑتا ہادی نہیں، یہ تو کوئی اور ہی ہادی تھا۔ ان کا بیٹا، ان کا لاڈلا ہادی ہرگز نہیں تھا۔

ضبط سے بھینچتے پھڑ پھڑاتے ہونٹ، خونی آنکھیں...... لہو چھلکاتے رخسار، غصے، اشتعال، کرب اور ان دیکھے دھوکے کے ادراک سے مشتعل بے قابو ہوتا وجود......

بابا نے آگے بڑھ کر ہادی کو تھاما تو وہ ان کے سینے سے لگ کر بھینچ، بھینچ کے رو پڑا...... اماں اور بابا کے کلیجے الٹ کر باہر آ پڑے تھے۔ ہادی کو کیا ہوا تھا؟ یہ اتنا لحیم شحیم وجود کیوں رو رہا تھا؟

اماں حق دق کھڑی بابا کو دیکھ رہی تھیں اور بابا خود انتہائی فکر کے عالم میں اندیشوں کے جھکڑ میں گھرے ہادی کی پشت سہلا رہے تھے...... معاً اسے اپنی آکورڈ سچویشن کا احساس ہوا تو وہ ایک دم بابا سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا...... اتنی دور کہ ان کے درمیان ڈھیر سارا فاصلہ آ گیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے بابا! یہ کیا، کیا ہے میرے ساتھ آپ نے؟ وہ کون ہے میرے کمرے میں؟'' ہادی کے الفاظ اماں اور بابا کا کلیجا اڑا کر لے گئے تھے۔ ہائے اسے کیا ہو گیا تھا...... ان کے بیٹے کا دماغی توازن تو ٹھیک تھا......؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا اس کے کمرے میں کون ہے؟ یہ ہادی کیا الٹ سلٹ بول رہا تھا۔

''میرے بچے......! تمہاری بیوی ہے اسما...... چند گھنٹے قبل تم اسے بیاہ کر لائے ہو......'' اماں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرے دکھ تلے دبتے ہوئے بہ مشکل بتایا۔ اماں کے احساس دلانے اور بتانے پہ ہادی بے ساختہ چیخ پڑا تھا۔

''وہ میری بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟ مجھے کسی اور کی تصویریں دکھائی گئی تھیں۔ مجھ سے فون پر کوئی اور بات کرتا تھا...... میں کسی اور سے خلیل انکل کے گھر میں ملا...... اور رخصت انہوں نے اپنی کم صورت بیٹی کو میرے ساتھ کر دیا۔ انہوں نے ہمیں دھوکا دیا ہے بابا......'' وہ بری طرح ٹوٹ کر چیخا تھا...... اس کے دہکتے جذبات کو بڑی شدت کی ٹھیس لگی تھی۔ یہ تکلیف ہادی کی برداشت سے باہر تھی...... وہ خود کو بے حد احمق...... بے وقوف اور خوار تصور کر رہا تھا۔ اپنے ساتھ ہوئے دھوکے کو سہنا اس کے حوصلے سے بڑھ کر اور برداشت

سے اوپر کی چیز تھی۔

''ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوا میری جان! میں نے تمہارے لیے خلیل کی بیٹی اسما کا رشتہ مانگا تھا۔ میں اسما کو بہو بنا کر لایا ہوں..... تمہیں کیا غلط فہمی لاحق ہوئی ہے؟'' بابا انتہائی تفکر سے اس کا غم و غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے..... انہیں لگ رہا تھا ہادی کسی غلط فہمی کا شکار ہوا ہے..... اسے مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے..... یا ہادی کو کسی نے ٹریپ کرنے کی کوشش کی ہو.....؟ وہ شدید ہیجانی تفکر کا شکار تھے۔

''آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں..... میں نے خود سنا تھا بابا! آپ اپنے دوست شکیل کی بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ جو خوب صورت اور ہنس مکھ تھی۔ جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا۔ وہ ہادی کے ساتھ سجے گی۔'' ہادی کوئی بہت پرانی بات تو نہیں جتلا رہا تھا جو ان کی یادداشت سے محو ہو چکی تھی..... انہیں یاد آ گیا تھا۔ جب انہوں نے ہادی کو اپنے کمرے میں بلایا تھا تب وہ اس کی اماں سے شکیل کی بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔

سچ تو یہ تھا..... ان کے من میں اسمارا کا خیال تھا..... پچھلی دفعہ وہ شکیل اور خلیل سے ملنے گئے تو اسمارا کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہ بچپن سے زیادہ خوب صورت ہو چکی تھی۔ وہ تب ہی اپنے دل میں اسے لاڈلے بیٹے ہادی کے لیے پسند کر چکے تھے۔ پھر گھر آ کر بیگم سے صلاح کی تو انہوں نے بھی رضامندی دے دی۔ سننے میں آیا تھا اسمارا بہت خوب صورت ہے..... ان کے ہادی کے ساتھ بہت جچتی..... سو بغیر دیکھے ہی شوہر کی پسند پر مہر لگا دی تھی۔

وہ بڑی آس، امید کے ساتھ اسمارا کا رشتہ لینے آئے تھے..... انہیں امید تھی کہ شکیل اور خلیل کبھی انکار نہیں کریں گے..... سچ تو یہ تھا ان کی درخواست پہ دونوں ہی بڑے خوش ہوئے تھے لیکن تب خلیل نے ان سے معذرت کر لی تھی۔

''عبدل! تم نے ہماری بیٹی کے لیے خواہش ظاہر کی ہے..... یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے..... اور اسمارا کی بھی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر وہ تمہاری بہو بنتی..... لیکن تم سے معذرت کرتا ہوں..... اسمارا میرے بیٹے عاشر کی منگیتر ہے..... بچپن سے رشتہ طے کر رکھا تھا؟'' خلیل کے شرمندہ انداز پر عبدل زئی کا دل بجھ گیا تھا..... انہیں ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ یہاں سے خالی ہاتھ لوٹائے جاتے..... ان کی مایوسی پہ شکیل لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئے تھے پھر انہوں نے پرانی دوستی اور بے تکلفی کا پاس رکھتے ہوئے کہا۔

''عبدل یار! دل چھوٹا نہ کرو..... اسمارا نہ سہی اسما تو ہے ناں.....؟ ہماری بڑی قابلِ پُرخلوص، محبت کرنے والی، سگھڑ، سیانی حلیم الطبع بیٹی ہے..... سمجھو تو اسمارا سے بڑھ کر لائق ہے..... تمہارے گھر میں روشنی بھر دے گی..... اور تم ہمیں دعائیں دیتے نہ تھکو گے۔'' شکیل کے الفاظ پہ عبدل زئی کے بجھتے چہرے کی لو دوبارہ روشن ہو گئی تھی۔ انکار کی صورت میں خالی ہاتھ لوٹنے سے بہتر تھا اسما کے لیے دستِ سوال دراز کر لینا..... پھر اگر اسمارا ہوتی یا اسما ان کے لیے تو دونوں ہی برابر تھیں..... تب کچھ سوچ کر انہوں نے حامی بھر لی تھی۔ اور اسما کو ہادی کے لیے مانگ لیا۔

انہیں اندازہ ہی نہیں تھا۔ اس چھوٹے سے ادل بدل کا اتنا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑے گا..... ان کا لاڈلا ہادی اپنے ماں، باپ سے بھی بدگمان لگ رہا تھا۔ جیسے سارا قصور ان دونوں کا ہو..... وہ ان کی کوئی وضاحت سمجھنے سے قاصر تھا۔ کوئی دلیل، جواز اسے قائل نہیں کر پا رہا تھا..... اماں بے بس، لاچار اور خود کو ناتواں سمجھ رہی تھیں۔

ابھی آج ہی تو اس کے سر پر سہرا سجایا تھا..... کل پوری برادری کو اکٹھا کر کے دعوتِ ولیمہ کرنا تھی..... اور وہ اپنے سہرے کے پھول اپنے ہاتھوں سے نوچنے پر تلا ہوا تھا..... اماں کے کلیجے پر ہاتھ پڑ رہے تھے۔ ان کا بیٹا کس اذیت و کرب میں مبتلا تھا۔

''میرے لعل اس میں ہمارا یا اس بے گناہ کا کیا قصور ہے؟ اسے تو خبر بھی نہیں تھی...... یہاں پہ آنے کے فوری بعد بیچاری کو عجیب، عجیب باتیں سننے کو ملیں...... پہلے تمہاری بہنیں کم تھیں باتیں سنانے کے لیے...... رہی سہی کسر تم پوری کر آئے ہو...... آخر تم اپنا کمرا چھوڑ کر کیوں آئے؟ اس معصوم کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ وہ اپنی قسمت پر ماتم کناں ہوگی۔ اس کا محبت بھرا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔ تم جاؤ، اپنی دلہن کے پاس...... اس کے اشک پونچھو...... اپنے برے رویے کی تلافی کرو...... لوٹ جاؤ اسما کے پاس...... وہ تمہاری راہ تک رہی ہوگی۔'' اماں کی بھرائی ملتجیانہ آواز نے معاً ہادی کو چونکا دیا تھا۔

''نہیں اماں...... ! میں نہیں جاؤں گا...... اور آپ مجھے مجبور بھی نہیں کریں گی۔ خوب صورتی ہو یا... بدصورتی، انسان کا اس پر کوئی اختیار نہیں...... میں جانتا ہوں مگر اپنے ساتھ ہوئے دھوکے پہ اسے معاف نہیں کرسکتا...... ان چالاک لوگوں نے آپ کی سادگی کا فائدہ اٹھایا اور مجھے سو فی صد یقین ہے اسمارا کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا ہے...... اور اس سارے گیم کی ماسٹر مائنڈ بھی آپ کی بیچاری مظلوم، معصوم بہو ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' ہادی کا انداز صاف اور دوٹوک تھا۔ جیسے وہ ایک فیصلہ کرچکا تھا اور اس سے ہٹنے کے لیے ہرگز بھی تیار نہیں تھا۔

''اسما نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا...... میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں...... وہ بڑی صاف اور سیدھی بچی ہے...... اس کا کوئی قصور نہیں...... تم اپنے ذہن کو صاف کرو...... جب تم نے اپنی زندگی کا معاملہ ہمارے سپرد کردیا تھا تو پھر ہم تمہاری شادی جس سے بھی کرتے...... تم اپنی سعادت مندی اور فرمانبرداری کا ثبوت دے چکے ہو۔'' بابا نے اسے دوبارہ سینے سے لگا کر سمجھایا، وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔

''آپ چاہیے مجھے کسی دھوکے باز، فراڈن اور دوغلی عورت کے پلے باندھ دیں اور میں اُف بھی نہ کروں۔'' وہ زخم خوردہ سا چیخا۔

''ہادی! اسما ایسی نہیں ہے۔'' اماں کو پھر مداخلت کرنا پڑی۔

''وہ جیسی بھی ہے۔ میں اس کی اصلیت جان گیا ہوں۔ میں کیسے مان سکتا ہوں؟ امی نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ ٹھیک تھا۔ اور مجھے تو اب یاد آرہی ہیں بہت سی باتیں...... امی کے دکھ، امی کی محرومیاں...... اُف میرے خدا...... میں پھر بھی انجان رہا......'' ہادی زیرِ لب بڑبڑاتا اپنے بالوں کو نوچ رہا تھا اور اماں سے اس کی اذیت دیکھی نہیں جارہی تھی۔

''میرے بیٹے! تم ہماری بات کا پاس رکھ کر اپنی فرمانبرداری اور سعادت مندی کا ثبوت دے چکے ہو۔ جب تم مانتے ہو ہمارا فیصلہ تمہارے حق میں برا نہیں ہوسکتا تو پھر اب اسے قبول کرنے سے کیوں ہچکچا رہے ہو؟ اسما بہت سلیقہ شعار، تعلیم یافتہ، بامروت، سونے کا دل رکھنے والی لڑکی ہے۔ میرے گھر کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جو تم تینوں بھائیوں کو جوڑے رکھتی...... پھر خوب صورتی اور کم صورتی میں کسی انسان کا اختیار نہیں...... تم اس بات کو تسلیم بھی کرتے ہو...... اتنے سمجھدار ہو کر بھی کیسی کم عقلی کا ثبوت دے رہے ہو بیٹا! خود کو سنبھالو، جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ...... دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ابھی کی صورتِ حال کل سے مختلف ہوگی...... پھر پرسوں اور ترسوں اور...... اسما اپنے حسنِ عمل سے تمہارے دل میں جگہ پالے گی...... تم اسے ایک موقع تو دو۔'' بابا اس کے شانے تھپتھپا کر اسے سمجھا رہے تھے۔ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں اپنی غلطی کا بھی احساس ہورہا تھا جب وہ اسمارا کی اتنی تعریفیں کرنے کے بعد اسما سے رشتہ طے کر آئے تھے تو پھر لازماً انہیں حقیقت بتادینی چاہیے تھی۔ ان سب کے ذہنوں میں اسمارا کا حسین امیج تھا جو اسما کو دیکھ کر ٹوٹ گیا۔ اب اس ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر کر ہی سب لوگ اپنا آپ سنبھال سکتے تھے ہر کوئی ان کی بیگم جیسا اعلیٰ ظرف نہیں تھا۔ انہوں نے اسما کو کھلے

دل سے قبول کرلیا تھا۔

باقی سب لوگ بھی اسما کو قبول کر سکتے تھے آج کا دن گزرتا اور سب کچھ بہتر ہو جاتا، معمول پر آجاتا..... لیکن کیا ہادی بہتری کی صورتِ حال پیدا کرسکتا تھا؟ کیا وہ ہادی کو نہیں جانتے تھے۔ جہاں ایک طرف وہ انتہائی سعادت مند، فرمانبردار تھا وہیں انتہا کا منتقم مزاج بھی تھا..... وہ اتنی آسانی سے اپنے ساتھ ہونے والی اس منافقت اور دھوکا دہی کو معاف نہیں کرسکتا تھا پھر عبدل زئی اس بات سے ہرگز بھی واقف نہیں تھے کہ ہادی بہت ساری چیزوں میں بالکل حق بجانب تھا کیونکہ اسے ایسے انداز میں ہی فیڈ اپ کیا گیا تھا۔ پھر ہادی کیسے بابا کے سمجھانے پر برہم نہ ہوتا؟ وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا پھر بابا کو چھوڑ کر اماں کی طرف آیا۔

''اماں.....! آپ بھی کچھ بولیں..... مجھے میری فرمانبرداری کی سزا مت دیں..... میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ آپ پر چھوڑا تھا کم ازکم آپ مجھے دنیا سے اپنی برادری، خاندان، دوست احباب ان سب سے نظر ملانے کے قابل تو چھوڑیں..... میں کل کس کس کی ترحم بھری نظروں کا سامنا کروں گا؟ ہر کوئی میرا مذاق اڑائے گا..... وہ گھٹنی، پستہ قد کی، معمولی سی کم صورت کالی عورت، کہاں میں اور کہاں وہ۔ میں خود کو شہزادہ گلفام نہیں سمجھتا..... لیکن جو بھی ہوں کم ازکم اس سے بہتر ہوں.....اور کیا میں بہتر چیز کی خواہش نہیں رکھ سکتا.....؟ میں عام سا انسان ہوں، کوئی فلمی یا افسانوی ہیرو نہیں..... جو ہر قسم کی سچویشن پہ قابو پالیتا ہے..... میں بھی ایک انسان ہوں..... میرے بھی جذبات ہیں، کچھ خواب ہیں..... میں بھی ایک دل رکھتا ہوں، آپ لوگ میرے احساسات اور جذبات کا تصور کر سکتے ہیں؟ میں کس قدر ٹوٹ گیا ہوں۔'' وہ بیک وقت اماں اور بابا سے مخاطب تھا۔

اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا..... آواز ٹوٹ رہی تھی۔ اس کی سماعتوں میں کچھ اور آوازیں آرہی تھیں..... بھیگتا سا پُرنم لہجہ..... روئی، روئی جذبوں سے بوجھل آواز..... اختیار کی ہر حد کو توڑتی..... ہادی کا دل چاہ رہا تھا وہ دیواروں کو ٹکریں مارے۔

''آپ کو میرا احساس نہیں..... میں نے ہمیشہ آپ دونوں کی خواہش کا احترام کیا ہے..... آپ دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہے..... مجھ سے بہتر تو فدا اور صائم ہیں..... کم ازکم وہ میری طرح اس اذیت کا شکار تو نہیں ہوئے تھے ناں..... ان کے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہوا..... جبکہ دوستی کے نام پر ان لوگوں نے آپ کو اور مجھے الو بنادیا ہے۔ اپنی بیٹی ہمارے متھے ماردی۔'' اس کے لفظ، لفظ میں زہر پھوٹ رہا تھا..... بابا اور اماں متوحش رہ گئے..... وہ انتہا کی حدوں تک بدگمان تھا..... اور بابا تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کبھی ایسی صورتِ حال کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔

''آپ نے میری زندگی اندھیر کردی ہے..... میری زندگی کو ''کالی رات'' اور ''سیاہی'' سے بھر دیا ہے..... آپ کا بھی قصور نہیں..... دراصل ہم سب کے ساتھ ہی گیم ہوا ہے..... اور میں گیم کرنے والوں کو چھوڑوں گا نہیں۔'' وہ مٹھیاں بھینچتا اپنے آپے میں نہیں تھا۔

''ہادی! تم سمجھتے کیوں نہیں..... ایسا کچھ بھی نہیں ہوا..... میں نے خلیل سے خود اسما کو تمہارے لیے مانگا تھا..... اور تمہیں کہا بھی تھا ایک مرتبہ اسما سے مل لو..... مل چکے ہوتے تو آج مجھے بھی یہ دن نہ دیکھنا پڑتا.....'' بابا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

''ملا تو تھا..... تبھی تو آپ کی پسند پہ پیار آگیا تھا..... اس پیار کی ایسی بھاری قیمت چکانا پڑے گی، یہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔'' ہادی نے زہرخند لہجے میں کہا تھا پھر پلٹ کر باہر جانے لگا.....اسے آندھی وطوفان کی طرح جاتے دیکھ کر اماں بے ساختہ پیچھے بھاگی تھیں۔ گو کہ ان کے گھٹنے کا درد جوں کا توں تھا..... پھر بھی..... وہ ہادی کو روک لینا چاہتی تھیں..... وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہر کی طرف

جار ہا تھا۔ اماں، بابا دونوں بوکھلا گئے تھے۔ مہمانوں سے بھرے گھر میں ہادی کیا تماشا کرنے والا تھا۔

''ہادی......! تم کہاں جارہے ہو؟'' بابا نے انٹرنس پر روک لیا تھا۔

''آپ کا گھر چھوڑ کر جارہا ہوں...... مجھے اس گھر میں نہیں رہنا...... اگر آپ لوگ چاہتے ہیں میں واپس لوٹ آؤں تو میرے آنے سے پہلے آپ اس لڑکی کو یہاں سے فارغ کردیں...... میں اس کی موجودگی میں اس گھر میں نہیں آؤں گا......'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر تن فن کرتا باہر نکل گیا تھا اور بابا، اماں دونوں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ اپنا گھر چھوڑ کر سیدھا کرنل اشفاق کے گھر آیا تھا...... درمیانی باڑ پھلانگ کر وہ برابر والے لان میں اتر گیا۔ ایک شکوہ کناں نظر اپنے گھر پر ڈال کر اس نے اوپر آسمان کی وسعتوں میں اپنے نصیب کے ''سیاہ'' ستارے کو کھوجا اور اذیت ناک تکلیف کے احساس تلے دب کر سیاہی سے سفیدی میں بدلتی رات کو دیکھنے لگا۔

صبح صادق کا سماں تھا...... ایک اذیت ناک، وحشت انگیز رات کا اختتام ہو چکا تھا۔ لان کے درختوں پر پرندوں کی چہل پہل تھی...... وہ ثنائے ربی میں مشغول لگ رہے تھے۔ ان کی خوب صورت آواز خاموشی میں ارتعاش پیدا کرتی تھی۔

وہ چھوٹے، چھوٹے شکستہ قدم اٹھاتا داخلی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر اپنے گھر کی طرف اٹھی تھیں...... اس گھر میں ہادی کے بڑے پیارے رشتے موجود تھے۔ اماں، بابا جان کے بغیر وہ سانس لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بہنیں، بھائی، بھابی اور ننھی عیشہ......

اس کا دل بھر بھر آیا تھا...... بس ایک عورت کی وجہ سے اسے اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا۔ اپنے پیاروں کے دل دکھانا پڑے...... انہیں چھوڑ کر آنا

میری دعا نئے سال کی آمد پر

یا اللہ! مجھے ایسا معاشرہ دکھادے
جہاں غریب غیرت مند ہو اور امیر دردمند
ہر بزرگ کے ماتھے پر ہو تاجِ ارجمند
پالنے میں نظر آئے نوری سا فرزند
یا اللہ! ایسے ہاتھ ہر سو دکھیں
جو بس لکھتے ہوں توصیف تیری
ہر قسم کی شاعری میں ہو ردیف تیری
ذہن ایسے ہوں مولا غور و فکر سے مالا مال
صرف تجھ سے کہیں اپنے دلوں کا حال
کسی کے آگے نہ پھیلائیں دستِ سوال
خود ہی پاس چل کے آئے دنیا کا مال

شاعرہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

غزل

اِک پل دکھوں کے موسم اِک پل خوشی کے موسم
ہر پل بدل رہے ہیں اس زندگی کے موسم
جب یہ نہ کٹ سکے تو ہم خود ہی کٹ گئے ہیں
جب کاٹنے پڑے ہیں تیری بے رخی کے موسم
ان مہوشوں سے ہم کو ہرگز غرض نہیں ہے
ہیں میری زندگی میں تیری سادگی کے موسم
احوال کچھ بتاؤ چلتی ہوئی ہواؤں
رہتے ہیں مست اب بھی اس کی گلی کے موسم
ہم سے بچھڑ کے پھر بھی ہوتے نہیں جدا یہ
بستے ہیں دل نگر میں تیری دلبری کے موسم
چلتے ہیں تھم تھما کے یہ سانس و دل کے ناتے
ہم کو ستا رہے ہیں یہ بے کلی کے موسم
تمثیلہ ہوگئی ہے ویران بے بسی سے
کچھ اس طرح ملے ہیں تیری بے بسی کے موسم

کاوش: تمثیلہ لطیف، لاہور

پڑا...... ہادی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ وہ ایک مرد ہو کر گھٹ رہا تھا محض اس لیے نہیں کہ اسے من پسند بیوی نہیں ملی تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے جذبات کے ساتھ کھیلا گیا تھا۔ اس کے احساسات کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ گیم ہوئی تھی۔ اسے دھوکا ملا تھا...... اس کا دل توڑا گیا تھا۔ انٹرنس پر کھڑے ہو کر اس نے آخری فیصلہ کیا اور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

کافی دیر بعد گرتے پڑتے صائم نے دروازہ کھولا۔ ہادی کو اس طرح سامنے کھڑے دیکھ کر صائم کا بجھا دل کچھ اور بجھ گیا تھا۔ اس کے شانے ڈھلک گئے تھے۔ اس نے آنے میں اتنی دیر کردی تھی؟ حالانکہ وہ اور عزہ اس کا کب سے انتظار کررہے تھے۔ صائم کو عزہ نے سب کچھ بتادیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک وہ دونوں میاں، بیوی سر تھامے عجیب رنج وغم کی کیفیت میں ہادی کا انتظار کررہے تھے۔ انہیں اندازہ تھا ہادی، اسمارا کو نہ پا کر محض اسما پر صبر کر کے خاموشی سے نہیں بیٹھنے والا ہرگز نہیں تھا۔ پھر اسمارا کے لیے ہادی کے جذبات، محبت اور چاہت ان دونوں سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

ابھی چند گھنٹے پہلے وہ کس قدر خوش تھا...... اس کی آنکھوں سے جذبوں کا خمار چھلکتا تھا اور اب سوجی آنکھوں کے ساتھ وہ شکستگی کا عجیب سا منظر پیش کررہا تھا۔

صائم اسے اپنے بیڈروم میں لے آیا...... وہاں عزہ پہلے سے غمگین اور پُرسوچ تاثرات کے ساتھ بیٹھی تھی۔

وہ دونوں بہت دیر تک اس صورتِ حال کو ڈسکس کرتے رہے تھے...... وہ جانتے تھے ہادی کا انتہائی اقدام یہی ہوگا...... وہ بہت جذباتی تھا...... جذبات میں پہلا کام گھر چھوڑنے کا کرتا...... مگر یہ مسئلے کا حل نہیں تھا...... ہادی کے جذبات بھڑکانے کے بجائے اسے محبت، پیار اور عقل کے ساتھ رام کرنا تھا۔ پھر اس معاملے پر غور کرنا تھا کہ آیا کسی نے ان لوگوں کے ساتھ بھیانک مذاق کیا ہے؟ یا محض ایک غلط فہمی یا اتفاق بھی ہوسکتا تھا؟ اس گھر کے بزرگ یا اسما کے گھر میں موجود بزرگ یقیناً اندر کی بات کو نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انہیں ''ڈسٹرب'' کرنا عقل مندی نہیں تھی۔

صائم نے عزہ کو اشارہ کیا تو وہ ہادی کے لیے جوس لینے چلی گئی تھی۔ جب وہ واپس آئی تب تک صائم نے ہادی کو کول کرنے کی کوشش کردی تھی...... لیکن اس سے پہلے وہ بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

''میں تو حیران ہوں، تم نے آنے میں دیر کیوں کردی؟ تمہیں تو تین گھنٹے پہلے آجانا چاہیے تھا۔''

''اماں اور بابا کے ساتھ کچہری لگا کے بیٹھا تھا...... میرے چہرے اڑا کر وہ کیسے مطمئن رہتے۔'' وہ حد سے زیادہ بدگمان اور بکھرا، بکھرا سا کہہ رہا تھا۔

''یار...... ! ان دونوں کا کیا قصور ہے......؟'' صائم نے فوراً اسے ٹوکا تھا۔ ''بلکہ تم نے بابا اور اماں کو پریشان کرنا ہی نہیں تھا۔'' اب وہ خفگی سے اس کی غلطی کا احساس دلا رہا تھا۔

''انہیں کیوں نہ بتاتا......؟ آخر میری زندگی میں اندھیرے بھرنے میں انہی کا کردار ہے......'' وہ زہر خند ہوا۔ ''وہ جانتے بھی تھے میری عادت اور مزاج کو...... میں کس قدر نفاست پسند ہوں...... کیسی رومانوی نیچر رکھتا ہوں، کس قدر حسن پرست ہوں...... میں کالے رنگ کا لباس نہیں پہنتا...... کجا کہ ایک کالی بھجنگ، کم صورت لڑکی کو عمر بھر برداشت کروں؟ انہوں نے کیا سوچ کر مجھے دھوکا دیا؟ ہم سب کے سامنے اسما کو کچھ اور بنا کر پیش کیا۔ دکھایا کسی اور کو...... بیاہ کسی اور کو دیا......'' اس کا دماغ ابلتے پانی کی طرح کھول رہا تھا۔

''دیکھو ہادی! جذباتیت، جلد بازی اور غصہ کرنے سے معاملہ بگڑتا ہے، ٹھیک نہیں ہوتا...... تمہیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے۔ ہر پہلو پر غور کرنا چاہیے...... کہیں کچھ مِس ضرور ہوا ہے۔ کیا پتا، تمہاری

بیوی اسما اس معاملے میں قطعاً بے قصور ہو......'' صائم نے اس کے ذہن اور سوچ کو دوسری سمت، دوسرے نکتوں کی طرف مائل کرنا چاہا...... لیکن وہ ایک مرتبہ پھر ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''خبردار جو اُس کی حمایت کی...... وہ میری کچھ نہیں لگتی...... میں اسے بیوی بنا کر اپنی بے عزتی نہیں کروانا چاہتا...... ہمارے تو نوکر بھی اتنے کالے نہیں ہیں......'' ہادی غم و غصے میں بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ذرا بھی ہچکچاتا نہیں تھا۔ اور اب تو اس کے دہکتے جذبوں پر کاری ضرب پڑی تھی۔ چوٹ سہلاتے اور مرہم رکھتے وقت تو لگنا تھا۔

''بکواس مت کرو...... شکل صورت میں کیڑے نکالنے والے ہم کون ہوتے ہیں...... وہ بھی ایک انسان ہے۔ جس کے کوئی جذبات بھی ہوں گے، جنہیں تم مجروح کرتے پھر رہے ہو۔'' صائم کو خاصا غصہ آ گیا تھا اور ہادی ایک مرتبہ پھر ابل پڑا۔

''اس کے جذبات ہیں تو میرے کوئی جذبات نہیں......؟ میرے ساتھ عظیم فراڈ ہوا ہے، بجائے تم میرا ساتھ دینے کے اس چڑیل کی سائڈ لے رہے ہو۔ اتنا تمہیں انسانیت کا درد اٹھ رہا ہے تب تم انسانیت کا احساس کر لیتے ناں جب یونیورسٹی میں ہماری کلاس فیلو وہ چارمن کی دھوبن زنیرا تمہارے عشق میں چوہے مار دوائیاں پھانکتی پھر رہی تھی اور تم اس کے مشرق و مغرب تک پھیلے وجود کے اندر موجود سونے جیسے دل کی قدر کر کے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتے...... تم نے تو دل دیکھا نہ اس کے جذبات...... شادی تو تم نے عزہ سے کی۔'' وہ بھی ہادی تھا اتنی نازک سچویشن میں بھی اس کا دماغ کس قدر چل رہا تھا۔ صائم پہلے تو جھنجلایا...... پھر تھوڑا خفیف ہوا پھر اسے گھور کر رہ گیا۔

''اگر قدرت کو میرا زنیرا کے ساتھ...... جوڑ منظور ہوتا...... اور وہ اتفاقاً یا حادثتاً میری بیوی بن بھی جاتی تو اللہ کی قسم! ضرور نبھا کرتا......'' صائم نے بہت خفگی کے ساتھ اسے گھرک کر جواب دیا تھا۔ عزہ، شوہر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''بس رہنے دو...... صرف کہنے کی باتیں ہیں...... جس پر گزرتی ہے اسے ہی پتا چلتا ہے۔ باقی لوگ بس تماشا دیکھتے ہیں۔'' اس کا دل غم کی تھاہ میں ڈوب گیا تھا۔

''آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے، تم تو قیامت تک نہ زنیرا کو منہ لگاتے۔''

''اُف...... آپ لوگ کیا زنیرا نامہ کھول کر بیٹھ گئے ہو...... حد ہے یار! اتنی خراب سچویشن میں تم لوگوں کو زنیرا سوجھ رہی ہے۔'' کب سے خاموش بیٹھی عزہ کھول اٹھی تھی۔

''زنیرا حواسوں پہ کیوں نہ سوار ہو...... اس کی بددعائیں صائم کے بجائے مجھے آ لگی ہیں...... زنیرا کی جڑواں میرے نصیب کو کالا کرنے، میری زندگی کو اندھیروں سے بھرنے کا اتفاقاً، حادثتاً اور پتا نہیں دانستاً میری زندگی میں سیاہی بھرنے آ پہنچی ہے...... میں نے تو کسی خوب صورت لڑکی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ پھر میرے ساتھ یہ بدصورت حادثہ کیوں پیش آیا؟'' ہادی کا کرب اور آہ و فغاں عزہ اور صائم کا دل پھاڑ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے ہادی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر اس کا کوئی حل بھی تو نکالنا تھا۔

''ہادی! میرے چاند! میرے جگر، بات سمجھنے کی کوشش کرو...... ٹھیک ہے، اسما، اسمارا نہیں ہے لیکن اب وہ تمہاری بیوی بن چکی ہے۔ اس کے حقوق تمہارے ذمے آتے ہیں...... کوتاہی کرو گے تو...... اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔'' صائم نے اسے میٹھے لہجے میں سمجھانا چاہا تھا۔

''اور اللہ دھوکے بازوں کو بھی معاف نہیں کرے گا......'' ہادی دوبدو کرب سے بولا تھا۔ صائم نے اپنا سر تھام لیا۔

''اسما اتنی بری نہیں ہے ہادی! تم اس کے ساتھ رہو گے...... وقت گزارو گے تب تمہیں

اور اک ہوگا، میں تو اِک نظر میں دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔ اس نے کب سے ہم سب کی شاکڈ کیفیت اور نازیبا الفاظ کو سن، سن کر بھی ٹیمپر لوز نہیں کیا۔ مجھے زری نے سب بتایا تھا۔ وہ لڑکی اعصابی طور پر بہت مضبوط ہے۔ وہ تمہارے لیے اچھی شریکِ سفر ثابت ہوگی۔ ایک مرتبہ تم اسے قریب سے جانو، سمجھو اور اماں، بابا کی پسند پر بھروسا تو کرو...... دیکھنا سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' عزہ کے مداخلت کرنے اور سمجھانے پہ ہادی شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''بس تمہاری کسر رہ گئی تھی۔ تم بھی زخموں پر نمک چھڑکو....'' اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کیا خبر...... اسما کا دل اتنا اجلا، نکھرا، ستھرا اور خوب صورت ہو...... تمہاری زندگی کو ہر سمت سے روشن کردے...... اس کی سیرت کا حسن چاندنی میں نہایا ہو...... اس کا کردار صبحِ نو کے مانند اجلا ہو....'' صائم نے ملائمت سے اس کے کندھے تھپک، تھپک کر احساس دلایا تھا۔ وہ تلخی سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

''پہلے صورت کا امپریشن پڑتا ہے، سیرت بعد میں آتی ہے جو پہلی نگاہ میں ہی اچھا نہ لگے...... اس کی سیرت کو پرکھنے...... اس کی پرتیں کھولنے، کھنگالنے اور جھانکنے میں کون وقت ضائع کرتا ہے؟'' ہادی تنفر سے بولا۔

''جو پہلی نگاہ میں اچھا نہ لگے وہ دوسری نگاہ میں ضرور اچھا لگتا ہے...... کوئی بھی انسان بغیر خوبی کے اللہ نے نہیں بنایا...... ہر کسی میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہے۔ اور اسما اتنی بھی بری، کالی، بھدی نہیں...... جتنا تم منہ پھاڑ، پھاڑ کر کہہ رہے ہو...... اس کا رنگ سانولا ہے، تمہاری محبت سے نکھر جائے گا...... مجھے لگتا ہے وہ بہت محنتی اور ذہین لڑکی ہے۔ پڑھائیوں میں اس نے اپنا حشر نشر کر رکھا تھا۔ تم نے ہماری دوست نائمہ نہیں دیکھی تھی؟ کس قدر کالی کلوٹی تھی...... بالکل سیاہ...... اور اب ترکی میں، میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسے لشکارے مار رہی تھی۔ خوشحالی، محبت اور سکون انسان کو نکھار بخشتے ہیں...... دیکھ لینا، تمہاری محبت اسے دنوں میں بدل دے گی...... اتنا پیارا، موہنا، سجیلا شوہر پا کر اس نے خود بخود ہی حسین ہو جانا ہے۔ تم دیکھ لینا......'' عزہ نے اٹھ کر اس کے نرمی سے ہاتھ سہلائے پھر پیار سے اس کے بال سنوارے، اپنا روٹھا، روٹھا ساری دنیا سے خفا یہ پیارا سا دیوران سب کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ کوئی بھی اسے ڈسٹرب نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''تم مجھے خیالی، تصوراتی اور کتابی باتیں سنا، سنا کر مت بہلاؤ......'' وہ عزہ سے بھی خفا ہوگیا۔

''بات اسما کی خوب صورتی پہ ختم نہیں ہوتی...... بات اس ''دھوکے'' پہ ختم ہوتی ہے......'' ہادی کو زہرخند لہجے میں اصل مسئلے کی طرف اُن کی توجہ مبذول کروانا پڑی...... اب کی دفعہ صائم اور عزہ دونوں چونک اٹھے تھے۔

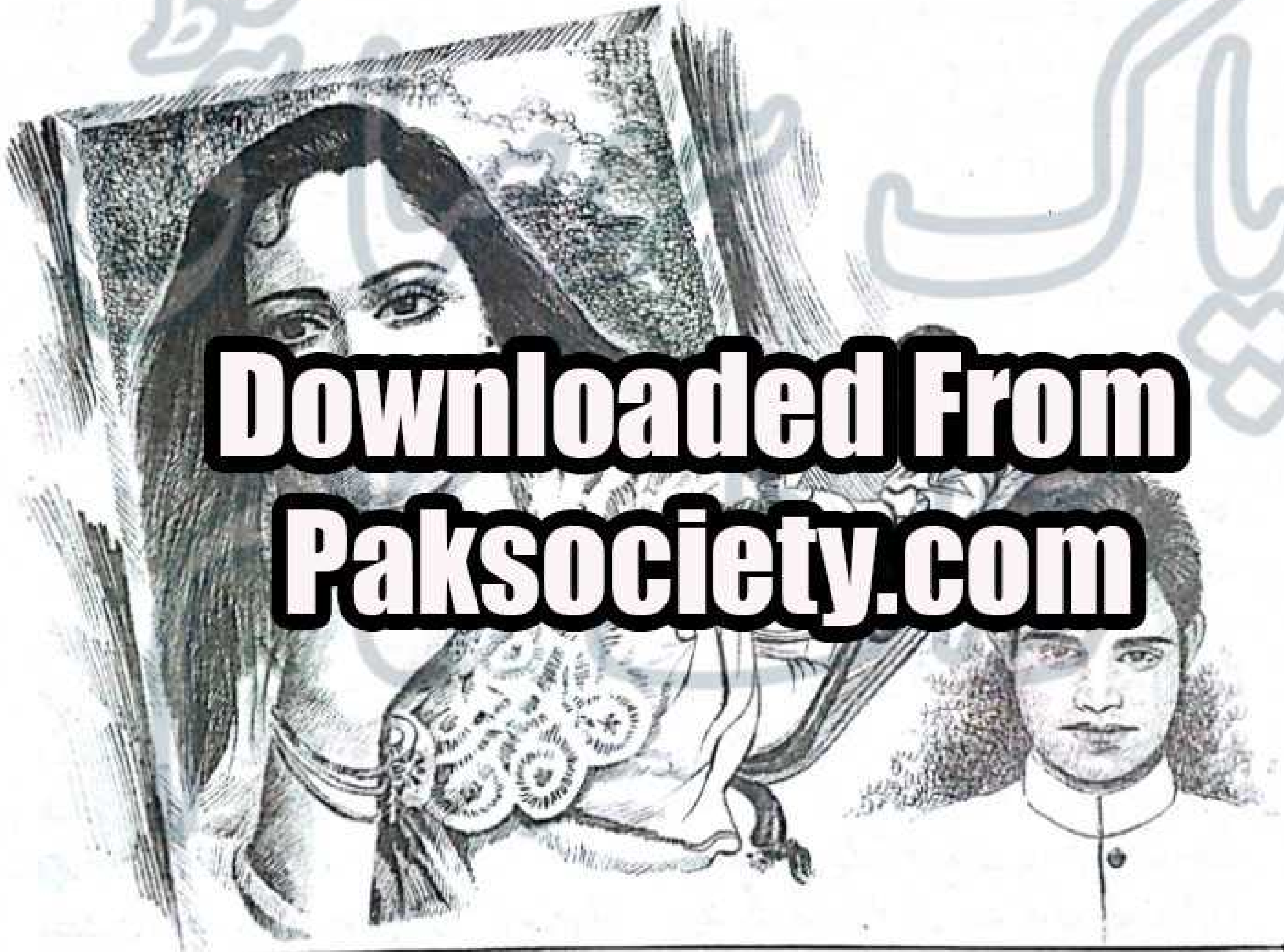
بات یہ نہیں تھی کہ ہادی، اسما کو ''اپنا'' نہیں رہا تھا۔ اسے دھتکار آیا تھا۔ اس کی کم صورتی کی بنا پر اسے رد کر آیا تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ اسما وہ لڑکی نہیں تھی جسے ایک سال تک ہادی اپنی منگیتر سمجھ کر باتیں کرتا رہا تھا اسے مل چکا تھا...... دیکھ چکا تھا...... اگر اسے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو یہ مسئلہ کبھی درمیان میں نہیں آتا۔

اب اصل مسئلہ تو یہ تھا...... جو لڑکی ہادی سے اس کی منگیتر بن کر بات کرتی رہی تھی، اس سے مل چکی تھی...... وہ لڑکی کون تھی؟ آخر کون......؟ کون اس قدر دیدہ دلیر لڑکی تھی جس نے ایک سال ہادی کی منگیتر بننے کا ناٹک کیا تھا۔

ہادی کسی طور بھی اس صورت حال کو محض اتفاق ماننے کو تیار نہ تھا۔ آخر اس کے ساتھ کس نے یہ مذاق کیا تھا اور اب اس کا انجام کیا ہونا تھا...... یہ سب جاننے کے لیے پڑھیں مارچ کا شمارہ

اصلِ زندگی

سیمی کرن



حسن تھا ناز تھا اور ادائے بانکپن جوبن پر تھی۔ ایسا کھلکھلاتا حسن کہ میں اس شوخ و چنچل کو ٹکٹکی باندھے دیکھے گئی اور یہ بھی بھول گئی کہ میں ایک پبلک پلیس پر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوں......

حسن اس قدر خیرہ کُن تھا کہ میں صنفِ نازک ہو کر جیسے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی، شاید میری محویت کچھ زیادہ گہری ہوگئی تھی کہ میں اپنے گرد و پیش سے ہی بے خبر دکھائی دینے لگی تھی۔ جبھی میری بے خبری کو سب سے

پہلے میرے شوہر کی تیز نظروں نے بھانپا اور ذرا تیز اور دبے، دبے غصے کے ساتھ میری آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے بولے۔

''جی بیگم صاحبہ...... آپ پھر کہیں کھو گئی ہیں، حسبِ معمول کسی نئی سوچ میں گم ہیں یا کسی ملکی، بین الاقوامی مسئلے میں ڈوب کر غور و فکر بلکہ غم کھایا جا رہا ہے؟''

یہ سب سنتے ہی میں واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی تا کہ مزید عزت افزائی سے بچ سکوں مگر کہاں؟ موقع تو میں نے خود فراہم کر دیا تھا اور اب وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔

''جانے کیسی عجیب عورت میرے حصے میں آئی ہے، ہر وقت مراقبے میں ڈوبی رہتی ہے جانے کن الجھے فلسفوں کی گتھیاں سلجھاتی پھرتی ہے، کسی فلاسفر کی بھٹکی روح لگتی ہو تم...... دور کیا جاؤں تمہارے ابا کے ہی اثرات لگتے ہیں، مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ میرے بچوں میں نہ کہیں یہ جراثیم آ جائیں۔''

''بے فکر رہیں آپ کے بچے ہیں آپ کے جراثیم ہی لگیں گے اور میرے ابا آپ کے بھی کچھ لگتے تھے۔'' میں شاکی نظروں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی اور اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئی جس نے کیچپ اپنے ہاتھوں اور منہ پر لگا لیا تھا۔ میں نے بڑھ کر اس کا منہ اور ہاتھ صاف کیے، ماحول میں کچھ تناؤ سا آ گیا تھا۔ اچھا مزے کی بات یہ ہے کہ میرے شوہر کی تیز نظروں سے میری محویت، بے دھیانی یا استغراق تو کبھی نہ چھپا تھا مگر میری افسردگی، ماحول کا تناؤ یا تلخی کو کبھی انہوں نے محسوس نہیں کیا یا پھر قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

اب بھی وہ بڑے آرام سے پوچھنے لگے۔

''ایسا کیا خاص تھا جس میں تم مگن ہو گئی تھیں اور بالکل ہی مدہوش نظر آ رہی تھیں؟''

یہ سن کر میرا دھیان دوبارہ کچھ ہی دور بیٹھے اس جوڑے پر گیا جہاں اس حسنِ جہاں سوز نے میری نگاہ کو خیرہ کیا تھا نہ صرف خیرہ کیا تھا بلکہ میں اپنی کافی عزت افزائی بھی کروا چکی تھی۔ میری نگاہوں کے ارتکاز پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

''ہاں تو ایسا کیا ہے وہاں؟ ہاں لڑکی کافی خوب صورت بلکہ بہت زیادہ خوب صورت ہے اور لڑکا بس ''ماٹھا'' سا ہی ہے ''ڈیٹ'' پر آئے ہوئے ہیں شاید یہ منظر تو تمہیں ہر ریسٹورنٹ میں نظر آ جائے گا۔ لاحول ولا میں سمجھا جانے کیا......'' وہ سرسری انداز میں بولے۔

بات تو ان کی واقعی صحیح تھی تھا تو کچھ ایسے ہی مگر ایک ہی منظر، ایک ہی شے ہوتی ہے مگر اس کو دیکھنے، محسوس کرنے، سمجھنے کے انداز جدا ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی تصور پر دو لوگ بعض اوقات بالکل مختلف انداز میں پینٹ کرتے ہیں نگاہ دور بین ہو، مشاہدہ تیز اور سینے میں دھڑ دھڑ کرتا دل ہو تو چیزیں اپنی اصل سمیت نظر آنے لگتی ہیں۔ اپنے صحیح مفہوم سمیت عیاں ہو جاتی ہیں۔ دیکھنے میں تو بظاہر ایسا ہی تھا جو میرے میاں نے کہا مگر جتنی دیر ریسٹورنٹ میں رہی دزدیدہ نظروں سے گاہے بگاہے اس جوڑے کو چپکے، چپکے دیکھتی رہی۔

یہ جوڑا واقعی ڈیٹ پر آیا ہوا تھا لڑکا بظاہر عام سا مناسب سا تھا مگر ٹھاٹ باٹھ سے امیر دکھائی دیتا تھا اور اس کا ثبوت وہ ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ بیٹھے تھے۔ لڑکی بے تحاشا خوب صورت تھی، ہلکے گلابی رنگ میں محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کہاں اس کی جلد ختم ہو کر کپڑا شروع ہو جاتا ہے......! وہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تمام مرد بن پیے بہکے، بہکے دکھائی دینے لگے اور اپنی عورتوں سے چوری، چوری اس کو دیکھتے رہے تھے حتیٰ کہ میں نے نوٹ کیا کہ میرے میاں نے بھی دو تین دفعہ یہ نگاہوں کی ہیرا پھیری کی تھی۔

لڑکی نے جدید تراش خراش کا انتہائی دیدہ زیب اور کچھ حد تک قابلِ اعتراض لباس پہن رکھا تھا، بازو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے چست قمیص اور گہرا گلا دوپٹا ادھر ادھر ہونے سے اس کی گلابی جلد اور ہوش ربا جلوے...... جب ہال کے دیگر خواتین و حضرات کا برا حال تھا تو اس کے ساتھی لڑکے کی حالت جو تھی سو تھی اور کچھ ایسی بے جا بھی نہ تھی...... لگ نہیں رہا تھا کہ وہ

''ڈیٹ'' پر آیا کوئی جوڑا ہے بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دربارِ حسن میں عاجزانہ کھڑا کوئی دربان تھا اور حسن کی بے اعتنائی و بے نیازی اپنے عروج پر تھی۔ وہ لڑکی اس سے واقعی کوئی شہزادی لگ رہی تھی اور وہ لڑکا عاجزانہ خوشامد کرتا اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ خوشی، انبساط و فخر سے گویا پھوٹا پڑتا تھا اس کی تمام وہ ادائیں جو کسی حد تک قابلِ اعتراض بھی تھیں وہ گویا ان پر بھی نازاں تھا اور اس کا رویہ ہال میں بیٹھے تمام افراد کو گویا چیخ، چیخ کر بتا رہا تھا کہ اس حسن کے خزانے کا پہرہ دار میں ہوں۔

وہ لوگ جتنی دیر بیٹھے رہے وہ لڑکا پروانہ وار اس حسن کی شمع پر نثار ہوتا رہا جس کی روشنی سے سارا ہال منور ہو رہا تھا۔ اِک توجہ طلب تھا اور اِک متوجہ بس مختصر الفاظ میں تو اس کو یونہی سمیٹا جا سکتا ہے اور جب وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے تو جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی ہال ایک دم پھیکا لگنے لگا۔ کچھ لوگ جو یونہی خواہ مخواہ بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی نکلنے لگے، بیرے جو بڑے مستعد سے دکھائی دے رہے تھے ایک دم سست سے نظر آنے لگے۔ ماحول یک دم بجھا، بجھا سا لگنے لگا یا پھر یہ کہ میں ہی اس لڑکی پر بری طرح فدا ہو گئی تھی اور یہ سب میرے اپنے محسوسات تھے میرا اخیل جو مجھے جانے کیا، کیا سمجھا رہا تھا۔

ہماری واپسی بھی اسی تناؤ بھرے ماحول میں ہوئی، میرے میاں کا مزاج اسی طرح میرے توجہ کے بٹ جانے پر برہم تھا اور وہ اپنے تاثرات اور گفتگو دونوں سے اپنی خفگی کا اظہار کر رہے تھے اور مشقِ ستم وہی میرا سنجیدہ اور بقول ان کے میرا فلسفیانہ مزاج! وہ اب بھی بڑبڑا رہے تھے۔

''ساری شام برباد کر کے رکھ دی اور پھر گلہ بھی مجھ سے کیا جاتا ہے کہ توجہ نہیں دیتے اور جب توجہ ہی کہیں اور مرکوز ہو تو بندہ کیا کرے...... اسی لیے میں اپنے آپ کو بزی رکھتا ہوں۔''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری کبھی وہ وقت بھی تھا کہ میرا یہی مزاج و عادات میرے میاں کو میری جانب کھینچ لائی تھیں، متوجہ کر گئی تھیں۔ میرے میاں جو میرے پھوپی زاد تھے اور میرے ابا ان کے ماموں تھے...... میرے ابا فلسفے کے پروفیسر تھے اور ہم سب بہن، بھائی اپنے ابا سے بڑے متاثر تھے یہ غور و فکر اور سنجیدہ مزاج بقول میرے میاں کے ''فلسفیانہ مزاج'' مجھ میں میرے ابا سے ہی منتقل ہوا تھا مگر اب میرے اس مزاج سے وہ جیسے عاجز سے آ چکے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ ہم کوئی بہت پریشان حال اور تکلیف دہ ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم ایک اچھی نارمل خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ ہاں بس شاید مجھے کچھ توقعات زیادہ تھیں کہ میرے میاں کے پُرزور اصرار پر یہ شادی ہوئی تھی تو میرا یہ خیال تھا کہ میرے خوب ناز اٹھائیں گے مگر ہوا اس کے بالکل برعکس تھا بہرحال میں نے اس صورتِ حال سے سمجھوتا کر لیا تھا کہ ظاہر ہے، بہت سی توقعات ان کو بھی مجھ سے ہوں گی جو پوری نہ ہو سکی ہوں گی کہ آخر میاں، بیوی کا رشتہ ہے ہی ایک دوسرے کی کمی و عیب کو ڈھک لینے کا...... اس لیے میں اپنی زندگی سے خوش و مطمئن تھی۔ کوئی ایسے مسئلے مسائل بھی نہ تھے، خوشحالی تھی، بچے تھے اور شوہر کا ساتھ تھا۔ بس کبھی کبھار یہ پھانس سی ضرور تنگ کرتی کہ حسن، میرے میاں جو پہلے اتنا چاہت کا دم بھرتے تھے اب جیسے بالکل ہی بدل گئے تھے۔

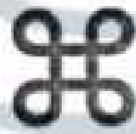
ریسٹورنٹ سے واپس آنے کے بعد بھی میں اس لڑکی اور لڑکے کو بھول نہ سکی۔ کبھی کبھار یونہی کوئی کام کرتے، کرتے اچانک چھم سے یاد آ جاتی۔

''کم بخت تھی بھی تو کس قدر خوب صورت اور وہ لڑکا اس کے سامنے کیسے بچھا، بچھا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت فخر و غرور، عاجزی و خوشامد کے رنگ ایسے بکھرے ہوئے تھے کہ بالکل ہونق معلوم ہوتا تھا۔''

یہ سوچ کر میری ہنسی نکل گئی اور وہ لڑکی یوں جیسے تمام صورتِ حال کا مزہ لے رہی تھی اور اپنی اداؤں سے اسے مرغِ بسمل کی طرح تڑپا رہی تھی اور گو کہ خود بھی اس کے ساتھ آخر کسی جذبے کی ڈور سے بندھ کر ہی آئی ہوگی مگر ایسا لگتا تھا کہ اس لڑکے کو ابھی ''ہاں یا نہ''

کے بین لٹکا رکھا تھا۔
مجھے خود پر حیرت ہوئی میں نے کس عمیق نظری سے ان دونوں کا مشاہدہ کیا تھا یوں جیسے ان کو اندر تک پڑھ آئی تھی اور پھر اتنے گہرے استغراق پر ڈانٹ بھی کھائی تھی میرے اندر کوئی مسکایا۔
☆☆☆
کچھ دن یونہی آگے کو سرک گئے اور میں اس واقعے کو تقریباً بھول ہی گئی تھی کہ دوبارہ ڈنر کے لیے اسی ریسٹورنٹ جانے کا اتفاق ہوا۔ دراصل یہ شہر کا بہترین ریسٹورنٹ تھا اور ہمیں ہمارے بچوں سمیت یہاں کا کھانا اور ماحول دونوں بہت پسند تھے۔ ہم آج بھی وہیں بیٹھے تھے جہاں کم وبیش بیٹھا کرتے تھے۔ سامنے نظر اٹھی تو خالی ٹیبل پر پڑی اس خالی ٹیبل کو دیکھ کر وہ لڑکا اور لڑکی مجھے گویا دوبارہ سے یاد آ گئے اور جیسے سارا واقعہ از سرِ نو تازہ ہو گیا۔
اس کے بعد دو تین مرتبہ ہمارا جانا ہوا میں جب، جب گئی اس ٹیبل پر نگاہ پڑی کبھی وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوتے اور کبھی وہ خالی ہوتی مگر اس ٹیبل کے ساتھ وہ لڑکا، لڑکی کچھ دیر کو مجھے یاد ضرور آتے۔
کچھ اور وقت گزرتا تو شاید وہ میرے ذہن سے محو ہی ہو جاتے کہ اس دفعہ ہم ڈنر کے لیے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد آئے تھے جب ہم اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو ارد گرد نگاہ دوڑانے پر میں نے اس جوڑے کو دیکھا سو فی صد وہی لڑکا، لڑکی تھے گو کہ آج ہم اور وہ دونوں مختلف ٹیبلز پر تھے مگر اس کے باوجود میں نے ان دونوں کو پہچان لیا تھا۔ گو کہ آج ان کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اب صاف یہ لگ رہا تھا کہ وہ نیا، نیا شادی شدہ جوڑا ہے بلکہ لڑکی شاید کچھ ماہ کے حمل سے تھی۔ اس کا چھوٹا سا ابھرا پیٹ اس کے چست کپڑوں سے ظاہر ہوتا تھا گو کہ وہ خود کو بڑے سے دوپٹے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی مگر حیرت انگیز طور پر ان کے بدن جو زبانیں بولتے تھے جسے عرفِ عام میں باڈی لینگویج کہا جاتا ہے وہ اس قدر تبدیل ہو چکی تھی کہ اگر وہ میرے ذہن پر کافی عرصے تک حاوی نہ رہے ہوتے تو شاید میں بھی انہیں نہ پہچان سکتی۔
وہ لڑکی، وہ حسین، بے تحاشا حسین لڑکی جو اپنی ناز و ادا، بانکپن سے شہزادی لگتی تھی اور اس کے دربارِ حسن کا وہ دربان...... گویا کسی جادو کی چھڑی سے دونوں اپنی حیثیتیں بدل چکے تھے وہ لڑکا اب بالکل کسی کرخت سے حاکم کے مانند اکڑا بیٹھا تھا...... چہرے کے تاثرات میں عجیب سی سنجیدگی و بے نیازی آ گئی تھی وہ پروانہ وار نثار ہوتا محبوب جانے کہاں جا چھپا تھا۔ چہرے کی سنجیدگی اور صحت میں بہتری کے باعث آج وہ کافی معقول لگ رہا تھا جبکہ لڑکی کے چہرے پر وہ تمام روایتی پژمردگی تھی جو تخلیق کے مراحل سے گزرتے ہوئے عورت کے چہرے پر ہوتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر آج وہی عاجزی اور متوجہ رویہ اس کا تھا۔
یہ سب جانے کیوں میرے لیے شاک سا تھا مجھے حیرت اور صدمے سے اِک جھٹکا سا لگا۔ میں نے لاشعوری طور پر اس لڑکے کو دیکھنے کے بعد اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر دونوں کے چہروں کے تاثرات میں گہری مماثلت تھی۔ دونوں چہرے میری نگاہوں میں گڈمڈ ہونے لگے۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ لڑکا کبھی میرے شوہر کا چہرہ اوڑھ لیتا اور کبھی حسن اس کا چہرہ پہن کر میرے سامنے آ جاتے۔
مگر وہاں بیٹھے، بیٹھے زندگی کی بڑی اہم گتھی میں نے سلجھائی، حسن کے رویّے سے جو میں شاکی سی ہو جاتی تھی مجھے محسوس ہوا کہ سب شکایتیں اور گلے جیسے جاتے رہے۔ مجھے یوں لگا کہ مرد کی فطرت کا بڑا اہم نکتہ میرے ہاتھ لگ گیا تھا کہ مرد عورت کی طرف اس وقت تک پوری شدت سے ''متوجہ'' رہتا ہے جب تک وہ ''توجہ طلب'' رہتی ہے جونہی وہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور یقیناً اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ بہت جلد متوجہ ہو جاتی ہے پھر تمام عمر وہ ''متوجہ'' رہتی ہے اور مرد ''توجہ طلب'' بن کر اونچی مسند پر جا بیٹھتا ہے۔





جگمگاتا ستارہ

رفاقت جاوید

جب اس روئے زمین سے شہید کوچ کرتا ہے تو
اِک جگمگاتا ہوا تارہ بن کر آکاش کی رونق بڑھاتا ہے
اور زندۂ جاوید ہو جاتا ہے تو پھر کیوں نہ ہم انہیں ہنس کر
رخصت کریں۔

جونہی چاند اپنے سفر کے آخری اسٹیشن پر ستانے چلا گیا...... تو آسمان چھوٹے بڑے ستاروں کے جھرمٹ سے مزین ہو گیا...... کیسا حسین امتزاج ہے کہ تارے اندھیاری رات میں چاند کے سونے کے بعد بیدار ہوتے ہیں...... اور گھٹا ٹوپ وسیع و عریض

آکاش پر اُن کا حسن اور جمال حدِ نگاہ تک بکھر جاتا ہے، سبحان اللہ! تاریکی اور سیاہی میں روشنی کے یہ ٹمٹماتے ہوئے دیے راہوں کے تعین اور وقت کے حساب کتاب میں آسانی کر دیتے ہیں...... اور روئے زمین کی چھت پر خوب صورتی کے ساتھ سجے رہتے ہیں۔

ایسی ہی 16 دسمبر 2014ء کی ایک تاریک رات میں افق پر ننھے منے تارے آنکھ مچولی، پکڑن پکڑائی کھیلتے ہوئے ابھرے، انہوں نے سات آسمانوں کی سیرو تفریح کے دوران فرشتوں کی ہمراہی میں آکاش کے دروازوں پر شرارت وشوخی سے بھرپور زوردار دستک دی۔ وہاں کے مکینوں نے ایک دوسرے کی طرف پُرمسرت انداز میں دیکھا اور اِدھر اُدھر کھسک کر آنے والے مہمانوں کے لیے جگہ بنائی...... اور در وا ہو گئے۔

ایسی ابدی حیات نصیبوں والوں کے لیے کاتبِ تقدیر لکھ دیتا ہے۔

☆☆☆

کالج پر امتحانات کے سائے لہرا رہے تھے۔ بچے صبح تیزی سے تیار ہوئے۔ جب وہ اپنے گھروں سے نکلنے لگے تو ماؤں نے آیت الکرسی پڑھ کر ان پر دم... کرتے ہوئے پھونک ماری اور اپنے، اپنے لختِ جگر کو اپنے پالنہار کے تحفظ میں دے دیا۔ کسی ماں نے بچے کی نظر اتاری اور چار قل پڑھ کر پانی پر دم کیا...... اور اپنے ہاتھوں سے ان گنت دعاؤں کے ہمراہ بچے کو پانی پلا دیا۔ ایک ماں نے میٹھا دودھ پلا کر خود کو مطمئن کر لیا...... اور امید وتمنا سے رخصت کیا کہ جب وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو شاداں وفرحاں ہو کر خوش آئند خبر سناتے ہوئے ماں کے سینے کی ٹھنڈک بن جائیں گے اور کہیں گے . . .

”بی بی، مام، اماں، امی، مما پرچہ بہت خوب ہوا ہے۔ کل کا پرچہ بہت مشکل ہے، ذرا مصلّے پر بیٹھ جائیں اور اس وقت تک چلّہ کاٹیں جب تک ہمارا نتیجہ نہیں نکلتا......“

زمانۂ طالب علمی میں ہماری خواہش اور التجائیں بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ بچے اچھلتے کودتے، چھیڑ خانیاں اور شرارتیں کرتے ہوئے ایگزامینیشن ہال میں پہنچے...... جہاں ابھی تک فرسٹ ایڈ کی کلاس جاری تھی۔ ہال بچوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا کہ یک دم فائرنگ کی آواز نے سب کو چونکا دیا اور پل بھر میں کالج میں بھگدڑ مچ گئی۔ پرنسپل کے ہمراہ ٹیچرز نے بچوں کو اسکول سے باہر نکالنا چاہا...... پرنسپل دہشت گردوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں...... اور تیزی سے بچے گیٹ سے باہر نکالتی چلی گئیں۔

اسکول میدانِ کارزار بن چکا تھا۔ مگر پرنسپل نے دلیری اور بہادری سے اپنا کام جاری رکھا...... اور جامِ شہادت نوش فرمانے میں بے خوفی کا مظاہرہ کیا......

جب 1500 بچوں کی روحانی ماں کا یہ کردار سب نے دیکھا تو چند لیڈیز ٹیچرز نے بھی باہمت ہو کر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے ہوئے مقابلہ کیا مگر انہیں بھی گولیوں سے چھلنی کر ڈالا گیا...... اور دو کو تو زندہ جلا دیا گیا...... اسکول کے چاروں اطراف خون ہی خون بکھر گیا...... اور دستی بموں کے دھواں دار بادلوں نے اسکول کے احاطے کو سیاہ کر ڈالا۔

معصوم بچے، جوان ٹیچرز اور تجربہ کار تعلیم یافتہ پرنسپل کا خون اتنا سستا تو نہیں تھا کہ یوں بہا دیا جاتا...... نہ جانے یہ کون لوگ تھے؟ جو ادارہ بچوں کی پرداخت کرتا ہو...... ان کی جان کے تحفظ کا ذمّے دار تصور کیا جاتا ہو...... اور والدین آنکھیں بند کر کے اس ادارے پر مکمل بھروسا رکھتے ہوں...... وہاں اس ستم ظریفی کا وارد ہونا بہت انہونا اور عجیب اور ناقابلِ یقین تھا۔

والدین کے بھروسے اور اعتماد کا ایسا قتال ہوا کہ جو صدیوں تک یاد رہے گا۔ ٹی وی چینلز سے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح دنیا بھر میں پھیل گئی تھی اور سب کے رشتے دار دور دراز علاقوں سے پشاور پہنچنے لگے۔ مگر کافی بچے، ٹیچرز اور پرنسپل لاپتا تھیں۔

اسکول دہشت گردوں کو قتل کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ آپریشن ختم ہونے کے باوجود گیٹ پر ایک بھیڑ

تھی۔ والدین اب بھی اپنے بچوں کے منتظر تھے۔ مائیں کسی صورت خالی ہاتھ وہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھیں جبکہ جہاندیدہ لوگ تمام صورتِ حال جان چکے تھے۔ اپنے پیاروں کی تلاش اسپتالوں میں شروع ہو چکی تھی۔ آس گزیدہ والدین سجدہ ریز ہو کر ان کی سلامتی کی دعائیں کر رہے تھے۔ ماؤں کو ان کی موت کا خدشہ کم ہی تھا۔ وہ کبھی پُر امید ہوتیں تو کبھی خوفزدہ ہو کر واویلا کرنے لگتیں۔

وہ ٹیچرز جو ابھی تک نئی زندگی کے سپنے آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھیں۔ جن کی شادی کی تیاریاں شروع تھیں۔ انہیں بے دردی سے زندہ جلا دیا گیا۔ جس کے گھر میں ایک پندرہ سالہ معصوم اپاہج بچہ کھانے پر ماں کی راہ تکتا تھا جو اُن کے ہاتھ سے نوالہ لے کر اپنی بھوک مٹاتا تھا اور محبت کرنے والا شوہر کیپٹن شاہجہان جو کارگل کی جنگ میں دونوں ٹانگوں سے محروم ہو گیا تھا۔ یاقوت کوئی معمولی عورت نہیں تھی...... یہ دونوں باپ، بیٹا اس قیمتی جان کی آمد میں محوِ انتظار رہتے تھے۔

یاقوت نے اور اس کے شوہر نے تو وطن کی خاطر قربانیاں دیں مگر ان کے اپاہج بیٹے عثمان کا کون سا مرتبہ تھا جو گھر میں بے شمار رشتے داروں میں اپنی ماں کو بے قراری سے ڈھونڈ رہا تھا۔ اور بی بی، بی بی کا ورد کر رہا تھا۔

کسی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا نہ چائے پی رہا تھا۔ اس کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔

''میری ممی کدھر ہے؟'' سب رشتے دار ممی کو ڈھونڈنے اسپتالوں میں مارے، مارے پھر رہے تھے۔ کیپٹن شاہجہان اپنی لاچارگی میں خاموش تھے اور عثمان کچھ نہ سمجھا کہ وہ ماں کو ڈھونڈنے کس کا ہاتھ تھام کر گھر سے نکل جائے۔

☆☆☆

وال کلاک نے رات کے نو بجے کی گھنٹیاں بجائیں تو عثمان کچھ بے تاب سا ہو کر لاؤنج میں باپ اور باقی پریشان حال رشتے دار خواتین کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ ان کی دعائیں، پیش گوئیاں اور قیاس آرائیاں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ وہ صرف یہی جانتا تھا کہ ماں ابھی تک گھر نہیں آئی، باپ نے معصوم بیٹے کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر نرمی سے کہا۔

''تم ابھی تک بھوکے پیاسے جاگ رہے ہو بیٹا...... بیمار پڑ جاؤ گے۔ میرے ہاتھ سے ہی کھانا کھالو...... ممی آٹھ بجے تمہیں سلا دیا کرتی تھیں۔ تمہیں اس وقت اس حالت میں دیکھ کر وہ بہت پریشان ہو جائیں گی۔ مجھ سے بھی خفا ہو جائیں گی اور تم سے بھی بات نہیں کریں گی۔''

''نہیں کھانا کھاؤں گا، نوالہ حلق سے نہیں اترے گا ڈیڈی......'' اپنا منہ کھول کر اشارہ کیا اور اپنے مخصوص لب و لہجے میں بول کر سر جھکا لیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ''ممی آ جاؤ، مجھے بھوک لگی ہے۔''

''میں جانتا ہوں بچے کہ تمہیں سب سینے سے لگا کر تسلی دینے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان میں تمہاری ماں کی خوشبو نہیں...... نہ ہی اس کی بے لوث محبت کی حدت ہے۔'' کیپٹن شاہجہان تڑپ کر سوچ رہے تھے۔

''عثمان بیٹا اسکول میں امتحان ہو رہے ہیں، اس لیے ممی لیٹ ہو گئیں۔ ابھی ابھی چچا کا فون آیا ہے کہ وہ کسی اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔'' تائی نے اسے اپنے گلے لگا کر تسلی و تشفی دی۔

''دیکھو تم نے تو اپنی ممی کو صرف اپنی ذاتی پراپرٹی سمجھ رکھا ہے۔ کبھی، کبھی انہیں آزاد چھوڑ دیا کرو۔ تمہاری اور تمہاری ماں کی صحت کے لیے اچھا ہوگا۔ یاقوت بیچاری اسکول اور گھر کے علاوہ کہیں جا ہی نہیں سکتی۔ ان پر ظلم کرنا چھوڑ دو یار۔'' تائی نے ذرا مسکرا کر چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔ عثمان کو اس وقت تائی کی ہنسی اور مشورہ بہت برا لگا۔ چھوٹے بچوں کی طرح منہ بسورنے لگا۔ ویسے بھی وہ دیکھنے میں اپنی عمر سے بہت چھوٹا نظر آتا تھا۔

''عثمان اچھے بچے ماں کو ناخوش نہیں کرتے۔ تم تو اپنی ممی کے بہت لاڈلے اور فرمانبردار بچے ہو۔ بس کبھی کبھار انہیں تنگ کرتے ہو...... آج تو وہ تم سے بچ



رفاقت جاوید سے مزید گفتگو

عزیز قارئین بعد سلام و دعا عرض ہے کہ ان صفحات کو آپ رفاقت جاوید سے ملاقات کا پارٹ ٹو سمجھ کر لطف اندوز ہوں۔

ہوا کچھ یوں کہ رفاقت جاوید کے ناول خلش کی پاکیزہ میں اشاعت کے بعد بے شمار تبصرے، تنقید اور سوالات ابھرے جو ہم نے رفاقت جاوید کے انٹرویو کے ضمن میں ان کو بھیجے اور انہوں نے تسلی بخش جوابات بھی دیے مگر ہماری کچھ اور بے حد پیاری بہنوں کے سوالات رہ گئے تھے۔جواب حاضر ہیں۔ رفاقت جاوید صاحبہ کا ایک مرتبہ پھر شکریہ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے ساتھ، ساتھ ان صفحات کو بھی پُر کیا اور ان قاری بہنوں کی تسلی کے لیے مزید سیر حاصل گفتگو کی تو آئیں چند سوالات اور ان کے تفصیلی جوابات پڑھتے ہیں۔

☆☆☆

تمام قارئین و مصنفین کو میرا پیار بھرا سلام اور دعائیں...... سوچ رہی ہوں کہ کیا انٹرویو میں کچھ تشنگی رہ گئی تھی جو پھر سے سوالنامہ آگیا۔

رچ کی خفا ہو جائیں گی۔ پھر کیا کرو گے؟'' وہ اسے... گدگدیاں کرنے لگیں۔

''عثمان میری جان...... ہاتھ اٹھاؤ اور ان کے لیے دعا مانگو...... ممی نے تو تمہیں بے جا لاڈ پیار دے کر بگاڑ ہی دیا ہے اور بیکار بھی کر دیا ہے۔ اٹھو یہاں سے چلو کھانا کھاتے ہیں اور دونوں مل کر سوتے ہیں۔ جب تمہاری ممی آجائیں گی تو تمہارے پاس سو جائیں گی۔ اٹھو میری جان...... خالہ کی بات تو مانتے ہیں ناں۔'' خالہ اپنے درد کو دباتے ہوئے بولیں۔

''نہ کھانا کھاؤں گا نہ ہی ممی کے بغیر سوؤں گا اور سن لو کہ میں ممی سے کبھی نہیں بولوں گا۔ نہ آج ان کا کوئی فون آیا اور نہ ہی میرا فون اٹھایا۔ جبکہ وہ مجھے دن میں کئی بار فون کیا کرتی تھیں۔'' وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

''خالہ تم فون کرو...... دیکھنا فوراً اٹھائیں گی۔ تمہیں ہر وقت یاد کرتی ہیں اور تم بہت دور رہتی ہو، خالہ تم ہمارے پاس آجاؤ۔'' اس نے ٹوٹے پھوٹے ہوئے لہجے میں اپنا مدعا سمجھا دیا۔ اس کے شعور میں وقتاً فوقتاً ایسے خیالات بھی آیا کرتے تھے کہ سب چونک جاتے تھے۔ رشتوں کو پہچانتا تھا۔ اس میں غصہ نہ ہونے کے برابر تھا...... خوش خلقی ماں نے سکھادی تھی۔ سب میں خاموش بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہتا تھا۔ جس کا علم صرف ماں کو ہی تھا۔ اس کی زبان، اس کی باتیں اشارے کنائے صرف اور صرف ماں ہی سمجھ پاتی تھی۔

وہ دیر تک مینٹل پیس پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھتا رہا۔ ماں اور باپ کی شادی کی فوٹو گراف میں دونوں کس قدر پُرسکون نظر آرہے تھے۔ پھر وہ ایک دم سے دہاڑیں مارتا ہوا ممی کو پکارنے لگا۔ اسی اثنا نانا چند قریبی رشتے داروں کے ہمراہ اندر آئے اور اپنی ہمت کو بحال کرتے ہوئے بیٹی کی شہادت کا مژدہ سنایا۔

ابھی تک اسکول کی ٹیچرز اور نڈر و باحوصلہ پرنسپل کی بہادری اور بے خوفی کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اس لیے چیخ و پکار اور آہ و بکا آسمان کو چیرنے لگا تھا۔

سب سے چھوٹی، پیاری اور دکھیاری بیٹی اور بہو کی ناگہانی موت اور وہ بھی خونخوار درندوں کے ہاتھوں...... قیامت کا برپا ہو جانا قدرتی امر تھا۔ اِک کہرام مچ گیا تھا۔ ماں شہید ہو گئی۔ شہادت کسے کہتے ہیں۔ عثمان کو

☆فرحانہ پروین......راول پنڈی

سوال: رفاقت جاوید کے بچوں میں سے کسی بچے کو لکھنے کا شوق ہے اور اگر ہے تو وہ کیسا لکھ رہے ہیں؟

جواب: میرے بیٹے ڈاکٹر عمر کو لکھنے کا شوق بچپن سے ہے، وہ فرسٹ ائیر میں تھے جب پہلا دیوان شائع ہوا تھا۔ اب بھی ان کے پاس انگلش پوئٹری کی بھرمار ہے۔ بہت خوب صورت لکھتے ہیں۔ مجھے اپنے بچے پر بہت فخر ہے کہ کہاں سائنس اور کہاں ادب؟ انشاء اللہ کبھی کسی نظم کا ترجمہ آپ سب تک ضرور پہنچاؤں گی (ضرور)

سوال: رفاقت جاوید لکھنے کے حوالے سے اپنا استاد کسے تسلیم کرتی ہیں؟

جواب: میری بہترین استاد، راہنما اور محسن انجم ہیں، آج بھی کوئی نیا قدم اٹھانے سے پہلے ان سے مشورہ لینا بہت ضروری سمجھتی ہوں۔ استاد اور شاگرد کے خیالات میں ہم آہنگی ہو تو وقت کے ساتھ رشتہ مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر انجم جیسا کہ آپ بھی جانتی ہیں۔ بہت اعلیٰ اخلاق کی مالک ہیں، اللہ کرے ہم سب میں بھی ان کی جھلک نظر آئے۔

سوال: پاکیزہ کا ناول لکھ کر آپ کو ایسا نہیں لگا کہ یہ کچھ ادھورا ہو، یہ مزید اور آگے چلتا؟

جواب: پاکیزہ میں رنگ خلش کے جلد ختم کرنے کا جواب آپ کو میرا انٹرویو (شمارہ نومبر 2015ء) میں پڑھ

کچھ سُدبُد نہ تھی۔ ہکا بکا ہر ایک سے سوال کرتا رہا۔

”امی، شہید ہوگئی ہے گھر تو آجائے ناں۔“ وہ معصوم کیا جانے کہ وہ تو پیغمبروں اور فرشتوں کی ہمراہی میں جنت الفردوس کی باسی بن گئی ہے۔ اب وہ اس دارِ فانی میں کیونکر آئے گی۔ اس نے شہادت کا میٹھا ذائقہ چکھ کر بار، بار شہید ہونے کی تمنا کی ہوگی۔ اور اپنا حالِ دل اور حسین احساس کی یچی سرگزشت سب کو سنائی ہوگی۔

”اب وہ تمہیں خوابوں میں ملنے آئے گی۔“ نانا کے آنسو لگاتار گر رہے تھے۔

☆☆☆

دس گھنٹے اسکول میں ڈیوٹی دینے کے بعد جب وہ گھر میں قدم رکھتی تو گھر میں رونق آجاتی۔ باپ، بیٹا محوِ انتظار ہوتے۔ انہیں اپنے آس پاس دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھتے تھے۔ یاقوت گھر کی ذمے داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھانا جانتی تھیں۔ اس کا صرف نام ہی قیمتی نہیں تھا وہ خود بھی بیش بہا تھی۔ حالات سے مقابلہ کرنے، خوش رہنے اور اپنے پیاروں کو خوش رکھنے کا ادراک اس نے اپنے خاندان سے پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر پریشانی اور مایوسی کی ہلکی سی رمق نہیں ہوتی تھی۔ ایسے گمان ہوتا کہ جیسے مسکراتے چہرے کے ساتھ ہی اس روئے زمین پر تشریف لائی ہو...... ہر طرح کی پریشانی اور غم و فکر اس کی شگفتہ مسکان میں چھپ جایا کرتا تھا۔

”ڈیڈی ہم دونوں ممی کو واپس لے آتے ہیں۔“ آج رسمِ قل کے بعد باپ، بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

”تم کھانا نہیں کھاؤ گے تو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی۔“ باپ نے اسے پیار سے دھمکی دی۔

”میں کھانا ممی کے ہاتھ سے کھاتا ہوں ڈیڈی... آپ کو پتا بھی ہے۔ پھر سب مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں ذرا ممی کو تو آنے دیں......“ وہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

”ڈیڈی، پھولوں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی وہ عورت کون تھی۔ سب اسے یاقوت کہہ کر کیوں رو رہے تھے۔ وہ میری ممی تو کہیں سے نہیں تھی۔ ڈیڈی چارپائی پر تو پھول ہی پھول تھے۔ اور خون ہی خون تھا۔ وہ سب

کر مل گیا ہوگا۔

☆ اینہ عندلیب...... سلانوالی

سوال: آپ بہت خوب صورت ہیں، آپ کی خوب صورتی کا کوئی راز؟

جواب: اینہ میری جان میرا خیال ہے کہ کیمرے کا کمال ہے، فوٹو جینک بھی تو ہو سکتی ہوں ناں۔ جبکہ ظاہری حُسن کا اختیار تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس ہی رکھا ہے۔ جو زوال پزیر ہے۔ باطنی حسن کو... کردار اور اعلیٰ اخلاقیات سے نکھارنے کا اختیار ہمیں سونپا گیا ہے جو اس دارِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد بھی زندہ وجاوید رہتا ہے۔ اصلی اور خالص حسن اسے ہی کہتے ہیں۔ اندرونی حسن کے بغیر ظاہری حسن نامکمل ہے اور ایسے حسن سے کراہت آنے لگتی ہے۔ میری بیٹیوں کے لیے میرا پیغام ہے کہ خوب صورت خدوخال، رنگ روپ اور تراشا ہوا سرو قد بے وقعت ہو جاتا ہے۔ جب اس میں باطنی حسن کی آمیزش کی رمق تک نہیں ہوتی۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ آج بھی اپنی ایک خامی کو خوبی میں بدلنے کی کوشش میں دوسری بہت بڑی برائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اپنے مشن پر رواں دواں ہوں یہ سوچ کر کہ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔

سوال: آپ کی شکل دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ بہت محبت نواز ہیں، کیا آپ کا حلقۂ احباب بھی ایسا ہی ہے؟ آپ کی کوئی خاص دوست جو آپ کی ذہنی دوست بھی ہو؟

کیا تھا۔ پھر گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا۔'' باپ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ یہ منظر نہ ہی دیکھتا تو بہتر تھا لیکن اس وقت کسی کو اس کی پروا نہ تھی۔

''تمہاری پروا کرنے والی تو جا چکی...... وہ اس دنیا کی کلفتوں سے آزاد ہو کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ ہم اس کے لیے بے وقعت و بے حیثیت ہو گئے۔ اس لیے تو اسے اپنا راستہ چننے میں مشکل ہی نہیں ہوئی۔ وہ جنتی روح تھی۔ اسے بچوں سے والہانہ لگاؤ تھا۔ بچوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر بہار آجایا کرتی تھی۔ جب تم پیدا ہوئے تو بہت خوش تھی۔ تمہارے پیدا ہونے سے ہمارے سونے آنگن میں بہار آ گئی تھی۔ ہم دونوں خوشی سے نہال ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ اہمیت دینے والی خاتون تھی۔ پھر بھی اپنے کلچر کے پیشِ نظر وہ تمہاری پیدائش پر فخر سے تن گئی تھی۔ جب تم اپنے ہم عمر بچوں سے پیچھے رہ گئے۔ تو بھی اس نے مان کے نہ دیا۔ اس کا دل تمہیں ہینڈی کیپ تصور کرنے سے قاصر تھا۔ ماں جو تھی۔ آخر کار ایک سے ایک بڑھ کر قابل ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود بھی اس کے ذہن نے تسلیم نہیں کیا کہ میرے بچے کی ذہنی عمر بہت کم ہے۔ اس انکشاف کے بعد اس کی بے لوث محبت میں ہمدردی، رحم اور ترس کا ایسا جذبہ ابھرا کہ ہر بچہ اس کے لیے اسپیشل اور فریجائل بن گیا۔ ہر بچے میں اسے تم نظر آنے لگے، تمہیں دیکھ کر وہ ڈھے جاتی تھی آخر سکونِ دل کی خاطر اس نے اسکول جوائن کر لیا اور اپنی تمام تر توجہ ہر عمر کے بچوں کی جانب مبذول کر دی۔ وہ ماں ہی خوب نہ تھی...... ہر رشتے میں بے مثال تھی۔'' وہ آہ بھر کر پھر سوچ کی گہری وادیوں میں بھٹکنے لگے۔

''وہ اسکول اور کالج کے ہر بچے کی ماں تھی۔ ان کے مستقبل کو روشن بنانا اور اس کی زندگی کا مشن تھا۔ ہر وقت نئے پراجیکٹ کے بارے میں سوچتی اور اسی کالج کو یونیورسٹی بنانے کا سپنا دیکھا کرتی تھی۔ وہ ایسی ماں تھی کہ اسکول میں دل وجان سے بچوں کی خدمت کرتی اور گھر میں تمہاری اور میری خاطر مدارات کرنے میں اپنا سکون، نیند اور آرام قربان کر دیتی تھی اور جب آزمائش کا وقت آیا تو اس کے اندر کی ماں نے شہید

جواب: ہمارا مذہب ہی محبت ہے جو اس حقیقت کو پالیتا ہے، وہ محبت نواز ہو جاتا ہے۔ میرے حلقۂ احباب میں آپ کو ہر فطرت کی دوست ملے گی جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور دنیا کو پہچانا۔ اگر ہم اپنی ہی ذہنی وقلبی مطابقت کے دوستوں میں بیٹھیں گے تو ہم عقل وشعور، سوچ وسمجھ کی دنیا سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ میں نے یہ سیکھا کہ دوسروں کی سنو اور اپنی کم سناؤ کے مقولے پر چلیں تو آٹومیٹکلی آپ محبتیں سمیٹنے بھی لگتے ہیں اور بانٹنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے۔ اگر آپ کو ایک ہی کھانا بار بار کھلایا جائے تو انسانی فطرت کے مطابق آپ کا دل اکتا جائے گا۔ کیوں نہ ہر طرح کی دوستوں کی قربت میں مختلف ذائقوں کا مزہ اٹھائیں اور بھئی جھگڑا لڑوانے کی نہیں ہو رہی۔ کسی ایک دوست کا نام لکھ کر کہیں کی نہیں رہوں گی۔ ویسے میری دو عدد دوست ایسی ہیں۔ ایک دوست میری کتاب یا اسٹوری پڑھ کر پیش گوئی کرتی ہیں کہ قارئین کو کیسی لگے گی؟ جب میں نے پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا لکھی تو مسودہ انہیں بھیج دیا تو انہوں نے جو فیصلہ سنایا کہ ہٹ ہوگی پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسری دوست میری زبانی کچھ سننا چاہتی ہیں تو میں جب بھی کوئی خوب صورت تحریر لکھوں تو فوراً انہیں فون کے ذریعے ہی گوش گزار دیتی ہوں۔ بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ یہی دوست میری استاد بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے برش کے تمام آرٹ کو میرے اندر انڈیلنے کی کوشش کی ویسے آپس کی بات ہے جب محترمہ دوستی سے پروموٹ ہو کر استاد بنیں تو ایسی بے لحاظ اور سخت مزاج ثابت ہوئیں کہ الاماں...... آج بھی ان کی ڈانٹ کا سوچ کر ہنس دیتی ہوں کہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ کبھی میں ان کے لیے سروس کے دوران بڑی تھی۔ بیسیوں دوستوں میں سے دو کا نام لکھ کر اپنی نیند حرام کرنے کا میرا کوئی پروگرام نہیں...... ویری سوری۔

ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ شہادت کا یہ جذبہ اسے آرمی ماحول سے ہی تو حاصل ہوا تھا۔ جہاں ہر وقت جنگ اور شہادت کا ذکر رہتا ہے۔ اگر وہ اک مجاہدہ نہ ہوتی تو مجھے ہنستے مسکراتے شادی کے صرف ایک مہینے بعد ہی لڑائی پر نہ بھیجتی۔ اور جب میں معذور ہو کر موت و زندگی کی کشمکش میں واپس آیا تو اس نے میری زندگی کی دعا کی۔ جب میں موت کے منہ سے واپس لوٹا تو تمہاری پیدائش نے ہمیں ایک دوسرے کے اتنا قریب کر دیا کہ وہ تمہاری پرورش کے ساتھ مجھے بھی پالنے لگی۔ عثمان وہ میری بیساکھی تھی۔'' یہ سوچتے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

☆☆☆

''ڈیڈی! آپ چپ کیوں ہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟'' عثمان کے ٹوٹے پھوٹے سوالات پر شاہجہان پژمردہ سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر خود سے سرگوشی کی۔

''میرے بچے! میں تمہارے معصوم سوالوں کا کیا جواب دوں...... تمہاری ماں کو ان جان لیوا آزمائشی لمحوں میں تمہارا خیال ضرور آیا ہوگا...... اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ تمہارے پیار کے صدقے اس نے کئی بچوں کو گھیرے میں لے کر اسکول کے گیٹ سے باہر نکالا ہوگا۔ اور یہ سوچ کر واپس پلٹی ہوگی کہ میں فقط ٹیچر ہی نہیں اپنی کلاس کے پچاس بچوں کی ماں بھی ہوں...... اور کوئی ماں اتنی ظالم نہیں ہو سکتی کہ اپنے جسم کے ٹکڑوں کو بندوق کی نذر کر دے۔ ان معصوم فرشتوں کی جان بچانا میری ذمے داری ہے۔ یہی میرا فرض ہے اور یہی ماں کے بے لوث پیار کی انتہا ہے۔ یا قوت طبعاً ہی خدمتگار تھی۔'' وہ بیٹے کی التجا پر چونکے۔

''ڈیڈی...... میں کھانا کھا لوں گا لیکن اپنے ہاتھ سے...... آپ کو تنگ نہیں کروں گا، کوئی سوال بھی نہیں کروں گا...... بس میری ممی کو واپس لے آئیں۔ انہیں میرا پیغام پہنچا دیں کہ میں کھانا خود کھاؤں گا...... آئندہ تنگ نہیں کروں گا۔ روزانہ خود نہایا کروں گا۔ ساتھ کھڑا ہو کر نماز بھی پڑھوں گا اور آئندہ اپنے اسکول سے چھٹی بھی نہیں کروں گا۔ اور وہ لوری جو مجھے آپ کبھی کبھار سنایا کرتی تھیں، وہ بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے وہ

سوال: اپنی خوبیاں تین سطروں میں؟

جواب: میری خوبیوں کے بارے میں میری دوستوں سے پوچھیں یا میری تین عدد جنت سے اتری ہوئی حوروں سے۔ جنہیں دنیا والے بہو کا نام دیتے ہیں، بہو ہمیشہ سچ بولتی ہے، یہ بھی سچ کے سوا کچھ نہیں کہیں گی۔ ان سے رابطہ کیجیے۔

☆ مسز نزہت اشفاق...... کراچی

سوال: آپ کے اب تک کتنے ناول شائع ہوئے ہیں اور آپ کا پسندیدہ ناول؟

جواب: نزہت بہت سا پیار اور سلام...... میرے 13 عدد ناول شائع ہو چکے ہیں، دو عدد آج کل آپ کے ہاتھوں میں آنے کے لیے بے قرار ہیں۔ میری قاری دوستوں نے فیصلہ کیا ہے کہ حوا کے روپ ہزار بہترین ناول ہے۔ میں ان کتابوں میں فیصلہ نہیں کر پائی کہ مجھے کون سی پسند ہے۔ جیسے ماں اپنے بچوں میں تفریق نہیں کر سکتی۔ ایک کا چناؤ کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بس مجھے ان بچوں کی وفادار اور بے حد محبت کرنے والی ماں ہی سمجھیں...... جو ممتا کے ہاتھوں مجبور ہے۔

سوال آپ کا پسندیدہ کردار؟

جواب: بیوی کا کردار...... اللہ تعالیٰ نے بھی بیوی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کے مال اور اپنی عزتِ نفس کی حفاظت اور بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ہے اس پر جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں بہت گہرائی ہے اگر غور و خوص کیا جائے۔ وفادار اور نیک خصلت بیوی ہی گھر کو جنت کا گہوارہ بناتی ہے وہ ہی بہترین ماں بن کر اپنی

میں خود کو ہی سنا کر سو جایا کروں گا۔ ممی بس تم واپس آجاؤ...... مجھے اپنے گلے لگا لو ممی...... میرا تم سے پکا اور سچا وعدہ ہے، ہر بات مانوں گا۔ تم نے میرے بغیر اتنے سال کیسے گزار لیے...... مجھے صرف اتنا ہی بتانے آجاؤ۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بہ مشکل بولا۔ اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک ممی کو پکارتا رہا۔

اس بدنصیب کو ماں کے بغیر گزرے ہوئے چند دن ان گنت سالوں پر محیط لگے تھے۔ کیپٹن شاہجہان اس کی آہ و بکا سے بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پا سکے۔ دل میں ہوک سی اٹھی۔

''اُف سب واپس جانے کی تیاری کر رہے ہیں، ہم دونوں اکیلے ہی رہ جائیں گے۔ ہم دونوں تمہاری ماں کے بغیر کیسے رہیں گے؟ تمہارا اور میرا خیال کون رکھے گا۔ کون کرے گا ہمیں بے لوث پیار اور کون کرے گا ہماری فکر، کوئی ہے جو ہماری ضرورتوں اور ہمارے آرام کی خاطر خود کو بے آرام کرے گا؟ کوئی نہیں...... سب آج کے بعد ہمارا حال احوال فون پر کبھی کبھار ہی پوچھ کر ہم پر احسانِ عظیم کیا کریں گے۔

کبھی بھولا بسرا کوئی پیارا ہمارا دیدار کرنے پہنچ جائے گا۔ یہ ہو گی ہماری زندگی، میرے بچے یہ بتاؤ کہ گھاٹا کس کا ہوا۔ یا قوت کا یا تمہارا اور میرا...... اور ان ماؤں کا جو اپنے بچوں کی تلاش میں ننگے سر اور ننگے پاؤں واویلا کرتی ہوئی اسکول کے باہر دوڑ رہی تھیں۔ بین کرتی ہوئی بہنیں اپنے شہید بھائیوں کو پکار رہی تھیں۔ غم سے نڈھال بزرگ اپنی نئی نسل کے خاتمے پر سکتے کے عالم میں صبر و ایثار کا مجسمہ بنے ہوئے تھے اور رشتے دار درد و کرب کی داستان بنے اپنے پیاروں کو تسلیاں دے رہے تھے خسارہ کس، کس کا ہوا میرے بچے صرف ہمارا نہیں۔''

☆☆☆

عشا کی نماز ادا کر کے کیپٹن شاہجہان نے وہیل چیئر کا رخ بیڈ کی طرف کرتے ہوئے گہرائی سے سوچا۔ اپنا دکھ تو جیسے بہت ہی معمولی لگا ہو...... بیٹے کے کرب نے مار ہی ڈالا تھا۔ عثمان سامنے والے پلنگ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر الجھ سے گئے۔

''شہید کبھی مرتا نہیں۔ تمہارا ایمان ڈانواں ڈول

اولاد کو بلند کرداری سے ہمکنار کر سکے گی۔ یہ بیوی کا کردار ہی ہے جس سے مثبت یا منفی کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اس لیے بچوں کو نکاح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے ہی انہیں تمام ذمے داریوں سے آگاہ کرنا اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے اپنی ذات کو منوانے کی تلقین کرنا ضروری ہے کہ لاٹھی بھی سلامت رہے اور سانپ بھی مر جائے' یہ کیسے ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ماں کے فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔

سوال پاکیزہ آپ کی نظر میں؟

جواب: ''پاکیزہ'' ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک وسیع پلیٹ فارم ہے۔ ماشاء اللہ بہت سی دعائیں ہیں عذرا رسول، انجم انصار، نزہت اصغر، آمنہ حماد اور عظمیٰ آفاق کے لیے جن کی یکجائی میں پاکیزہ پر ہر لمحے نکھار آ رہا ہے۔ جزاک اللہ اب مجھے اجازت دیجیے۔ اللہ نے چاہا اور زندگی نے اجازت دی تو پھر ملیں گے۔

میرا خیال ہے اب قاری بہنوں کی تشنگی کسی حد تک دور ہو گئی ہوگی۔

رفاقت جاوید

بہت شکریہ رفاقت جاوید صاحبہ...... ویسے اب ہم سوچ رہے ہیں کہ ان بہنوں نے سوالات بھیج کر بہت اچھا کیا کہ رفاقت سے اس بہانے مزید باتیں ہو گئیں بلکہ کافی تفصیل سے ہو گئیں۔ یوں اب جا کر ان کا انٹرویو مکمل ہوا ہے کیوں ٹھیک ہے ناں قارئین.....!

کیوں ہے۔ اسے مستحکم اور مضبوط کرو، تمہاری بے سکونی، اطمینان میں بدل جائے گی۔ شہادت کو موت تصور کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ ذرا گریبان میں جھانکو کیپٹن' روزِ حشر تمہیں منافقین کے گروہ سے اٹھایا جائے گا۔ اور یاقوت شہدا کے گروہ میں کھڑی تمہارا استہزا اڑا رہی ہوگی۔ تم اسے کیا جواب دو گے؟'' ان کے اندر سے آواز آ رہی تھی جیسے یاقوت کہہ رہی ہو کہ ''تم نے میری حیات کو موت کا نام دے دیا۔ اس گناہ کی پاداش میں میرا حساب کتاب بہت سخت کر دیا گیا ہے۔'' وہ یہ سوچ کر بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گئے۔ اپنے قلب و ذہن کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرتے ہوئے انہیں زیادہ وقت نہ لگا۔ وہیل چیئر بیٹے کے قریب لے گئے۔ اپنی کمر کو ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے بڑبڑائے۔ ''یاقوت محتاجی تمہاری رفاقت میں کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اب تو لگتا ہے کہ دن اور راتیں بہت لمبے اور بھاری ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے تمہارے بے وقت اور اچانک جانے نے کمر توڑ دی ہے لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس فانی دنیا سے پیار کرنے والوں کا

یہی حال ہوتا ہے۔ جو اس وقت میرا ہے۔'' وہ پژمردہ لہجے میں بولے۔ ''مجھ سے کیے گئے تمام وعدے وعید کہاں چلے گئے۔ تمہیں ہمارا خیال کیوں نہیں آیا۔ یاقوت، باپ، بیٹے کو چیلنج کرنے کا انداز پسند آیا۔ تمہارا لختِ جگر محتاجی سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے، لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے کام خود کرنے لگا ہے۔ میرا بھی خیال رکھتا ہے۔ یہ اوپر والے کی اس پر رحمت ہے کیونکہ وہ تمہیں زندہ سمجھتا ہے۔ آج سے تم بھی میرے لیے زندہ ہو اور جنت کے دروازے پر میرا انتظار کرنا مت بھولنا۔'' وہ معمولی سا مسکرا دیے۔ ''میں تمہارا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ میری زندگی کا ہر لمحہ تمہاری قربت میں خوب گزرا...... اور تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے فوج اور اپنے خاندان کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ اگر تم اسکول سے فرار ہو کر اپنی جان بچا لیتیں تو میں چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جاتا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ تم نے ہماری پرانی ریت کی لاج رکھ لی۔ تمہیں اپنے خاندان اور قوم کی مائیں سلیوٹ کرتی ہیں۔ یاقوت بتاؤ کہ گھاٹا کس کا ہوا۔ تمہارا نہ میرا

نہ ہی تیرے، میرے خاندان کا اور نہ ہی فوج شرمندہ ہوئی اور نہ ہی ان، ماؤں، بہنوں، باپ، دادا کا جن کے خاندان میں شہادت نے بسیرا کرلیا ہے۔ وہ خوش بخت تو جنتی ٹھہرائے گئے ہیں۔ پھر خسارہ کیسا؟ ہم سب فائدے میں رہے۔ یہی شہید جنت کے دروازے پر ہمارا استقبال کرنے کھڑے ہوں گے اور ہماری گردنیں معطر گلاب کے تازہ پھولوں سے بھر دیں گے۔ پھر ہمیں جنت کا دیدار کرایا جائے گا۔ جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

اِنَّ اللّٰہ مع الصّٰبرین

بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' وہ عثمان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں ورد کرنے لگے تو عثمان نے اچنبھے سے باپ کی طرف دیکھا اور ممی کو آواز دی اور دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ وہ اس کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''بیٹا تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہاری ممی زندہ ہیں۔ لیکن وہ اس دنیا میں واپس نہیں آنا چاہتیں کیونکہ جس مالک نے ہمیں پیدا کیا ہے تمہاری ممی کی اسے ضرورت تھی سو اس نے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ بے شک ایسی حیات نصیب والوں کے لیے لکھ دی جاتی ہے۔''

''کہاں، کیسے اور کس نے بلالیا؟'' عثمان نے حیرت سے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔

''اٹھو میں تمہیں ممی کا گھر دکھاؤں......'' ملازم وہیل چیئر چلاتا ہوا باہر لان میں لے آیا۔ عثمان بھی کچھوے کی چال چلتا ہوا باپ کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''اوپر آسمان کی طرف دیکھو...... ان ستاروں کے جھرمٹ میں تمہارے جیسے بے شمار بچے تمہاری ممی سے درس لے رہے ہیں۔ اس نے وہاں اسکول کھول کر تدریس شروع کردی ہے۔ وہ ان تمام بچوں کی ماں بن گئی ہے کیونکہ انہیں تمہاری ماں کی اشد ضرورت تھی۔ ہم بھی بہت جلد تمہاری ممی کے پاس چلے جائیں گے۔'' وہ ستاروں کی طرف دیکھتے ہوئے عقیدت مندانہ لہجے میں بولے۔ ''اب یہاں دل نہیں لگتا......

یہ دنیا فانی اور بے وقعت ہے میرے بچے۔''

عثمان خاموشی اور حیرت سے ستاروں کو گننے لگا۔

کیپٹن صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''یاقوت میں تمہاری فطرت کو جانتا ہوں، تم نے دنیا میں معصوم شہید ہونے والے بچوں کو پہچان لیا ہوگا کیونکہ تم نے شہیدوں کے خون کے رنگ اور ان کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو اور سروں پر چمکتے دمکتے تاجوں سے اپنی برادری کو ڈھونڈنے میں دیر نہیں کی ہوگی۔ اور فوراً ان تمام بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہوگا۔ جامِ شہادت نوش فرمانے والے یہ ستارے تمہارے بیٹے ہی تو ہیں۔ ننھے منے پاکیزہ فرشتے اور ہر غم و فکر سے آزاد فقط خوشیوں، قہقہوں اور شرارتوں کے جھولوں میں ہلکورے لینے والے۔ ان کی شناخت میں تمہیں قطعاً مشکل نہیں ہوئی ہوگی۔ چاہے وہ اس دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں۔ تم نے انہیں گلے لگالیا ہوگا۔''

''ممی، میری ممی...... صرف میری ممی......'' عثمان آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

''ہاں بیٹا تمہاری ممی...... اسے انہی ستاروں میں ڈھونڈو، وہ تمہیں نظر آئے گی۔ وہ تمہیں مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلائے گی اور تم بھی اسے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کر کل پھر اسی وقت ملنے کا وعدہ کرو۔ میرے معصوم فرشتے اگر تم آنسو بہاتے ہوئے بھی ممی کو پکارو گے، ضد کرو گے تو وہ تم سے روٹھ جائے گی اور پھر تمہیں ملنے نہیں آئے گی۔''

وہ سمجھاتے رہے اور وہ افسردگی سے دیکھتا رہا۔

''ثانی تم تو بہادر اور نڈر ماں کے خوش قسمت بچے ہو۔'' وہ اسے بوسہ دیتے ہوئے بولے تو عثمان نے پھر ستاروں میں ماں کو تلاش کرنا شروع کردیا۔ اور تھوڑے توقف کے بعد باپ کی طرف فتحمندانہ انداز میں دیکھ کر آکاش کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے اپنی ممی کے نام کا اِک جگمگاتا ستارہ چن لیا تھا۔





سمجھوتا

فاطمہ جنان

''زین ، مجھے ذرا مارکیٹ سے یہ میڈیسن تو لادیں، کل سے وہی مسئلہ ہے دانت میں درد کا۔'' دعا نے زین کے سامنے وہی نسخہ لہراتے ہوئے کہا جو پچھلے مہینے ڈاکٹر نے لکھ کر دیا تھا۔

''دعا ، میں آفس کے انتہائی اہم کام میں مصروف ہوں ، تم خود جا کر لے آؤ۔'' زین نے انتہائی بیزاری سے جواب دیا جو اس وقت اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ نہ جانے کون سے کھیل کھیلنے میں مگن تھا۔

دعا نے ایک دکھ بھری نظر اپنی زندگی کے ساتھی کی طرف ڈالی اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ زین کا اس طرح کا رویّہ دعا کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر ہر بار کی طرح اس بار بھی زین کا وہی لہجہ دعا کی آنکھیں نم کر گیا۔

دعا اور زین کی شادی کو ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے اور ان چند مہینوں میں دعا اپنے مجازی خدا کے مزاج کے روکھے پن سے بہت حد تک آشنا بھی ہو چکی تھی۔ وہ فطرتاً ایک شوخ مزاج کی حامل لڑکی تھی اور اس نے اپنی زندگی کے ساتھی کے حوالے سے بھی کچھ خوب صورت خواب دیکھ رکھے تھے مگر ان خوابوں کی تعبیر کچھ زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔ اس کے نصیب میں زین جیسے روکھے انسان کا ساتھ لکھ دیا گیا تھا جو نہ صرف انتہائی سنجیدہ اور کم گو بلکہ بیوی کے معاملے میں بہت حد تک بے پروا تھا۔ وہ ہروقت اپنے دفتر کے کاموں میں مصروف رہتا...... دعا جیسی خوب صورت لڑکی اس کی زندگی میں آنے کے بعد بھی اس کے معمولات میں کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ شادی کے بعد زندگی اتنی اداس اور روکھی پھیکی ہوگی ایسا تو دعا نے کبھی نہیں سوچا تھا مگر اب یہی زندگی اس کا مقصد تھی۔

☆☆☆

زین جبار ایک کنسٹرکشن کمپنی میں پراجیکٹ ہیڈ تھا...... وہ اور اس کے بڑے بھائی موسیٰ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بہن کوئی تھی نہیں اس لیے اب وہ دونوں بھائی ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ موسیٰ، زین کی نسبت زندگی سے بھرپور ایک انسان تھے۔ ان کی شادی ان کی پسند سے ہوئی تھی۔ ان کی بیگم زرقا اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ، دیکھ کر جیتے تھے اب جبکہ ان کی زندگی میں دو خوب صورت بچوں کا اضافہ بھی ہو چکا تھا...... اس کے باوجود ان دونوں کی ایک دوسرے کے لیے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ زین کی شادی موسیٰ کے ایک جاننے والے کے توسط سے طے ہوئی تھی۔ اس گھرانے کی شرافت اور روایت پسندی نے موسیٰ کو بہت متاثر کیا تھا اور وہ فوراً سے پیشتر زین کا وہاں رشتہ طے کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس سلسلے میں میاں، بیوی دونوں نے زین کی رائے لینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ زین جو پہلے ہی اپنے بڑے بھائی کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور یوں دعا، زین کی زندگی میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح داخل ہوگئی مگر زین کے تلخ رویّے نے شروع دن سے ہی دعا کو اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ وہ ان کی زندگی میں خوشی سے نہیں بلکہ زبردستی داخل ہوئی ہے۔

☆☆☆

زندگی کسی حبس زدہ موسم کی طرح دعا کے پاس سے گزرتی جا رہی تھی اور اسے لگتا تھا کہ تازہ ہوا کے چند جھونکوں کی خواہش میں اس کی عمریوں ہی تمام ہو جائے گی۔

اس روز چھٹی والے دن اچانک ہی اس کے بھائی، بھابی اس سے ملنے کے لیے آ گئے۔ اپنے بھائی اور بھابی کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ خوشگوار ہوا کے کئی جھونکے ایک ہی جست میں اس سے آ کر لپٹ گئے ہوں۔ بہت دنوں بعد اس نے زندگی کے کسی لمحے کو اتنی خوشی سے محسوس کیا تھا۔ زین کو اگرچہ ان کی آمد کی خبر ہو چکی تھی مگر اسے کوئی ضروری فون آ گیا جس کے بعد وہ گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ دعا اپنے بھائی اور بھابی کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کرنے لگی تھی مگر وہ دونوں کھانا کھانے کہیں باہر جانا چاہتے تھے اور دعا کو بھی وہ اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے۔ وہ پہلے تو راضی نہیں ہوئی مگر پھر ان دونوں کے بے حد اصرار پر وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ وہ زین کو فون کر رہی تھی مگر زین اس کی کال نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس پر اس کی جیٹھانی نے اسے یقین دلایا کہ وہ بھائی، بھابی کے ساتھ چلی جائے وہ سارا معاملہ سنبھال لیں گی۔ موسیٰ

بھائی نے کہا اور یوں دعا ان دونوں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے باہر نکل گئی۔ شہر کے ایک معروف ریسٹورنٹ کے سامنے انہوں نے اپنی گاڑی پارک کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے بھائی، بھابی کے ساتھ بڑے خوشگوار موڈ میں وہ وہاں کھانا کھا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی اور بہت زیادہ باتیں کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس سے زیادہ مزیدار کھانا اس نے پہلے کبھی نہیں کھایا۔ ابھی انہیں کھانا کھاتے ہوئے کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ اچانک کچھ آوازوں نے دعا کے سارے جسم کو جیسے برف کر دیا تھا۔

''وقت دیکھا ہے تم نے...... پتا نہیں لوگ اتنے مصروف کیوں رہتے ہیں۔''

شکوے میں ڈوبی ایک آواز سنائی دی اور دعا اس آواز کو لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

''سوری زین، ایک تو آج چھٹی ہونے کے باوجود آفس میں بہت کام تھا اور دوسرے گاڑی ٹریفک میں پھنس گئی تھی۔ تو کیا کرتی اچھا چلو اب تم اپنا موڈ ٹھیک کرو۔''

انتہائی نرمی سے کچھ جملوں کو ادا کرنے کے بعد وہ لڑکی شاید اب کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان دونوں کے ہنسنے کی آوازیں دعا کے کانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ وہ دونوں دعا کی میز کے پیچھے والی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ اس کی پشت اُن کی طرف تھی۔ جبھی وہ ان کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھی۔ اس کے بھائی اور بھابی کھانے میں اس قدر مگن تھے کہ ان کی توجہ ان کی سامنے والی میز کی طرف بالکل بھی نہیں تھی۔

ویسے بھی ریسٹورنٹ میں کرسیوں کی ٹیک اتنی لمبی تھی کہ دوسرا بندہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ دعا کو وہ آوازیں پریشان کر رہی تھیں...... اپنی بے چینی دور کرنے کے لیے وہ واش روم جانے کے بہانے آئی اور جیسے ہی اس نے اپنا رخ بدلا۔ اسے اس مرد کا چہرہ نظر آ گیا۔ یہ وہی مرد تھا جو اس کی زندگی کا ساتھی ہونے کا دعوٰی دار تھا جو ہر وقت اپنی مصروفیت کی کہانیاں اسے سناتا رہتا تھا۔ اس لمحے اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک انتہائی کم گو اور سنجیدہ آدمی ہے۔ وہ کچھ دیر تک دور سے زین کو اس لڑکی کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھتی رہی اور پھر تھکے، تھکے قدموں سے واپس اپنی جگہ آ گئی۔ تعجب تھا کہ زین نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں ریسٹورنٹ سے باہر تھے اور گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دعا کے بھائی نے البتہ زین کو اس لڑکی کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان کا دل چاہا دعا کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں۔

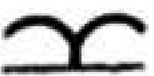
''اب کدھر جانا ہے تمہیں؟'' وہ پوچھ بیٹھے تھے۔ دعا ان کے لفظوں میں چھپے معنی کھوج چکی تھی۔

''مجھے میرے گھر واپس چھوڑ دیں......'' دعا نے سر جھکا کر کہا۔ آنسوؤں کی آمیزش سے اس کی آواز میں گھلتی نمی کو اس کے بھائی نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا

''مگر......'' ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی انہیں ایک بار آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دعا کے چند اور جملے سنائی دیے۔

''بھائی، میں ایک کمزور لڑکی ہوں، ایک مرد کے سہارے کی منتظر ایک کمزور اور بے بس لڑکی...... جو اگر اپنے گھر سے نکلی تو زمانے کی تیز نظروں اور چبھتے ہوئے جملوں کا سامنا نہیں کر سکے گی۔'' بھرائی ہوئی آواز میں چند جملے ادا کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔

انہوں نے حیرت سے اپنی اس بہن کی طرف دیکھا جو اپنے کالج کی ایک بہترین مقررہ اور عورتوں کے حقوق پر گھنٹوں بولنے والی لڑکی تھی......اور اب اپنی خوشی سے ایک سمجھوتے بھری زندگی گزارنے جا رہی تھی۔ ان کی بیگم حیرت سے ان دونوں بہن بھائیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اب ان کی گاڑی کا رخ زین کے گھر کی طرف تھا جہاں ان کی بہن اپنی خوشی سے سمجھوتے کی زندگی گزارنے جا رہی تھی۔





اختر شجاعت

نماز...... رابطۂ الٰہی

کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو یکتا و لاشریک ہے...... اسی کے لیے حمد و ستائش ہے۔ وہ زندگی و موت دینے والا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہی بھلائی ہے اور ہر چیز پر اسے قدرت حاصل ہے...... اے اللہ! تو کرم و بخشش کرنے والا اور ہر عیب سے پاک ہے تو جود و سخا کرنے والا اور بزرگ و برتر ہے۔ اے وہ ذات! جو حاجت طلبی کی آخری منزل ہے اور اے وہ ذات! جس سے مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ بے شک تو بڑے فضل والا اور قدیم احسان کرنے والا ہے اور اپنے لطف و کرم سے بہت بخشنے والا ہے، بے شک تو بزرگی اور اعزاز والا ہے۔

اے اللہ! تو حضرت محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما...... جس طرح تو نے ان کے وسیلے سے ہماری ہدایت فرمائی ہے۔ ان کے ذریعے ہمیں گمراہی کے بھنور سے نکالا ہے...... آمین۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کائنات میں بھیجا اور اسے کامیاب زندگی گزارنے کے طریقے بتائے تاکہ انسان دونوں جہانوں (دنیا و آخرت) میں کامیابی حاصل کرے...... اور یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اطاعت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے...... لہٰذا اس کے احکامات، تعلیمات، ہدایت اور بھلائی کس طریقے پر عمل کر کے حاصل ہوگی یہ سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ ہدایت شروع کیا۔

نسلِ انسانی کے لیے یہ ہدایت لانے والے نبی اور رسول کہلائے کیونکہ رسالت کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے پیغام کو، اس کے احکام کو، اس کی مرضی کو نہیں جان سکتا، اس لیے نبیوںؑ ہی نے بحکم الٰہی بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت عطا کی۔ خالقِ کائنات اللہ رب العزت نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے امتِ مسلمہ کو جس آخری اور مکمل دین سے نوازا وہ مقدس اور پسندیدہ دین، دین اسلام ہے جو بنیادی طور پر پانچ ارکان پر مشتمل ہے۔ جن پر اسلام کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے ان میں سے ایک کا بھی انکار اسلام کا انکار ہے۔

1۔ کلمہ پڑھنا، توحید و رسالت کا اقرار

2۔ نماز، 3۔ روزہ، 4۔ زکوٰۃ، 5۔ حج،

اگر ہم اس ترتیب پر غور کریں تو ہمیں نماز کی اہمیت اور اس کی مرکزیت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ نماز وہ عبادت ہے جو پروردگار کے سب سے زیادہ قرب کا باعث بنتی ہے۔ نماز درحقیقت انسان کی بے چین روح کا چین اور قلب کا قرار ہے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شریعت کے دوسرے احکامات زمین پر بھیجے گئے لیکن جب نماز فرض کی گئی تو آنحضرت ﷺ کو عرش پر بلایا گیا اور معراج کی شب اس کی تکمیل ہوئی۔ ابتدا میں پچاس نمازیں تھیں مگر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کی نافرمانی دیکھ چکا ہوں آپ ﷺ کی امت پچاس نمازیں ادا نہ کر پائے گی لہٰذا آپ ﷺ بارگاہِ الٰہی میں نمازوں میں کمی کی درخواست کے ساتھ تشریف لے گئے اور دس نمازیں کم ہوگئیں۔ واپسی میں حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی دلیل دی آپ دوبارہ تشریف لے گئے اور نمازیں دس مزید کم ہوگئیں......

یہاں تک کہ کم ہوتے، ہوتے پانچ رہ گئیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ نمازیں پانچ ہیں لیکن ثواب پچاس نمازوں کا ہے۔ نمازیں وہ عبادت ہے جو دن میں پانچ بار فرض ہے۔

اس کے لیے عربی لفظ صلوٰۃ ہے۔ نماز کے لغوی معنی ہیں پرستش، عاجزی۔ بندہ اپنے اللہ کے سامنے اپنی حد درجہ عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ نماز ذکر الٰہی کی کامل ترین صورت ہے اور تعلقِ بندگی میں مومن کے لیے معراج کی حیثیت رکھتی ہے۔ نماز ہی کے ذریعے قربِ الٰہی کی منزلیں طے کی جاسکتی ہیں۔

قرآن حکیم میں سو سے زائد مقامات پر نماز کا حکم دیا ہے۔

صلوٰۃ (نماز) کا لفظ صلی سے مشتق ہے اور وہ آگ ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی ٹیڑھی چیز کو سیدھا کرنا چاہتے ہیں تو اسے آگ دکھاتے ہیں اور وہ اس کی تپش سے سیدھی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح انسان میں اس کے نفس کے سبب سے کجی ہے۔ جو اسے برائی کی جانب مائل کرتی ہے اور ذاتِ الٰہی کے انوار ایسے ہیں اگر اس پر سے پردے ہٹادیے جائیں تو جو چیزیں وہاں موجود ہوں گی اس کو جلا ڈالیں گے بس جب مومن سطوتِ الٰہی اور عظمتِ ربانی کے شعلے سے سنک جاتا ہے تو اس سے نفس کی کجی دور ہوجاتی ہے۔ نماز کے لیے وہ پانچ آداب ہیں جو بے حد ضروری ہیں۔

1۔ طہارت 2۔ ستر 3۔ پابندیِ وقت

4 ۔ استقبالِ قبلہ 5۔ نیت

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ”جب کوئی شخص وضو کر کے پورے آدابِ وکمالِ یکسوئی کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو کر نماز ادا کرتا ہے تو نماز خود اس کے حق میں دعا کرتی ہے کہ جس طرح تو نے میری حفاظت کی اللہ تعالیٰ اسی طرح تیری حفاظت کرے...... پھر وہ دعا آسمان کی طرف پرواز کرتی ہوئی عرشِ الٰہی کے کنگرے تھام کر اس نمازی کی بخشش و مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے سفارش کرتی ہے......

اس کے برعکس جو شخص اس حالت میں نماز میں داخل ہوتا ہے کہ اس کی زبان تو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہے لیکن اس کا دل دنیاوی معاملات میں الجھا ہوا ہو تو وہ نماز زبانِ حال سے اس نمازی کے لیے بددعا کرتی ہے کہ اے بندے جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا اللہ تعالیٰ تجھے بھی اسی طرح ضائع کرے...... وہ نماز اس بندے کے منہ پر ماردی جاتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ”میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔“

اللہ تعالیٰ نے توحید کے بعد اپنے بندوں پر نماز سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز فرض نہیں کی...... اگر نماز سے زیادہ کوئی دوسری چیز محبوب تر ہوتی تو فرشتے اس کی عبادت کرتے...... حالانکہ فرشتے نماز کے افعال ادا کرتے ہیں...... ان میں سے کوئی حالتِ رکوع میں ہے کوئی سجدہ کرنے والا اور کوئی کھڑا ہے اور کوئی بیٹھا۔

قیامت میں بندے کے اعمال میں سب سے پہلے نماز دیکھی جائے گی اگر وہ پوری ہوئی تو اس کی نماز اور اس کے تمام اعمال قبول کرلیے جائیں گے اور اگر وہ ناقص ہوئی تو اس کی نماز اور اس کے تمام اعمال رد کردیے جائیں گے۔

جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی وہ محمد ﷺ کے ذمے سے نکل گیا اور جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی اس نے کفر کیا۔

بعض علما کہتے ہیں کہ نمازی کی مثال ایسی ہے جیسے تاجر...... جب تک تاجر کے پاس سرمایہ نہ ہو اسے نفع حاصل نہیں ہوتا...... فرض نمازیں دراصل راس المال ہیں جب تک کسی بندے کے پاس اصل نمازیں نہ ہوں اس وقت تک نوافل بھی قبول نہیں ہوتے...... نماز کا جب وقت آتا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ لوگوں سے کہتے ”کھڑے ہوجاؤ اور جو آگ تم نے لگائی ہے اسے بجھادو......“ (یعنی نماز کے ذریعے گناہوں کا ازالہ کرو) چوری کسی شے کی بھی ہو گناہ ہے مگر سب

سے برا وہ شخص ہے جو نماز میں چوری کرے۔ کچھ لوگوں کو آنحضرت ﷺ نے نماز میں نہیں دیکھا تو خفا ہو کر فرمایا۔

’’میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ کسی شخص کو نماز پڑھانے کے لیے کہوں اور خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں نہیں آتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔‘‘

’’جو شخص عشا کی نماز میں حاضر ہوا گویا اس نے آدھی رات کی عبادت کی اور جو صبح کی نماز میں حاضر ہوا گویا اس نے رات بھر عبادت کی۔‘‘

’’جو با جماعت نماز ادا کرتا ہے وہ اپنا سینہ عبادت سے پُر کر لیتا ہے۔‘‘

☆☆☆

ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا...... یا رسول اللہ ﷺ! میرے لیے دعا فرمائیں...... اللہ تعالیٰ مجھے ان لوگوں میں سے بنائے جن کے لیے آپ کی شفاعت ہو اور جنت میں آپ کی رفاقت نصیب کرے۔ ارشاد فرمایا۔ ’’تو سجدوں کی کثرت سے میری مدد کر۔‘‘

’’بندہ اللہ تعالیٰ سے اس وقت سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب وہ حالتِ سجدہ میں ہو۔‘‘

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ ’’رسول اللہ ﷺ ہم سے باتیں کرتے اور ہم آپ سے باتیں کرتے مگر جب نماز کا وقت آجاتا تو آپ کی یہ حالت ہو جاتی کہ گویا نہ آپ ﷺ ہم کو پہچانتے اور نہ ہم آپ ﷺ کو پہچانتے......‘‘ ایک اور روایت میں ہے کہ

’’حضور اکرم ﷺ جب اذان سنتے اسی وقت سے آپ کی یہ حالت ہو جاتی کہ گویا آپ کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔‘‘

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب کسی فرض نماز کا وقت قریب آتا تو آپ کرم اللہ وجہہ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا اور عجیب قسم کی کیفیت ہو جاتی...... لوگ عرض کرتے...... امیر المومنین......! کیا ہوا؟ آپ کرم اللہ وجہہ فرماتے......’’اس امانت کی ادائیگی کا وقت آ گیا جو اللہ نے آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان سب نے اس امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔‘‘

حضرت امام زین العابدینؒ کی وضو کے وقت یہی کیفیت ہو جاتی تھی...... گھر والے پوچھتے کہ وضو کے وقت آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟ فرماتے...... ’’کیا تم لوگ جانتے نہیں ہو کہ مجھے کس کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔‘‘

حضرت حاتم اصم سے لوگوں نے ان کی نماز کی کیفیت دریافت کی...... فرمایا۔’’ جب نماز کا وقت آتا ہے۔ میں اچھی طرح وضو کرتا ہوں۔ اور اس جگہ آتا ہوں جس جگہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے۔ وہاں کچھ دیر بیٹھتا ہوں یہاں تک کہ میرے حواس مجتمع ہو جاتے ہیں پھر نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور اس تصور کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں کہ کعبہ میرے دونوں ابروؤں کے درمیان ہے۔ پل صراط پاؤں کے نیچے ہے۔ جنت دائیں جانب اور دوزخ بائیں جانب ہے اور ملک الموت پشت کی طرف ہے۔ میں اپنی اس نماز کو آخری نماز سمجھتا ہوں...... پھر خوف و امید کے ساتھ اللہ اکبر کہتا ہوں قرأت اچھی طرح کرتا ہوں، رکوع تواضع کے ساتھ اور سجدہ خشوع کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔ مکمل افعالِ نماز اخلاص کے ساتھ ادا کرتا ہوں پھر میں نہیں جانتا کہ میری نماز قبول ہوئی یا نہیں۔‘‘

حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ’’تفکر کے ساتھ دو رکعتیں غافل دل کے ساتھ تمام رات عبادت کرنے سے بہتر ہیں۔‘‘ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ مرنے والے نمازی پر زمین چالیس روز تک روتی ہے۔‘‘ گریہ وزاری اور نالہ و اشک باری صرف گناہ گاروں، فاسقوں اور فاجروں کی ہی ضرورت نہیں بلکہ ہمیشہ زاہدوں اور عبادت گزاروں کا بھی شیوہ رہا ہے...... اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جس قدر کوئی برگزیدہ اور مقرب ہوتا ہے اس کی رقیق القلبی اور گریہ وزاری

میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے...... الطاف وعنایاتِ خداوندی میں اضافے سے مقبولان الٰہیؒ میں رقتِ قلب اور سوز وگداز کی کیفیت دوچند ہو جاتی ہے۔

حضرت سیدنا عمر فاروقؓ کی سخت گیری مشہور ہے لیکن اللہ کے حضور آپؓ کی گریہ وزاری اور رقت انگیزی حیران کن ہے...... آپؓ خوفِ خدا کے باعث اتنی کثرت سے روتے تھے کہ آپؓ کے رخساروں پر شدتِ گریہ سے نشانات پڑ گئے تھے۔

سیدنا حضرت امام حسنؓ سے منسوب ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا...... کہ ''میں اپنے عبادت گزار بندے سے نماز میں تین چیزوں کا طالب ہوں...... جسم کی نیاز مندی، دل کی یکسوئی...... اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو...... اگر وہ یہ تینوں چیزیں میری نذر کر دے تو مجھے میری عزت کی قسم میں اس کے اتنا قریب ہو جاتا ہوں کہ اس سے زیادہ بہتر قرب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' تو باطنی ادب کا تقاضا یہ ہے کہ تمام چیزوں سے بے نیاز ہو کر اپنی تمام تر توجہ صرف اور صرف اپنے عظیم الشان رب کی طرف کر دے۔ قلبی اور باطنی توجہ کے ذات باری تعالیٰ کی طرف مرتکز رہنے سے انسان کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کی خلوت وجلوت میں کوئی فرق نہیں رہتا...... تو جسے لذت و آشنائی کی دولت نصیب ہو جائے اس کی تمام تر محبتیں...... چاہتیں، جذب وکیف اور سوز ومستی کی کیفیتیں صرف ایک ذات کے لیے وقف ہو جاتی ہیں۔ حضرت زین العابدینؒ فرض نماز کے علاوہ ہر روز ایک ہزار رکعت نوافل ادا کرتے تھے اور وفات تک اس معمول میں فرق نہیں آیا۔ اس عبادت کی وجہ سے آپ کا لقب زین العابدین ہوا۔ قیامِ لیل میں سفر وحضر میں کسی بھی حالت میں ناغہ نہ ہوتا تھا۔

اور خوفِ الٰہی کا یہ حال تھا کہ حضوری کے وقت سارے میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جب آپؒ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو سارے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپؒ کو یہ کیا ہو جاتا ہے؟ فرمایا...... ''تم لوگ کیا جانو میں کس کے حضور میں کھڑا ہوتا ہوں اور کس سے سرگوشی کرتا ہوں۔''

محویت کا یہ عالم ہوتا کہ نماز کی حالت میں کچھ بھی ہو جائے آپؒ کو خبر نہیں ہوتی...... ایک مرتبہ آپؒ سجدے میں تھے کہ کہیں پاس ہی آگ لگ گئی لوگوں نے آپؒ کو بھی پکارا۔

''اے ابنِ رسول...... آگ لگ گئی...... آگ لگ گئی۔'' لیکن آپؒ نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ آگ بجھ گئی لوگوں نے آپؒ سے پوچھا...... آپؒ کو آگ کی جانب سے اس قدر بے پروا کس چیز نے کر دیا تھا...... فرمایا۔ ''دوسری آگ نے جو آتشِ دوزخ ہے۔''

☆☆☆

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے اپنے اوپر چار سو رکعات لازم کر رکھی تھیں...... اس قدر درجۂ کمال رکھتے ہوئے اتنی مشقت کس لیے ہے؟ انہوں نے فرمایا...... ''یہ تمام رنج وراحت تمہاری حالت کا پتا دیتا ہے...... حق تعالیٰ کے کچھ دوست ایسے ہیں جن کی صفات فنا ہو چکی ہیں، ان پر نہ رنج اثر کرتا ہے اور نہ راحت...... ! کاہلی کو رسیدگی کا نام نہ دو اور نہ حرص کا نام طلب رکھو۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ذوالنون مصریؒ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا تھا جب انہوں نے تحریمہ کے وقت اللہ اکبر کہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے گویا جسم میں حس وحرکت نہ رہی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ عورت خوب یاد ہے جسے میں نے بچپن میں دیکھا تھا جو بہت عبادت گزار تھی بحالتِ نماز بچھو نے اس عورت کے چالیس مرتبہ ڈنک مارے مگر اس کی حالت میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے کہا۔ ''اے اماں! اس بچھو کو تم نے کیوں نہیں ہٹایا؟'' اس نے کہا...... ''اے فرزند! تو ابھی بچہ ہے، یہ کیسے جائز تھا میں اپنے رب کے کام میں مشغول

تھی...... اپنا کام کیسے کرتی ؟''

حضرت ابو الخیر اقطعؒ کے پاؤں میں آکلہ تھا...... طبیبوں نے مشورہ دیا کہ یہ پاؤں کٹوا دینا چاہیے مگر وہ راضی نہیں ہوئے آپ کے مریدوں نے طبیبوں سے کہا کہ جب یہ نماز میں ہوں تو ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے کیونکہ اس وقت انہیں اپنی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب نماز سے فارغ ہو کر دیکھا تو پاؤں کو کٹا ہوا پایا...... اللہ اکبر...... کس قدر توجہ خضوع وخشوع والی نمازیں تھیں ہمارے اسلاف کی...... سبحان اللہ......!

حضرت اویس قرنیؓ عشق و محبت کا پیکر تھے...... جنہیں سرکارِ دو عالم ﷺ کی قربت اور حضوری دور رہ کر بھی حاصل تھی...... فرطِ محبت میں جنوں کا غلبہ ہوا تو آپؓ دیوانوں کی طرح ننگے پاؤں، پریشان حال، خستہ حال پھر رہے ہوتے تھے۔ لڑکے ان کو پتھر مارتے جسم سے خون بہنے لگتا...... تب وہ بچوں سے کہتے۔

''مجھے بڑے پتھروں سے نہیں بلکہ چھوٹے پتھروں سے مارو...... تب ان میں سے کسی نے کہا۔'' اویس......! تیرے دعویٔ عشق ومحبت کی یہی حقیقت ہے کہ بڑے پتھروں سے خوفزدہ ہو گئے۔'' وہ یہ سن کر رو پڑے...... اور فرمانے لگے کہ'' میں بڑے پتھروں سے نہیں ڈرتا بلکہ بات یہ ہے کہ ان سے خون بہنے لگتا ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے مجھے یہ گوارا نہیں کہ یادِ محبوب کا کوئی بھی لمحہ بے وضو بسر ہو...... اس لیے میری تمنا ہے کہ محبوب سے تعلق برقرار رکھتے ہوئے تمہارے پتھر بھی کھاتا رہوں اور وضو بھی نہ ٹوٹے۔''

تو نماز کا وقت عشاق کے لیے درحقیقت بارگاہِ محبوب میں حاضری اور حجابات اٹھنے کا وقت ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ایسے ہی پروانوں کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے کہ......'' اے محبوب! آپ انہیں (ہمہ وقت) رکوع و سجود کی حالت میں اللہ کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہوئے (ہی) دیکھیں گے۔'' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ'' جو شخص اللہ تعالیٰ کے آگے جتنا جھکتا چلا جاتا ہے وہ ذات اسے اتنا ہی سر بلند کرتی چلی جاتی ہے۔ عاجزی، تواضع، خاکساری اسے انتہائی پسند ہے جبکہ غرور وتکبر، رعونت و تفاخر...... ظلم و ستم اس کے قہر و غضب کو دعوت دیتا ہے...... اللہ کی راہ میں جھکنے والے بلندی و رفعت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

نماز بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان تعلق کو استوار کرتی ہے۔ اس لیے بندے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ اس تعلق میں خضوع وخشوع کا اظہار کرے...... غفلت کی نماز بندے کے لیے زوال کا باعث بن جاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ'' جب بندہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتا ہے پس جب وہ کسی طرف ملتفت ہوتا ہے یا کسی طرف توجہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ'' اے ابنِ آدم کیا وہ تیرے لیے مجھ سے بہتر ہے؟ (جس کی طرف تو دیکھ رہا ہے) میری طرف منہ کر...... میں تیرے حق میں بہتر ہوں اس شخص سے جس کی طرف تو نے توجہ کی۔''

حضور اکرم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا......'' اگر اس شخص کے دل میں خضوع وخشوع ہوتا تو اس کے اعضا و جوارح بھی خضوع وخشوع کرتے......'' اس لیے تاکید فرمائی کہ تم جس وقت نماز پڑھو تو اس طرح پڑھو جس طرح ایک رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے...... کیونکہ نمازی اللہ تعالیٰ کی جانب دل سے رواں دواں ہے۔ یعنی اس وقت وہ اپنی خواہشوں اپنی دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نماز میں محویت کا یہ عالم ہوتا کہ جب لڑائی میں ان کے تیر لگ جاتے تو وہ نماز ہی میں نکالے جاتے...... چنانچہ ایک مرتبہ ران میں

ایک تیر گھس گیا لوگوں نے نکالنے کی کوشش کی نہ نکل سکا..... آپس میں مشورہ کیا کہ جب مولائے کائنات نماز میں مشغول ہوں اس وقت نکالا جائے جب آپ نے نفلیں شروع کیں اور سجدہ میں گئے تو ان لوگوں نے تیر کو زور سے کھینچ لیا..... جب آپ کرم اللہ وجہہ نماز سے فارغ ہوئے تو آس پاس مجمع دیکھا..... فرمایا..... ”کیا تم لوگ تیر نکالنے کے واسطے آئے ہو؟“ لوگوں نے عرض کیا کہ ”وہ تو ہم نے نکال بھی لیا.....“ آپ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا..... ”مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔“

☆☆☆

نماز دعا ہے..... نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے تمام اعضا اور جوارح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اس کے تمام اعضا زبان بن جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ بندہ ظاہر و باطن میں اس کو پکارتا ہے تو جب وہ انتہائی عاجزی سے سراپا دعا بن کر اپنے رب کو پکارے گا تو وہ عظیم الشان رب اپنے بندے کی دعاؤں کو ضرور سنے گا کیونکہ اس نے فرمایا ہے ”تم مجھے پکارو میں ضرور تمہاری دعا قبول کروں گا۔“

اللہ تعالیٰ نے نمازی کے لیے دو رکعت میں وہ تمام عبادتیں جمع فرمادی ہیں جو آسمان والوں کے لیے الگ تقسیم کر رکھی ہیں..... یعنی ان میں بہت سے فرشتے ایسے ہیں کہ جب سے وہ پیدا ہوئے ہیں حالتِ رکوع میں ہیں..... اور وہ قیامت تک حالتِ رکوع سے نہیں اٹھیں گے۔

بہت سے فرشتے ایسے ہیں جو حالتِ سجدہ میں ہیں بہت سے حالتِ قیام و قعود میں ہیں..... تو جب ایک مومن دو رکعت نماز پڑھتا ہے تو فرشتوں کی دس قطاریں اس پر تعجب کرتی ہیں۔ اور ہر قطار میں دس ہزار فرشتے ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایک لاکھ فرشتوں پر اس کے ذریعے فخر کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بندے میں نماز کے چاروں ارکان جمع ہیں۔ یعنی قیام، قعدہ، رکوع، سجدہ..... اور یہ چاروں ارکان چالیس ہزار فرشتوں پر منقسم ہیں..... پھر اللہ تعالیٰ نے نماز کے دوسرے چھ ارکان بھی اس نمازی بندے میں جمع کردیے ہیں۔ یعنی تلاوت، حمد، استغفار اور دعا.....

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ”درود وسلام ان میں ساٹھ ہزار فرشتوں پر تقسیم کردیا اس لیے کہ فرشتوں کی ہر قطار ان چھ اذکار میں سے ایک، ایک ذکر میں مصروف ہے تو جب فرشتے بندے کو اس دو رکعت میں یہ چھ ارکان اور دوسرے اذکار جمع دیکھتے ہیں تو انہیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان پر فخر فرماتا ہے اس لیے کہ اس نے یہ ارکان اور اذکار ایک لاکھ فرشتوں میں تقسیم کر رکھے ہیں..... اس طرح فرشتوں پر مومن کو فضیلت دی۔“

جناب رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔“

ترکِ نماز ایسا سنگین جرم ہے جس کا مرتکب عالمِ آخرت میں روسیاہ اٹھایا جائے گا ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں ایک شخص مرگیا..... اس کو قبر میں اتارتے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ مسخ ہو کر سیاہ خنزیر کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس شخص کے لواحقین سے پوچھا۔ ”کیا وہ نماز پڑھتا تھا؟“ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے ایسے بے نمازی کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ ”قیامت کے دن اللہ اسے کالے خنزیر کی صورت میں اٹھائے گا۔“

بے نماز شخص ایسا بدبخت ہے کہ حضور اکرم ﷺ اسے اپنا اُمتی تسلیم کرنے سے انکاری ہیں..... جب قیامت کے دن میزانِ عمل برپا ہوگی تو پہلا سوال لوگوں سے نماز کے بارے میں ہی کیا جائے گا اگر نماز کو پورا کیا ہوگا تو اس پر حساب آسان ہوجائے گا اور اگر اس سے کچھ کم کیا ہوگا تو اللہ فرشتوں سے فرمائے گا کہ ”اگر میرے بندے کے کچھ نوافل ہوں تو اس کی کمی کو پورا کردو۔“

ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک عورت سیدنا موسیٰؑ کے پاس آئی اور اس نے عرض کیا! اے اللہ کے نبیؑ...... میں نے بڑا سخت گناہ کیا ہے اور میں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ بھی کی ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ میرا گناہ معاف فرمادے۔ اور میری توبہ قبول کرلے...... حضرت موسیٰؑ نے پوچھا۔ ''تیرا گناہ کیا ہے؟'' اس نے کہا کہ میں نے زنا کیا اور پھر بچہ جنا...... پھر اسے قتل کردیا...... حضرت موسیٰؑ نے فرمایا...... ''نکل جا اے بدکار......! کہیں آسمان سے آگ نہ برسے اور تیری بدبختی کی وجہ سے ہمیں بھی نہ جلادے۔'' وہ شکستہ دل عورت وہاں سے نکلی......

حضرت جبرائیلؑ تشریف فرما ہوئے اور فرمایا...... ''اے موسیٰؑ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو نے توبہ کرنے والی کو کیوں رد کردیا؟ اے موسیٰؑ کیا میں تمہیں اس سے بھی برا نہ بتاؤں۔'' حضرت موسیٰؑ نے پوچھا۔ ''اے جبرائیلؑ! اس سے برا کون ہے؟'' فرمایا...... ''جو نماز چھوڑ دے قصداً جان بوجھ کر۔'' بعض سلف سے منقول ہے۔ ان کی ایک بہن فوت ہوگئیں جب اس کو دفن کیا تو ایک مال والی تھیلی اس کی قبر میں گرگئی اور اس کا خیال نہ رہا...... آخرکار دفن کرکے قبر سے چلے آئے...... پھر بعد میں یاد آیا تو دوبارہ قبر کی طرف گئے اور لوگوں کے جانے کے بعد قبر کھودی...... تو قبر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

انہوں نے مٹی ڈال دی اور روتے ہوئے غمگین حال میں ماں کے پاس آئے اور کہا اے ماں! مجھے اپنی بہن کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیا کرتی تھی؟ ماں نے کہا یہ کیوں پوچھتے ہو؟ انہوں نے کہا۔ ''اے ماں میں نے قبر کو دیکھا کہ اس میں سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔'' ماں رو پڑی...... اور کہا۔ ''اے بیٹا! تیری بہن نماز میں سستی کرتی تھی...... اور وقت سے دیر کرکے نماز پڑھتی تھی۔''

چنانچہ جو شخص نماز میں دیر کرتے اس کا یہ حال ہے اور جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتا تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔

☆☆☆

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سردیوں کے موسم میں باہر تشریف لائے اس وقت پتے درختوں سے گر رہے تھے آپ ﷺ نے ایک درخت کی ٹہنی ہاتھ میں لی اس کے پتے اور بھی گرنے لگے...... فرمایا۔ ''اے ابوذرؓ بندۂ مسلمان جب اخلاص سے اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس سے اس کے گناہ ایسے ہی گرتے ہیں جیسے یہ پتے درخت سے گر رہے ہیں۔''

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا...... ''اگر کسی شخص کے دروازے پر ایک نہر جاری ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟'' صحابہ نے عرض کیا کہ ''کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔'' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''یہی حال پانچوں نمازوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے گناہوں کو زائل کردیتا ہے۔''

جو شخص نماز کی حفاظت کرتا ہے اللہ تعالیٰ پانچ طرح سے اس کا اعزاز و اکرام فرماتا ہے۔

1۔ رزق کی تنگی دور کردی جاتی ہے۔

2۔ عذاب قبر ہٹادیا جاتا ہے۔

3۔ قیامت میں اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

4۔ پل صراط سے بجلی کی سی تیزی سے گزر جائے گا۔

5۔ حساب سے محفوظ رہے گا۔

نماز کو صرف قضا کرنے کے سلسلے میں ذکر کروں گی کہ آپ ﷺ نے فرمایا...... ''جو شخص نماز کو قضا کردے گا وہ بعد میں پڑھ بھی لے پھر بھی اپنے وقت پر نہ پڑھنے کی وجہ سے ایک حقب جہنم میں جلے گا اور حقب کی مقدار اسی 80 کی برس ہوتی ہے۔ اور ایک برس تین سو ساٹھ دن کا اور قیامت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہوگا۔ اس حساب سے ایک حقب کی مقدار دو کروڑ اٹھاسی لاکھ برس ہوئی۔

اللہ ہم پر رحم فرمائے...... آج ہم کس قدر آسانی سے نمازیں قضا کر دیتے ہیں...... بالکل نماز کو اس طرح سمجھ رکھا ہے کہ بس سب سے فالتو چیز یہی ہے ذرا سی بیماری آئی نماز چھوڑ دی۔ شاپنگ پر جانا ہے نماز چھوڑ دی...... اگر کسی تقریب میں جانا ہے اور وہاں نماز کا وقت ہوچکا ہے مگر ہم خواتین نماز ادا نہیں کرتیں کیونکہ وضو کرنے سے میک اپ صاف ہو جائے گا...... کس قدر گھاٹے اور نقصان کا سودا ہم کر رہے ہیں...... ذرا غور وفکر تو کریں......

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا...... ''بندہ کثرت سجود سے اللہ تعالیٰ کا مقرب بنتا ہے۔'' کتنے بزرگانِ دین تھے جو فرائض کے علاوہ بے تحاشا نوافل ادا کرتے۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو حنیفہؒ اور بہت سارے کوئی ہزار رکعت، کوئی پانچ سو رکعت روزانہ نوافل ادا کرتا...... یہ ان کے معمولات میں سے تھا...... فرائضِ نماز کے بعد اللہ کا قرب حاصل کرنے والی رات کی نمازِ تہجد ہے۔ جو پروردگار کی توفیق اور عطا ہی سے ادا کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ شب بیداری کی توفیق اور صبح خیزی کی دعا اور استغفار پروردگار اپنے مقبولان کو عطا کرتا ہے۔

ایک بار حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ رات کو وضو کا پانی بھی تیار کرتے ہیں اور بہت کوشش کرتے ہیں کہ ہم تہجد کی نماز پڑھ سکیں مگر آنکھ نہیں کھلتی...... تب آپؒ نے فرمایا کہ دن میں گناہ کم کیا کرو...... تو اللہ کے مقبول بندے کسی بھی حال میں ذکرِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتے...... ان کی راتیں اس طرح بسر ہوتی ہیں کہ ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں...... پس ہم اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کامل نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے کہ یہ سب اس کی عطا اور توفیق سے ہی ممکن ہے کہ نماز، روزی کو کھینچنے والی ہے...... صحت کی محافظ ہے...... بیماریوں کو رفع کرنے والی ہے۔ دل کو تقویت پہنچاتی ہے۔ چہرے کو خوب صورت و منور کرتی ہے...... جان کو فرحت پہنچاتی ہے، اعضا میں نشاط پیدا کرتی ہے...... کاہلی کو رفع کرتی ہے...... روح کی غذا ہے، دل کو منور کرتی ہے، اللہ کے انعام کی محافظ ہے، عذابِ الٰہی سے حفاظت کا سبب ہے...... شیطان کو دور کرتی ہے۔ رحمٰن سے قرب پیدا کرتی ہے...... اور دونوں جہانوں میں منافع پیدا کرنے میں اس کو بہت خصوصیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اے میرے رب تُو ہم سب کو نماز قائم کرنے والا بنادے۔ اور وہ نماز پڑھنے کی توفیق عطا کر جو ایک مومن کی معراج ہے...... جو تیرے قرب کا باعث ہے...... آمین۔

حرفِ آخر: اللہ تعالیٰ کی بارگارہ میں دعا گو ہوں کہ اے میرے رب اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی کوئی کمی دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہے تو اے مہربان رب! تو اسے معاف کردے...... اور اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمالے۔

نماز نہ پڑھنے کے سلسلے میں بہت زیادہ سخت عذاب کا ذکر ہے...... جس کا میں نے دانستہ ذکر نہیں کیا...... اس لیے کہ میں ذاتی طور پر اپنے پروردگار کے بے حد لطف وکرم اور فضل پر نظر رکھتی ہوں۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک غلام اپنے آقا کی مہربانیوں اور کرم نوازیوں کو دیکھ کر اس کی نافرمانی پر اتر آئے...... تو نماز سب سے اہم عبادت ہے کیونکہ ہم نماز ہی سے اللہ کا قرب حاصل کر سکتے ہیں...... اللہ تعالیٰ اس نئے سال میں تمام بے نمازیوں کو نماز کا پابند کردے...... اور ہم سب کو اپنی نمازوں کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اپنے اس مضمون کی تیاری میں، میں نے بے حد قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین!

باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

عزیز بہنو! ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

☆ دیا آفرین، شاہدرہ

1۔ دور ایسا ہے کہ اپنا آپ منوانے کے لیے آپ کو خود ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خواتین کے لیے بھی بہت ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں پھر دوسروں سے ملنے، بات چیت کے طریقے بھی آپ کو منفرد بناسکتے ہیں۔ آپ کا لباس، آپ کا حلیہ بھی آپ کی پہچان ہوتا ہے جبکہ خواتین کی اکثریت گھر کے کاموں میں الجھی ماسیوں والے حلیے میں رہتی ہے۔

2۔ سوال ایسا ہے کہ میں آپ کو کسی سیر کا دلچسپ احوال تو بتانے سے رہی۔ البتہ ایک واقعہ ہے دراصل کالج میں ری ایڈمیشن کا مسئلہ تھا ڈیٹ گزر گئی تو وہ لوگ کر نہیں رہے تھے۔ اس پر کچھ قریبی عزیزوں نے بہت تسلی دی کہ سفارش وغیرہ سے کروالیں گے۔ میرا دل تو نہیں مان رہا تھا مگر میں چپ رہی۔ انہوں نے بہت کوشش کرلی بڑے فون کیے۔ مجھے بھی کئی بار جانا پڑا۔ ساتھ میں کسی کو بلالیتے مگر ساری تگ و دو کے باوجود بھی کام نہیں ہوسکا اور مجھے پرائیویٹ امتحان دینا پڑا... مگر میں مطمئن ضرور ہوگئی۔

3۔ پاکیزہ کے مستقل سلسلے جن میں دین کی باتیں ہوں یا ہومیو کلینک سب ہی اپنی جگہ بہترین ہیں۔ مجھے تو سب ایسا ہی اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر اپنی مصنفات کے بارے میں جاننا اچھا لگتا ہے۔ اور جلترنگ کی کیا بات ہے، ہمارے معاشرتی حقائق کو کوزے میں سمیٹا ہوتا ہے۔ اتنے موضوعات، اتنا تنوع ویل ڈن...... نیا سلسلہ تو نہیں، شاعری کا الگ سے سلسلہ ہو تو بہت اچھا ہے۔

4۔ پاکیزہ نے ہمیں بہت سے عظیم رائٹرز دیے ہیں۔ جن میں مجھے خاص طور پر نگہت سیما، نایاب جیلانی، قیصرہ حیات، اقبال بانو، روشانے عبدالقیوم، سعدیہ عزیز آفریدی، رخ چوہدری اور نفیسہ سعید زیادہ پسند ہیں جو پاکیزہ کو سجاتے ہیں۔ یہی میرے دل کی بات سمجھ لیں کیونکہ میں پہلی بار ان کا نام لے رہی ہوں۔

5۔ ہم کچھ الجھے ہوئے سے ہیں کوئی سمجھ سکے تو سمجھ لے......

وفا کی بستی میں رہنے والوں سے ہم نے محسن یہ طور سیکھا
لبوں پر صحرا کی تشنگی ہو مگر دلوں میں نہاں سمندر
میرے آنسوؤں سے جلتا ہے میری امیدوں کا دیا
میرا حوصلہ میری آنکھوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے

☆ انیسہ زینب، فاروق آباد:

1۔ میرے نزدیک عورت چونکہ ''گھر کی ملکہ'' ہوتی ہے لہٰذا وہ گھر کی حکومت کو اپنے بہترین فیصلوں سے بہت اچھے طریقے سے چلاسکتی ہے۔ گھر کا بجٹ، بچوں کی تعلیم و تربیت کو احسن طریقے سے انجام دے تو وہ خود بخود پُراثر بناسکتی ہے نہ صرف اپنی شخصیت کو بلکہ اپنے سے جڑے ہر رشتے کو۔

2۔ ہر حساس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں اور خواہش ہوتی ہے کہ معاشرتی بدصورتیوں پر احتجاج

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُراثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......
2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔
3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟
4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں......کوئی دل کی بات؟
5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔
آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

☆ شہلا نواز......لاہور

1۔ اپنی شخصیت کو پُراثر بنانے کے لیے 5 وقت کی نماز اور تلاوتِ قرآن باترجمہ اپنا شعار بنائیں...... 10 منٹ کی ایکسر سائز اور 10 منٹ کی ہی واک کے لیے ٹائم نکالیں۔ بیوٹی ٹپس ضرور کریں اگر ٹائم نہ ہو تو سادہ دہی 5 منٹ کے لیے چہرے پر لگائیں اور دھولیں۔ شادی شدہ بہنیں اپنے میاں کے آنے سے پہلے شاور لے کر صاف لباس، آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پر نیچرل لپ اسٹک اور اچھی خوشبو اور پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ میاں کا استقبال کریں، آپ کے میاں کی ساری تھکاوٹ اتر جائے گی۔



2۔ میری زندگی کا غمناک واقعہ جس نے میرے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا، میرے پیارے والد کی ناگہانی موت تھی۔ مادیت پرست تو پہلے بھی نہیں تھی۔ والد کی وفات کے بعد دنیاداری سے دل اچاٹ ہو گیا۔ مزید سادگی پسند ہو گئی اور پانچ وقت کی نماز شروع کر دی اب تو یہ حال ہے کہ چار سوٹ اگر بن جائیں تو وہ بھی زیادہ لگتے ہیں، سونے کے زیور پہننے کا کوئی شوق نہیں رہا......اونچے، اونچے محل نہیں بھاتے سادے گھر اچھے لگتے ہیں۔

ضرور کروں چاہے کسی بھی صورت میں، جس میں مجھے لگے کہ میں بہتر طور پر اپنا موقف پیش کر سکتی ہوں نظم ہو یا کہانی یا کوئی مضمون، ریاضی میں بہت نکمی ہوں گزشتہ سال ایف ایس سی میں پاس ہوئی تو جھوم اٹھی۔ سانحۂ پشاور (APS) نے البتہ جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا سب کی طرح مجھے بھی اور ضربِ عضب نے حب الوطنی کے عنصر کو کافی بڑھاوا دیا ہے۔

3۔ پاکیزہ میں میرا پسندیدہ سلسلہ بہنوں کی محفل اور جلترنگ ہے کیونکہ دونوں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوتا ہے چاہے وہ حسِ مزاح کی تسکین ہو یا دوسروں کی رائے اور خیالات سے آگہی، میں اگر کوئی نیا سلسلہ شروع کرنا چاہوں تو یہ ہو گا کہ ہر ماہ ایک عنوان دیں اور بہنوں کو اس پر نظم لکھنا ہو کبھی مزاحیہ موضوع ہوں تو کبھی سنجیدہ بہت اچھی محفل جمے گی۔

4۔ پاکیزہ کی مصنفات سے میں یہ کہوں گی کہ روایتی موضوعات سے ہٹ کر تحریروں میں نیاپن لانے کی اشد ضرورت ہے۔ بیشتر تحریریں اپر کلاس معاشرے کے گرد گھومتی ہیں۔ نوجوان نسل میں جذبۂ حب الوطنی کو فروغ دینے کے لیے بھی لکھیں۔

5۔ اصل میں، میں اب تک خود سے بھی ٹھیک سے متعارف نہیں ہوئی بقول میرے۔

معمّا ہوں کہ خود سے بھی نہ تسخیر ہوا ہوں
مجھ میں ہے چھپا کیا، نہ میں جان سکا ہوں

3۔ پاکیزہ کے تقریباً تمام سلسلے مجھے بہت پسند ہیں جن میں سرِفہرست بہنوں کی محفل، جلترنگ، بزم پاکیزہ، روحانی مشورے، اداریہ اور انٹرویوز پسند ہیں۔ ہمیں پاکیزہ میں موجود اشتہارات تک بھی پسند ہیں، پاکیزہ میں نیا سلسلہ تو ہم کلاسیکی ادب کا شروع کریں گے یعنی معروف رائٹرز کے وہ افسانوی مجموعے مہنگے ہونے کے باعث کتابیں ہم خرید نہیں سکتے جیسے منٹو...... عصمت چغتائی، اشفاق احمد وغیرہ......

4۔ پاکیزہ مصنفات کی تمام بہنوں کو سلام پیش کریں گے جو بہت محنت سے افسانے، ناول اور ناولٹ مرتب کرتی ہیں ہماری تربیت اور تفریحِ طبع کے لیے۔

5۔ تعارف کے بارے میں عرض ہے کہ......

گلاب کو جس نام سے بھی پکارو وہ گلاب ہی رہے گا اور چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں......

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

1۔ آج کے دور میں ہر ایک کی زندگی ان گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ ان حالات میں خاص کر خواتین کو اپنے آپ کو پُراثر بنانا دشوار ہوتا جارہا ہے۔ صبح بچوں کو ناشتا دینا، اسکول کی تیاری کروانا، میاں کی تیاری کروانا پھر صبح سے شام تک نہ گیس ہوتی ہے نہ بجلی اگر خاتونِ خانہ خود بھی سروس کر رہی ہو تو اور بھی مشکل...... سارا دن بھاگ بھاگ کر خاتونِ خانہ ہلکان ہوجاتی ہے مگر اس دوران اگر کوئی بن بلایا مہمان گھر میں آجائے تو تھکن سے چُور تمام گورکھ دھندوں کو ایک سائڈ پر رکھ کر جی جان سے مہمان داری میں لگ جاتی ہے...... دوسرے یہی سمجھ کر رہ جاتے ہیں کہ کتنی پُراثر خاتونِ خانہ ہے۔ دنیا کے تمام گورکھ دھندوں سے دور کتنی خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔ بس اس ایک تعریف سے عورت اپنے آپ کو پُراثر بنالیتی ہے۔ اسے اچھے اخلاق کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے، یہ تمام گورکھ دھندے وقتی ہوتے ہیں مگر اپنے آپ کو پُراثر بنانے میں عمر لگ جاتی ہے۔

2۔ جنوری 2014ء میں جب میں عمرے پر گئی خانۂ خدا (خانۂ کعبہ) کا طواف کیا۔ دل میں جتنے فکر و خیال تھے تمام دل سے نکل گئے ...... بس اللہ کی پکار دل میں رہ گئی...... دنیا دل سے نکل گئی۔ اس دن سے اب تک کسی خیال یا فکر نے نہیں ستایا...... نماز کی پابندی ہوگئی۔ (واہ میرے مولا تیرے رنگ)

3۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں اتنی سینئر رائٹرز پاکیزہ میں بہت محنت سے لکھ رہی ہیں۔ کہانی کو حقیقی رنگ دینا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا...... جس نقطے سے شروع کرتی ہیں اینڈ اسی پر کرنا بہت مشکل ہے۔ میں تمام اپنی لکھاری بہنوں کو مبارک باد پیش کرتی ہوں جو دنیا کے ان گورکھ دھندوں کے باوجود اتنا قیمتی وقت پاکیزہ رسالے کو دے کر اسے روز بروز نکھار رہی ہیں۔

4۔ میں اپنی پاکیزہ کی لکھاری بہنوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت و تندرستی دے...... ماشاء اللہ بہت محنت کررہی ہیں دنیا داری نبھانے کے ساتھ، ساتھ دنیا کو اچھا پیغام دے رہی ہیں۔ اچھی تحریر دل پر اثر کرتی ہے۔ جب دل پریشان ہوتا ہے تو آپ سب کی تحریریں دل کو ڈھارس دیتی ہیں۔

5۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

☆ صائمہ سجاد بنگش...... کوہاٹ

1۔ میرے خیال میں انسان سب سے مشکل مضمون ہے سارے موسم اس کی طبیعت پر حکمرانی کرتے ہیں۔ کبھی دل اچھا ہوتا ہے اور کبھی دل بہت افسردہ...... اور اندر کے موسم ہی انسان کی شخصیت بناتے ہیں۔ وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا...... زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ ایسے میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا ہوتا ہے۔ چھوٹی، چھوٹی خوشیاں زندگی سے کشید کرنی پڑتی ہیں جو زندگی کا حسن برقرار رکھتی ہیں نا مساعد حالات زندگی میں آتے ضرور ہیں مگر ہر تاریک رات کے بعد ایک روشن صبح بھی ضرور ہوتی ہے۔

2۔ زندگی دلچسپ واقعات و لمحات سے بھری ہوئی ہے مگر اپنے بچپن کا ایک واقعہ پوری جزئیات

کے ساتھ یاد آجاتا ہے تو بہت ہنسی آتی ہے...... میری خالہ کی شادی کے دن تھے۔ ہم سب کزنز نانی اماں کے گھر ڈیرا ڈالے ہوئے تھے روز ہلا گلا کرتے...... میری عمر یہی کوئی تیرہ، چودہ سال ہوگی۔ میری نانی کے کمرے میں بہت سارا فروٹ پڑا تھا جو غالباً شادی کے لیے منگوایا ہوگا۔ میں اور میری کزن سعدیہ ہم کھیل رہے تھے، بھاگ دوڑ لگائی ہوئی تھی۔ مجھے کیلے بہت پسند ہیں، میں نے دو کیلے اٹھائے اور باہر آگئی اور چلتے، چلتے کھانے لگی ایک کھا چکی اور دوسرا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں وہ بھی کھانے لگی تھی کہ میری کزن جو میرے پیچھے آرہی تھی اس نے مجھ سے کیلا مانگا میں نے دیکھا کہ وہ لینے کے لیے میرے پیچھے آرہی ہے میں نے ایک دم سارا کیلا منہ میں ڈالا اور دوڑ لگادی۔ مجھے پتا نہیں چلا میں کب نیچے گری اور کب ایک دم بے ہوش ہوگئی۔ کیلا گلے میں کب پھنسا جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا سب ماموں، ممانیاں، نانی، خالہ سب میرے اوپر جھکے ہوئے تھے ہاتھ میں کٹورے پکڑے کوئی پانی ڈال رہا تھا کوئی پاؤں مالش کررہا تھا سب کی سٹی گم تھی کہ آج بھی جب یاد آتا ہے تو بہت ہنسی آتی ہے بچپن کتنا اچھا اور معصوم ہوتا ہے۔

3۔ پاکیزہ کے سب سلسلے بہت اچھے ہیں مگر کچھ نیا اور کچھ منفرد بھی ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں پاکیزہ رائٹرز کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تبصرہ نگار بہنوں پر بھی تبصرہ کریں۔ ان پر رائے دیں کوئی بات جو انہیں اچھی نہ لگی ہو تو وہ بھی اپنی رائے دیا کریں...... اپنے تجربات واقعات ہمارے ساتھ شیئر کریں...... اور ایک سلسلہ ایسا ہونا چاہیے جس میں پاکیزہ رائٹرز کی معرف کہانیوں میں سے اچھے اقتباسات شائع کیے جائیں اور اردو ادب کی طنز و مزاح لکھنے والوں کی تصانیف کے کچھ اقتباسات بھی شامل کیے جائیں جیسے شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی...... ابن انشاء وغیرہ، وغیرہ......

4۔ پاکیزہ مصنفات سے یہ کہنا چاہوں گی کہ پرانی اور منجھی ہوئی رائٹرز بہت اچھا لکھتی تھیں ان کے ناول اور افسانے سبق آموز ہوتے تھے وہ کبھی گھر توڑنے کا امیج نہیں پیش کرتی تھیں، آج کل جو نئے لکھنے والے ہیں وہ سسرال اور بہو کا بہت برا امیج بنارہے ہیں جس کی وجہ سے طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے۔ ہماری نئی رائٹرز پڑوسی ملک کے ڈراموں جیسا ماحول پیش کررہی ہیں جو بالکل غیر مناسب ہے۔ ہماری روایات، اتفاق سلوک، رشتوں کا احترام، تقدس، ہمارا سرمایہ ہیں اس کو ختم نہ کریں پلیز...... زندگی کا حسن رشتوں کو برقرار رکھنے میں ہے نہ کہ ختم کرنے میں...... اس پر توجہ دیں۔

5۔ اپنے تعارف کے بارے میں یہی کہوں گی کہ پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا تقریباً 15 سال شادی سے پہلے بھی لکھتی تھی اور اب تو شادی کو بھی دس برس گزر گئے ہیں...... مختلف سلسلوں میں تھوڑا تھوڑا لکھنا شروع کیا۔

☆ نگہت غفار...... کراچی

1۔ اپنی شخصیت کو بہ آسانی... پُراثر بنایا جاسکتا ہے اس کے لیے خوب صورتی یا امارت کی ضرورت نہیں......



بہت سی خواتین اپنی امارت سے کچھ اپنی خوب صورتی سے کچھ اپنی تعلیم سے کسی نہ کسی اور طریقے سے اپنی باتوں میں اپنی ان خوبیوں کا بڑے فخر سے اظہار کرتی ہیں، ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ میری ان چیزوں سے لوگ متاثر ہوتے ہیں، مجھے پسند کرتے ہیں، میرے ساتھ وقت گزارنے کو ہر بندہ بے چین رہتا ہے، یہ ان کی سوچ ہوتی ہے۔ میرے نزدیک سب سے پہلے خاتون کو اپنے لہجے اور آواز میں مٹھاس اور نرمی پیدا کرنی چاہیے۔ ملازمت پیشہ خاتون ہے تو اپنے سلوک سے مدِمقابل کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے مثلاً ڈاکٹر ہے تو ان کا لہجہ شفیق اور ہمدردانہ ہو۔ ٹیچر ہے تو شاگرد کے ساتھ اچھے رویے اور

الفاظ سے مخاطب ہو۔ نرس ہے تو اپنے مریضوں کے ساتھ نرمی اور تسلی آمیز انداز رکھے اور اگر ماں ہے تو شفیق بن کر دوست بن کر اپنے بچوں کے ساتھ رہیں۔ بیوی ہے تو وفا شعار، باسلیقہ، سگھڑ اور معاملہ فہم ہو...... بہو ہے تو اطاعت گزار اور فرمانبردار ہے، چھوٹوں کے ساتھ محبت اور پیار، دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ پُرخلوص ہو۔

2۔ زندگی کیا ہے، ایک ڈراما ہے ہر سین میں کچھ نہ کچھ پہلے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ واقعہ سالوں پرانا ہے.. جو میری بہن نزہت جبیں ضیا کی منگنی کے دوسرے دن پیش آیا تھا میں بالکل مختصراً لکھ رہی ہوں۔

میں اور میری چھوٹی بہن عفت سی ٹیچر تھیں...... ہماری الیکشن میں ٹریننگ سوک سینٹر کے قریب آفس میں تھی، ان دنوں ہماری امی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ اور ہم دونوں کو ٹریننگ کے سلسلے میں آفس جانا تھا۔ ہم لوگ لانڈھی سے صبح 8 بجے آفس کے لیے روانہ ہوئے اور دوپہر ایک بجے واپس گھر کے لیے آفس کے اسٹاپ کی طرف جارہے تھے...... قریب سے ایک سفید رنگ کی کار بڑی آہستگی کے ساتھ آکر ہمارے قریب رک گئی...... ایک بہت ہی سلجھے انداز میں سلام کرنے کی آواز آئی، میں نے بھی اسی معتبر انداز میں سلام کا جواب دیا۔ (یہاں میں آپ کو ایک بات بتاتی چلوں کہ اکثر کئی مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ نوجوان یا ادھیڑ عمر حضرات سلام کرتے ہیں اور اپنے بچوں بھائی یا کزن کا حوالہ دے کر ہمیں بتاتے ہیں) میں کبھی کسی طالب علم کا بھائی ہوگا نوجوان نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی شکل صورت سے وہ کافی امیر اور شریف لگ رہا تھا۔ باجی آپ لوگ کہاں جارہی ہیں، اس نے سوال کیا اور میں نے بلاتامل جواب دیا۔ "لانڈھی" وہ مسکرانے لگا...... ارے میں بھی ادھر ہی جارہا ہوں آیئے بیٹھ جائیں۔

میں نے کہا نہیں، نہیں شکریہ...... ہم لوگ چلے جائیں گے مگر وہ اصرار کرتا رہا ہم پیدل چل رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلارہا تھا ابھی ہم بلڈنگ کے احاطے سے مکمل باہر بھی نہیں نکلے تھے کہ عفت نے آہستہ سے کہا باجی بیٹھ جاتے ہیں شدید ترین گرمی ہے اس وقت عفت کی آنکھ میں بہت تکلیف تھی دانہ نکلا تھا اس نے کہا میری آنکھ میں بھی بہت درد ہورہا ہے، امی بھی اتنی بیمار ہیں ہم لوگ جلدی گھر پہنچ جائیں گے۔ میں نے اسے منع کیا تو وہ بولی آپ کے پاس (یٰسین شریف) تو ہے ناں...... میں نے کہا ہاں......! اس نے کہا بس ہم بیٹھ جاتے ہیں اور پھر وہ لمحہ ہمارے لیے عذاب جان بن گیا۔ کیا ہوا لمبی داستان ہے...... لیکن میں تو شادی شدہ تھی اور میرے شوہر دمام میں تھے مگر یہ ان میرڈ تھی...... اور اتفاق کہ روزانہ سے زیادہ تیار تھے ہم لوگ...... میرا مطلب ہے کہ ایک دن پہلے بہن کی منگنی ہونے کی وجہ سے گولڈ کا اچھا خاصا زیور میں نے پہنا روزمرہ سے زیادہ...... ہماری جان عزت و آبرو کیسے بچی ہم کس طرح گھر پہنچے یہ ہم اور ہمارا رب جانتا ہے مجھے اور میری بہن کو کراچی کے بہت کم علاقے معلوم تھے ہم گھر سے باہر بہت کم نکلتے تھے، گنتی کے دوست، رشتے داروں کے پاس جاتے تھے۔ ہم جب گھر پہنچے تو مغرب کی اذان ہورہی تھی۔ اور بہت دیر کے بعد ہم دونوں یہ ہی سوچ رہے تھے کہ ہم گھر کس طرح پہنچے...... میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی چادر اتاری...... وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر اپنے اللہ کے سامنے سربسجود ہوئی اور اس قدر روئی کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم اس طرح کیسے بچ کر آئے۔ اللہ پاک نے ہماری کس طرح مدد فرمائی...... ہم اتنے گنہگار اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوؤں پر میرے رب کی اتنی مہربانیاں ہمیں بچانے والا اللہ اور رسول تھے اور...... ان کی پاک و مقدس چمکتی دمکتی چھوٹی سی یٰسین شریف میرے پرس میں تھی، میں نے یٰسین شریف کو آنکھوں سے لگایا بے تحاشا آنسو بہائے۔

اس روز سے میں خود اور اپنے بچوں، عزیز رشتے داروں، دوستوں سب کو یہ ہی کہتی ہوں کہ کہیں

بھی جائیں۔ اس خوب صورت سی پیاری مقدس و پاکیزہ یٰسین شریف کو اپنے پاس رکھیں ...... یہ واقعہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کل کا ہو آپ سب سے بھی میری التجا ہے کہ پلیز آپ اپنے پرس میں اور مرد حضرات اپنی جیب میں یا پھر اپنی بنیان میں اندر کی طرف چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی میں یٰسین شریف رکھ کر پن کے ذریعے اندر لگالیں۔

3۔ میرا خیال ہے کہ مجھے رسائل کی جان و دل ایک ہی چیز نظر آتی ہے وہ ہے، سوال و جواب اور رسالے پر تبصرہ...... باقی تمام سلسلے اپنی، اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں ...... بہنوں کی محفل میں اختتامی .... پیراگراف مجھے دل و جان سے پسند ہے۔ مجھے دعائیں دینا اور کسی کی دعائیں لینا بہت اچھا لگتا ہے۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے میں یہ ہی کہنا چاہوں گی کہ سینئر رائٹرز ہم جیسے جونیئر رائٹرز کی مدد کریں، رہنمائی کریں...... ہماری تحاریر پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ ''تنقید برائے اصلاح'' جو آگے چل کر ہمارے کام آئے اور اس طرح ادب کے اس میدان میں ہر شہ سوار فاتح قرار پائے۔ آپ لوگوں کے تبصرے اور مشورے ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں...... اس سفر میں نئے مسافروں کو گائیڈنس کی ضرورت ہوتی ہے۔

5۔ میں ہر ایک کی ہر بات کو مثبت انداز میں لیتی ہوں۔ دعائیں دینے کا خبط ہے، ہر کسی پر بھروسا کر کے زک اٹھاتی ہوں اور اکثر و بیشتر سچ بول کر معاملہ گڑ بڑ کر دیتی ہوں۔ ہر بڑے سے بڑے قصور وار کو لمحوں میں معاف کر دیتی ہوں۔

☆ سلمیٰ غزل...... کراچی

1۔ میں تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہی ہوں اور مجھے بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ بھی ملا ہے صرف اس لیے کہ میں نے اپنے پیشے کی اہمیت کو سمجھا اور پوری devotion کے ساتھ نبھایا۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر شخص اگر اپنے حصے کا کام پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ کرے تو ناممکن ہے کہ ہم کسی سے بھی پیچھے رہ جائیں۔ میں نے کبھی بے مقصد زندگی نہیں گزاری اور زبان شیریں ملک گیری کے مقولے پر عمل کیا آپ جتنا بھی بن سج لیں اور قیمتی لباس پہن لیں لیکن منہ کھولتے ہی آپ کی اصل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔

2۔ خوشی اور غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر مجھ میں ایک خامی ہے کہ میں خوشی اور غم دونوں میں روتی ہوں، میں فرسٹ ایئر کی کلاس لے کر نکلی تھی دوسرے دن بڑے بیٹے کی (وہ امریکا میں تھا) منگنی تھی جب میرے شوہر نے فون کر کے بتایا کہ چھوٹے بیٹے کا lums یونیورسٹی لاہور میں داخلہ ہوگیا ہے اور اسے کل رپورٹ کرنی ہے بالکل آخری وقت میں فون آیا جبکہ سب مایوس ہو چکے تھے سوائے میرے...... اب میں رو رہی تھی اور پورا اسٹاف پریشان اور پھر بتانے کے بعد ہر ٹیچر کے گلے لگ کر روتی رہی خوشی میں...... میں یہ کبھی نہیں بھول سکتی۔

3۔ پاکیزہ اتنا مکمل میگزین ہے کہ صرف کسی ایک سلسلے کی تعریف کرنا زیادتی ہے البتہ میری خواہش ہے کہ ایک صفحہ کراچی کی سوشل سرگرمیوں کا بھی ہونا چاہیے۔

4۔ پاکیزہ کی مصنفات اتنا اعلیٰ پائے کا لکھ رہی ہیں کہ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ...... صرف ایک تجویز ہے کہ ہر کہانی میں اصلاحی پہلو ضرور ہونا چاہیے خاص طور پر نوجوان نسل کے لیے پھر ہلکے پھلکے الفاظ میں معنی اور مطلب بیان کیا جائے تو دل پر اثر ہوتا ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ اکثر لوگ تمہید اور منظر نگاری کو پڑھے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

5۔ میں تو بہت ناچیز ہستی ہوں اپنے بارے میں کیا کہوں، دوسروں کی رائے آپ کے بارے میں صحیح شخصیت کی عکاسی کرتی ہے پھر بھی یہ شعر عرض ہے جو، میری فطرت اور شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

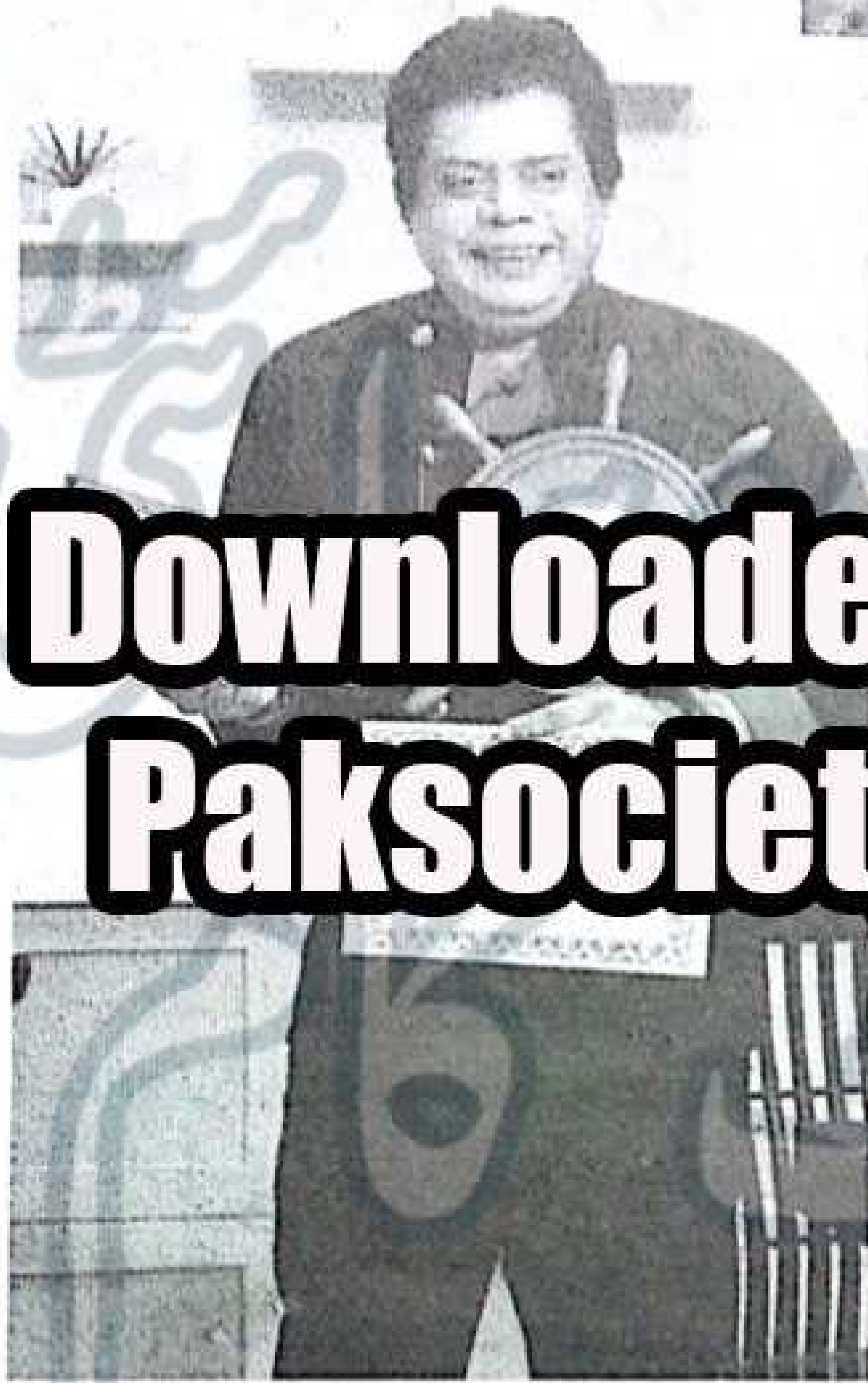
لہجے میں اگر رس ہو تو دو بول بہت ہیں
انسان کو رہتی ہے محبت کی زباں یاد

☆☆☆



پاکیزہ کے مہمان

شائستہ زریں





پکوان کی دنیا کی قدآور شخصیت

شیف گلزار حسین اور شیف روبینہ گلزار

قارئینِ کرام! السلام علیکم
مثل مشہور ہے ''کھاؤ من بھاتا اور پہنو جگ بھاتا'' جب سے ہمارے ٹی وی چینلو پر پکوان کے پروگرام بکثرت دکھائے جانے لگے ہیں پکوان سے دلچسپی رکھنے والی خواتین نے محاورہ ہی بدل دیا ہے اب وہ ''پکاؤ اور کھاؤ ٹی وی دکھاتا'' پر زیادہ عمل کرتی ہیں۔ مصالحہ چینل تو خواتین کا من پسند فوڈ چینل ہے! اکثر خواتین کاغذ قلم ہاتھ میں لیے نہایت انہماک اور دلچسپی

سے مصالحہ چینل پر پکائے جانے والے پکوان دیکھنے کے ساتھ، ساتھ ضروری باتیں بھی نوٹ کرتی جاتی ہیں۔ اس وقت ہر عمر کے افراد کی دلچسپی ٹی وی دیکھنے میں بڑھ جاتی ہے جب عالمی شہرت یافتہ شیف گلزار حسین ٹی وی اسکرین پر جلوہ گر ہوتے ہیں اور آپ کا ہنر دو آتشہ ہو جاتا ہے جب ہنسی مذاق کی زبان میں آپ کام کی باتیں بتادیتے ہیں اور یہی کارآمد باتیں باورچی خانے میں کام کے دوران خواتین کی رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ اس ماہ پاکیزہ کو شرفِ میزبانی بخشنے والی پکوان کی دنیا کی قدآور شخصیت شیف گلزار حسین کی ہے جنہوں نے اپنے ہنر سے خوب نام کمایا ہے۔ شیف گلزار کے تعارف کے سلسلے میں یہ واضح کردیں کہ آج کل وہ مصالحہ ٹی وی کے فوڈ ایڈوائزر اور ڈیزائنر کے طور پر کام کررہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ culinary expert بھی ہیں۔ پاکیزہ کے مہمان شیف گلزار حسین نے کیسے سفر کا آغاز کیا اور آج وہ اس مقام تک کیسی مسافت طے کرتے ہوئے پہنچے۔ آپ بھی پڑھیے۔

پاکیزہ ✧...... اپنے بچپن میں بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ کا کیا جواب دیتے تھے؟

شیف گلزار ❖...... چونکہ میرے والد انجینئر تھے سو وہ مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے، والدہ کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنوں لیکن میرے اندر کا پیدائشی فنکار کہتا تھا ”گلزار حسین“ اداکار بن جاؤ۔ میں اداکار ہی بننا چاہتا تھا۔

پاکیزہ ✧......اداکار کیوں نہ بن سکے؟

شیف گلزار ❖...... اداکار بنا تو تھا، میں نے ٹی وی ڈراما اور کمرشل میں کام کیا اور ایک پاکستانی فلم سائن بھی کرلی تھی لیکن میرے سامنے دو آپشن تھے یا تو میں شیف کورس کروں۔ پاکستان سے باہر جاکر یا پھر پاکستان میں رہ کر اداکاری کروں لیکن میں نے اپنی پڑھائی اور شیف کورس کو ترجیح دی اور میں باہر چلا گیا۔ فیصلہ کرتے وقت مجھے کافی سوچنا پڑا لیکن میرے دل نے کہا Chef Training زیادہ بہتر ہے اور یوں آج میں ایک کامیاب شیف ہوں۔

پاکیزہ ✧...... پکوان کی دنیا میں آمد کیسے ہوئی؟

شیف گلزار ❖...... میرے والد نے ٹاپ ٹیسٹ (toptaste) کے نام سے اپنا ایک ریسٹورنٹ بھی کھولا تھا۔ گریجویشن کے بعد والد کے اصرار پر میں نے ریسٹورنٹ جانا شروع کردیا تھا لیکن بے دلی سے۔

پاکیزہ ✧...... والد صاحب کے اصرار پر بے دلی سے ان کے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے نے پکوان کی دنیا میں دل کیسے لگالیا؟

شیف گلزار ❖...... اس کی دو وجوہات ہیں اول یہ کہ چونکہ میں پیدائشی آرٹسٹ ہوں۔ اس لیے کھانوں کے رنگ اور سجاوٹ نے میرے آرٹسٹک ذہن کو بہت متاثر کیا۔ دیکھنے میں بھی بہت بھلے لگتے تھے اور پھر آنکھوں کے رستے دل میں شوق بن کر اترتے چلے گئے۔ دوسرا یہ کہ میں ہر کام کو چیلنج سمجھ کر کرتا ہوں اور یہ تو میرے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔

پاکیزہ ✧...... گویا بطور چیلنج آپ نے یہ پیشہ اختیار کیا؟

شیف گلزار ❖...... جی ہاں بطور چیلنج اس پیشے کو اختیار کیا اور الحمدللہ کامیاب بھی ہوا۔ (ہاں یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... پر چیلنج تھا کیا؟

شیف گلزار ❖...... جس طرح بعض اوقات چھوٹی سی بات بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، بالکل اسی طرح ایک چھوٹے سے واقعے نے مجھے وہ بنادیا جو میں نے بننے کا کبھی سوچا تک نہ تھا اور میرے لیے کامیابی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ہوا یوں کہ اپنے ریسٹورنٹ کے ایک صارف کی شکایت پر میں نے باورچی کو فہمائش کی تو اسے یہ مداخلت سخت ناگوار گزری کہ ایک اناڑی اسے ٹوک رہا ہے۔ بس اسی وقت میں نے عزم کرلیا کہ ایک کامیاب شیف بن کر دکھاؤں گا۔ والد سے کوکنگ کلاسز جوائن کرنے کی بات کی تو انہوں نے کوئی خوشی یا دلچسپی ظاہر نہیں کی لیکن میں نے ٹھان لی تھی کہ شیف تو مجھے بننا ہے۔

پاکیزہ ✧...... اس سلسلے میں پیش رفت کیسے کی؟

شیف گلزار ❖...... جاپان کے گنز اٹو کیو ہوٹل، میں فوڈ اینڈ بیوریج کی ڈگری کے لیے درخواست دی۔ وہاں سے کال آگئی تو میرا عزم مزید پختہ ہوگیا۔

پاکیزہ ✧...... کوکنگ کلاسز کی اجازت والد صاحب نے دی نہیں تھی تو آپ کے شیف بننے کی خواہش پراُن کے تاثرات کیا تھے؟

شیف گلزار ❖...... والدہ صاحبہ نے میری بھرپور وکالت کی اوران کے بے حد اصرار پر بالآخر والد صاحب رضا مند ہوگئے اور اجازت مل گئی۔

پاکیزہ ✧...... یہ کب کی بات ہے اور آپ نے کہاں داخلہ لیا؟

شیف گلزار ❖...... یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے میں نے ٹوکیوانسٹی ٹیوٹ آف کوکنگ اینڈ مینجمنٹ جاپان سے تین سال کا ڈگری اور دو سال کا تربیتی کورس کیا۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا شمار کیسے طالب علموں میں ہوتا تھا؟

شیف گلزار ❖...... میں نہایت محنت لگن اور وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تعلیم پر توجہ دینے والا طالب علم تھا۔

پاکیزہ ✧...... جاپان جانے سے پہلے جاپانی زبان سیکھی؟

شیف گلزار ❖...... جی نہیں وہیں جا کر سیکھی۔

پاکیزہ ✧...... وطن اور گھر سے دوری کا اولین تجربہ کیسا رہا؟

شیف گلزار ❖...... مشکل تھا لیکن اپنا goal (ہدف) حاصل کرنے کے لیے قربانی دی اور home sick (گھر کی یاد آنا) بھی ہوگیا۔

پاکیزہ ✧...... اس کڑے وقت میں کسی نے ساتھ دیا؟ کیسے؟

شیف گلزار ❖...... جاپانی بہت مددگار ہوتے ہیں وہاں کے ایک بڑے اسپتال کے ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے سمجھایا یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ تم لوگوں سے گھلو ملو تو سب ٹھیک ہو جائے گا، وہ ہر ہفتے چھٹی کے دن چار، پانچ لوگوں کو لے کر آجاتے اور مجھے کسی بھی تفریحی مقام پر لے جاتے۔ رفتہ رفتہ میں تنہائی کے احساس سے باہر آتا چلا گیا گویا مجھے اپنا دوست کہنے والوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اور لائقِ تعریف بات یہ ہے کہ اپنی اس محنت کا کوئی معاوضہ بھی طلب نہیں کیا۔ دوست کہا تو دوستی نبھائی بھی۔

پاکیزہ ✧...... مزید گفتگو سے پہلے آپ ہماری پاکیزہ بہنوں کو یہ بتایئے کہ شیف کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

شیف گلزار ❖...... شیف فرنچ زبان کا لفظ ہے اور میری زبان میں اس کا مطلب ہے کھانا پکانے والا جادوگر۔

پاکیزہ ✧...... گویا یہ جادو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہر ماہر پکوان شیف نہیں کہلایا جاتا؟

شیف گلزار ❖...... جی! بالکل نہیں کہلا سکتا۔

پاکیزہ ✧...... پیشہ ورانہ اور تربیت یافتہ شیفس کی بہتات سے روایتی باورچیوں کا کاروبار متاثر ہوا ہے کیا؟

شیف گلزار ❖...... نہیں، ہرگز نہیں باورچی اپنا کام کرتے ہیں اور شیف اپنا۔

پاکیزہ ✧...... جاپان میں بتدریج ترقی کا سفر کیسے طے کیا؟

شیف گلزار ❖...... جاپانی سسٹم اور جاپانی اصول و ضوابط کی میں نے پیروی کی۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ جاپانی ساری دنیا میں سب سے زیادہ محنتی کہلاتے ہیں اور میں نے ان سے زیادہ محنت کر کے کامیابی حاصل کی۔

پاکیزہ ✧...... جاپان میں کون سے ریسٹورنٹ سے اور کس حیثیت سے وابستہ رہے؟

شیف گلزار ❖...... گنز اٹو کیو ہوٹل میں پانچ سالہ کورس مکمل کر کے پہلے شیف اور بعد میں ترقی کر کے ایگزیکٹو شیف بنا۔

پاکیزہ ✧...... دیگر ممالک کی بہ نسبت تھائی لینڈ میں زیادہ کام کیوں کیا؟



شیف گلزار حسین ان کی اہلیہ اور صاحبزادی ایمانہ حسین

شیف گلزار ❖......تھائی لینڈ کا کلچر اور فوڈ بہت زیادہ مختلف نہ تھے پھر یہ کہ میری بیوی بھی تھائی ہیں۔

پاکیزہ ❖......تھائی لینڈ میں مزید کوکنگ کورسز کرنے کا موقع ملا؟

شیف گلزار ❖......ملائشیا سے kitchen Appreciate کا کورس کیا اس کے ساتھ، ساتھ تھائی کھانوں میں دسترس حاصل کی۔

پاکیزہ ❖......تھائی لینڈ میں کام کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش آیا جس سے آپ بہت متاثر ہوئے؟

شیف گلزار ❖......جس ہوٹل سے میں تربیت حاصل کر رہا تھا وہاں کسی غیر ملکی نے کرنسی نوٹ پھاڑ دیا تو ہوٹل کے منیجر نے پولیس کو کال کر دی پولیس آئی اور اس کو تھانے لے گئی۔ تو میں نے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ نوٹ پر ہمارے بادشاہ کی تصویر ہے اور ہم اپنے بادشاہ سے بہت پیار کرتے ہیں یہ ہمارے یہاں جرم ہے تو مجھے یہ اس کی بات اچھی لگی کہ وہ اپنے بادشاہ سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ اس کی تصویر پھٹتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے۔

پاکیزہ ❖......ناساز گار ملکی حالات کے باوجود مستقل وطن واپسی کے فیصلے میں کیا حکمتِ عملی تھی جبکہ جاپان یا دیگر بیرونی ممالک میں ترقی کی راہیں خوب روشن تھیں؟

شیف گلزار ❖......اپنی بیوی اور بیٹی کی دینی اور دنیاوی تعلیم اپنے ملک پاکستان میں رہ کر کرنا چاہتا تھا وہاں کا معاشرہ یہاں کے معاشرے سے مختلف ہے اس وجہ سے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ میں وطن واپس لوٹ آؤں اور یوں بھی ایک عمر بھی ہوتی ہے، بیس بائیس سال باہر رہنے کے بعد میری خواہش تھی کہ اب اپنے وطن میں رہوں میری اخلاصِ نیت کا صلہ اللہ نے یہ دیا کہ میرے لیے راستہ بنا دیا۔

پاکیزہ ❖......وطن واپسی کے بعد آپ نے کہاں ملازمت کی؟

شیف گلزار ❖......ملازمت تو کہیں نہیں کی ہاں ریسٹورنٹ ایڈوائزر کی حیثیت سے کام کیا اور مختلف چینلز

کے ساتھ کام کیا اور کر تا رہا ہوں۔
پاکیزہ ✧......کون، کون سے ٹی وی چینل پر اپنا ہنر آزمایا؟
شیف گلزار ❖......ہم، آج، سماء، اے آر وائی، ٹی وی ون، جیو اور ایک عدد انڈین چینل پر پروگرام پیش کیے۔
پاکیزہ ✧......کون سے ٹی وی چینل سے سفر کا آغاز کیا؟
شیف گلزار ❖......ہم ٹی وی نیٹ ورک سے۔
پاکیزہ ✧......ہم چینل سے وابستگی کیسے ہوئی؟
شیف گلزار ❖......ایک ریسٹورنٹ کی opening کروا رہا تھا جبھی ہم ٹی وی نیٹ ورک کی صدر سلطانہ صدیقی نے آفر کی اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم ٹی وی کے ساتھ ہوں۔
پاکیزہ ✧......کیا آپ کا آڈیشن لیا گیا تھا؟ کس نوعیت کا تھا؟
شیف گلزار ❖......جی ہاں پہلے انٹرویو لیا اس کے بعد چند شیفس سے ایک، ایک ڈش بنوائی، میں نے تھائی ڈش بنائی تھی شاید میری ڈش پسند کی گئی اور مجھے منتخب کر لیا گیا۔
پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں آپ کی ڈش کو دیگر شیفس کے مقابلے میں کن ترجیحی بنیادوں پر فوقیت حاصل ہوئی؟
شیف گلزار ❖......میں ریسپی کو آسان بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ ہر انسان کو اس کی سمجھ آجائے۔
پاکیزہ ✧......اب تک آپ نے مصالحہ چینل پر کتنے پروگرام کیے ہیں؟
شیف گلزار ❖......الحمد للہ پانچ ہزار سے زائد پروگرام کیے ہیں۔
پاکیزہ ✧......اپنے کوکنگ شوز میں ہنستے گاتے کمالات دکھاتے ہیں۔ اس کا خیال کیسے آیا؟
شیف گلزار ❖......اپنے وطن میں خوف اور مایوسی کی فضا دیکھ کر خیال آیا کہ کم از کم میں اپنے پروگرام کے توسط سے کچھ دیر کے لیے سہی اس فضا سے لوگوں کو آزاد کراؤں اور میرے ناظرین اور مداحوں نے میرے اس انداز کو بہت سراہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے طور کی جانے والی اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔
پاکیزہ ✧......موسیقی کے دلدادہ نے کبھی گائیکی کی جانب سنجیدگی سے دھیان کیوں نہیں دیا؟
شیف گلزار ❖......شوق بہت ہے، گا بھی لیتا ہوں لیکن فرصت نہیں ملتی اس لیے سنجیدگی سے دھیان نہیں دیا کہ مسلسل ریاض سے ہی اس فن میں نکھار آتا ہے۔
پاکیزہ ✧......یہ چھو منتر والا آئیڈیا کس کا ہے؟ کبھی ایسا ہوا کہ کسی نے آپ کی اس جادوگری کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے خود کو فاتح قرار دیا؟
شیف گلزار ❖......نتیجے کے اعلان کے وقت مقابلے میں حصہ لینے والے جس ذہنی دباؤ میں ہوتے ہیں اسے کم کرنے کے لیے اور انہیں کسی بھی نتیجے کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھنے کے لیے خوشگوار ماحول بنانا میری ہی اختراع ہے جسے سب نے پسند بھی کیا اور ابھی تک کسی نے تسلیم کرنے سے انکار بھی نہیں کیا بلکہ سب مذاق کے اس انداز سے لطف اندوز ہی ہوتے ہیں۔
پاکیزہ ✧......کوکنگ کے حوالے سے آپ کی کتاب کب منظرِ عام پر آئی اور اس کا خیال کیسے آیا؟
شیف گلزار ❖......2011ء میں میری کتاب شائع ہوئی، میرے پکوان کی تراکیب لوگ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں یکجا کیا اور کتابی صورت میں شائع کروا دیا۔
پاکیزہ ✧......کتاب کی پزیرائی کیسے ہوئی؟
شیف گلزار ❖......بہت شاندار، سب نے بہت سراہا۔
پاکیزہ ✧......کتاب کے بارے میں کچھ بتائیے؟
شیف گلزار ❖......کتاب کا نام ہے من پسند

لائیو نائن وِد شیف گلزار کتاب کے کل صفحات 252 ہیں اور تراکیب 200 ہیں۔

پاکیزہ ✧...... اور اب تو نئی کتاب بھی آجانی چاہیے۔ کب تک لا رہے ہیں؟

شیف گلزار ✧...... انشاء اللہ 2016 میں نئی کتاب آجائے گی۔

پاکیزہ ✧...... کیا کبھی آپ کے نام سے کوئی جعلی کتاب شائع کی گئی؟

شیف گلزار ✧...... ایک سے زائد جعلی کتابیں شائع ہوئیں، میری اجازت کے بغیر میری سی ڈیز بنا کر فروخت کی گئیں، غصہ بھی بہت آیا، احتجاج بھی کیا لیکن لاحاصل، ان لوگوں کے حال پر چھوڑ دیا اور ایمانداری سے اپنا کام کرتا رہا۔

پاکیزہ ✧...... ریڈیو کے کون، کون سے چینل پر کام کیا اور کہاں زیادہ لطف آیا؟

شیف گلزار ✧...... ایف ایم 101، ایف ایم 105، ایف ایم 100 اور بہت سے چینل کے ساتھ کام کرنے کے مزے لیے۔

پاکیزہ ✧...... کسی ایسے تربیتی ادارے کے قیام کی خواہش ہے جس میں آپ وسیع پیمانے پر کوکنگ کے حوالے سے فعال کردار ادا کرسکیں؟



شیف گلزار حسین ہم ٹی وی کی سربراہ سلطانہ صدیقی اور ہم ٹی وی کے سینئر نائب صدر اطہر وقار عظیم کے ہمراہ

شیف گلزار ✧...... جی ہاں عنقریب بلکہ 2016ء کے آغاز میں ہی شیف گلزار کوکنگ انسٹی ٹیوٹ کھولنے جا رہا ہوں کوشش اور دعا یہی ہے کہ ادارے میں آنے والوں کو اچھی تربیت دے سکوں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے خیال میں کوکنگ کی تربیت کے بنیادی اصول کیا ہوتے ہیں؟

شیف گلزار ✧...... کھانا پکانے کے دوران جن بنیادی اور اہم باتوں میں وقت پیش آتی ہے ان پر خصوصی توجہ دینا مثلاً چاول پکاتے وقت نہ ٹوٹیں، گوشت کی مہک کیسے دور کریں، اچھی روٹی پکانے کے لیے آٹا گوندھنے کا طریقہ اور اس نوعیت کے دیگر مسائل کی نشاندہی کر کے اس جانب دھیان دینا۔

پاکیزہ ✧...... اپنے ریسٹورنٹ بزنس میں کن باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟

شیف گلزار ✧...... مہمانوں کے سامنے گرم کھانا پیش کیا جائے۔ فوری سروس ہو، اور قیمت بھی مناسب......

پاکیزہ ✧...... اپنے ریسٹورنٹ کو دیگر ریسٹورنٹ

سے کیسے ممتاز قرار دیں گے؟

شیف گلزار ❖......مہمانوں کے ریسٹورنٹ میں آنے کے بعد جلد از جلد سروس دی جائے۔اور کھانے کے انتظار کے دوران کوئی نہ کوئی ایسی چیز رکھوں جو بِلا معاوضہ ہوگی اور جسے کھا کر لوگ اپنے کھانے کا انتظار بخوشی کرلیں۔

پاکیزہ ✧......کوکنگ چینلو پر دکھائے جانے والے کچن اور اس میں استعمال ہونے والی اشیا اور پکوان کے لوازمات کیا متوسط طبقے کی خواتین کی دسترس میں آسکتے ہیں؟

شیف گلزار ❖......ایسے کچن کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن پکانے والی اشیا، اس کے لوازمات، ترکیبیں لوگوں کی دسترس میں ہیں۔

پاکیزہ ✧......اس ضمن میں آپ نے کبھی کوئی ایسی کوشش کی کہ وہ کچھ دکھایا جائے جو بہ آسانی اپنایا جاسکے؟

شیف گلزار ❖......جی ہاں، بہت ساری چیزیں۔

پاکیزہ ✧......بہت سے ایسے کام جو پہلے ہاتھ سے کیے جاتے تھے اب مشینوں کے محتاج ہیں بالخصوص سِل بٹے کی پسائی۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے کھانے کی لذت متاثر ہوئی؟

شیف گلزار ❖......جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ لذت اب نہیں رہی لیکن میرا ماننا ہے مشین سے بھی اگر محنت اور ایمانداری سے کام کو کیا جائے تو پرانے زمانے کی لذت کے قریب ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کون، کون سے ممالک میں بحیثیت شیف گئے اور وہاں آپ کی کارکردگی کو کیسے سراہا گیا؟

شیف گلزار ❖......یوں تو دنیا کے کئی ممالک میں رہا ہوں لیکن بحیثیت پاکستانی شیف انٹرنیشنل شیف کانفرنس میں چائنا کے شہر شنگھائی میں پاکستان کی نمائندگی کی اور بہت سراہا گیا اور پاکستانی کھانوں کو پسند بھی کیا گیا۔دبئی میں پاکستان کی نمائندگی کی، بھارت کے شہر دہلی میں نمائندگی کی اور ان تمام جگہوں پر بہت عزت ملی۔مجھے اور پاکستانی کھانوں کو بھی بے حد پسند کیا گیا۔

پاکیزہ ✧......اب تک ملنے والے اعزازات کے بارے میں بتایئے؟

شیف گلزار ❖......

Best chef of the year 1999 جاپان،
Best chef of the year2006 تھائی لینڈ،
Best chef of the year 2011 پاکستان،
Appreciation Award Excellent chef in Pakistan, china (shangahi) chef in HighCommission india Delhi, Appreciation Excellent Certificate of excellenc 2012 by Govt of sindh.

پاکیزہ ✧......چلیں کچھ سوال نجی زندگی کے حوالے سے کرلیتے ہیں یہ بتایئے۔جاپان میں لڑکیاں تو اور بھی تھیں آپ کی نظر انتخاب شیف روبینہ پر ہی کیوں ٹھہر گئی تھی؟

شیف گلزار ❖......Thankful تھی، کام کے دوران خیال رکھنے والی تھی اور آج تک ہے۔روبینہ کی ان صفات نے دل میں جگہ بنالی اور دل نے کہا کہ اسے ہی اپنی شریکِ حیات بنانا ہے۔

پاکیزہ ✧......ملاقات کے کتنے عرصے بعد دِلی مدعا بیان کیا؟

شیف گلزار ❖......چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد۔

پاکیزہ ✧......والدین سے اجازت طلب کی تھی یا صرف اطلاع دے دی تھی؟

شیف گلزار ❖......یقیناً دونوں کی اجازت کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا تھا اور یہ اجازت انہوں نے بخوشی دی تھی۔

پاکیزہ ✧......شادی سے پہلے کی روبینہ اور آج کی روبینہ میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟



شیف گلزار حسین اپنی ڈش کے ہمراہ

شیف گلزار ❖......شادی سے پہلے ایک آزاد ماحول میں اپنے مذہب اور کلچر کے مطابق زندگی گزار رہی تھی اور شادی کے بعد ایک مسلمان پاکستانی خاتون کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہی ہے خیال رکھنے والی کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

پاکیزہ ✧......روبینہ پاکستانی کھانے کیسے پکاتی ہیں؟ ان کے ہاتھ کی کون سی پاکستانی ڈش شوق سے کھاتے ہیں؟

شیف گلزار ❖......بہت عمدہ بناتی ہیں۔ بنیادی طور پر ان کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے اور پلاؤ تو انتہائی لذیذ بناتی ہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کی اہلیہ نے یکسر مختلف ماحول اور تہذیب میں خود کو ڈھالا ان کے اس جذبے کو کن الفاظ میں سراہیں گے؟

شیف گلزار ❖......روبینہ اُس ماحول میں پروان چڑھی ہے جہاں کسی بات کا عزم کر لیا جاتا ہے تو اسے نباہ کر بھی دکھایا جاتا ہے۔ روبینہ جانتی تھی کہ مختلف ماحول اور تہذیب میں رہتے ہوئے اسے کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرنی ہے اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی تھی۔ میں روبینہ کی بہت تعریف کروں گا کہ اس نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اسے عملاً اختیار بھی کیا اس کے ساتھ، ساتھ پاکستانی کلچر کے مطابق خود کو ڈھالا بلاشبہ یہ بہت مشکل تھا لیکن روبینہ نے بخوشی یہ سب کیا اور مجھے روبینہ پر فخر ہے کہ اس نے محض مجھ ہی سے محبت نہیں کی بلکہ مجھ سے وابستہ ہر، ہر شے اور رشتے کو اپنایا۔

پاکیزہ ✧......گلزار صاحب! شیف بننے کے آرزومندوں کی رہنمائی کے لیے آپ کیا کہیں گے؟

شیف گلزار ❖......محنت، ایمانداری اور لگن بہت ضروری ہے اس کے ساتھ۔ ساتھ جو بھی کھانا پکائیں بار، بار اس کی پریکٹس کیجیے۔

شیف روبینہ گلزار

آیئے اب ذرا بات ہو جائے شیف گلزار حسین کی

شریکِ حیات شیف روبینہ گلزار سے۔

پاکیزہ ✧......جی روبینہ بہت شکریہ کہ آج آپ پاکیزہ کی مہمان بنیں...... روبینہ مزیدار کھانوں کے ساتھ کچھ مزیدار باتیں بھی ہو جائیں...... یہ بتایئے کہ جب گلزار صاحب نے آپ سے شادی کی درخواست کی تو آپ کے لیے یہ سوال حیران کن تھا یا آپ کو اندازہ تھا کہ ایسا تو ہونا ہی تھا آج نہ سہی کل سہی؟

شیف روبینہ ❖......بالکل حیران کُن تھا۔ میں نے فوری حامی نہیں بھری تھی بلکہ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت مانگا تھا اور لڑکیوں کی طرح میں نے بھی سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا انہیں تھوڑا انتظار بھی کروایا اور پھر یہ کہ مذہب اور کلچر مختلف تھا والدین سے مشورہ کیا، اور سب کی باہمی رضامندی سے شادی کے لیے راضی ہوگئی۔

پاکیزہ ✧......گلزار صاحب کی کون سی خوبی نے متاثر کیا کہ ان کی شریکِ حیات بننے پر راضی ہوگئیں؟

شیف روبینہ ❖......گلزار جھوٹ نہیں بولتے اور اپنا وعدہ نہیں توڑتے اور میری نظر میں ان باتوں کی بہت اہمیت تھی ان خوبیوں کی وجہ سے میرا مستقبل محفوظ رہے گا۔ الحمدللہ آج میں بہت خوش ہوں۔

پاکیزہ ✧......آپ نے محض گلزار صاحب کی محبت میں اسلام قبول کرلیا تھا یا مذہبِ اسلام میں خود بھی کشش محسوس کی تھی؟

شیف روبینہ ❖......دونوں چیزیں تھیں کیونکہ گلزار کی محبت کے ساتھ ساتھ ان کا مذہب بھی پیارا لگا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی میری مسلمانوں سے ملاقات رہتی تھی اور ہمیشہ مجھے خوشی محسوس ہوتی اور میرا دل اس طرف کھنچتا تھا اس لیے اسلام قبول کرنے میں مجھے بہت زیادہ وقت نہیں لگا۔

پاکیزہ ✧......سسرال میں کیسے پزیرائی ملی اور کس رشتے سے زیادہ اپنائیت ملی؟

شیف روبینہ ❖......بے حد، میری توقع سے کہیں بڑھ کر......اور میری ساس نے تو بے انتہا محبت دی یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ایک ماں کی طرح میرا خیال رکھا۔

پاکیزہ ✧......یکسر مختلف ماحول اور تہذیب و تمدن میں خود کو ڈھالنے میں ابتدا میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟

شیف روبینہ ❖......لباس اور کھانے مختلف ہونے کی وجہ سے ابتدا میں تھوڑی مشکل پیش آئی لیکن میں نے رفتہ رفتہ خود کو ان کا عادی بنالیا۔

پاکیزہ ✧......گلزار صاحب کو بحیثیت شوہر کیسا پایا؟

شیف روبینہ ❖......یہ ایک اچھے شوہر ہیں جو ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں اسی لیے تو ماشاء اللہ زندگی کے اکیس سال خوشگوار سفر طے کیا۔ دعا کریں کہ آگے بھی زندگی خوشگوار گزرے آمین!

پاکیزہ ✧......آپ جاپان سے واپس مستقل پاکستان آنے پر بخوشی راضی ہوگئی تھیں؟ یا محض گلزار صاحب کی رضا پر راضی ہوگئی تھیں؟

شیف روبینہ ❖......گلزار میرے شریکِ حیات ہیں اب ان کا وطن میرا وطن ہے اس لیے اپنی خوشی سے پاکستان آئی اور بخوشی یہاں رہ رہی ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے اسلام کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنا چاہتی تھی اور اللہ کے فضل سے میری نیک نیتی رنگ لائی اور میں خود کو مسلمان پاکستانی عورت کہنے میں فخر محسوس کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......پاکستانی معاشرے اور روایات کی کیا بات پسند اور کون سی ناپسند ہے؟

شیف روبینہ ❖......ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا، پاکستان میں ہونے والی تقریبات اور تہوار بہت پسند ہیں اور ایک دوسرے کی چغلی کرنا سخت ناپسند ہے اس کی وجہ سے دلوں میں برائیاں ہوتی ہیں جس سے ماحول خراب ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......گلزار صاحب آپ کے پکائے کھانے بخوشی کھالیتے ہیں؟ یا مداخلت کرتے ہیں؟

شیف روبینہ ❖......گلزار میرے پکائے تمام کھانے بخوشی کھالیتے ہیں اس لیے میں گھر کے کھانے خود ہی بناتی ہوں، یہ دخل اندازی نہیں کرتے۔



شیف گلزار حسین چینی مندوبین سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے

پاکیزہ ✧......گلزار صاحب معروف بھی ہیں اور مصروف بھی؟ ان کی شہرت، مقبولیت اور مصروفیت آپ پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟

شیف روبینہ ❖......بالکل مصروف زیادہ رہتے ہیں اس لیے وقت نہیں دے پاتے لیکن جب فرصت ملتی ہے تب تمام توجہ گھر پر دیتے ہیں اور ہم ساتھ ہی وہ وقت گزارتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......میرا گھر میری جنت مگر کیسے؟ دو فقروں میں بیان کیجیے؟

شیف روبینہ ❖......میں ان سے ڈیمانڈ نہیں کرتی جو ملتا ہے اس پر شکر کرتی ہوں اور یہ شکر کی برکت ہی ہے کہ اللہ نے خوب، خوب نوازا ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے بحیثیت شیف اپنی صلاحیتوں کو گھر کی دنیا تک کیوں محدود کرلیا؟

شیف روبینہ ❖......شروع میں ایک سال تک تو ٹی وی پر کام کیا لیکن اس میں وقت بہت لگتا ہے میں نے محسوس کیا کہ گھر کا نظام متاثر ہو رہا ہے اور میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے، اس لیے میں نے خود کو گھر تک محدود کر لیا۔ لیکن کبھی موقع ملا تو اپنا ہنر ضرور آزماؤں گی۔

پاکیزہ ✧......ایک اچھی خاتون شیف میں کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے؟

شیف روبینہ ❖...... manners کا ہونا ضروری ہے، ناخن کٹے ہوئے اور صاف ہونے چاہئیں، نیل پالش نہیں ہونی چاہیے، انگوٹھی بھی نہیں پہنیں، بال باندھے رکھیں اور جو ڈش بنا رہی ہوں اس کے بارے میں مکمل معلومات ہونی چاہیے۔

پاکیزہ ✧......پاکیزہ کی قارئین بہنوں کے لیے آپ دونوں کا مشترکہ پیغام؟

شیف روبینہ ❖......کھانا دل لگا کر بنائیں۔ جب تک کھانا بنانے میں ذاتی دلچسپی اور محنت نہیں ہوگی کھانے میں لذت نہیں آئے گی۔ مل جل کر رہیں کہ اتفاق میں برکت ہے۔ (بہت شکریہ، آپ دونوں کا)

☆☆☆

جی قارئین! اب آپ اپنی رائے ضرور دیجیے گا ہمارے ان مہمانان گرامی کے بارے...... انشاء اللہ اسی طرح ہم میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے مزید... پُرلطف اور ہنرمند مہمانوں سے ملواتے رہیں گے، اللہ حافظ۔

☆☆☆



میرا پیارا شہر شکار پور

نور افشاں شیخ

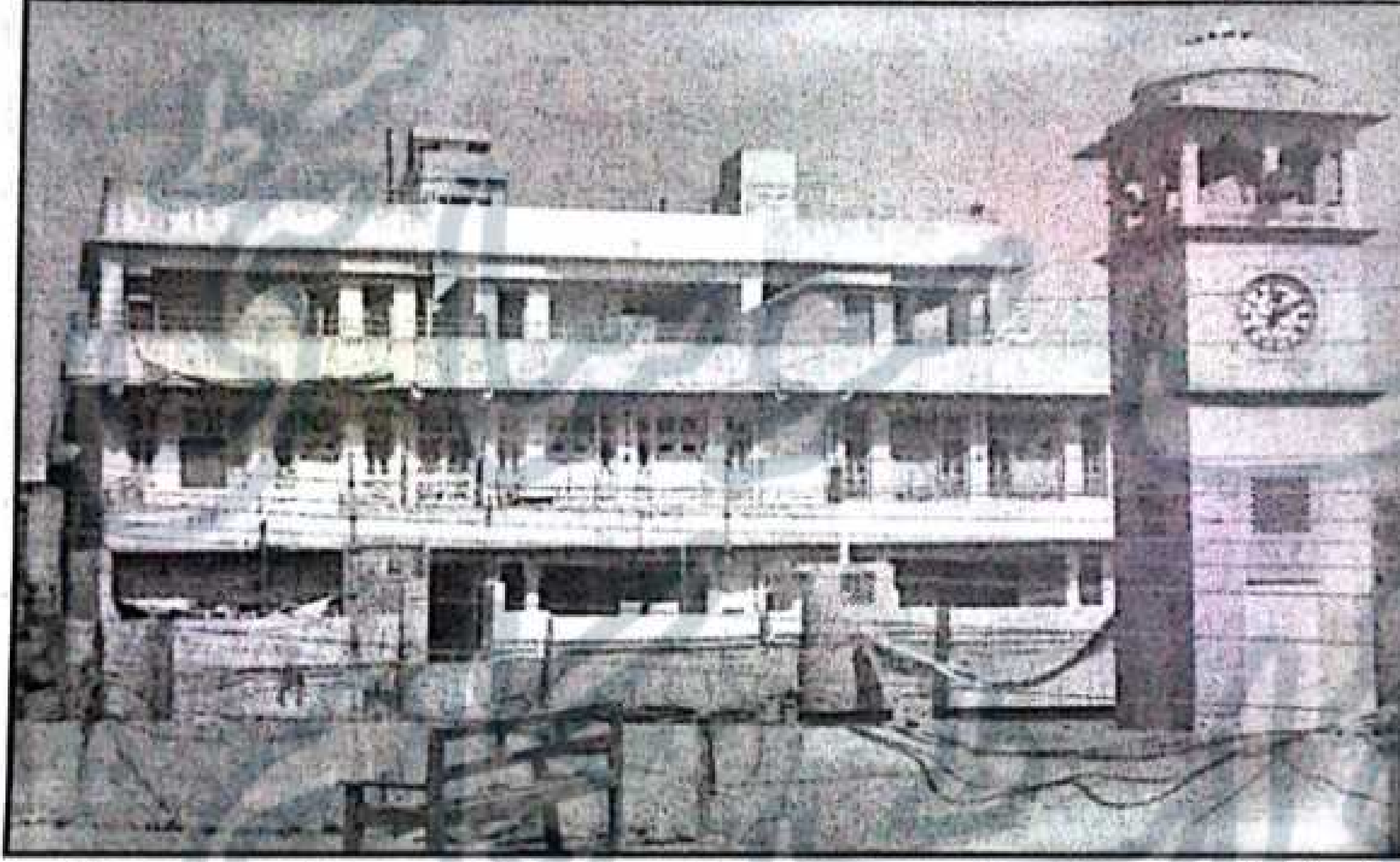
ہمارا پیارا شہر شکار پور سندھ کے بڑے شہروں میں سے ایک خوب صورت شہر ہے، جس کو اپنے ماضی اور حال دونوں پر فخر ہے۔ ماضی میں یہ شہر بیوپار اور سیاسی لحاظ سے بہت اہم تھا۔ کابل، قندھار، سمرقند، بخارا اور تاشقند کے بیوپاری قافلے شکار پور میں آکر منزل کرتے تھے۔ چار سو سال پہلے یہاں صرف جنگل تھا، جتوئی اور مہر قبیلے اس جگہ کو شکار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس شہر کی بنیاد داؤد پوتا خاندان کے حاکم امیر بہادر خان نے 1618ء میں رکھی اور اس کا نام شکار پور رکھا۔ شکار پور کو سن 1843ء میں سندھ کے تین ضلعوں میں سے ایک ضلع بنایا گیا۔ اس وقت سکھر شہر اسی ضلع میں تھا۔

سکھر کا ائرپورٹ شکار پور شہر سے صرف اٹھائیس کلو میٹر دور ہے۔ یہاں کندکوٹ، کشمور اور ڈیرا غازی خان کے لیے بھی شاہراہ نکلتی ہے، لاڑکانہ، دادو اور سیہون جانے کے لیے بھی یہاں سے ایک راستہ جاتا ہے، اس طرح یہ شہر تین بڑی شاہراؤں کا ملاپ ہے۔ کافی وقت پہلے شکار پور شہر کے چاروں طرف مٹی کا بڑا مضبوط کوٹ تھا جس میں آٹھ دروازے لگے ہوئے تھے مگر وہ دروازے اب اپنی جگہ پر نہیں ہیں۔ صرف دو دروازے ابھی تک موجود ہیں جو ہائی در اور لکی در کے نام سے آج بھی قائم ہیں۔ لکی در کے پاس سارے بازار آکر ملتے ہیں جہاں شکار پور کا قدیم گھنٹا گھر ہے جو ایک سو سال پرانا ہونے کے باوجود آج بھی پورا وقت دیتا ہے۔ لکی در سے آگے ایک بازار ہے جس کی چھت ساگوان کاٹھی کی بنی ہوئی ہے جو ایک ریلوے پلیٹ فارم کی طرح دکھائی دیتی ہے' اس کو ڈک بازار کہتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ بازار بہت ٹھنڈا رہتا ہے یہاں پر کتابوں اور جنرل اسٹور سے لے کر میک اپ، جیولری، شوز، بے شمار کپڑوں کی دکانیں اور بوتیکس وغیرہ بھی ہیں...... ڈک بازار کے دوسری طرف چوڑ یگر بازار اور آگے گنج کا علاقہ شروع ہوتا ہے جو کسی آفیسر کے نام سے

منسوب ہے، یہاں پرانی گڑ بندی، اناج منڈی اور بینکوں کی عمارتیں ہیں، مطلب یہ جگہ کاروباری مرکز کہلاتی ہے۔

یہاں سب سے بڑی سبزی مارکیٹ اور گھریلو سامان کی دکانیں بھی ہیں۔ شکار پور کا اچار اور مٹھائی بہت مشہور ہیں جن میں ماوا، حلوا اور پیڑے ہر جگہ پسند کیے جاتے ہیں۔ دیوان ٹھاکر داس کی قلفی بھی پورے سندھ میں مشور ہے۔

شکار پور میں پوت کا کام بھی بہت عمدہ ہوتا ہے یہاں کے لوگ گرمیوں میں سفید ململ کے کُرتے اور وائٹ شلوار پہنتے ہیں۔ یہاں بچوں کے لیے خالص زری کی واسکوٹیاں بنائی جاتی ہیں، سردیوں میں کشمیری طرز کی اونی شالیں بھی یہاں بنائی جاتی ہیں۔



ڈی سی او آفس سندھ زمیندار ہوٹل، انڈس ہوٹل، شاہ رخ ہوٹل، سٹی ٹاپ ہوٹل اور مہران ہوٹل کی جدید عمارتیں شکار پور کے حسن کو ظاہر کرتی ہیں۔ شکار پور کی بلال بریانی بھی بہت مشہور ہے۔ نارائی نواس بلڈنگ، میمن بلڈنگ جس کی اوپر کی چھت سے پورا شکار پور نظر آتا ہے...... اور جمانی ہال جیسی تاریخی عمارتیں قدیم طرز کی ہیں اسی کے علاوہ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے بہت سارے گورنمنٹ ہائی اسکول بھی ہیں۔ اور الگ، الگ کالجز بھی ہیں جہاں ماسٹرز تک تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہاں پر ایک شکار پور یونیورسٹی بھی ہے جو ابھی پچھلے سال سے ہی شروع ہوئی ہے۔ یہاں بہت سارے پرائیویٹ اسکولز بھی ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کورسز اور انگلش لینگویج سیکھنے کے بھی بے شمار سینٹر ہیں۔ یہاں فوجیوں کی تعلیم والا اسکول بھی ہے جہاں دوسرے شہر کے اسٹوڈنٹ تعلیم حاصل کررہے ہیں

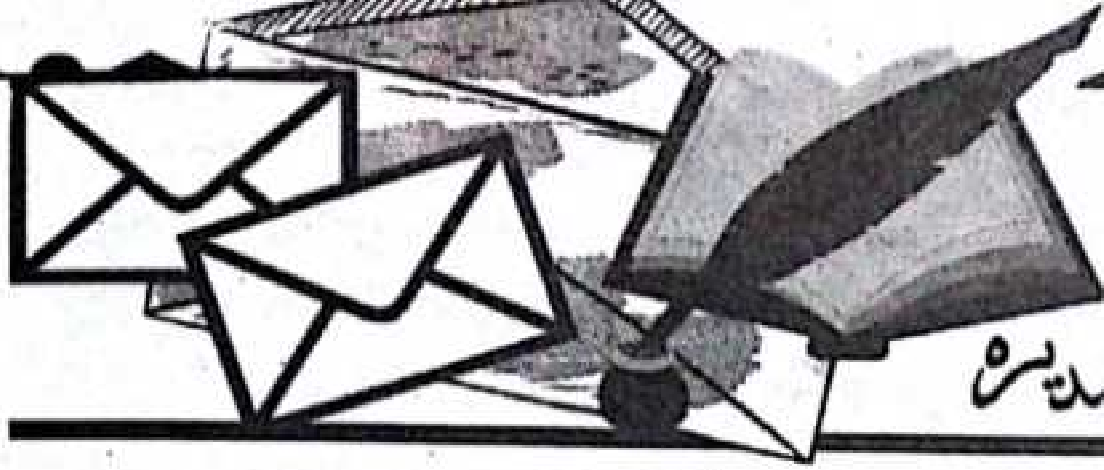
اور ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ یہاں پر دو مشہور باغ ہیں......

ٹمنیس باغ جو اب لیاقت پارک کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا بیگاری واہ پے بڑا شاہی باغ ہے، شاہی باغ کے اندر میری ویدر کے نام سے ایک قلعہ ہے جو 1871ء میں سارا ساگوان کاٹھی سے بنایا گیا تھا۔ وہ دیکھنے کے لائق ہے، یہ شاہی باغ شہید اللہ بخش سومرو کے نام سومرو کے نام سے مشہور ہے یہاں لوگ گرمیوں میں پکنک منانے کے لیے بھی آتے ہیں۔

یہاں مشہور بڈل فقیر کا میلا ہر سال لگتا ہے۔ شکار پور کو قدرت نے میٹھے پانی کی نعمت سے نوازا ہے۔

یہاں سندھ فائن ٹیکسٹائل مل اور غالیچہ بنانے کے کارخانے بھی ہیں۔ یہاں ایک بڑا سول اسپتال ہے، اس کے علاوہ پرائیویٹ اور خیراتی اسپتال بھی ہیں۔ آنکھوں کی بیماریوں کے لیے سرہینری ہالینڈ میموریل اسپتال بھی ہے۔ یہاں دو سینما ہاؤس بھی ہیں اور یہاں میرج ہال اور لان وغیرہ بھی ہیں۔

یہاں کا اللہ والا چوک اور جہاز چوک بھی بہت مشہور ہیں۔ ہمارے شہر میں ایک بڑی لائبریری بھی موجود ہے۔ قارئین میں آپ سب کو شکار پور آنے کی دعوت دیتی ہوں کہ یہ شہر آکر ضرور گھومیں۔ مجھے اپنے شہر اور اپنے ملک سے بہت پیار ہے۔...... ☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو...... یا الٰہی دونوں جہاں میں ہم سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے...... آمین، ثم آمین۔

پیاری بہنو! اس وقت میں آسٹریلیا کے خوب صورت ترین شہر سڈنی سے آپ سے مخاطب ہوں...... یہاں موسم گرما چل رہا ہے...... دن میں ہلکی سی گرمی ہوتی ہے مگر راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں...... اپنے بیٹے، بہو اور پوتی کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا ہے...... پاکستان سے آنے سے پہلے ہی ہماری بہت سی قاری بہنوں کے فون آگئے تھے...... ان سے تفصیلی بات چیت کا تذکرہ تو انشاء اللہ پاکستان آکر آپ کو بتاؤں گی۔ ایک اشاعتی ادارے نے مجھ سے آسٹریلیا کا سفرنامہ لکھنے کی بھی فرمائش کی ہے...... (کوشش کروں گی، پکا وعدہ نہیں) دورانِ قیام اپنے مشاہدات لکھتی بھی رہوں...... اس ماہ میرے پاس دو ایسے فون آئے جو دوستوں سے نالاں تھیں بقول ان کے ان کی زندگی کو ضیق بنانے میں رشتے داروں سے زیادہ ان کے قریبی دوستوں کا ہاتھ تھا۔ اور اس وقت مجھے اہلِ جرمنی کی ایک کہاوت یاد آرہی ہے۔ سچی خوشی وہ کمینی خوشی ہوتی ہے جو ہم دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر محسوس کرتے ہیں۔ ایسا اکثر دیکھا گیا ہے ہمارے چند دوست ہماری کامیابیوں کے بجائے ہماری پریشانیوں پر زیادہ خوش ہوا کرتے ہیں۔ اچھا چوری ہوگئی...... ہاہا...... نئی گاڑی پر ڈینٹ پڑ گیا...... اوہ...... بیٹے کی پروموشن نہیں ہوئی...... واؤ...... بہو کے دانت نکل آئے...... ہُرّا...... (ہاں بھئی ایسا ہوتا......) اگر کوئی منہ سے کچھ نہ کہے تو ان کا خوشیوں بھرا چہرہ اور ہنستی ہوئی آنکھیں سب کچھ کہہ دیا کرتی ہیں) اس لیے احتیاط کا یہ تقاضا ہے کہ اب ہمیں اپنے کارناموں اور اپنی خوشیوں کا بہت کم تذکرہ کرنا چاہیے...... اس لیے آپ کو یہی مشورہ دوں گی۔ ہم سب کو اعتدال پسندی سے کام لینا چاہیے...... کہ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ یہ واقعی سچی بات ہے کہ ہمیں ہر حال میں اعتدال پسند اور منکسر المزاج ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم اور آپ ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں...... ہم سب چل بسیں گے...... زندگی بہت مختصر ہے...... ہم دوسروں کے سامنے اپنی بڑائی ہی کیوں ظاہر کریں بیکار باتوں سے اپنے وقت کا کیوں زیاں کریں...... ہم اس کا ذکر اور اس کی بڑائی اور کبریائی کیوں نہ بیان کریں...... جس کا نام لیے بغیر اپنی محفلیں سجانے والوں پر لعنت بھیجی گئی ہے...... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

☆ اور اب آیئے پہلے ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے...... ابھی پڑھ لیں...... اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں اور اب ایک نظر نئی اور تر و تازہ سرگرمیوں پر بھی ڈال لیجیے......

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق، کراچی کے ہاں پہلا پوتا تولد ہوا ہے اور وہ اپنے بیٹے، بہو اور پوتے کے پاس ان دنوں امریکا گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)
- پاکیزہ کی مستقل قاری مقدس کی رخصتی اسی ماہ ہو رہی ہے۔ (مبارک باد)
- پاکیزہ کی مستقل قاری فرحانہ پروین، راول پنڈی کی بہن شاہانہ کی اس ماہ رخصتی ہوگی۔ (مبارک باد)
- نئی مصنفہ اور شاعرہ سارہ اکبر، پنجاب کا پہلا مجموعۂ کلام بہت جلد آنے والا ہے۔ (ماشاءاللہ)
- مصنفہ اور شاعرہ پروین عذرا نشنہ، کراچی ان دنوں اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں، واضح رہے کہ

ان کا شاعری کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ (ماشاء اللہ)

- مصنفہ غزالہ جلیل راؤ کا نیا ناول دیا اور جگنو کتابی شکل میں آگیا ہے۔ جس کا انتساب انہوں نے آپ کی باجی انجم انصار کے نام لکھا ہے...... ناول کی قیمت صرف چار سو روپے ہے اور یہ دلچسپ اور رومانی ناول حاصل کرنے کے لیے آپ رابطہ کیجیے...... نواب سنز پبلی کیشنز، اقبال روڈ کمیٹی چوک راول پنڈی، فون نمبر، 051.5555275
- شمیم فضل خالق اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئی ہیں۔
- شاعرہ اور مصنفہ یمنیٰ احمد کے ہاں پیارا سا بھتیجا تولد ہوا ہے۔ جس کا نام محمد آزین رضوان رکھا گیا ہے۔ (بہت مبارک باد)

☆ فائزہ شہزاد کا بڑا بیٹا محمد عمر بن شہزاد ایم بی ایس کے لیے چائنہ گیا ہے جبکہ چھوٹے بیٹے محمد عمیر بن شہزاد نے 9th کلاس میں 85 فیصد نمبر لے کر کامیابی حاصل کی ہے۔

- گزشتہ ماہ ڈاکٹر سعدیہ شہزاد کی سالگرہ اور ان کی شادی کی سالگرہ بھی منائی گئی۔
- مستقل قاری فرخندہ جعفری، گجرات کے ہاں پیارا سا نواسا تولد ہوا ہے جن کا نام علی حسنین رکھا گیا ہے۔
- عابش جنجوعہ، تونسہ شریف کے بھائی کی شادی گزشتہ دنوں بخیر و خوبی انجام پائی۔
- مصنفہ صائمہ قیصر، راول پنڈی کی پیاری بیٹی ماہ نور قیصر کی شادی اسی ماہ ہو رہی ہے۔ (بہت مبارک باد)
- ڈراما رائٹر اور شاعرہ بشریٰ فرخ کی بیٹی کی شادی گزشتہ دنوں بخیر و خوبی انجام پائی۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

- فائزہ شہزاد ہرنیا کی سرجری کے بعد ماشاء اللہ اب روبصحت ہیں۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی علیل ہیں۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری مسز ستارہ شیخ، سندھ بیمار ہیں۔
- پاکیزہ کی نئی تبصرہ نگار فرحانہ پروین کی والدہ کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔
- پاکیزہ کی مستقل قاری مصباح رضا سعید، فیصل آباد کی بیٹی کی ذہنی و جسمانی صحت کے لیے دعا کریں۔
- پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

انتقالِ پُرملال

- مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ یاسمین کنول، پسرور کا پندرہ سالہ بھتیجا اویس احمد برضائے الٰہی انتقال کر گیا۔
- نگہت غفار کی سمدھن حلیمہ بیگم انتقال کر گئیں جبکہ دوسری بہو کے والد بھی انتقال کر گئے۔
- پاکیزہ سے وابستہ نزہت اصغر کے بڑے بہنوئی یٰسین رضا، لندن برضائے ربّی انتقال کر گئے۔

☆☆☆

بہ فریدہ لاکھانی، سڈنی سے دعاؤں بھرا نامہ لیے حاضر ہیں۔ جس کا جواب عذرا رسول صاحبہ نے خود دیا ہے۔ "ڈیئر معراج رسول صاحب و عذرا رسول صاحبہ! آداب و خلوص، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گی۔ 2015ء کی روانگی ہو رہی ہے اور نئے پُر بہار سال کی آمد آمد ہے گویا منزلوں کو ساتھ لیتے جائیں اور ہر سال نئے سال کی خوشیاں مناتے جائیں ہر قدم پر ایک پہیلی سامنے گویا زندگی بھر مسئلے سلجھائیں۔ نئے سال کے اس موقع پر آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کو زندگی کے نشاط آمیز لمحے مبارک ہوں۔ خدا کرے 2016ء کا سال امن و آشتی کا سال گردانا جائے۔ پہلے سے کہیں بہتر ہو... اور اللہ تعالیٰ صحت کے حصار میں آپ کو اور آپ کے خانوادے کو ہمیشہ رکھے۔ زندگی کا ہر قدم اور ہر نقش معتبر ٹھہرے، بہار پھر سے آپ کے خوابوں کو مہکائے اور نذرانہ عقیدت پیش کرے، پاکستان کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اپنے دشمنوں سے۔ آپ کی کاوش عمر دراز ہو اور پاکیزہ کی اشاعت بلندی پر پہنچے، آمین۔" (فریدہ لاکھانی آپ کا بہت، بہت شکریہ! اللہ آپ کو بھی اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ یہ سال ہم سب کے لیے اور ہمارے ملک کے لیے امن و سکون اور خوشحالی کا سال ہو۔ الٰہی آمین...... میرے لیے پاکیزہ سے وابستہ تمام مصنفات و تبصرہ نگاران نہایت محترم اور قابلِ قدر ہیں۔ آپ کے تعاون سے ہی ہم رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے میں سرگرم عمل ہیں۔) ہاں ایک سوال اپنی باجی انجم سے بھی پوچھنا چاہوں گی کہ پہلے پاکیزہ آسٹریلیا میں آیا کرتا

تھا اب پاکیزہ مجھے مشکل سے ملتا ہے۔ تاہم کراچی سے اپنی فیملی سے رابطہ کر کے منگوا لیتی ہوں۔ اور اپنی فیملی سے کراچی میں خبر رکھے رہتی ہوں کہ آیا اگلے ماہ کا پاکیزہ آیا یا نہیں اور اگر بازار اس سے بچ گئے ہوں تو اسے میرے لیے بھی خرید کر پوسٹ کر دیا جائے یا کسی آنے جانے والے کے ہاتھ دو یا تین جتنے بھی مہینوں کے رسالے جمع ہو گئے ہوں، مجھے بھیج دیے جائیں۔ یہاں یوں تو وقت نہیں ملتا لیکن کام پر جاتے ہوئے ٹرین میں دورانِ سفر پڑھ لیتی ہوں یا سنڈے کی رات اپنے شوقِ خواندگی کو مہکائے رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں کچھ عمدہ افسانوں کا ذکر کرنا چاہوں گی جن کے لکھنے والوں کو مبارک باد پیش کر دیں تو عین نوازش ہوگی۔ ۱۔ پل صراط ۲۔ خوشبو کا سفر ۳۔ محبت ہم سفر میری ۴۔ یادوں کی مالا، شمع ہدایت وغیرہ کا۔" (فریدہ میں آرہی ہوں ناں آپ کے لیے پاکیزہ آسٹریلیا لا رہی ہوں اور آپ سالانہ خریدار بھی بہ آسانی بن سکتی ہیں)

✿ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے کے بعد اعتبارِ وفا کا نمبر تھا...... نگہت سیما کی سولھویں قسط کا معیار اپنے اسی معیار پر قائم و دائم ہے جو پہلی قسط کا تھا...... شیریں حیدر کا منی ناول اختتام کو پہنچا...... بہترین آغاز اور بہترین اختتام، شیریں حیدر، میں آپ کے افسانے ہوں یا ناول بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سکینہ فرخ کا مکمل ناول خوب رہا...... سکینہ فرخ جتنی بھی دیر لگائیں پر جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ شمیم فضل خالق، غزالہ عزیز، شہناز وسیم کے افسانے بے حد پسند آئے۔ نیلم احمد بشیر کو پڑھ کر قارئین کی آنکھیں ضرور نم ہوئی ہوں گی۔ عاشقہ مسعود کی بات دل کو لگی...... صبر وہ کڑوا گھونٹ ہے جس کو پی کر رب سے قریب ہوا جا سکتا ہے۔ اختر شجاعت جیتی رہیے...... اللہ ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ عظمیٰ آفاق آپ کے نقشِ قدم پر چل پڑی ہے۔ ہالہ احمد کا مختصر افسانہ بھی خوب رہا...... ربیعہ اکرم کے انٹرویو میں تشنگی محسوس نہیں ہوئی۔ بہنوں کی محفل تو سب کا میکا ہے۔ جلترنگ ٹاپ "ٹاپ" پر رہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کا قلم یونہی ہنستا رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ساتھ خیریت آسٹریلیا لے جائے اور لائے آمین، ثم آمین۔" (تبصرے کا شکریہ)

✿ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔ "سب سے پہلے یادوں کی مالا کی طرف رخ کیا اُف ذکیہ بلگرامی کیسے یادوں کے موتی چن، چن کر لکھ رہی ہیں۔ قرآن پاک سے ان کی محبت پڑھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ماشاءاللہ ...... اتنی عاجزی و انکساری کے ساتھ وہ اپنے اتنے بڑے، بڑے کارنامے لکھ رہی ہیں کہ میرا دل تو ان کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ ایک، ایک لفظ کو میں بغور پڑھتی ہوں اور ان کی اعلیٰ و ادبی شخصیت کی دل سے قائل ہو جاتی ہوں۔ جب بھی ان کی کوئی تحریر قرآن پاک کے حوالے سے دیکھی میں نے ہمیشہ دلچسپی سے مطالعہ کیا اور قرآن پاک سے عقیدت و محبت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ کاش ایسی ہستی سے ملنے کا شرف حاصل ہو جائے تو ان ہاتھوں کا بوسہ لوں جو میرے رب کے اتارے کلام کو اتنی چاہت و عقیدت سے سطحِ قرطاس پر اتارتی ہیں۔ اللہ انہیں مزید ہمت دے۔ افسانے اس مرتبہ کے مختصر و پُراثر تھے۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ معذور ہمارے معاشرے کی تلخ سچائی۔ فریدہ لاکھانی نے بھی لفظوں سے خوب انصاف کیا۔ شبانہ شوکت کی تحریر پڑھ کر نوال کی حرکت پر بڑی حیرت و شرمندگی ہوئی۔ بیچارہ ارسل بے عزت ہوتے، ہوتے رہ گیا۔ ویسے اب کیمروں کی وجہ سے اس طرح کے واقعات کم ہی دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ شہناز وسیم کی تحریر ادا سی سے پڑھی اور مجھے امید ہے کہ کتنے ہی لوگوں کو راہ بھا دی ہوگی۔ بہت خوب۔ میں ہمیشہ جلترنگ ذوق شوق سے پڑھتی ہوں۔ ساری فکریں، ذہنی ٹینشن لمحوں کے لیے دور چلی جاتی ہیں پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا مگر اس مرتبہ میں ضرور ذکر کروں گی۔" (آپ کی پسندیدگی کا شکریہ معذرت خواہ ہوں آپ کے محبت بھرے جملے حذف کر دیے...... میں چاہتی ہوں کہ پاکیزہ کی یہ محفل شائع ہونے والی ہر تحریر کے بارے میں رائے دیں۔ آپ کی پسندیدگی کے لیے احسان مند ہوں)

✿ مدیحہ شاہد، اسلام آباد سے۔ "بہنوں کی اس محفل کی روشنی ہمیشہ میرے دل میں رہی مگر سفر کی گردشوں اور مصروفیت کے انبار نے بہت عرصہ فرصت سے دور رکھا۔ آپ سب بہنوں کی دل سے ممنون ہوں جنھوں نے میرے ڈراما سیریل ڈائجسٹ رائٹر کو بے حد پسند کیا اور خوب صورت لفظوں سے سجے خطوط لکھے۔ پاکیزہ میرے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوا کہ پاکیزہ میں چند کہانیاں لکھنے کے بعد ہی الیکٹرانک میڈیا تک میری پہچان بن گئی۔ اور اس پہچان نے مجھے انڈیا سے یورپ تک پہنچا دیا۔ پاکیزہ کے پلیٹ فارم سے اٹھایا گیا پہلا قدم میرے سفر کا آغاز تھا۔ میں فخریہ کہتی ہوں کہ میں پاکیزہ کی ڈائجسٹ رائٹر ہوں۔ انجم باجی کی محبت اور حوصلہ افزائی نے میرے ہاتھ میں پکڑے قلم کو مضبوطی دی۔ کچھ لوگ دوسروں کے لیے روشنی کا

مینار ہوتے ہیں۔ لوگوں کی محبت کا مرکز ہوتے ہیں، ان کے ہاتھ میں زندگی سے مایوس لوگوں کے لیے شفا ہوتی ہے۔ وہ جس کا ہاتھ تھام لیں وہ خوش قسمتی کے حصار میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسی ہی شخصیت انجم انصار باجی کی ہے۔ رخ چوہدری کا انٹرویو صحرا میں کھلے پھول جیسا خوب صورت تھا۔ رخ چوہدری آپ نے جس خوب صورتی سے ڈائجسٹ رائٹر کو سراہا اور اس ڈراما سیریل کی روح کو سمجھا، وہ میرے لیے بڑی خوشی کا باعث ہے۔ آپ سب بہنوں کی تعریفیں اور محبتیں میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔'' (پیاری مدیحہ مجھے اپنی ہر بہن کی خوشی اپنی خوشی لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین)

✿ فائزہ شہزاد، پشاور سے۔ ''پیاری آپی جان! ایسی زندگی کے الجھاؤں میں الجھی مطلب الجھنوں میں کہ بس کسی کام کا کرنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ ایک تو پورا سال شدید بیماری میں گزرا...... پھر باقی زندگی کے گورکھ دھندے جو قبر تک ہمارے ساتھ ہی چلیں گے اور جو ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ بس آج ہمت پکڑی اور قلم تھاما...... ہر ماہ ایک دو لائنیں لکھ کر چھوڑ دیتی تھی...... امینہ عندلیب کیسی ہو؟ ہر وقت، ہر بہن دعاؤں میں ہے، اللہ پاک سب کو صحت و زندگی سے نوازے آمین! آپ ہر نماز کے بعد محمد الرسول اللہ احمد الرسول اللہ...... 35، 36 بار پڑھیں بلکہ تمام بہنیں، ہر لاعلاج بیماری کی شفا ہے۔ میں نے بھی اپنی تمام بیماریوں کے لیے ہر وقت یہی ورد کیے رکھا اور شکر ہے اللہ پاک کا...... سب بہنیں اس ورد کو اپنا معمول بنالیں لیکن پورے عقیدے اور ایمان کے ساتھ...... شیریں حیدر آپ کی اسٹوری بہت اچھی تھی۔ بھول بھلیاں تھی۔ مجھے ہر ماہ پچھلے مہینے کا رسالہ ساتھ رکھنا پڑتا تھا اگر آپ اپنے اسی پرانے اسٹائل میں سیدھے سادے اسٹائل میں لکھتیں تو شاید زیادہ دلچسپ ہو جاتی۔ شمیم فضل خالق آپا آپ کی کہانیاں اور افسانے آپ جیسے ہی سیدھے سادے اور دلچسپی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جلترنگ میں آپی جان! چھیتی سی پڑھ کر بے اختیار قہقہے تھے میرے...... کیونکہ خاندان میں اکثر ایسی بلکہ اکثر نہیں اب تو ہر جگہ ایسی پائی جاتی ہیں اور ایسی ہی کامیاب رہتی ہیں۔ سسرال میں کامیابی کی ضمانت ڈگری نہیں بلکہ چالاکی اور منافقت ہے۔ جس کو یہ گر آتا ہے وہی کامیاب ہے۔'' (بہت دنوں بعد آگئی ہو...... اب غیر حاضر مت ہو جانا۔)

✿ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار سونیا کے خوب صورت سرورق سے سجا پاکیزہ میرے ہاتھوں میں ہے لے آؤٹ دیکھ کر ہمیں بھی سردی لگنے لگی۔ سلسلے وار ناولز تو خوب اچھے جار ہے ہیں ان کے علاوہ کھوئے، کھوئے لمحے، جرمِ الفت کے اسیر، نبھانا ہے محبت نے سوئی سے دھاگے تک...... وہی ہوتا ہے جو، زندگی تماشا بنی، وہ کون تھی، آواز کی دنیا کی شہزادی ربیعہ اکرم سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ ان کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آپ سے گزارش ہے زینت یاسمین، نیلوفر عباسی، شبینہ افتخار وغیرہ...... سے بھی ملاقات کروادیں تو مزہ آجائے۔ (کوشش کریں گے) میری طرف سے تمام بہنوں کو سالِ نو 2016ء کی دلی مبارک باد قبول ہو۔ (شکریہ) ہماری دعا ہے کہ فریدہ جاوید فری اور امینہ عندلیب کو اللہ تعالیٰ صحت دے اور سدرۃ المنتہیٰ کے والد صاحب کو حمیرا نوشین کے بھائی کو...... راشدہ صمد کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور پاکیزہ سے وابستہ ساری ٹیم کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین'' (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

✿ مسز نگہت غفار، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بہت اچھا موضوع لیا۔ یادوں کی مالا کس قدر خوب صورت عنوان ہے۔ جتنا خوب صورت عنوان ہے اتنی خوب صورت، قابلِ احترام محترمہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی زندگی کے خوب صورت لمحات پڑھے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ باقی کہانیوں میں مختصر کہانی، بھوک، ٹھپا، جھوٹی اچھی کہانیاں تھیں۔ تمام بیماروں کی صحت کی بحالی کے لیے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ دعا گو ہوں۔ اللہ رب العزت آپ سب کو صحتِ کلی کی دولت سے مالا مال فرمائے (آمین) اقبال بانو کی دونوں بہنوں، شازیہ شبیر، آپ لوگوں کے لیے صبرِ جمیل کی، مرحومین کے لیے دعائے مغفرت......'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ مسز حق، اسلام آباد۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس قسم کی اپیل ہم لوگ نہیں لگاتے، آپ رسالے پر تبصرہ ضرور بھیجیں۔ اللہ آپ کو آپ کے نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔

✿ یاسمین کنول، پسرور سے۔ ''قیصرہ حیات، نگہت سیما اور دُرِّ ثمن بلال کے ناول واقعی خوب صورت لگے۔ نیلم احمد بشیر، سکینہ فرخ اور تابندہ نعیم کی تحریریں واقعی بہت دلکش محسوس ہوئیں۔ ربیعہ اکرم کی کاوشوں کی داستان واقعی حوصلہ افزا ہی ان کی

زندگی ایک رول ماڈل ہے اتنی لائق صداکارہ کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اور وہ اپنی صلاحیتوں اور خوب صورت آواز سے انسانوں کو سکون فراہم کرتی رہیں۔ یادوں کی مالا، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی خوب صورت تحریر ہے جو روحانیت کا سفر لگتی ہے۔ سوئی سے دھاگے تک فریدہ لاکھانی نے بہت مشکل لکھا...... جلترنگ میں ٹاپ اور بارش کے بعد دونوں تحریریں زبردست رہیں۔ ماشاء اللہ تربیت یافتہ خواتین کے حوالے سے ٹاپ میں تعلیمی اہمیت اور بارش کے بعد گھریلو صفائی ستھرائی سلیقہ شعاری کو موضوع بنایا گیا۔ بڑا اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ پیار ساس اور ہم بہت اچھی اور منفرد نظم ہے۔ باقی آپ نے باتیں بہاروخزاں کی میں مجھے شامل فرمایا اس کرم فرمائی پر جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔'' (شکریہ کی کیا بات یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے اور آپ لوگوں کی نگارشات ہی اسے خوب صورت بناتی ہیں)

٭ فرحت احمد، گلشن حدید سے۔ ''باجی حج سے واپسی پر نومبر اور دسمبر کے پاکیزہ اکٹھے ہی پڑھے ہیں اور دونوں ہی اچھے لگے۔ نومبر میں خاص طور پر عید ملن پارٹی (اپنی کمی خود کو ہی بہت محسوس ہوئی) تصاویر اور عظمیٰ کا انداز تحریر غضب ڈھا گیا۔ ویل ڈن اور اب کرتے ہیں ماہِ دسمبر کے شمارے پر تبصرہ...... سب سے پہلے تو تمام بہنوں کو ان کی ہر طرح کی خوشی پہ بہت، بہت مبارک باد اور دکھ اور غم میں برابر کی شریک ہوں اور ان کے لیے دعاگو ہوں۔ سب سے پہلے یادوں کی مالا کی تو جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے دوسرے قیصرہ حیات کی آخری امید تو خصوصی تعریف کے قابل ہے۔ یقین کریں کئی جگہ پڑھتے پڑھتے خود بخود دل بھر آیا۔ آنکھیں چھلک پڑیں اور اپنے آپ سے خود ہی سوال کرنے کو دل چاہا کہ کیا ہم واقعی مسلمان ہیں...... بہت خوب قیصرہ...... خوب ترجمانی کی ہے صرف مسلمان اور سچے حقیقی مسلمان کی...... شیریں حیدر کا زندگی خاک نہ تھی، شروع سے آخر تک بہت بہت پسند آیا۔ انجام بھی بالکل ٹھیک لگا۔ غرض کہیں کوئی ابہام یا تشنگی محسوس نہیں ہوئی۔ میری جانب سے اتنی بہترین تحریر پر مبارک باد پہنچا دیجیے گا...... (جی ضرور) اے عمرِ رواں آہستہ چل...... عاشفہ مسعود کا ہلکا پھلکا افسانہ بہت اچھا لگا۔ اس کے علاوہ وہی ہوتا ہے جو معذور، نورِ دیارِ دل، ہم روح سفر ہیں، وہ کون تھی اور فرحین اظفر کا جرمِ الفت کے اسیر بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ ربیعہ اکرم کا انٹرویو اور نیلم احمد بشیر کا افسانہ بھی بہت پسند آیا۔ اور مستقل سلسلے تو اچھے ہی ہوتے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ مسکان مبارک، نوشہرہ کینٹ سے۔ ''پیاری نانو جان آپ کیسی ہیں، میں آپ کو نانو کہہ کر ہی مخاطب کرسکتی ہوں۔ میرا نام مسکان مبارک ہے میری طرف سے آپ کو بہت سا پیار اور دعائیں...... وہ تو خیر آپ مجھے دیں میری ایج چودہ سال ہے اور میں نازیہ نزی کی بیٹی ہوں جو عظمیٰ آنٹی کی ہم عمر ہیں۔ اب بتائیں کیا میں آپ کو نانو کہہ سکتی ہوں؟ (جی ضرور) ماما، نازیہ نزی کو تو آپ پہچان ہی چکی ہوں گی جن کی چیزیں آپ نے پاکیزہ میں شائع کی تھیں۔ ان کی ایک تحریر انعام یافتہ بھی قرار پائی ہے۔ مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے اس سے میری اردو بہت امپروو ہوئی ہے۔'' (گڑیا پاکیزہ پڑھنے والیاں بارہ سال سے شروع ہوجاتی ہے اور آگے عمروں کی کوئی قید نہیں......

٭ ارم کمال فیصل آباد سے۔ ''ٹائٹل موسم کی مناسبت سے تھا مگر پاکیزہ کا ٹائٹل دوپٹے کے بغیر جچتا نہیں کیا خیال ہے؟ اداریے نے زبان گنگ کردی اور دماغ کے روزن کھول دیے۔ یادوں کی مالا ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی ایمان افروز داستان جس کا ایک، ایک حرف نور کا ہالہ ہے۔ ایمان افروز روشنی سے لبریز اس یادوں کی مالا کی شعاعیں دل کو اندر سے معطر اور شفاف کردیتی ہیں۔ بقیہ حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ سلسلے وار ناول اعتبارِ وفا خوب اچھا جارہا ہے جبکہ آخری امید خوب سے خوب تر جارہا ہے۔ زندگی خاک نہ تھی، شیریں حیدر کی شاہکار تحریروں میں سے ایک تھی۔ دیگر کہانیوں میں معذور، کھوئے کھوئے لمحے، اے عمرِ رواں آہستہ چل خاصے کی تحریریں رہیں۔ شمارے کی سب سے جاندار اور شاندار تحریریں نبھایا ہے محبت سے، سکینہ فرخ کے قلم سے رہی ویسے مردوں کی یہ کیٹیگری تقریباً نایاب ہے عامر کو ماورا کو وہیں نہیں لے کر جانا چاہیے تھا بھی بات بنے گی ورنہ......؟ باتیں بہاروخزاں کی...... میں پروین افضل شاہین اور کوثر خالد کے خیالات پسند آئے۔ تمام مستقل سلسلے اے ون رہے۔ بہنوں کی محفل میں جا کر جو دل کو مسرت اور خوشی کا اچھوتا احساس ملتا ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں اس کا سارا کریڈٹ ہماری پیاری انجم آپی کو جاتا ہے۔ میری طرف سے پاکیزہ کے تمام اسٹاف کو تمام قارئین بہنوں کو اور خصوصاً انجم آپی کو نئے سال کی بہت بہت مبارک ہو۔'' (تبصرے اور پُرمحبت دعاؤں کا بہت بہت شکریہ)

٭ سنبل ملک اعوان، شاہدرہ سے۔ ”میری طرف سے ان سردیوں کی طرف سے ڈھیروں سلام اور خشک میوہ جات خرید کر رکھ لیں میرا مطلب ہے کہ بجٹ میں شامل کرلیں کہ خشک میوہ جات بھی خریدنے ہیں۔ (بہت شکریہ مگر میں کولیسٹرول کی وجہ سے خشک میوہ جات نہیں کھاتی) مجھے پاکیزہ اس مرتبہ تھوڑا لیٹ ملا اس لیے تبصرہ بھی لیٹ ہی لکھ رہی ہوں مگر امید ہے کہ شامل ضرور ہوگا۔ (امید پر دنیا قائم ہے) میں نے پورا ڈائجسٹ ایک ہی مرتبہ پڑھنے کی کوشش کی مگر جاب اور پھر کلینک کی مصروفیت کی وجہ سے ایک ہی نشست میں پڑھنا ممکن ہی نہیں ہوسکا اور دوسری بات یہ ہے کہ ناول اتنے اچھے ہیں کہ رات کی تنہائی میں ہی پڑھنے میں مزہ دیتے ہیں ویسے بھی پاکیزہ تو میری سہیلی ہے۔ میں اپنے اردگرد دیکھتی ہوں، لوگوں سے سنتی ہوں کہ فلاں کو دکھ تھا اس نے فلاں سے دوستی کی، نشے کی لت میں پڑ کر اپنے آپ کو مختلف قسم کی ادویات کا عادی کرلیتے ہیں۔ جبکہ مجھے بھی ٹینشن ہوتی ہے۔ گھر میں بھی اختلافات ہوجاتے ہیں مگر میں الحمدللہ ایسی کسی خرافات میں پڑنے کے بجائے صرف مطالعہ کرتی ہوں جس کی وجہ سے میں گھر بیٹھے ہی حالات جان لیتی ہوں اور دینی دنیاوی معلومات مل جاتی ہیں تو میں جب بھی پریشان ہوتی ہوں تو سب سے پہلے تو میں باوضو ہوکر نمازِ نوافل ادا کرتی ہوں اور جب مجھے نیند نہیں آتی تو پڑھتے ہوئے پاکیزہ دوبارہ پڑھتی ہوں کہانیوں کی جنت میں ڈوب کر مجھے اپنے غم اور دکھ بھول جاتے ہیں اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ میں شکرگزار ہوں آنٹی انجم انصار کی آنٹی عذرا رسول صاحبہ کی اور پورے اسٹاف کی جن کی انتھک محنت اور لگن ہم کو سیدھی راہ دکھانے کا باعث بن رہی ہے۔“ (سنبل تم خود بھی بہت پیاری اور بہت اچھی سی لڑکی ہو اس لیے اچھی اچھی باتیں سیکھنے کی بھی شوقین ہو)

٭ ناہید حیات، ملتان سے۔ ”پچھلے کچھ عرصے سے پاکیزہ زیرِ مطالعہ ہے ملتا تو کافی لیٹ ہے پر خیر...... پاکیزہ کا اپنا علیحدہ اسٹائل ہے جو اسے دوسرے رسالوں سے منفرد بناتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی بات رائٹرز، قارئین اور ادارے کا آپس میں اپنائیت بھرا تعلق ہے۔ یوں تو سبھی رائٹرز اچھا لکھ رہی ہیں مگر مجھے شیریں حیدر کی تحریروں کا خصوصی انتظار رہتا ہے۔ میں دوسرے رسالوں میں وقتاً فوقتاً لکھتی رہی ہوں مگر پاکیزہ کے لیے یہ (افسانہ) میری پہلی تحریر ہے امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔“ (اس محفل میں خوش آمدید آپ کا افسانہ قابلِ اشاعت ہے۔ اپنے مزید افسانے بھی ارسال کریں)

٭ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ”آپ یقیناً ان دنوں آسٹریلیا میں ہوں گی (جی ہاں) میرا موبائل نمبر نوٹ کرلیں تاکہ آپ سے رابطے میں رہیں۔ خوب اچھے سے سفرنامے لکھنا تاکہ ہمیں بھی مزہ آئے۔ باتیں بہار و خزاں کی نیا سلسلہ شروع کرکے اچھا کیا ہمیں بھی شاملِ تفتیش کرلیں۔ (جلدی سے خوب مزیدار جوابات بھیجوناں) مختصر افسانے اچھے تھے۔ زندگی تماشا بنی تسلیم احمد بشیر نے شاید روحی بانو کے اوپر لکھا شاید نہیں بلکہ یقیناً کیونکہ آج کل سوشل میڈیا پر ان کو دکھایا جارہا ہے ویسے بہت برا ہوا ان کے ساتھ حالات اور وقت کا پتا نہیں چلتا جانے کب کیا ہو، اولاد کا دکھ انسان کو اندر سے ختم کردیتا ہے۔ نبھانا ہے محبت سے سکینہ فرخ کی پُر اثر تحریر تھی۔ بہت طریقے سے ماورا کو آئینہ دکھایا گیا۔ واقعی جتنی ایڈجسٹمنٹ میں ٹائم لگتا۔ عامر نے بڑے اچھے طریقے سے ہینڈل کیا سسرال میں رہ کر۔ عاشقہ مسعود کی اے عمرِ رواں آہستہ چل نے محظوظ کیا چالیس کے پیٹھے کے بعد خواتین کی عمر پوچھنا اور قبول کرنا واقعی مشکل امر ہے سچائی جانتے ہوئے بھی دل کو دکھی نہیں کرنا چاہتی خواتین۔ زندگی خاک نہ تھی۔ اختتام پزیر ہوا۔ دانیال کی اصلیت کھل ہی گئی۔ قیصرہ حیات نے آخری امید بہت اچھا لکھا۔ اعتبارِ وفا کی اکٹھی اقساط پڑھیں۔ بہت مزہ آیا شروع کی کچھ قسطیں مس ہوگئی تھیں لیکن اب اگلی کا شدت سے انتظار ہے نگہت سیما بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ توقیر فاطمہ، لیہ سے۔ ”پہلی مرتبہ اپنی رائے دے رہی ہوں۔ میں پاکیزہ آٹھویں جماعت سے پڑھ رہی ہوں اور اب ماشاءاللہ دو پیاری، پیاری نواسیوں کی نانی بھی ہوں...... مجھے عظمیٰ آفاق کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ مجھے ذیشان کی شادی کی تصویریں اور شادی کا احوال بہت دلچسپ لگا تھا...... میرا دل چاہتا ہے کہ عظمیٰ ہماری عذرا رسول کا ایک بے تکلف سا انٹرویو لکھیں......“ (اس محفل میں خوش آمدید...... آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے)

٭ مسز رضوی، انچولی سے۔ ”ایک مرتبہ پہلے بھی آپ کو اپنی رائے دی تھی...... عظمیٰ نے پتا نہیں اپنے کسی مضمون میں عذرا رسول کے بالوں کا ذکر کیا تھا...... کہ وہ اپنے بالوں کی چوٹی سیٹ سے اٹھا کر گاڑی سے قدم باہر نکالا کرتی تھیں...... کیا واقعی ان کے اتنے لمبے بال ہیں۔ دراصل میں اپنی بیٹی کے بال لمبے کرنا چاہتی ہوں۔“ (ہمارا تو یہ تجربہ ہے کہ جن کے بال بڑھنے والے ہوتے ہیں وہ ہر صورت میں بڑھا کرتے ہیں۔ گزشتہ ماہ مسز عاصمہ کا آزمودہ نسخہ روحانی مشوروں میں شائع کیا

ہے آپ بھی اپلائی کر کے دیکھیں...... اور رہی بات محترمہ عذرا رسول کے بالوں کی تو ان کے خوب صورت اور لمبے بالوں کی گواہی تو ہم بھی دے سکتے ہیں...... ایک مرتبہ لندن میں وہ معراج رسول صاحب کے ساتھ چہل قدمی کے لیے باہر نکلیں...... یہ ان کی شادی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ان کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور راستے میں گاڑیاں رک رک کر ان کو دیکھ رہی تھیں اور گوریاں ان سے پوچھ رہی تھیں کہ کیا یہ آپ کے اصلی بال ہیں...... وقت کے ساتھ، ساتھ اب ان کے بال پہلے جیسے تو نہیں رہے مگر پھر بھی لمبے بالوں میں آتے ہیں۔)

✉ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ ''ڈیئر انجم امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ آج میں صرف وہ آئے بزم میں کی بات کروں گی۔ باقی سلسلے، کہانیاں وغیرہ تو خیر بہت اچھی جا رہی ہیں مگر انٹرویو کے سلسلے میں آپ کا اور آپ کے ادارے اور خاص طور پر نزہت اصغر کا شکریہ کہ اتنا پیارا انٹرویو لگایا۔ سچ ہے آپ لوگ رائٹر کو بہت عزت اور اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے میرے ملنے والوں اور مداحوں کے بے شمار فون آئے کہ بہت عرصے بعد آپ کے بارے میں پڑھا اور آپ نے بہت اچھی باتیں کیں۔ اس کا کریڈٹ یقیناً باجی انجم انصار آپ کو اور نزہت اصغر کو جاتا ہے۔ عذرا رسول صاحبہ کی رہنمائی میں پاکیزہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اور انشاء اللہ کرتا رہے گا۔ (آمین) دیگر کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ لے کر پھر حاضر ہوں گی۔'' (سیما آپ کا بھی شکریہ اور یہ آپ کی محبت اور خلوص ہی ہے...... نزہت اصغر بھی شکریہ ادا کر رہی ہیں۔)

✉ مصباح رضا سعید، فیصل آباد سے۔ ''باجی ماشاء اللہ میرا بیٹا یونیورسٹی میں آ گیا ہے (دلی مبارک باد) بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی مگر پھر بھی پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بہت اچھی لگ رہی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ چلتا ہی رہے۔ (ہم یہ پوری کوشش کریں گے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک چلے) ناولوں میں مجھے شیریں حیدر کا ناول سب سے زیادہ پسند آیا تھا...... اور اب گم شدہ محبت کی منتظر ہوں۔''
(ذکیہ بلگرامی، شیریں حیدر آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہیں اور ہاں آپ کی بیٹی کی جسمانی ذہنی صحت کے لیے ہماری تمام بہنیں ضرور دعا کریں گی)

✉ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''اعتبار وفا کی سولہ اقساط ہو چکی ہیں۔ کہانی بھی خاصی واضح ہو گئی ہے۔ شیریں حیدر نے اپنے ناول کو بہت اچھی طرح انجام تک پہنچایا...... شیریں نے پانچ عورتیں اور پانچ کہانیاں بہت عمدگی سے لکھ ڈالیں...... اور نصیحت آموز بھی رہی...... مبارک باد، قیصرہ حیات کی یہ قسط بھی اچھی رہی...... شبانہ شوکت نے چوری کی نشان دہی کی ہے۔ قرۃ العین نے بھی بہت اچھا لکھا...... درثمن بلال کے ناول کی کہانی اوسط درجے کی ہے...... شہناز وسیم نے فوتگی والے گھر کی اچھی منظر نگاری کی ہے۔ فرحین اظفر کی تحریر بالکل پسند نہیں آئی، ہاں نیلم احمد بشیر نے روحی بانو کی زندگی کی کہانی بہت درد بھرے انداز میں تحریر کی ہے۔ آخری پیراگراف پڑھ کر دل دہل گیا۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ پسند آیا۔ انجم تمہارے ناول کا اشتہار تو دیکھ لیا ہے انشاء اللہ پڑھیں گے بھی ضرور...... کیونکہ میں ہی سب سے زیادہ تمہیں کہتی تھی کہ ناول لکھو ناول لکھو...... شائستہ زریں نے ربیعہ اکرم کا انٹرویو بہت اچھا لیا ہے...... ربیعہ نے بھی تمہاری بہت تعریف کی ہے۔ خوش رہو اسی طرح محبتیں سمیٹتی رہو۔ دعاؤں کی صورت اللہ پاک تمہیں آسٹریلیا ساتھ خیریت سے لے کر جائے اور واپس لائے۔ کیا صدیقی بھائی بھی تمہارے ساتھ جا رہے ہیں۔ (جی ہاں) میں بھی اپنے بچوں کے پاس کبھی لاہور اور کبھی کراچی گھومتی رہتی ہوں۔''
(تبصرے کا شکریہ، آپ کی آرا پہنچائی جا رہی ہیں)

✉ رفیعہ ابدالی، کراچی سے۔ ''بہنوں کی محفل میں ایک بہن کا تذکرہ پڑھا کہ ان کے شوہر نے ان سے کہا کہ اگر وہ یہ چائے پی گئیں تو وہ ان پر حرام ہو گئیں اور وہ بے وقوف بہن غصے میں وہ چائے پی گئیں...... تو ان پر ایک طلاق ہو گئی ہے۔ ان کو دوبارہ نکاح کرنا ہو گا۔ (رفیعہ بہن آپ نے چونکہ کسی مولانا صاحب سے پوچھا تھا اس لیے آپ کی یہ رائے شائع کر دی ہے مگر اس قسم کے مسائل کا حل تمام بہنیں دارالعلوم میں کسی مفتی کے پاس جا کر پوچھا کریں کیونکہ یہ نہایت اہم مسائل ہیں اور ان کی باریکیوں سے ہم ناواقف ہیں مذکورہ بہن کو بھی کسی مفتی کے پاس ہی جانا چاہیے۔)

✉ عکاشہ اسلم، کراچی۔ یہ بات میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ آپ کو اپنی یہ تحریریں کسی بھی پروڈکشن

ہاؤس میں بھیجنی چاہئیں تاکہ ان پر ڈراما بنایا جاسکے۔ پاکیزہ میں یہ شائع نہیں ہو سکے گا۔

ایس ایم، پنجاب۔ آپ نے جن رسائل کا نام لکھ کر ہمیں بتایا ہے کہ آپ جو بھی اور جیسا بھی لکھ دیں وہ اسی طرح من وعن شائع بھی ہو جاتا ہے پیاری بہن ایسے بہت سے رسائل موجود ہیں جن کے پاس اچھی تحریروں کا فقدان ہے ان کو جیسا اور جو بھی مل جائے وہ اسے قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں...... اور ہماری بہت سی نئی رائٹرز جو خط اچھی طرح لکھ لیتی ہیں تو وہ سمجھتی ہیں کہ وہ افسانہ بھی لکھ لیں گی تو ان کی یہ خام خیالی ہے۔ افسانہ لکھنا، ناول سے بھی زیادہ مشکل کام ہے مگر آج بھی ہماری بعض نئی رائٹرز اتنی خوب صورتی سے افسانہ لکھ رہی ہیں کہ اسے پڑھ کر بے اختیار منہ سے واہ نکلتا ہے۔

ریحانہ حسن، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ پاکیزہ ڈائجسٹ میں انٹرویو کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ جو کہ میرے ساتھ، ساتھ قاری بہنوں کو بھی ضرور پسند آیا ہوگا۔ بلاشبہ پاکیزہ ہر ماہ کی طرح اس بار بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب، یہ تحریر مجھے پسند آئی۔ افسانوں اور ناولٹ سے ہی کسی ڈائجسٹ کا معیار پتا چل جاتا ہے۔ مزید آپ کے توسط سے جو جلترنگ بجتے ہیں وہ اپنے اندر موجود پیغام کو قارئین تک بہت خوب صورت انداز میں پہنچاتے ہیں۔ آپا ایک خوش خبری بھی آپ سے شیئر کروں گی کہ انشاءاللہ میری کتاب جو کہ خوب صورت افسانوں اور منفرد ناولٹ پر مبنی ہے۔ قارئین کے لیے نئے سال کا تحفہ ثابت ہوگی۔ (ماشاءاللہ) اگر آپ اپنے دل میں جگہ دینے کے ساتھ، ساتھ پاکیزہ میں بھی اپنی دعاؤں کے ساتھ ذکر کریں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں اپنی کتاب میں دیگر قابلِ احترام لوگوں کے ساتھ آپ کی دعائیں بھی شامل کروں گی کیونکہ آپ بہرحال میری محسن ہیں جن کی وجہ سے میں پاکیزہ میں اپنی تحریروں کے ساتھ موجود ہوں۔'' (پاکیزہ میں لکھنے والی تمام بہنوں کی کاوشوں کو ہم دل وجان سے سراہتے ہیں)

ماریہ یاسر، کراچی سے۔ ''میں کافی عرصے سے آپ کا پرچہ پڑھ رہی ہوں لیکن خط لکھنے کی ہمت پہلی بار کی ہے۔ آپ کا رسالہ روز بروز بہتر سے بہترین کی راہ پر گامزن ہے۔ سارے ہی سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ساری مصنفین بہت محنت سے لکھ رہی ہیں۔ اس لیے سیدھا دل میں اترتا ہے۔ میں نے اپنی شاعری بھیجی ہے امید کرتی ہوں آپ کے معیار پر پوری اترے گی اور میری ایک گزارش ہے کہ ثمرہ بخاری سے بھی اپنے پرچے میں کچھ لکھوائیے۔'' (جی ضرور آپ کی شاعری بھی لگ جائے گی۔ اگلی مرتبہ تبصرہ ضرور بھیجنا)

سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''چھ مہینے اپنے دونوں بیٹوں کے پاس امریکا گزار کر آئی... جیسے قلم پکڑنا ہی بھول گئی مگر کسی نے سچ کہا ہے جو سکھ چوبارے نہ بلخ نہ بخارے۔ پتا نہیں لوگ اپنے وطن اور پیاروں سے دور کیسے رہ لیتے ہیں بے شک اس ملک میں کرپشن ہے، نفسا نفسی افراتفری ہے، لوٹ مار اور قتل و غارت گری ہے، گندگی کے ڈھیر ہیں مگر...... یہ میرا ملک ہے اور تمام تر خامیوں کے باوجود جان سے عزیز بھی۔ (جی بالکل) باہر جا کر اس کی قدر بھی ہوتی ہے اور اہمیت کا احساس بھی یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ سچ پوچھیں تو مئی سے دسمبر تک کے پاکیزہ میرے سامنے ہیں اور میں پریشان ہوں کہ کیا پڑھوں اور کیسے پڑھوں وقت کم مقابلہ سخت...... پھر بھی تمام رسالوں کی بہنوں کی محفل ضرور پڑھ لی۔ محترمہ رفاقت جاوید سے ملاقات بھی اچھی لگی ویسے بھی مارشل لا کی لعنت کے باوجود میرے دل میں فوجیوں کے لیے بے پناہ احترام اور محبت ہے اور پھر مریم نے شہید ہو کر ہم عورتوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔'' (بے شک)

جویریہ خان، کراچی سے۔ ''میں اور میری بہن ہم دونوں کو چند سال ہوئے ہیں پاکیزہ پڑھتے ہوئے، یہ پڑھنے کا شوق امی اور خالہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ نائنتھ کلاس میں امی سے چھپ کر ایک کہانی پڑھی اچھی لگی تو پھر خالہ سے سفارش کرائی کہ امی اب تو پڑھنے دیں۔ خالہ نے سفارش کی اور پھر امی نے کہا پہلے میں پڑھوں گی پھر پڑھ لینا ہم تو اسی میں خوش ہو گئے۔ مگر پھر وقت کے ساتھ، ساتھ اب خود سے ہی پڑھتے ہیں۔ پاکیزہ کو پڑھتے ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں۔ میں تو سارا ایک ہی دن میں پڑھ لیتی ہوں مگر اب تو وقت کم ملتا ہے مگر مل جاتا ہے اور پاکیزہ کی کہانیاں پڑھنا کوئی چھوڑ دے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ سب ہی رائٹر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ہمارا دل بہت چاہتا ہے آپ سے ملنے کو آنٹی آپ بہت سویٹ لگتی ہیں شاید کبھی مل پائیں۔ دعا ہی کر سکتے ہیں۔ (انشاءاللہ آپ سے ملاقات ضرور ہوگی) نگہت سیما کا ناول بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ ویسے دُرِ ثمن کا بھی

اچھا لگا پڑھ کر۔'' (شکریہ)

٭ تسنیم منیر علوی، دبئی سے۔ ''بھئی جلترنگ کی کیا بات ہے۔ ''دوبارہ'' بھی پڑھو تو لطف دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ عظمیٰ بیٹی کی تحریر میں ماں کا عکس بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ماشاء اللہ بہت ترقی کرے گی یہ بچی انشاء اللہ...... آپ کو سڈنی کا سفر مبارک ہو...... امید ہے جلد ویزا مل جائے گا اور ہم کو ایک عدد سفرنامہ بھی...... (ہاں آپ کی دعا سے میں پہنچ گئی ہوں۔) ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا ایک خوب صورت اور دلکش تحریر ہے جس میں انہوں نے یادوں کے موتی بڑی چابکدستی سے پروئے ہیں...... ذکیہ چاہنے والوں کی خاطر آپ وہ بھی ضرور لکھیں جو لکھنا نہیں چاہتیں کیونکہ وہ بھی ایک یادگار، شاندار اور شاہکار ہوگا...... بے شک قلم اور قرآن سے گہرا اسمبندھ ہونے کے باوجود آپ نے قرآن حکیم کے ساتھ، ساتھ قلم کی حرمت کا پاس بھی رکھا ہے کیونکہ آپ نے ایک جگہ لکھا ہے وہ سب لکھ دینا چاہتی ہوں جو میری یادوں میں مگر لکھ نہیں سکتی یا لکھنا نہیں چاہتی۔ کیوں ذکیہ ایسا کیوں......؟ خطائے نظر سے پہلے ایک بد عادت کی طرف۔ اشارہ ہے جو کہ نفسیاتی وجوہ سے ہو جاتی ہے مثلاً چوری کی عادت...... اور یہ ایک سچی کہانی ہے ابھی حال میں ایک خاتون پکڑی گئی تھیں جو ساتھ میں ایک بچے کو رکھتی تھیں، وہ چوری کا سامان بیگ میں ڈالتا جاتا تھا...... سوئی سے دھاگے تک فریدہ لا کھانی یہ تو ہر گھر کی کہانی ہے۔ کراچی میں ہم اپنی سلائی مشین اپنی ملازمہ کو دے آئے تھے یہاں اکثر یاد کرتے ہیں تو ہمارے بیٹے صاحب فرماتے ہیں امی مشین تو آپ کی ایک منٹ میں آسکتی ہے...... آپ پہلے طے تو کریں رکھیں گی کہاں......؟ اور آٹھ سال سے اب تک اس سوچ میں ہوں کہ مشین لاؤں تو رکھوں کہاں...... (بہت خوب) واہ فریدہ خوب لکھا...... تم بن کپڑوں پر اعتراض منگیتر کو ہوا۔ مگر یہ شکر ہوا کہ لڑکی کو بات سمجھ میں آگئی سو دیر تو ہوئی...... مگر بعد کو شرمندہ بھی ہوئی...... ایک ہلکی پھلکی سی کہانی تھی۔ شیریں حیدر ہماری دل پسند لکھاری جو کہا سچ کہا...... اور زندگی سے جڑے واقعات کو افسانے میں ڈھالنا شیریں کا ہی کام ہے مگر اب اتنا بھی نہ چاہو کو دم ہی نکل جائے۔ ایک بے حس بے شرم شوہر صرف اس لیے کہ شوہر نامدار ہے بچیوں کا باپ اتنا برداشت کرنا جبکہ وہ شرمندہ بھی نہیں سب آنکھوں کے سامنے...... اُف توبہ...... اتنا بھی ڈیپ نہ جایا کرو میری جان...... معذور ایک اچھی کہانی تھی حقیقی زندگی میں ہلکا سا جسمانی عیب لڑکی کا برداشت نہیں کرتے مگر مرد کے لیے کھلا تضاد...... بھئی مرد ہے، اچھا شریف ہے، کماتا ہے...... بس کوئی حرج نہیں...... اے عمر رفتہ ایک لائٹ کامیڈی افسانہ تھا۔ شمیم فضل خالق نے حقیقت سے قریب اور وقت سے زیادہ قریب افسانہ تحریر کیا۔ آج کل الیکشن، الیکشن کھیل جاری ہے...... روح سفر میں شہناز وسیم نے زندگی کی سرگزشت اچھے پیرائے میں بیان کی۔ رشتے داروں کے تبصرے بعد مرنے کے ایسے دل سوز اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ نیلم احمد بشیر جب آتی ہیں چھا جاتی ہیں زندگی تماشا بنی شوبز سے تعلق کی بڑی اندوہ ناک کہانی ہے۔ روحی بانو کی کہانی سے متاثر ہے مگر اس میں اس ظالم اور قلم کی جادوگری کا المیہ بھی پوشیدہ ہے۔ غرض نیلم تم نے کیا لکھ دیا۔ دل کو گداز کر گیا افسانے کی آخری لائن خاصے کی چیز ہے ''صوفے پر لیٹی زرد رو نیم جاں چھپکلی نما جسم کو تو وہ ''میری بات نے میرے لبوں پر ہی دم توڑ دیا...... آواز کی دنیا کا نمایاں نام ربیعہ اکرم کا انٹرویو بہت جاندار تھا ہماری خواتین کسی سے کم نہیں...... ہر قدم پہ کامران ہیں یہ...... باقی سلسلے بھی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔'' (باریک بینی سے تبصرہ کرنے کا شکریہ)

٭ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں جو کچھ آپ کے ذہن و قلم نے کہا کاش ارباب اختیار آپ کے جیسی قول و عمل اور سوچ والے ہو جائیں تو رونا کس بات کا...... پاکیزہ میں شائع ہونے والے کالم اپنی مثال آپ ہیں، کس کس کی تعریف کی جائے...... ہر انچارج نے اپنا اپنا شعبہ احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔ افسانے کہانیاں لاجواب، بہنوں کی محفل میں قارئین کے پُرزور تبصرے، شاندار...... ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کا ایک، ایک موتی بے حد قیمتی اور انمول ہے۔ عظمیٰ آفاق سعید کا کیا خیال ہے، اچھا لگا۔ نیلم احمد بشیر نے روحی بانو کی زندگی کو زندگی تماشا بنی میں اجاگر کیا۔ معاشرے کے چند کردار میری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایک تو کاغذ، کچرا چننے والے بچے دوسرے درزیوں (آج کل کے ٹیلرز) کے ہاں دکان میں کام کرنے والے وہ نوجوان کاریگر جو اوپر چھجے پر دوزانو بیٹھ کر سارا دن سلائی کرتے ہیں۔ وہ صرف بیٹھ سکتے ہیں کھڑے نہیں ہو سکتے...... میں اکثر ان کی بیٹھنے والی پوزیشن کے بارے میں غور کرتی ہوں کہ ہم اس حالت میں اتنی اتنی دیر بھی نہ بیٹھ سکیں۔ جبکہ ہم لباس کی سلائی کروا کے اس میں سو سو عیب نکالتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں...... یہ تنگ سلا یہ یوں سلا...... کوئی

لکھاری بہن بیٹی ان پر بھی لکھ پائے گی؟ (اچھا موضوع دیا) شمیم فضل خالق کی کہانی اچھی گی...... یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے دو دن آپ کی میزبانی کے مزے اڑا کر آپ کی کہانی کی تعریف کی...... (ارے ہمیں بھی معلوم ہے شمیم کی مہمان نوازی کا) جلترنگ، پاکیزہ ڈائری، بہنوں کی محفل روحانی مشورے میرے پسندیدہ کالم ہیں۔ آپ کے سلسلے وار ناول کا انتظار ہے۔ افسانے اور ناول پسند آئے گو کہ کہانی کا سلسلہ اگلے مہینے تک برقرار رکھنا، یاد رکھنا قدرے مشکل لگتا ہے مگر پھر سے تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

یہ سال ہم سب کے لیے خوشیوں، برکتوں، رحمتوں والا ہو اور اللہ تعالیٰ کی خاص نظر رہے۔ (آمین) ہم اللہ کے بڑے ناشکرے بندے ہیں، ہمیں اپنا شکر گزار بندہ بنائے۔ ہمیں انسانوں، انسانیت سے محبت ہو اور ایسے لوگ اقتدار میں آئیں جو صحیح معنوں میں اس ملک کو فلاحی مملکت بنائیں، آمین۔

ثمینہ طاہر بٹ، شاد باغ لاہور سے۔ ”آپا! آپ کو پاکیزہ کے تمام اسٹاف، سب قارئین اور معزز مصنفین کو میری طرف سے پیار بھرا اسلام اور ڈھیر ساری دلی دعائیں کہ اللہ رب العزت اس نئے سال کو ہم سب کے لیے مبارک اور سعد بنائے آمین۔ ہمارے پیارے پاکستان کو صحیح معنوں میں امن و آشتی کا گہوارہ بنا دے۔ اب آتی ہوں سالِ نو کے پاکیزہ کی طرف جس کا سرورق ہمیشہ کی طرح اعلیٰ رہا۔ مجھے کچھ کہنا ہے، میں انجم آپا کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل کو چھو لینے والی تھیں۔ بہت عمدہ اور حسبِ حال، واقعی آپا آپ نے بالکل ٹھیک کہا اگر ہم اپنے غصے پر قابو پانا سیکھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے اردگرد کا ماحول یکسر تبدیل ہو جائے۔ حسبِ معمول دین کی باتوں سے اپنے قلب و روح کو منور کیا، ماشاء اللہ، بہت اچھا لگا جزاک اللہ خیر...... آپا ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی یادوں کی مالا میں ایسے، ایسے زبردست موتی لڑی وار پروئے ہوئے ہیں کہ بے ساختہ دل سے سبحان اللہ نکلتا ہے۔ اس بار پاکیزہ کے صفحات پر ایک نہ دو پورے تیرہ افسانے اپنی چھب دکھا رہے تھے، سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کا تقدیر سامنے آیا۔ ان کے نام کی طرح ان کا کام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں...... ناہید صاحبہ کو اتنا عمدہ افسانہ لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد...... نظیر فاطمہ نے بہت بے نظیر انداز میں ایک عمدہ تحریر ہمیں پڑھنے کو دی۔ جیو تو ایسے صحیح کہا نظیر فاطمہ نے کہ واقعی اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرمان کے مطابق لوگوں کے ساتھ اس طرح رہو کہ جب تک تم زندہ ہو، وہ تمہاری تمنا کریں اور جب تم مرجاؤ تو وہ تم پر روئیں۔ اگر ہم اپنے عام روزمرہ کے معمولات میں بھی اس قول کو یاد رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے معاشرے میں پھیلا انتشار اور افراتفری کسی حد تک کم ہو جائے۔ ندا حسنین کا میں زیرِ بار تیرا...... مرد کی ازلی بے وفائی اور عورت کے صبر اور عظمت کی داستان...... تابندہ نعیم، کھوئے کھوئے لمحے کے ساتھ محفل میں شریک ہوئیں۔ کہانی بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مصنفہ کی گرفت ہر کردار، ہر واقعے پر کافی مضبوط نظر آرہی ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ...... ہاجرہ ریحان کی بدلہ، میں خیر اور شر کے تصور کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنی مختصری تحریر میں ان تمام جذبوں اور احساسات کو بڑی خوب صورتی سے سمو دیا۔ سعدیہ عزیز آفریدی کا لکھنے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے، وہ جب بھی لکھتی ہیں جہاں بھی لکھتی ہیں اپنی ایک خاص پہچان چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک ایسی ہی تحریر رہی۔ سعدیہ کی یہ تحریر پڑھ کر جانے کیوں ممتاز مفتی صاحب کی علی پور کا ایلی اور الکھ نگری کے کئی کردار بے ساختہ نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اوور آل بوجھ سعدیہ کی لاتعداد تحریروں میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوئی۔ جزاک اللہ نزہت جبیں ضیا سالِ نو کے حوالے سے نیا سورج لے کر آئیں اور ہمیشہ کی طرح ان کی آمد اچھی لگی۔ نورعین کی جسٹ فار انجوائے منٹ دل کو ہلا دینے والی تحریر۔ واقعی ہم لوگ بعض اوقات ایسی، ایسی باتوں کو جسٹ فار انجوائے منٹ کہہ کر اگنور کر دیتے ہیں کہ اگر تہ میں جا کر ٹھنڈے دل سے ان پر غور کریں تو پھر وہ کبھی نہ ہو جو آفرین کے ساتھ ہوا۔ اب بات کروں گی۔ شبینہ گل کی جگر ہو جائے گا چھلنی کی اُف ... شبینہ گل صاحبہ، آپ کی تحریر نے کیا کچھ یاد نہیں کروا دیا۔ سچ ہے ایسے ماحول اور ایسے حالات میں جگر چھلنی بھی ہوتا ہے، روح میں شگاف بھی پڑتے ہیں اور دل...... دل بیچارہ تو اپنے مقام پر رہتا ہی نہیں...... مگر یہ اللہ کا دیا ہوا حوصلہ ہی ہوتا ہے کہ ہم جیسے معمولی بندے اس کے فضل و کرم سے ہی ان آزمائشوں ان امتحانوں سے سرخرو ہو کر نکل آتے ہیں۔ شبینہ گل کی اس تحریر نے میری نگاہوں کے سامنے میرے ہی ماضی کے کئی ادوار لا کھڑے کیے۔ سمیرا یونس ہارون صاحبہ نے اپنی تحریر ہم لوگ میں لوگوں کی مجموعی عادات اور خیالات کو عمدگی سے پیش کیا۔ سچ ہے بھئی دوسرے کی آنکھ کا تو تنکا بھی ہمیں بہت کھٹکتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہما بیگ کا گھر تو آخر اپنا ہے،

ایک بہت ہی حساس موضوع پر لکھی جانے والی خوب صورت تحریر، ہما بیگ صاحبہ نے اپنی مختصری تحریر میں بہت اچھا پیغام دیا ہے۔ ام ثمامہ کی بانجھ کمہارن بھی حساس موضوع پر لکھی جانے والی ایک حساس تحریر، محبت میں اگر اعتبار اور اعتماد نہ ہو تو پھر وہ محبت، محبت نہیں رہتی۔ غرض بن جاتی ہے۔ ناہید فاطمہ حسنین کی ناکردہ بھی اچھی کاوش تھی۔ سچ ہے بعض اوقات انسان کو کسی ناکردہ گناہ کی سزا اس طرح ملتی ہے کہ پھر اس کی ساری زندگی ہی گناہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ناہید فاطمہ حسنین نے بہت حساس موضوع پر قلم اٹھایا۔ سیما بنت عاصم کی منجدھار ایک معاشرتی موضوع پر لکھی گئی معاشرتی تحریر...... سچ ہے، جن کی مائیں زندہ ہوں، وہ کبھی یتیم نہیں ہوتے۔ نایاب جیلانی خوب صورت لفظوں سے نایاب اور حسین کہانیاں تخلیق کرنے والی مایہ ناز مصنفہ، اپنے خاص انداز میں پاکیزہ کے صفحات پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ دیارِ صبح کے اجالوں میں یقیناً ان کی بہترین کاوش ثابت ہوگی۔ قیصرہ حیات کے ناول آخری امید کی آخری قسط بھی اچھی رہی۔ جزاک اللہ وہ آئے بزم میں اس بار ہماری ملاقات معروف مصنفہ سیما یاسمین مجتبیٰ صاحبہ سے رہی۔ اور بہت عمدہ اور اعلیٰ بھی ماشاء اللہ ان کی تحریروں سے جو عکس ان کا ذہن کے پردوں پر بنتا تھا وہ اس پر بالکل فٹ بیٹھیں۔ مجھے سیما صاحبہ کی باتیں پڑھ کر ان کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ اللہ انہیں ہر قدم پر کامیابیوں سے نوازے اور وہ ہمیشہ خوش رہیں، آمین۔ پاکیزہ کی شمع ہدایت حقیقت میں ہم سب کے لیے ہدایت کی روشن شمع کے مانند ہے۔ اڑنے کا ہنر جانتی ہوں۔ شائستہ زریں صاحبہ کا ایک بہت خوب صورت سلسلہ جس میں ایسی باہمت اور ہنر مند خواتین سے ملوایا گیا کہ جن کے بارے میں جان کر واقعی بہت انسپریشن ملتی ہے۔ شادی مبارک میں کمیرا حمیدہ فاروق اپنی لاڈلی بیٹی سعدیہ فاروق کی شادی کا احوال لے کر آئیں، بہت اچھا لگا، اللہ پاک سعدیہ کو اپنے گھر کی خوشیاں دیکھنی نصیب کرے اور ان تمام بہنوں، بیٹیوں کے نصیب بھی کھولے جن کے گھر والے ان کی شادیوں کے لیے پریشان ہیں، آمین۔ پاکیزہ کے باقی تمام سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح بہت شاندار اور جاندار رہے۔ رابعہ فیاض قادری اپنی حاضری کی روداد کے ہمراہ تشریف لائیں۔ اللہ پاک ان کی حاضری قبول فرمائے۔" (بہت طویل تبصرے کا شکریہ...... جگہ کی کمی کے باعث خاص خاص باتیں ہی لگا پائے ہیں تاکہ سب بہنوں کو موقع مل سکے۔ بہت شکریہ آئندہ بھی لکھتی رہیے گا۔)

نوٹ:

(پیاری بہنو! پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا مع فون نمبرز اسی محفل کے آخر میں بھی لکھا ہے اور رسالے میں درج فہرست کے صفحے پر بھی تحریر ہے۔)

اور اب آئیے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ یا رحمٰن یا کریم...... میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما...... اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا...... اور ہر گناہ ہر غلطی...... اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا...... اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظروں میں بڑا بنا دینا...... اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرم کرنے والا ہے...... اور تیری ثنا سب سے بڑی اور تیری پناہ عزت والی ہے...... اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا اور ہمیشہ، ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم، کرم اور فضل کرنا اور ازل سے ابد تک سب کو معاف کرنا کہ...... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

نعتِ رسول مقبول ﷺ

اے رحمت للعالمین کیسے کہوں کیا دل میں ہے
آپ سب کچھ جانتے ہیں کیا کہوں جو دل میں ہے
عشق کہتے ہیں کسے کوئی نہ سمجھا آج تک
میں جو بھی کچھ نہ سمجھی کیا کہوں جو دل میں ہے
یہ وہ رستہ ہے کہ جس پر بھاگتا ہے آدمی
پاؤں میں پڑتے ہیں چھالے پھر بھی وہ تھکتا نہیں
دردِ دل ملتا ہے اس کو عشق کے پتواریں
روح میں جلتی ہے شمع کیا کہوں جو دل ہی ہے
عشق تو بس نور ہے اور نور ہی ہے زندگی
زندگی ہے بندگی کیسے کہوں کیا دل میں ہے
عشق خالص عشق سچا بے ریا اور بے غرض
پُرسکوں دل عشق میں کیا کیا کہوں کیا دل میں ہے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

شان نرالی

گنبدِ خضریٰ ،سنہری وہ جالی
روضۂ نبیؐ کی ہے شان نرالی
پہنچوں وہاں بن کے میں بھی سوالی
رہتی نہیں ہرگز جہاں جھولی خالی
شفقت و رحمت میں نہ ان کا ثانی
نبیوں میں میرے نبیؐ سب سے عالی
جس پر نبیؐ نے نظر ایک ڈالی
دنوں جہاں میں فلاح اس نے پالی
میں بھی کروں انؐ کی مدح سرائی
جنؐ کے لیے رب نے دنیا بنائی

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

تہمت

☆حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا...... "کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت نہ لگائے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو تو یہ تہمت (اسی لگانے والے) کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔" (بخاری)

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

انمول دعائیں

رابعہ بصریؒ کی تہجد کے وقت کی دو انمول دعائیں......

1۔ اے اللہ رات آگئی تارے چمک چکے، دنیا کے بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کر لیے...... اے اللہ تیرا دروازہ اب بھی کھلا ہے، میں تیرے در پر "مغفرت" کا سوال کرتی ہوں۔

2۔ اے اللہ جس طرح تو نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے۔ اسی طرح مجھ پر شیطان کو مسلط ہونے سے بچا۔

مرسلہ: ابینہ عندلیب، سلانوالی

حضرت علیؓ کے خوب صورت اقوال

☆زندگی میں خود کو کبھی کسی انسان کا عادی مت بنانا کیونکہ انسان بہت خود غرض ہے جب آپ کو پسند کرتا ہے تو آپ کی برائی بھول جاتا ہے اور جب آپ سے نفرت کرتا ہے تو آپ کی اچھائی بھول جاتا ہے۔

☆انسان کی غلطیاں اسے وہ درس دیتی ہیں جو اسے کسی درس گاہ سے نہیں ملتا۔

☆صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی گرنے نہیں دیتی نہ کسی کے قدموں میں نہ کسی کی نظروں میں۔

☆جس کا رابطہ اللہ کے ساتھ ہو وہ کبھی ناکام

نہیں ہوتا...... ناکام وہ ہوتا ہے جس کی امیدیں دنیا والوں سے وابستہ ہوں۔

☆ دولت مٹی کی طرح ہے اور مٹی پاؤں کے نیچے رہنی چاہیے اگر سر پر چڑھاؤ گے تو قبر بن جائے گی اور قبریں زندہ انسانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مرسلہ: اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

محبت کا سفر

محبت کے سفر میں کوئی بھی رستہ نہیں دیتا
زمیں واقف نہیں بنتی فلک سایہ نہیں دیتا
خوشی اور دکھ کے موسم سب کے اپنے، اپنے ہوتے ہیں
کسی کو اپنے حصے کا کوئی لمحہ نہیں دیتا

مرسلہ: بنت اصغر حسین، کراچی

نیا سال مبارک

محبت

نئی طرح سے نبھانے کی دل نے ٹھانی ہے
وگرنہ اس سے محبت بہت پرانی ہے
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میں کسی سے سنوں
کہ تو نے بھی غمِ دنیا سے ہار مانی ہے
زمیں پہ رہ کے ستارے شکار کرتے ہیں
مزاجِ اہلِ محبت کا آسمانی ہے

شاعر: محسن نقوی

مرسلہ: صبا نور، لیہ

توقع

اپنے، ہم سفر سے اپنے جیسا ہونے کی توقع مت کرو کیونکہ تم کسی کا سیدھا ہاتھ اپنے سیدھے ہاتھ میں پکڑ کر نہیں چل سکتے۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

تعلیم

تعلیم جس کے اندر داخل ہوتی ہے، وہ سادگی اختیار کرتا ہے اور جس کے اوپر سے گزر جاتی ہے وہ ماڈرن بن جاتا ہے۔

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

دعویٰ محبت

محبت کو برا مت کہو
کہ خود خدا بھی
محبت کا دعویدار ہے
اور دیکھو
اپنے محبوب کی خاطر
یہ دنیا بھی بنا ڈالی
اور اے دوست
تمہیں بھی تو دعویٰ محبت
بہت تھا مجھ سے
مگر یہ کیا
تم نے تو میری دنیا ہی
مٹا ڈالی

از: گلشاد نذیر، مری

محبت یاد رکھوں گی

تمہارے ہجر کے موسم گوارا ہیں
تمہارے ہجر میں دنیا بھلا دوں گی
تمہارے پیار کی گہری اذیت
یاد رکھوں گی
میں سب کچھ بھول جاؤں گی
محبت یاد رکھوں گی

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

غزل

کسی بھی چیز کی گر حسرت کرنا
بس تقدیر کے مقابل جسارت کرنا
وہ قریب آئے تو تنہائی نے جانا
تڑپ بھی احساس کی صورت کرنا
اب کے کرنا تو فاصلے اور قربت کو
لذتِ پیار سے عبارت کرنا
وہ نصاب آئے کہ بچے سیکھیں
اپنے اجداد کی عزت کرنا
معتبر دھوپ ہے کہ سایہ ہے

اس فرق نے سکھایا محبت کرنا

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح

مرسلہ: ماہا بلوچ...... میر پور خاص

وعدۂ محبت

محبت کا حسین وعدہ
بس اِک پل میں ہی ٹوٹا
وفا کی خوشنما تتلی
جو اپنے ہاتھ سے مسلی
یقیں کے سرسبز موسم
خزاؤں کی طرح بے دم
بتاؤں کس کو میں یارب
بھرم کا قفل ہے لب پر

شاعرہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

غزل

محبت میں مسافت کی نزاکت مار دیتی ہے
یہاں پر ایک ساتھ کی ہمت مار دیتی ہے
غلط ہے یہ گماں تیرا کہ تجھ پر کوئی فدا نہ ہو
کسی پر کون مرتا ہے ضرورت مار دیتی ہے
میں حق پہ ہوں مگر میری گواہی کون دیتا ہے
کہ دنیا کی عدالت میں صداقت مار دیتی ہے
سرِ محفل جو بولوں تو زمانے کو کھٹکتا ہوں
رہوں میں چپ تو اندر کی بغاوت مار دیتی ہے
کسی کی بے نیازی پر زمانہ جان دیتا ہے
کسی کو چاہے جانے کی یہ حسرت مار دیتی ہے
زمانے سے الجھنا بھی نہیں اچھا مگر غالب
یہاں حد سے زیادہ بھی شرافت مار دیتی ہے

مرسلہ: مہوش جواد، چوک اعظم لیہ

اِک دوست کے نام

تو نے وفا کی خاص کوئی گفتگو نہ کی
اور میں نے بھی دل کی بات تیرے روبرو نہ کی
تو بھی تمام عمر ڈھونڈتا رہا مجھے
میں نے بھی تیرے بعد کوئی جستجو نہ کی

مرسلہ: طیبہ لاہور

غزل

وہ میری جان لیتے ہیں مگر آہستہ، آہستہ
کچھ ایسا بول دیتے ہیں مگر آہستہ، آہستہ
اندھیری رات میں اکثر میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں
کہ کب ہوگی نصیبوں کی سحر آہستہ، آہستہ
نگاہیں ہیں ابھی تک منتظر بھٹکے مسافر کی
دبے پاؤں چلا آئے مگر آہستہ، آہستہ
خلاؤں میں، میں اکثر ڈھونڈتی ہوں جن کو
مرے خوابوں میں آتے ہیں مگر آہستہ، آہستہ
یہ ضربوں کی تپش ہے یا ارادہ ان کا بدلا ہے
رکھیں وہ دل کے آنگن میں قدم آہستہ، آہستہ
پسِ چلمن وہی محفل وہی ہم جولیاں ان کی
سنائی دیں مجھے سرگوشیاں آہستہ، آہستہ

شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

نظم

محبت کیا ہے
سمجھو تو احساس
دیکھو تو رشتہ
کہو تو لفظ
چاہو تو زندگی
کرلو تو عبادت
نبھالو تو بندگی
ٹوٹ جائے تو مقدر
چھوٹ پائے تو زوال
ہار جائے تو نفرت
چھولو تو خواب
سوچو تو خوشی
پالو تو جنت
نہ مل سکے تو قسمت

یہ ہے
محبت

از: مہرین ضیا بخش، کراچی



جلترنگ

انجم انصار

سرخرو

میں ایک پڑھی لکھی خاتون ہوں، ماشاءاللہ پانچ بچوں کی ماں ہوں، اسکول میں جاب اس وجہ سے کرتی ہوں کہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے کے باعث جو ذہنی طور پر بیمار ہوجاتی ہوں کچھ دیر اسکول جاکر فریش ہوجاتی ہوں۔ یوں بھی بہت سے ایسے کام ہوتے ہیں جو گھر میں سکون سے ہو ہی نہیں سکتے۔ لاکھ میں کتنی ہی کوشش کرلوں کہ گھر میں بیٹھ کر اپنے پانچوں بچوں کے سوئٹر بنالوں، کبھی بنا ہی نہیں سکتی، خیر سے اسکول جانے کے طفیل نہ صرف پانچوں بچوں کے سوئٹر بہ آسانی بُن لیتی ہوں بلکہ خاندان میں کسی بھی پیدا ہونے والے بچوں کو اون کا سیٹ ہمیشہ تحفے میں دیتی ہوں۔

کروشیے کی بیلیں تو کیا کروشیے کی صوفے کی بیک شیٹ تک بنالیتی ہوں۔ ساڑیوں پر فال، دوپٹوں پر ٹکائی اسکول کے اسٹاف رومز میں بیٹھ کر تو کی جاتی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میں کوئی ایسی ٹیچر ہوں جو بچوں کو پڑھانے میں دلچسپی نہیں لیتی۔ اللہ نہ کرے میرا شمار ایسی ناکارہ ٹیچرز میں ہو۔ میں تو اپنی مانیٹرز کو پورا ٹرینڈ کرتی ہوں، وہ نہ صرف کلاس میں جاکر حاضری لیتی ہیں بلکہ جو میں کہوں وہ پورا کام کرواتی ہیں۔ مانیٹر کی کاپی میں خود چیک کرتی ہوں پھر وہ ماشاءاللہ تمام بچوں کی کاپیاں چیک کرلیتی ہیں۔ میری سیکنڈ مانیٹر تو اتنی ذہین ہے کہ وہ میرے دستخط تک کرلیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خواتین جو سروس کرتی ہیں وہ اپنی تنخواہ ساری کی ساری اپنے اوپر لٹالیتی ہیں۔ اب لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو میں کیا کرسکتی ہوں کہ میں تو ایسا ہرگز نہیں کرتی...... دس پندرہ جوڑے اگر کپڑے بنالیتی ہوں تو وہ کتنے دن چلتے ہیں، میک اپ کرنے کا تو مجھے شوق ہی نہیں ہے بس تھوڑی سی لپ اسٹک، بلش آن، پاؤڈر، آئی لائنر اور مسکارے کے سوا کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی ورنہ خواتین کیسی، کیسی اپنے چہرے پر لیپا پوتی کرتی ہیں کہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔

پیسہ جمع کرنے کا تو مجھے ہمیشہ سے شوق ہے، اپنی پوری تنخواہ تو میں اسکول میں ہی کمیٹی میں جمع کرتی ہوں تاکہ میکے کی تقاریب میں سرخرو ہوسکوں۔ اور شوہر کے دل و دماغ میں یہ بات ڈال سکوں کہ میں اپنے سسرائیل سے محبت کرتی ہوں۔ ہونہہ......

محتاط

رشید بھائی حیدرآباد میں تو مکان میں رہتے تھے مگر جب روزگار کی تلاش میں کراچی آئے تو ایک ایسے فلیٹ میں مقیم ہوئے جو علاقہ فلیٹوں کا شہر کہلاتا تھا۔ ایک پڑوس میں سالن چڑھتا اور دوسرے پڑوس میں اس کی خوشبو پھیل جاتی۔ تب اسے کھانے کو دل مچل جاتا۔ سامنے والے اپنی بیگم کو لتاڑتے، پاس پڑوس کی بیویاں سہم جاتیں اور ان آوازوں میں پہچان کرنا مشکل ہوجاتا۔ رشید بھائی کو فلیٹ میں رہنا اچھا لگا۔ عجیب اپنائیت بھرا ماحول تھا۔ ہر شے، ہر چیز اپنی، اپنی سی لگتی۔ موسم گرما شروع ہوا تو بجلی کی لوڈ شیڈنگ شروع ہوگئی تب ساری بالکونیاں بج گئیں۔ رشید بھائی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو دیکھیں اور کس کو نہ دیکھیں۔ گلابی پردوں والی رضیہ کی آواز ایسی موہنی تھی کہ جب وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی باتیں کرتی تو ان کا دل چاہتا کہ وہ بولتی رہے اور وہ سنتے رہیں۔ ناصرہ کے بال بہت لمبے تھے، وہ جھک کر اپنے نیچے مالے میں رہنے والی سہیلی سے باتیں کرتی تو اس سے زیادہ اس کے بال نیچے جھک آتے اور وہ تصور ہی تصور میں اسے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی پر لپیٹا کرتے اور خوب محظوظ ہوتے۔ خالدہ کی ادائیں بڑی قیامت خیز تھیں۔ وہ بالکونی میں کھڑے ہوکر اپنے آپ کو

اس انداز سے پنکھا جھلا کرتی جیسے کباب والے اپنی انگیٹھی پر جھلتے ہیں۔ تب رشید بھائی کباب کی سیخوں کی طرح پلٹتے رہتے۔ ہاں پینو سب میں مختلف تھی۔ اس کی بالکونی رشید بھائی کی بالکونی کے عین سامنے تھی۔ بجلی کے جاتے ہی خوب میک اپ کر کے اپنی بالکونی میں آجاتی اور یوں پوز بنا کر کھڑی ہو جاتی جیسے سب سے بے نیاز کھڑی ہے اور اس کی نظر کسی پر نہیں ہے۔ بجلی کی یہ آنکھ مچولی ساری رات ہی چلتی تو پینو بھی رات بھر اپنی بالکونی میں کھڑی رہتی۔ کبھی اسٹول پر بیٹھ کر اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں یوں سجالیتی کہ رشید بھائی کو وہ گلاب سا لگا کرتا۔ رشید بھائی کے سارے ووٹ اب پینو کی جانب چلے گئے تھے۔ لہراتی، بل کھاتی یہ لڑکی انہیں دل و جان سے پسند آگئی تھی۔ وہ یہ دعائیں مانگا کرتے کہ موسم گرما بھی ختم نہ ہوا اور نہ محکمہ کبھی راستی پر آئے۔ اب نہ انہیں گرمی لگتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی پریشانی ہوتی تھی۔ اپنا کھانا، چائے، پانی وہ سب بالکونی میں ہی اٹھا لاتے تھے حالانکہ پینو کے بغیر کھاتے ہوئے ان کے حلق میں اٹکتا تھا مگر مجبوری تھی کہ ان کی محبت نے زندہ باد کہہ کر اپنا قدم پینو کی بالکونی تک ہی بڑھایا تھا۔ پینو نے بھی ان کی دلچسپی محسوس کر لی تھی مگر وہ ہمیشہ بے نیاز ۔۔ سی کھڑی رہتی۔ رشید بھائی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ بھی دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھا کرتی ہے۔ انہیں چھینک آتی ہے تو ان کے الحمدللہ کہنے سے پہلے وہ زیرِ لب یارحمک اللہ تک کہہ دیتی ہے مگر پہل کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ لائٹ آجاتی تو ان کا وقت بڑی بے چینی سے گزرتا۔ بہ حالتِ مجبوری کمرے میں پنکھے کے نیچے بیٹھنا پڑتا۔)

''پتا نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، بجلی کے جانے سے ہنگامے کرتے ہیں۔'' وہ فلیٹ کے ساتھیوں کو سمجھاتے۔

''بھائی صاحب! اس کے بغیر زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ رات کو جب سوئیں گے نہیں تو صحت کیسے ٹھیک رہے گی۔'' فلیٹ کے مکین ناراضی سے کہتے۔

تب وہ دل میں ہنس کر سوچتے۔ خواہ مخواہ محکمہ بجلی کو الزام دیتے ہیں یہ لوگ۔ کراچی کے شہری بھلا رات کو کہاں سونے کے عادی ہیں اور فلیٹ میں رہنے والے تو 90 فیصد لوگ موسمِ سرما میں بھی رات کو نہیں سویا کرتے۔ سارا وقت گھومنے اور ہی، ہی، ہو، ہو کرنے میں گزارتے ہیں۔ اب بیکار میں لوڈ شیڈنگ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ رشید بھائی کو ان دنوں چھوٹی موٹی ملازمت بھی مل گئی تھی جسے وہ شروع سے سخت ناپسند کر رہے تھے مگر پینو کو دل سے پسند کرنے کے بعد وہ اتنے سرشار سے رہنے لگے تھے ... جیسے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایم ڈی بن گئے ہوں۔ ان کے ایک دوست نے ایک دن ان سے پوچھا اس جلتے ہوئے موسم میں۔ ''جب بجلی نے بھی بیڑا غرق کر رکھا ہو، تمہارے چہرے پر یہ بہاراں کیسی ہے؟'' تب انہوں نے بتایا کہ ''کوئی پسند آگیا ہے اور پسند کی خوشبو نے روح تک کو مسحور کر دیا ہے۔'' (اس میں موسم کی سختی بھی خود ہی اوندھے منہ گر پڑی ہے)

''کون ہے وہ؟'' دوست نے رازداری سے پوچھا۔

''پینو ہے، بہت پیاری سی ہے۔ سامنے رہتی ہے، سونے پر سہاگا کہ وہ اپنے آپ کو سنوارنا بھی جانتی ہے۔ جب بھی بالکونی میں آکر کھڑی ہوتی ہے، میک اپ قرینے سے کیا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں کاجل کی تحریر، کٹاؤ دار لبوں پر لپ اسٹک اور رخساروں پر روج۔''

''کیا وہ بیوٹی پارلر میں کام کرتی ہے؟'' دوست نے تشویش سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں مگر اسے کبھی بغیر بجے سنورے نہیں دیکھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ اوریجنل ہی اتنی خوب صورت ہو۔ جسے میں لپ اسٹک سمجھتا ہوں اس کے ہونٹ ہی گلاب کی کلی ہوں۔''

''اپنے دل کی بات کہی اس سے؟''

''کس طرح کہتا؟'' رشید بھائی نے یاس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''رشید یار! زمانہ قدیم کے عاشقوں سے ہماری مماثلت اتنی ضروری ہے کہ آج بھی محبت بھرے خط لکھ

کر دل کا حال بیان کیا جاتا ہے۔''
''مگر مجھے خط لکھنا اور وہ بھی محبت بھرے، کہاں آئے گا۔ میری تو اردو بھی بہت کمزور ہے۔ پنّو کو اگر خط لکھ بھی دیا تو وہ اگلے دن ہی سرخ روشنائی سے اس میں املا کی دس غلطیاں نکال کر بھیج دے گی۔''
''پھر فون پر اپنی کتھا سنا دو۔'' مشورہ بے لوث تھا۔
''اتنی ہمت نہیں ہے۔ میری تو آواز ہی نہیں نکل سکے گی۔''
''یار! تو کیا میرا پیارا دوست نہیں ہے۔'' لجاجت بھرے لہجے میں کہا گیا۔
''ہاں، وہ تو میں ہوں جب ہی تو یہ سب پوچھ رہا ہوں۔''
''پھر تو لکھ کر دے، دے کوئی خط۔''
''یہ کیا بات ہوئی، عشق تم کر رہے ہو، خط میں لکھوں۔''
''دوست ہی تو برے وقت میں کام آتے ہیں۔'' خوشامدانہ لہجے میں کہا گیا۔
''مگر یہ کوئی برا وقت تھوڑی ہے، تم پر تو اچھا وقت آیا ہے، حیدر آباد میں کسی لڑکی نے تم کو نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ یہاں وہ صاحبہ تمہارے سامنے ٹکی رہتی ہیں۔'' (بار بار دیکھو...... ہزار بار دیکھو......)
''ہاں، یہ تو خیر ہے۔'' رشید بھائی نے شرما کر گردن جھکا لی اور اپنے ہاتھ مروڑنے لگے۔
''اردو میری بھی اچھی نہیں ہے۔ شعر و شاعری بھی نہیں آتی۔ خط لکھنا میرے لیے بھی خاصا مشکل ہوگا۔'' دوست نے اتراتے ہوئے کہا۔
''یار! سیدھا سادہ سا خط لکھ دو۔ میں کون سا تم سے غالب کے زمانے کا خط لکھوانا چاہتا ہوں جس کو سمجھنے کے لیے ان کی محبوبہ کو شرح خریدنی پڑی ہوگی۔''
''ٹھیک ہے لکھ دوں گا مگر دماغ بنانے کے لیے ایک دو پیکٹ سگریٹ کے اور دودھ پتی کی چائے چاہیے۔''
''لے مر!'' رشید بھائی نے اس کے ہاتھ میں سو کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔

''مگر خط مجھے کل شام تک مل جانا چاہیے تاکہ مغرب کے بعد جب لائٹ جائے تو میں اس کو وہ خط دے سکوں۔''
''تم پروا مت کرو، تمہارا خط کل دوپہر تک ہر حالت میں مل جائے گا۔''
رشید بھائی اگلے دن صبح سویرے سے ہی خط کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر تک اس کے گھر اب دس فون کیے گئے تو وہ خط لے کر ان کے پاس آیا۔ رشید بھائی نے بے تابی سے پرچہ کھولا تو اس پر تین لفظ لکھے ہوئے تھے۔
''آپ کیسی ہو؟''
''یہ خط ہے؟'' رشید بھائی نے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں، اب پرچے بازی اسی طرح ہوتی ہے' مختصر بات چیت ہوتی ہے۔''
''ابے الو...... اس ٹائپ کے خط پر تو اسمبلیوں میں جوتے اور گھونسے پڑ گئے۔ تو کیا چاہتا ہے کہ میں پنّو اور اس کے بھائیوں سے جوتے کھاؤں۔''
''جب مجھے خط لکھنا ہی نہیں آتا تو میں کیا کروں؟'' دوست پرچہ میز پر پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور رشید بھائی وہ پرچہ ہاتھ میں پکڑ کر سوچنے لگے کہ اسے بھیجوں یا نہ بھیجوں۔ کروں تو کیا کروں؟ پھر ذہن میں ایک کرن سی چمکی اور اس میں اضافہ کرتے ہوئے وہ خط دوبارہ پڑھا تو اب عبارت ایسی ہوگئی تھی۔
''پیاری باجی!
آپ کیسی ہو؟

فقط تمہارا بھائی جان''
''پہلا خط ہے محتاط قسم کا ہونا چاہیے جبکہ اس کے مزاج کا کچھ معلوم بھی نہیں ہے۔'' خط انہوں نے دوبارہ پڑھا۔
''ہاں اب میری کوئی پٹائی نہیں کر سکتا۔'' وہ یہ سوچ کر مطمئن تھے۔

☆☆☆



☆ارم کمال......فیصل آباد
جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہیں محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کا بن کے رہنا ہنر ہی سہی
کسی کو اپنا بنانا کمال ہوتا ہے

☆فصیحہ آصف خان......ملتان
لبوں پہ ہنسی تو آنکھوں میں سمندر ہوگا
کون جانے کتنا درد دل کے اندر ہوگا

☆ماہ رخ......حیدر آباد
یارب یہ سال سب کی مسرت کا سال ہو
پیغام عیش لائے یہ عشرت کا سال ہو
آنسو کا سال ہو نہ یہ آہوں کا سال ہو
نغمے نئے سنائے بہاروں کا سال ہو

☆لائبہ کائنات......لاہور
وہ محبتوں کے سودے بھی عجیب کرتا ہے فراز
بس مسکراتا ہے اور دل خرید لیتا ہے

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ
صبح کے تخت نشیں شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

☆مسز فرح امجد......ٹاؤن شپ لاہور
نہ جانے کیوں ہر امتحاں کے لیے
زندگی کو میرا ہی پتا یاد رہتا ہے

☆فردوس شازیہ......نیو کیمپس لاہور
نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہوجائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے
میرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

☆نازش زاہد......یو کے
تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستورِ الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی

☆حمیرا نوشین......منڈی بہاؤ الدین
اسے بھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں
جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے

☆عروبہ ناز......کوٹلی
سچائیوں کا جن کے سروں پر جنون تھا
ہر شہریار وقت نے وہ سر اڑادیے
بارود کے خمار سے وحشت امڈ پڑی
اپنے ہی بھائیوں نے بھرے گھر اڑادیے

☆ممتاز خانم......کراچی
ہوا ہے آپ کے ہاتھوں تو برائی کیا ہے
ہماری آرزوؤں کا کہیں تو خوں ہونا تھا

☆جبین ناز......ملتان
ایک، ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر
ممکن جو اگر ہوتا ہم تم کو بھلا دیتے
یادوں کا کفن دے کر بے وقت سلادیتے
تنہائی میں جی لیتے تم کو نہ صدا دیتے
اس دل سے اس دل تک بس دیوار اٹھادیتے

☆صائمہ سجاد بخش......کوہاٹ
میں چاک بھی نہ کرسکا ارادتاً
اتنے لفافے تھے بعض چہروں پر

☆عمیرا عاشر......رحیم یار خان
فلک سے توڑ لایا ہوں مگر پھر سے نئی ضد ہے
ستارے میں نہیں لیتی، مجھے تو چاند لا کر دو

☆فرحین عمران......کراچی
اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا
لو پھر تیرے لبوں پر اسی بے وفا کا ذکر
احمد فراز تجھ سے کہا ناں بہت ہوا

☆ایمان چوہدری......سمندری
کوئی انساں کسی انسان کو کیا دیتا ہے
آدمی صرف بہانہ ہے خدا دیتا ہے

☆عرشیہ جنید......کراچی
محبت ہاتھ میں پہنی ہوئی چوڑی کے مانند ہے
سنورتی ہے کھنکتی ہے کھنک کر ٹوٹ جاتی ہے

☆کوثر خالد......جڑانوالہ
میرے چمن کے سارے گلوں پر نکھار ہو
اس پر خزاں نہ آئے ہمیشہ بہار ہو

☆فرخندہ جعفری......گجرات
مانی ہزار منتیں رد نہ ہوئی بلائے دل
درد کچھ اور بڑھ گیا میں نے جو کی دوائے دل

☆نزہت جبیں ضیا......کراچی
خدا کرے نہ شکن آئے تیرے ماتھے پر
میری آنکھیں تجھے ہر دور میں ہنستا دیکھیں

☆طیبہ عبید......کراچی
سیلاب دیکھتا ہوں تو آتا ہے یہ خیال
پانی بھٹک رہا ہے تلاشِ حسینؓ میں

☆ماہ نور قیصر......راولپنڈی
اعمال سے خالی دنیا کو آفات کی دیمک چاٹے گی
ہم روز نمازیں چھوڑیں گے تو روز قیامت آئے گی

☆نگہت آصف......اسلام آباد
وقت کا ہے یہ تقاضا متحد ہو جائیں ہم
کب سے دشمن آسماں تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

☆انعم حیدر خان......پاکپتن
جاتے، جاتے تو مجھے موت کا تحفہ دے جا
زندگی بعد تیرے مجھ سے بسر ہو کہ نہ ہو

☆سیما گل......ملتان
نہ مجھ سے آنکھیں چراؤ اے دوست
کہ دوستی میں غلط فہمیاں بھی ہوتی ہیں
کسی طرح سبھی منوالوں گی میں دل سے
کہ مہربانوں سے بے رحمیاں بھی ہوتی ہیں

☆فردوس شاہی......لاڑکانہ
پیار بٹنے سے کبھی ختم نہ ہوگا امجد
دل کے دریا تو نہیں ہوتے اترنے والے

☆ہما یاسمین......کراچی
اس کی آنکھیں بلا کی تاجر ہیں
جس کو چاہیں خرید لیتی ہیں

☆روبینہ حنیف......کراچی
بو کر زمینِ دل میں تیری آرزو کے بیج
بیٹھے ہوئے ہیں ہم غریب زمیندار کی طرح

☆مسز تسنیم......جہلم
اصلاح قوم آپ کو منظور ہے اگر
بچوں سے پہلے ماؤں کو تعلیم دیجیے

☆صائمہ قیصر ہاشمی......راولپنڈی
تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

☆شافیہ پرویز......گوجرانوالہ
بند آنکھیں ہوں تو کھلتے ہیں اور دروازے
عشق نے کھول دیے پور پور دروازے
کھڑکیوں سے بھی چلی آئیں حسن کی لہریں
حسن ایسا ہے کہ کرتے ہیں غور دروازے

☆نایاب کرن صدیقی......کمالیہ
ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا، کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا، کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا، کیا

☆☆☆

جھینگا مسالا

اشیا: جھینگے صاف کیے ہوئے، 250 گرام۔ ٹماٹر کا پیسٹ آدھا چمچ۔ ادرک، لہسن کا پیسٹ، 1 چائے کا چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ زیرہ، 1/2 چائے کا چمچ۔ اجوائن، 1 چٹکی۔ کڑی پتے، 6 عدد۔ ہری مرچیں، 2 عدد۔ ٹماٹر، باریک کٹا ہوا، 1 عدد۔ ادرک، باریک کٹی ہوئی، 1 انچ کا ٹکڑا۔ گرم مسالا پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، حسب ضرورت۔ نمک، حسب ضرورت۔ تیل، 1/4 کپ۔

ترکیب: دیگچی میں تیل گرم کر کے ادرک، لہسن پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ ٹماٹر کا پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، زیرہ، اجوائن اور جھینگے ڈال کر بھونیں۔ ٹماٹر، کڑی پتے، ہری مرچیں، ادرک، گرم مسالا پاؤڈر اور نمک ڈال کر مکس کریں۔ 5.10 منٹ کے بعد ہرا دھنیا..... چھڑک دیں اور دم پر رکھ دیں مزیدار جھینگا مسالا تیار ہو جائے گا۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

تلے ہوئے جھینگے

اشیا: جھینگے (صاف کیے ہوئے)، 1/2 کلو۔ سویا ساس، 2 چائے کے چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ اجینو موتو، 1/2 چائے کا چمچ۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، 1 چائے کا چمچ۔ میدہ، 1 کپ۔ بیکنگ پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ کارن فلور، 3 کھانے کے چمچ۔ انڈا، 1 عدد۔ سرکہ، 3 کھانے کے چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب: پیالے میں جھینگے سرکہ، سویا ساس، سیاہ مرچ پاؤڈر، نمک، اجینو موتو ڈال کر ایک گھنٹے تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں دوسرے پیالے میں کارن فلاور، میدہ، بیکنگ پاؤڈر، انڈا اور نمک ملا کر پھینٹ لیں۔ اس آمیزے میں جھینگے ڈال کر کم تلیں۔ سنہری ہو جائیں تو ڈش میں نکال لیں ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔ (جھینگے زیادہ دیر نہیں تلے جاتے)

مرسلہ: ہنین عباس، کراچی

اورنج فرائڈ رائس

اشیا: اورنج سلائس، (مالٹا یا موسمی) 20 عدد۔ سیلا چاول، 3 کپ۔ اورنج جوس، 1/2 کپ۔ انڈے، 2 عدد پھینٹ لیں۔ لہسن، ادرک (کٹا ہوا) 1 کھانے کا چمچ۔ ہری پیاز، 1 کپ۔ (چوپ کی ہوئی) شملہ مرچیں، 1 کپ۔ (چوپ کی ہوئی) سفید مرچ پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ چکن پاؤڈر، 1 چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تیل، 1/4 کپ۔

ترکیب: پھیلے ہوئے پتیلے میں تیل گرم کر کے لہسن، ادرک ڈال کر فرائی کریں۔ انڈے ڈالیں اور 1/2 منٹ انڈوں کو سیٹ ہونے دیں۔ پھر چمچے کی مدد سے انڈے کے ٹکڑے کر لیں۔ اب ابلے ہوئے چاول پتیلے میں ڈال دیں پھر چکن پاؤڈر تھوڑا نمک، اورنج جوس اور سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کریں، ہری پیاز اور شملہ مرچ شامل کر کے اچھی طرح مکس کر کے سرونگ پلیٹ میں نکال لیں اور اب اس پر اورنج سلائس کو سجا کر پیش کریں۔

مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کہو

کھجور ایگ کباب

اشیا: انڈے، 6 عدد۔ (سخت ابلے ہوئے) مکھن، 1 کھانے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، حسب پسند۔ پیپریکا پاؤڈر، 1 کھانے کا چمچ۔ دار چینی پاؤڈر، 1 کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تیل، 2 کھانے کے چمچ۔ کھجوریں، چار عدد۔ (بیج نکال کر چوپ کر لیں)

ترکیب: ابلے ہوئے انڈوں کو چھیل لیں۔

ایک فرائنگ پین میں تیل اور مکھن گرم کریں۔ اس میں ابلے ہوئے انڈے ڈال کر 2 منٹ تک ثابت فرائی کرلیں۔ اس میں نمک، سرخ مرچ پاؤڈر، پیپریکا پاؤڈر اور دار چینی پاؤڈر شامل کر کے مزید 2 منٹ تک پکائیں اب ایک سرونگ پلیٹ میں نکالیں اور کھجور سے گارنش کر کے سرو کریں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

کھویا مال پوہ

اشیا: میدہ، ایک پیالی۔ کھویا، ایک پیالی۔ انڈے، دو عدد۔ نمک، چٹکی بھر۔ دودھ، آدھی پیالی۔ چینی، ایک پیالی۔ کینو کا رس، ایک پیالی۔ کینو کے چھلکے، ایک کھانے کا چمچ۔ زعفران یا زردے کا رنگ، ایک چٹکی۔ فریش کریم، حسبِ پسند۔ گھی، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: کھوئے کو چورا کرلیں اور اس میں تھوڑا تھوڑا کر کے میدہ اور انڈے ڈالتے جائیں پھر اس میں نمک اور زردے کا رنگ اور دودھ ڈال کر آمیزہ تیار کرلیں۔ ڈھک کر دس سے پندرہ منٹ کے لیے گرم جگہ پر رکھ دیں۔ چینی اور کینو کے رس کو اچھی طرح ملا کر ہلکی آنچ پر پکانے رکھیں اور اس دوران صاف توے یا فرائنگ پین میں برش کی مدد سے گھی لگا کر درمیانی آنچ پر رکھ دیں۔ تیار کیے ہوئے آمیزے کو ایک مرتبہ پھینٹ لیں اور آدھی پیالی بھر کر فرائنگ پین میں پھیلا کر ڈال دیں۔ دو سے تین منٹ بعد جب ایک طرف سے سنہرا ہو جائے تو پلٹ کر دوسری طرف سے سنہرا کرلیں۔ اسی طرح سارے مال پوے پین کیک کی طرح بنا کر رکھ لیں۔ چینی کا شیرہ گاڑھا ہونے پر آجائے تو کینو کے چھلکے کا چورا ڈال کر تین سے چار منٹ پکا کر چولھے سے اتار لیں۔ مال پورے کو پلیٹ میں سجا کر اوپر سے گرم چینی کا شیرہ ڈال دیں اور کریم کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: نگہت آصف، اسلام آباد

خوش مزہ معلومات

موسم سرما جہاں سرد ہوائیں لاتا ہے وہیں جسم کی حدت برقرار رکھنے کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بھی ساتھ لاتا ہے جیسے خشک میوہ جات، نت نئی سبزیاں اور رسیلے پھل...... جسم کو گرم رکھنے کے لیے جہاں اونی اور گرم کپڑے ضروری ہیں وہیں جسم کا اندرونی درجہ حرارت متوازن رکھنے کو مچھلی، جھینگے، مرغی، انڈے، خشک میوہ جات اور گرما گرم مشروب کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سورج کی روشنی بھی کسی نعمت سے کم نہیں جسے ہم بغیر کچھ خرچ کیے ہر وقت حاصل کرسکتے ہیں۔ سورج وٹامن D حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جس کی وجہ سے جلد کے کینسر اور ہڈیوں کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے طلوعِ آفتاب کے بعد سے ابتدائی چند گھنٹے دھوپ میں کام کرتے ہوئے گزاریں۔ جسے کچی دھوپ بھی کہا جاتا ہے۔

خواتین دھوپ میں بیٹھ کر سبزی کاٹ سکتی ہیں دال چاول، چنیں، سلائی کرتی ہیں تو وہیں مشین رکھ لیں حتیٰ کہ کپڑے بھی دھونے کا اہتمام ہوسکتا ہے۔ آج کل فلیٹ سسٹم کی وجہ سے یہ نعمت کم، کم ملتی ہے۔ بچے اپنی پڑھائی بھی صبح کی دھوپ میں بیٹھ کر کریں...... بجلی کی بھی بچت ہوگی، میوہ جات اور مغزیات حسبِ استطاعت ضرور استعمال کریں۔ موسمی پھل و سبزیوں کا استعمال کریں...... بات سبزیوں کی آئی تو سلاد کے طور پر کھانے والی سبزی مولی کی بہت اہمیت ہے۔ اس کے پتے ہاضمے کے لیے مددگار ہوتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ، ساتھ اس کا عرق رنگت نکھارنے اور جلد کی صفائی میں بھی کام آتا ہے کیونکہ یہ قدرتی کلینزر ہے۔

☆ روغنِ زیتون کے چند قطرے مولی کے پیسٹ میں ملا کر اس آمیزے کو جلد پر رگڑ کر لگائیں تو یہ پھٹی ناہموار جلد کو نرم و ملائم بنا دے گا۔

☆ مولی کے پیسٹ میں تھوڑا سا دہی ملا کر لگانے سے چہرے کی رنگت شاداب ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: فضہ بتول، بہارہ کہو



☆نازنین آفریدی...... پشاور

س: میری جلد ٹین ایج میں حد سے زیادہ چکنی تھی یہاں تک کہ میں نے ایک رجسٹر چکنی جلد کی دیکھ بھال کے ٹوٹکے نوٹ کر کے بھر دیا اور اب میری جلد اچانک سے خشک ہوگئی۔ آج کل سردیاں بھی ہیں لیکن اب یہ گرمی میں بھی خشک رہنے لگی ہے۔ کیسے دیکھ بھال کروں؟ کیا یہ وقتی طور پر خشک ہوئی ہے یا عمر کے ساتھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ میری عمر 29 سال ہے۔

ج: چکنی جلد آہستہ، آہستہ خشک ہونے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اس میں آپ کے معمولات، ذہنی و جسمانی، بے آرامی اور متوازن غذا نہ ہونا ہے۔ آپ نے اپنے منہ دھونے کا صابن یا فیس واش بھی بدلا ہوگا، بہتر ہے کہ ماہر حسن سے بھی رجوع کریں۔ فی الحال آپ پانی اور تازہ پھلوں کے رس کا استعمال زیادہ کریں۔ اپنے فیس لوشن یا موئسچرائزنگ کریم میں خالص روغنِ بادام ڈال کر مکسچر سا بنائیں اور رات، دن اسے استعمال کریں۔ اس کے علاوہ خشک جلد کے لیے ازلی آزمودہ نسخہ عرقِ گلاب، گلسرین اور لیموں کے عرق کا ہے یہ چیزیں ہم وزن لے کر ایک شیشی میں لوشن کی طرح بنا کر رکھ لیں اور رات سوتے وقت خاص طور پر لگائیں۔ انشاء اللہ فرق پڑے گا۔ دھوپ میں نکلنے سے پہلے چہرہ دھولیں۔

حنا یاسمین...... کوٹلی

سوال: باجی میری عمر بیس سال ہے، میرا مسئلہ یہ ہے کہ چہرے کی اسکن تو صاف ہے مگر گردن بہت کالی ہے اس کی وجہ سے کھلے گلے نہیں پہن سکتی اور بال اونچے کر کے نہیں باندھ سکتی۔ گدی تو بہت کالی لگتی ہے۔ کوئی ترکیب بتائیں کہ تھوڑی بہت تو صاف ہوجائے۔

جواب: یہ مسئلہ اکثر بہنوں کا ہوتا ہے کہ ہم چہرے کی نگہداشت میں گردن اور ہاتھ پیروں کو بھول جاتے ہیں۔ نہانے سے کچھ دیر قبل بیسن ذرا سے دودھ میں گھول کر اس سے گردن کا مساج کریں۔ توری کے جھانویں سے یا تولیے کے ٹکڑے سے غسل کے دوران گردن اور ہاتھ پیر ملیں...... خالی اسفنج کبھی میل نہیں نکالتا وہ بس بچوں کی نرم کھال کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ رات کو چہرے اور گردن کی کلینزنگ کریں اور صبح دھولیں۔ غذا میں سلاد اور دودھ کو لازمی جزو بنائیں۔ اور آپ دو، دو دانے خشک میوہ جات بھی کھایا کریں۔

☆شمائل خان...... لاہور

سوال: پلکیں اور بھویں لمبی اور گھنی کرنے کی کیا ترکیب ہوگی؟ نیز کیا بالوں کی نوکیں کاٹنا ضروری ہوتا ہے؟

جواب: کسٹر آئل یا زیتون کا تیل انگلی سے بھوؤں پر اور پلکوں پر لگائیں مگر بہت احتیاط سے۔ یہ دراصل ہمارے بالوں کی growth پر منحصر ہے اگر آپ کے سر کے بال گھنے نہیں ہیں تو بھویں بھی ہلکی ہوں گی۔ انہیں شیپ میں کرواتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ بہت زیادہ باریک نہ ہوں۔ ویسے آپ بالوں کے ہم رنگ آئی پنسل اور مسکارے سے انہیں ابھار سکتی ہیں۔ آج کل تو کلرڈ مسکارے کا بھی کافی رجحان ہے۔ بالوں کے اگر سرے نکل رہے ہوں تو ضرور مہینے میں ایک مرتبہ ایک دو انچ بال ترشوالیں۔ مسکارا صرف پلکوں کے لیے ہے۔

اپنی تمام بہنوں کے لیے بہت پیار کے ساتھ ایک انوکھا نسخہ لیے حاضر ہوں۔ چہرے کی رنگت نکھارنے اور چمک پیدا کرنے کے لیے آپ کو سحر خیزی کی عادت ڈالنا پڑے گی۔ صبح سویرے پودوں پر پڑے شبنم کے قطروں کو اگر بہت احتیاط کے ساتھ کسی برتن میں جمع کر کے چہرے پر روئی کی مدد سے لگائیں تو چہرے پر خاص چمک دمک پیدا ہوجاتی ہے۔

بہنیں سورۂ نور تلاوت کر کے اپنی ہتھیلیوں پر دم کریں اور چہرے پر منہ دھونے کے انداز میں ہاتھ پھیر لیں، انشاء اللہ بھرپور رونق آجائے گی۔......☆☆☆



بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ منور شہزادی...... گوجرانوالہ
سوال: آج کی بیوی کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اپنی بھری ہوئی سسرال میں اسے اختیارات ہوں، ایسے ہوں...... ایسے ہوں...... یہ آپ بتائیں کہ کیسے ہوں؟
جواب: ایسے ہوں جیسے کراچی میں رینجرز کو حاصل ہیں۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ خولہ عرفان...... کراچی
سوال: کیا شادی کے بعد خواتین کا بلڈ گروپ بدل جاتا ہے......؟ اگر ہاں تو اس کے کیا نتائج نظر آتے ہیں؟
جواب: جی ہاں' شادی شدہ خواتین کی قوتِ برداشت کے باعث ان کا بلڈ گروپ فوراً بدل جاتا ہے...... زیادہ تر خواتین کا بلڈ گروپ ڈھیٹ پوزیٹو یا ڈھیٹ نگیٹو ہوتا ہے...... اور جن کا ڈھیٹ پوزیٹو ہوتا ہے وہ خوش وخرم، صحت مند ازدواجی زندگی گزارتی ہیں...... باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔

☆ سنبل ملک اعوان...... شاہدرہ، لاہور
سوال: سنا ہے، دن میں تارے بھی دکھائی دیتے ہیں، کیسے بھلا؟
جواب: آپ ہمارے پاس کسی دن آجائیں...... ہم دکھادیں گے...... بس اس کے بعد گالوں کو سہلانا ہوگا...... اور بس...... کم از کم آپ کی خواہش تو پوری ہوجائے گی۔

☆ ارم کمال...... فیصل آباد
سوال: دل جھوم، جھوم جاتا ہے...... کب بھلا......؟
جواب: جب دوست واحباب تعریفوں کے ٹوکرے ہر ملاقات پر نچھاور کرنے کو تیار نظر آئیں۔

☆ حمیرا نوشین...... منڈی بہاؤالدین
سوال: میں نے تو ہنستے، ہنستے اس کے ایک چماٹ مارا تھا، اس نے روتے، روتے...... آگے مکمل کریں......؟
جواب: میرے کان ہی کاٹ لیے۔

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات
سوال: انسان کی آنکھ میں اندھیرا کب چھاجاتا ہے؟
جواب: روزانہ رات کو جب لائٹ جاتی ہے۔

☆ ماہ رخ...... حیدرآباد
سوال: نیکی کرکے اسے دریا میں کیوں ڈالا جاتا ہے؟
جواب: تاکہ کوئی اترا نہ سکے اور بھرم بازی سے دور، دور رہے۔

☆ ناعمہ تحریم...... ملیر، کراچی
سوال: ٹنگنی کا ناچ نچانے کا آسان طریقہ؟
جواب: کسی ڈانس اکیڈمی سے رجوع کریں...... جب وہ تگڑی سی فیس لیں گے تو پہلے آپ خود ہی ٹنگنی کا ناچ، ناچ جائیں گی...... تو نچانا بھی آجائے گا۔

☆ صائمہ سجاد بنگش...... کوہاٹ
سوال: وہ ہمیشہ ہر کام کا کریڈٹ خود لے جاتی ہے؟
جواب: سویرا ایکٹو، بہویں، نندیں اور ساسیں اب ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔

☆ فرحانہ پروین......راولپنڈی

سوال: آج بہت ہی پیارا موسم ہو رہا ہے...... بتائیں اس خوب صورت موسم میں میرا دل کیا کہہ رہا ہے؟

جواب: میں اڈی اڈی جاواں ہوا دے نال۔

☆ شبنم کنول......پاپانگری

سوال: اگر دوست بے وفائی کرنے پر آمادہ ہو تو؟

جواب: تو اسے وفا داری پر ایک اچھا سا میسج سینٹ کرنا چاہیے۔

☆ گلشاد نذیر......کوہ مری

سوال: آج کیا پکایا جائے؟

جواب: کچھ نہیں......کہیں دعوت میں چلی جاؤ۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال: دولھا کو گھوڑے پر ہی کیوں بٹھایا جاتا ہے، گدھے پر کیوں نہیں؟

جواب: بھئی اگر گدھے کو گدھے پر بٹھائیں گے تو اچھا نہیں لگے گا ناں......بس ذرا عزت دینے کے لیے۔

☆ سنجیدہ خاتون......کراچی

سوال: فرض کریں کہ اگر میں فلم بناؤں تو آپ اس کی کہانی لکھیں گی......؟

جواب: ہاں ایک شرط پر اس میں ہیروئن کا کردار تم ادا کرو گی۔

☆ شہناز قدیر......کراچی

سوال: زندگی ہماری ہوتی ہے مگر اسے گزارتا کوئی اور ہے......کون بھلا......؟

جواب: سسرال میں جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے والی اکثر بہوؤں کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

☆ نسرین الہیٰ......سندھ

سوال: مجھ سے کسی کی تعریف نہیں کی جاتی......کہ شاید سچ بولنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں......؟

جواب: آپ کی بھی تو کوئی نہیں کرتا......مجبوری ہے۔

☆ ماہا بلوچ......میر پور خاص

سوال: آئے بھی وہ، گئے بھی وہ......ختم فسانہ کس بات کا اشارہ ہے؟

جواب: فسانہ تو شروع ہوا ہے......اس لیے یہ آنا جانا ہو رہا ہے۔

☆ نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ

سوال: محبت میں صرف دل دھڑکتا ہے اور نفرت میں؟

جواب: دل، دماغ، گھر، خاندان، پارٹی سب چیخ کر آنے کو تیار رہتے ہیں۔

☆ تسنیم رضا ذوالفقار......فیصل آباد

سوال: بچپن سے لڑکپن کی عادتیں کیا بچپن میں بھی ایسی ہی چلبلی سی رہیں گی؟

جواب: ہاں......مضائقہ کیا ہے......یا اب تم نے اس کے لطائف پر ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔

☆ فرح ناز......ملکوال

سوال: بچہ غلطی کرے تو اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے اور اگر کوئی بڑا غلطی کرے تو؟

جواب: اس سے لڑا جاتا ہے۔

☆ صبا نور......لیہ

سوال: اداکارہ میرا کبھی انڈیا میں رہتی ہیں کبھی کینیڈا میں......اور کبھی پاکستان میں......اصل میں وہ کہاں رہتی ہیں؟

جواب: یہ تو مجھے نہیں پتا مگر وہ زیادہ تر کنٹروسی میں ہی رہتی ہیں۔

☆ نازیہ......نوشہرہ

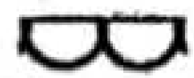
سوال: یہ محبت ظہور پزیر کب ہوتی ہے؟

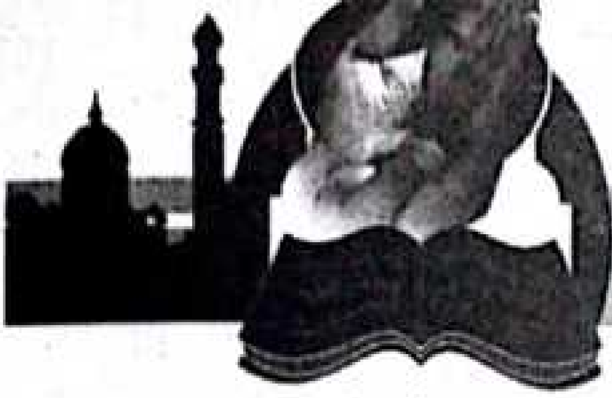
جواب: بس، جب جس کا وقت آجائے...... تب ہی۔

☆ پروین وحید......پنجاب

سوال: سر کے بل کھڑے ہونے کو کب دل کرتا ہے؟ اپنے تجربے سے جواب دیں؟

جواب: ہر شخص کی خوشیاں اپنے، اپنے دائرۂ اختیار کے حساب سے ہوتی ہیں مگر میری سوچ کی کوئی خوشی اس حد تک تو ہرگز نہیں جاتی۔





روحانی مشورے

ادارہ

صحابی رسول حضرت
علاء بن حضرمیؓ کی پُر اثر دعا

مشہور صحابی حضرت علاء بن حضرمیؓ اپنی انفرادی خصوصیات اور کرامات کی بنا پر ایک نمایاں حیثیت اور بلند مقام کے مالک ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ جو مشہور تابعی ہیں، انہوں نے اور دیگر ساتھیوں نے حضرت علاء بن حضرمیؓ کی صحبتوں اور مجلسوں میں حضرت علاءؓ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والی ایک عجیب و غریب دعا کا ذکر آیا اور پھر خلیفہ کی بھی پریشانی و بے کلی دور ہوگئی۔

مطرف بن عبد اللہ سے امام ابو بکر محمد بن ولید کتاب الدعاء میں روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں عباسی خلیفہ منصور سے ملاقات کرنے گیا تو انہیں بہت زیادہ غم زدہ پایا۔ وہ اپنے بعض دوستوں اور مخلص ساتھیوں کے کھو جانے کے سبب چپ سادھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا۔

اے مطرف! مجھ پر ایسا غم سوار ہو چکا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا جس نے مجھے آزمائش میں ڈالا ہے اسے کوئی دور نہیں سکتا۔

کیا کوئی ایسی دعا ہے کہ جسے پڑھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھ سے غم کو دور فرما دے۔

میں نے جواب دیا: اے امیر المومنین! مجھے محمد بن ثابت نے بتایا ہے کہ بصریٰ کے رہنے والے ایک شخص کے کان میں مچھر گھس گیا اور اس کے دماغ تک جا پہنچا...... وہ شخص سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور دن رات نیند سے محروم تھا، تب اسے حضرت حسن بصریؒ کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ حضور اکرم ﷺ کے صحابی حضرت علاء بن حضرمیؓ والی دعا پڑھو جو انہوں نے جنگل اور سمندر میں پڑھی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت فرمائی تھی۔ بیمار شخص نے کہا۔ اللہ جل جلالہ تم پر رحم کرے، مجھے بھی بتاؤ وہ کون سی دعا ہے؟ انہوں نے اس کا تذکرہ کیا۔

روایت کے مطابق ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ حضرت علاء بن حضرمیؓ کو ایک لشکر کے ساتھ بحرین کی طرف بھیجا گیا۔ میں بھی اس لشکر میں شامل تھا۔ اس دوران ہم ایک ویران اور غیر آباد صحرا سے گزرے جہاں سخت پیاس نے اتنا ستایا کہ ہمیں اپنی ہلاکت کا خوف ہونے لگا۔ تب حضرت علاء بن حضرمیؓ اپنی سواری سے اترے انہوں نے دو رکعت نماز (صلوٰۃ الحاجات) ادا کی پھر اللہ تعالیٰ کے دربار میں یوں دعا مانگی۔

"یَا حَلِیْمُ یَا عَلِیْمُ یَا عَلِیُّ یَا عَظِیْمُ اَسْقِنَا"

"اے پروردگار! ہمیں پانی سے سیراب فرما۔"

پس ہم نے دیکھا کہ اسی وقت ایک بدلی آئی جیسے کسی پرندے کا پر ہو...... وہ ہم پر خوب برسی...... یہاں تک کہ ہم نے پانی سے اپنے برتن بھر لیے اور اپنے، اپنے جانوروں کو بھی خوب سیراب کر لیا۔ پھر ہم آگے چل پڑے، یہاں تک کہ ایک سمندری خلیج پر پہنچے جو اس قدر گہری تھی کہ اس دن سے پہلے اور نہ اس دن کے بعد اس میں کوئی داخل ہوا، ہمیں وہاں کوئی کشتی نہ ملی تو وہاں بھی حضرت علاء بن حضرمیؓ نے دو رکعت نماز پڑھی اور بارگاہِ خداوندی میں یوں گویا ہوئے۔

"یَا حَلِیْمُ یَا عَلِیْمُ یَا عَلِیُّ یَا عَظِیْمُ اَجِزْنَا"

"اے پروردگار! ہمیں پار لگا دے۔"

یہ دعا مانگتے ہی انہوں نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور فرمایا: اللہ کے نام سے پار کرو۔ حضرت ابو ہریرہؓ

..... فرماتے ہیں کہ ہم سمندر کے پانی پر چل رہے تھے۔ اللہ کی قسم! ہم میں سے کسی کے پاؤں یا ہمارے کسی جانور کے کھر تک گیلے نہیں ہوئے۔ یہ ہمارا لشکر چار ہزار سواروں (نفوس) پر مشتمل تھا۔

یہ واقعہ سن کر بیمار آدمی نے ان اسما کے ذریعے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! ہم ابھی وہیں تھے کہ مچھر اس کے کان سے نکل گیا۔ بھنبھناتا ہوا جا کر دیوار سے ٹکرایا اور مرگیا۔ اور وہ آدمی ٹھیک ہوگیا۔

حضرت علاء بن حضرمیؓ سے متعلق دعائیں ان کے اثرات و کرامات سن کر خلیفہ منصور نے قبلہ رو ہو کر تھوڑی دیر ان اسما کے توسل سے دعا مانگی پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ ''اے مطرف! اللہ تعالیٰ نے میرے غم کو دور فرمادیا۔'' پھر انہوں نے کھانا منگوایا، مجھے بھی ساتھ بٹھایا اور ساتھ ہی کھانا کھایا۔

سورۂ فاتحہ کے فضائل

سورۂ فاتحہ قرآن پاک کی پہلی سورۂ مبارکہ ہے۔ فاتحہ کے لغوی معنی ہیں ''کنجی'' یا ''چابی......'' یعنی فاتحہ کے معنی ہیں کھولنے والی۔ کیونکہ اس سورۂ مبارکہ سے قرآن پاک کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے اس کا نام فاتحہ یعنی کھولنے والی رکھا گیا ہے۔

سورۂ فاتحہ کے بے شمار فضائل ہیں۔ یہ ایک زبردست خزانہ ہے۔ اس میں لاکھوں امراض کی شفا موجود ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی گاؤں کے سردار کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تھا گاؤں والے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ ﷺ چل کر دم کریں تو وہاں پر موجود ایک صحابیؓ مریض کے پاس گئے اور تین مرتبہ الحمد شریف پڑھ کر دم کیا تو زہر کا اثر جاتا رہا۔

اسی طرح سخت سے سخت مرض گٹھیا، مرگی اور دردِ سر وغیرہ کے لیے فجر کی سنتوں کے بعد فرضوں سے پہلے 41 مرتبہ سورۂ فاتحہ اس طرح پڑھیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی م (میم) الحمد کے ل (لام) سے ملا کر پڑھیں اور پانی پر دم کر کے مریض کو پلائیں۔ نہایت مفید اور مجرب ہے۔

2۔ سخت مصیبت، آفت یا بیماری سے نجات کے لیے گیارہ ہزار مرتبہ صرف ایاک نعبد وایاک نستعین سات دن تک پڑھیں۔ انشاء اللہ مصیبت دور ہوگی یعنی ہر روز گیارہ ہزار مرتبہ پڑھنا ہے۔

3۔ اگر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں مختلف رائے ہو اور پتا نہ چلتا ہو کہ کون سی رائے صحیح ہے تو ضرورت مند شخص رات کو سوتے وقت اھد نا الصراط سے ولا الضالین تک دو ہزار مرتبہ پڑھے۔ انشاء اللہ صبح تک دل میں سچی رائے آجائے گی اور کام بھی ٹھیک ہوجائے گا۔

4۔ اگر کسی کی سونگھنے کی حس ختم ہوجائے یا کسی کو مستقلاً زکام رہتا ہو اور اس کی ناک بند ہو تو وضو کرتے وقت سورۂ فاتحہ پڑھ کر ناک میں پانی ڈالیں تو انشاءاللہ ... بند ناک کھل جائے گی اور سونگھنے کی حس لوٹ آئے گی۔ (یہ نسخہ آزمودہ ہے)

5۔ کسی بھی مشکل کام یا حاجت روائی کے لیے بعد نمازِ عشا دو رکعت نفل اس طرح پڑھیں کہ پہلی رکعت میں سو مرتبہ سورۂ فاتحہ اور ایک بار سورۂ اخلاص جبکہ دوسری رکعت میں ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ اور سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھیں۔ انشاء اللہ بہت جلد مشکل حل ہوجائے گی۔

6۔ نافرمان بچوں کو سورۂ فاتحہ 21 مرتبہ اول و آخر گیارہ، گیارہ مرتبہ درود ابراہیمؑ پانی پر دم کر کے پلائیں۔ عمل کی مدت تین ماہ ہے۔

7۔ شوہر کے دل میں محبت بڑھانے کے لیے اول و آخر درود ابراہیمی تین، تین مرتبہ، گیارہ مرتبہ سورۂ فاتحہ اور اکتالیس مرتبہ یاودود پڑھ کر پانی پر دم کر کے شوہر کو پلائیں اور جب انہیں غصہ آئے تو ترکی بہ ترکی جواب دینے کے بجائے دل میں سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کردیں۔ ان کا غصہ جلد اتر جائے گا۔ انشاءاللہ!

☆☆☆







شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

کمر کے خراب مہرے

زریدہ...... اسلام آباد

اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ میں مزید شفا دے اور مریضوں کی ڈھیروں دعائیں لیں (آمین) ڈاکٹر صاحب مجھے مہروں کا مسئلہ ہے۔ مہرے کمزور ہیں چل نہیں سکتی۔ پوری ٹانگیں مع پاؤں کی انگلیوں تک بہت جکڑن ہے، ایسا لگتا ہے کہ رسیوں سے کس کر باندھی ہوئی ہوں۔ اب تو رات میں 3 سے 4 بار باتھ روم جانا پڑتا ہے، پیشاب بار، بار آتا ہے، شوگر بھی نہیں ہے، قبض بہت ہے۔ آپ کو اپنی رپورٹ بھیج رہی ہوں، پہلے ملی نہیں تھی۔ بلڈ پریشر بھی ہے۔ پاؤں کی انگلیوں میں لگتا ہے تاروں سے بندھی ہیں، پاؤں بہت جلتے ہیں۔ اچھی سی دوائی لکھ دیں تاعمر دعائیں دوں گی۔

جواب: محترمہ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Bryonia30، Calc.Carb30، Acid Phos30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت

سے مطلع کریں۔

اندرونی کمزوری

مسز شبانہ جواد......لیہ

میرے شوہر کا مسئلہ ہے اندرونی طور پر کافی کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کو چیک نہیں کرایا نہ ہی کوئی میڈیسن کھائی ہے۔ ان کے لیے کوئی میڈیسن تجویز کریں تاکہ ہماری ازدواجی زندگی اچھی گزرے۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Staphi sagria 200 ہر ہفتہ ایک خوراک لیں۔ اور Damiana Pantarkan Ptk40 کے 15 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پیئں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

☆☆☆

جذباتیت

ناصر شیخ......وہاڑی

ڈاکٹر صاحب میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ مجھے کمزوری بہت زیادہ ہے، جسم ہر وقت گرم رہتا ہے۔ دل دماغ بہت پریشان رہتے ہیں۔ دل کی دھڑکن بہت تیز رہتی ہیں، بیوی سے ناچاقی رہتی ہے۔ براہِ مہربانی اچھا سا نسخہ لکھ دیں۔ مجھے خون کی کمی ہے، مالی گھریلو اور کاروباری پریشانی ہے..... کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

جواب: جب بندہ اللہ سے دور ہو جاتا ہے تو زندگی کا مقصد بھول جاتا ہے۔ خدارا اپنے ذہن کو میچور کریں۔ 5 وقت کی نماز کی پابندی کریں، باوضو رہیں، درود شریف اور استغفار ہر وقت پڑھتے رہیں۔ جب بھی جتنی مرتبہ بھی گھر میں داخل ہوں زور سے سلام کریں۔ بیوی کا خیال کریں،



خود غرض نہ بنیں۔ آپ کی ذہنی اور کاروباری پریشانی، بیوی سے ناچاقی اور دیگر تمام مسائل انشاءاللہ مکمل طور پر صحیح ہو جائیں گے۔ بلڈ پریشر چیک کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Damiana Pentarkan Ptk 40 کے 15 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

سروائیکل اسپانڈیلائٹس

مسز رزاق......کراچی

میرے سر میں بہت بھاری پن ہے، چکر بھی بہت آرہے ہیں، کروٹ لینے سے پوری گھوم جاتی ہوں، سر میں بہت درد ہے، چکر سے الٹی محسوس ہوتی ہے۔

جواب: آپ کی Cervical Spondilitis کی پرابلم ہے۔ کچھ عرصہ کالر کا استعمال کریں۔ دودھ دہی پنیر سبزی اور فروٹ کا استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل دوائیں 3 ماہ تک استعمال کریں اور دوبارہ حال تفصیل سے بتائیں۔ Angustura30, Rhustox30, Calc.Carb30, جب متلی ہو تو Ipecac30 لیں۔ ہر شیشی میں سے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

ہاضمہ کی خرابی

مزمل حسین......جڑانوالہ

بعد سلام عرض ہے کہ میں ایک بیماری کا شکار ہوں جس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ میری بیماری دو سال پرانی ہے۔ میں نے بہت دوائیں استعمال کیں لیکن مجھے آرام نہیں آیا۔ امید کی



آخری کرن سمجھ کر خط لکھ رہا ہوں۔ میری بیماری کی علامات مندرجہ ذیل ہیں۔ قبض ہے، پاخانہ ٹھیک سے نہیں آتا، کبھی پانی کی طرح تو کبھی بہت سخت ہوتا ہے، سر چکراتا ہے آنکھوں کے آگے اندھیرا آتا ہے، ہاتھ پاؤں کا سن ہونا، بھوک کی کمی، صبح کو ناشتا کرنے کا دل نہیں کرتا اگر کچھ کھا بھی لوں تو قے کرنے کو دل کرتا ہے، منہ کا ذائقہ کڑوا ہے، زبان کے اوپر سفید تہ جمی ہوتی ہے، پیشاب کا جل کر آنا، پیشاب کا زرد رنگ کا آنا، گاڑھا آنا، ہاتھ پاؤں میں جلن اور گرمی نکلتی ہے۔ پانی پینے سے کچھ سکون ہوتا ہے، کام میں دل نہیں لگتا، معدہ میں گیس رہتی ہے۔ پیٹ سے آواز آتی ہے گڑگڑ کی، معدے میں جلن بھی ہوتی ہے، آنکھوں کے آگے پتنگے اُڑتے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے کوئی دوائی تجویز کر دیں۔

جواب: سبزیوں اور فروٹس کا استعمال بڑھائیں، چہل قدمی کیا کریں۔ اچھی صحبت اختیار کریں۔ اچھے لوگوں، اچھی کتابیں اور اچھی ویب سائٹس کو دیکھیں، ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Antim.crud30, Merc.cor 30 کے 5,5 قطرے ایک گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ، Nux Vomica, Pentarkan Ptk 63 کے 10,10 قطرے ایک گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں، ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

جسمانی نشوونما

عائشہ منیر......سرائے نورنگ، بنوں

ڈاکٹر صاحب میرا یقین ایلوپیتھک کے بجائے ہومیو پیتھک علاج پر زیادہ ہے۔ آپ میری بچی کے لیے بہترین دوائی تجویز کر دیں۔ بچی کی بھوک بالکل نہیں ہے، جب دوائی استعمال کرتی ہے تو تھوڑا بہت کھا لیتی ہے ورنہ بھوک ختم، پیریڈ بہت تکلیف سے آتے ہیں، نسوانی حسن کی شدید کمی ہے جس کی وجہ سے شدید احساسِ کمتری ہے۔ آپ اس کے لیے دوائیں تجویز کر دیں تاکہ اس کا وزن بھی بڑھ جائے۔ مختلف حکیمی، ہومیو پیتھک، ایلوپیتھک دوائیں استعمال کرائی ہیں۔ ان سے وقتی بھوک بھی بڑھ جاتی ہے اور وزن بھی بڑھ جاتا ہے۔

جواب: متوازن غذا کا استعمال کریں، ہلکی ورزش بھی کیا کریں، ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Magnesium Phos, کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ، Pentarkan Ptk60, Iodium30, Acid.Phos30 Chimaphila30 کے 7,7 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا کپ پانی میں لیں۔ دو ماہ بعد دوبارہ کیفیت سے آگاہ کریں۔

کانوں سے سنائی نہیں دیتا

فرہاد علی......کوٹ عبدالمالک، شیخوپورہ

ڈاکٹر صاحب میرا کانوں کا مسئلہ ہے۔ چار سال کی عمر میں بارش میں نہانے کی وجہ سے بیمار ہوا تھا، یاد نہیں ہے کہ تیز بخار ہوا تھا یا ٹائیفائیڈ اس وقت کی رپورٹس نہیں ہیں، میو اسپتال لاہور میں علاج ہوا تھا۔ دو خون کی بوتلیں بھی لگی تھیں اور اس وقت خسرہ بھی ہوا تھا۔ علاج کے بعد کانوں میں خرابی پیدا ہوئی، ہمارا غریب طبقے سے تعلق ہے، میرے ماں باپ اور خاندان اَن پڑھ ہے اس وجہ سے کسی علاج کی طرف توجہ نہیں دی۔ عام ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ انہوں نے ٹیسٹ کیے

بغیر دوائی یا ڈراپس دے دیے جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، درد وغیرہ نہیں ہوتا۔ ایک بار پیپ بہنے لگی تھی، ڈراپس استعمال کیے اس سے پیپ بہنا بند ہو گئی۔ پہلے ایک کان مکمل بند ہوا۔ دو سال پہلے گاؤں میں نہر میں نہانے کی وجہ سے دوسرا کان بھی مکمل بند ہو گیا۔ اب میری عمر ۲۳ سال ہے۔ بہرے پن کی وجہ سے شادی بھی نہیں ہو رہی ہے۔ رات سونے سے پہلے جیسے چڑیا بولتی ہے ایسے سیٹی بجتی رہتی ہے اور سارا دن مشینوں جیسا اور غوں غوں جیسا شور ہوتا رہتا ہے۔ آلۂ سماعت یا موبائل فل آواز میں کان کے ساتھ لگانے سے شور اور بے چینی ہوتی ہے۔ آواز یا الفاظ کی پہچان نہیں ہوتی۔

جواب: ناک اور کان کا باقاعدہ معائنہ ہونا چاہیے اور سماعت کا ٹیسٹ بھی ہونا چاہیے۔ بہرحال 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Verbascum-Q کے 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور ایک ایک قطرہ دونوں کانوں میں ڈالیں اور Acid Phos30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی ڈال کر لیں۔

جسم اور چہرے پر بال

حمیرا......حیدر آباد

میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ایام 10 سال سے ایک مہینہ آتے ہیں اور 2 مہینہ نہیں آتے جس کی وجہ سے میرے جسم خاص طور پر چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں۔ جب نکالوں تو خون نکلتا ہے اور جگہ کالی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کسی سے بھی ملنے سے گھبراتی ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی اچھی دوائی تجویز کریں جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی ایک دکھی بہن کی فریاد ہے۔ میرا مسئلہ ضرور شائع کریں۔



جواب: اللہ آپ کو صحت دے، آمین۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Carb 200 کے 5 قطرے ہفتے میں ایک دفعہ لیں جبکہ روزانہ Pulsatilla 30 اور Oleum Jec30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں ایک گھونٹ پانی میں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بچی کا قد اور بال

راحیلہ سعود......نوری آباد

یہ میری بچی کا مسئلہ ہے۔ میری بچی کے پورے جسم پر بال ہیں۔ پیدائش کے وقت رُواں تھا جوں جوں بڑی ہوتی گئی کالے اور لمبے بال بن گئے۔ ٹانگوں پر رانوں تک اور کمر پر بھی ہیں لیکن ذرا چھوٹے ہیں۔ بازوؤں پر کلائی سے لے کر کاندھے تک آدھا آدھا انچ لمبے بال ہیں۔ زیادہ بازو پر ہیں اور گھنے بھی جو کہ بچی بھی اب محسوس کرتی ہے۔ میری بچی کا دوسرا مسئلہ قد کا ہے۔ جو عمر کے ساتھ نہیں بڑھ رہا۔ دو سال سے وہی کپڑے پہن رہی ہے۔ اس کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔

جواب: آپ اپنی بچی کی غذا کا خیال رکھیں۔ اس کو متوازن غذا دیں۔ ورزش کرائیں یا کھیل کود کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc. Carb 200 کے 4 قطرے تھوڑے سے پانی میں ایک دن چھوڑ کر دیں اور اسی کمپنی کی Acid Phos 30 کے 5 قطرے تھوڑے سے پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں 3 ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

قد نہیں بڑھ رہا

کوثر فاروق..... میرپور آزاد کشمیر

میری عمر 14 سال ہے اور قد 4 فٹ 8 انچ ہے۔ جسامت درمیانی ہے، نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی، ایک سال سے قد نہیں بڑھ رہا ہے۔ برائے مہربانی یہ بتائیں کہ قد کتنی عمر تک بڑھ سکتا ہے اور پلیز کوئی دوا تجویز کر دیں۔ یہ بھی بتائیں کہ دوائی کتنی دیر تک لینی ہے۔

جواب: بی بی آپ نے خاندانی پسِ منظر نہیں لکھا کہ آپ کے خاندان میں ماں باپ کی طرف سے لوگوں کا قد کتنا ہے؟ بہرحال آپ اپنی غذا کا خیال رکھیں۔ متوازن غذا لیں، چکنی اور میٹھی چیزیں زیادہ نہ لیں، ورزش یا کھیل کود ضرور کریں۔ بھاری وزن نہ اُٹھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Baryta Carb 200 کے 4 قطرے ہر صبح لیں اور اسی کمپنی کی Ferrum PentarkanPtk45 کی دو گولیاں تھوڑے سے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں اور تین ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بھوک نہیں لگتی

انجلینا..... راولپنڈی

محترم، میری بیٹی کی عمر پانچ سال ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ روٹی بالکل نہیں کھاتی نہ چاول شوق سے کھاتی ہے، چند ایک فروٹ کھا لیتی ہے۔ وہ زیادہ شوق سے دودھ نہیں پیتی ہے، فیڈر میں دو حصے دودھ ہوتا ہے اور ایک حصہ کوک، چینی نہیں ڈلواتی۔ اکثر رات کو پیشاب کر دیتی ہے۔ جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہے، نہ اسے کبھی بخار ہوا نہ موشن۔

جواب۔ اکثر مائیں بچوں کے متعلق یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کا بچہ/بچی کو بھوک نہیں لگتی یا وہ صحیح سے نہیں کھاتے اس کی وجوہات میں نمبر 1، آپ کی محبت کہ آپ اس کو سب کچھ کھلا دینا چاہتی ہیں، اس کے پیٹ (معدے) کی گنجائش سے زیادہ۔ نمبر 2، بار بار کھلانا، کولڈ ڈرنک، شربت چپس، بسکٹ ٹافیاں دینا۔ جب ہم بچوں کو یہ سب چیزیں کھلاتے رہیں گے تو بھوک ان کو کب لگے گی؟ نمبر 3، کوئی اندرونی بیماری یا اندرونی خرابی جو عموماً کم ہوتی ہے۔ آپ اپنی بچی کو عمر کے حساب سے کھلائیں اور پانی پلائیں۔ بچوں کو کیا خود بھی پیک شدہ اور کیمیکل سے بنی چیزوں سے بچائیں۔ صاف، تازہ، قدرتی غذا دیں۔ کولڈ ڈرنکس کوئی سی بھی اور یہ سب بازاری شربت کلر + پریزرویٹو + ایسنس کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی مضرِ صحت ہیں۔ فیڈر سے کبھی بھی بچوں کو دودھ نہ پلائیں یہ بیماری کا منبع ہے۔ بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Euphrasia30 Kali.mur30 اور Calc.Phos30 کے 3,3 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆☆☆